نواب بہادر حیدر علی خاں

الماس ایم اے

غریب شہر

شمشیر صرف تباہی، بربادی اور قتل و غارت ہی کے لیے بے نیام نہیں ہوتی بلکہ شمشیر کو اس وقت بھی بے نیام کیا جاتا ہے جب تعمیر کا جذبہ دل میں موجزن ہوتا ہے۔

نواب حیدر علی خاں ایسے ہی شمشیر زنوں کا سرخیل ہے جنہوں نے تخریب کے بجائے تعمیر کے لیے تلوار بلند کی۔ وہ اگرچہ تعلیم سے بے بہرہ تھا مگر اس نے ایک چھوٹی سی ریاست کو ایک عظیم سلطنت میں تبدیل کرنے کا جو منصوبہ بنایا اس پر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک طرف نظام دکن، دوسری طرف مرہٹے اور تیسری طرف انگریزی راج کی بنیادیں مضبوط کرنے والے بدنسبی ناجر قدم قدم پر حیدر علی کے قدم روکنے کی کوشش کرتے رہے۔

مگر ــــ

یہ مجاہد اور فاتح "سلطنتِ خداداد میسور" بنانے میں کامیاب و کامران ہوا۔ عظیم جدوجہد پر مشتمل یہ عظیم ناول آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔

المالس ایم۔ اے

۲۶۱۔ خیبر بلاک
اقبال ٹاؤن لاہور
ستمبر ۱۹۹۲ء



شیخ فتح محمد کے گھر میں ہُن برس رہا تھا۔

وہ سرآ کے صوبیدار عابد خاں کے منصب دار تھے۔ منصب دار بھی کوئی ایسے ویسے نہیں بلکہ پانچ سو سوار اور دو ہزار پیادوں کے علاوہ فیل، نقارہ اور علم کے منصب دار تھے۔ ہر روز، روزِ عید تو ہر شب، شبِ برات، کا معاملہ تھا۔ لوگ شیخ فتح محمد کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

مگر —

اس فلکِ کج رفتار کو کسی کی خوشیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ کہتے ہیں کہ ریاست میسور کے اس صوبہ کو کسی کی ایسی نظر لگی کہ یہاں کی بہاریں خزاں میں بدل گئیں۔ سرآ کے صوبے دار عابد خاں کا انتقال کیا ہوا کہ دنیا ہی بدل گئی۔ مرحوم صوبیدار عابد خاں کا بیٹا عبدالرسول صوبیداری کا دعوے دار ہوا۔ اس کا حق بھی تھا لیکن شاہیوں اور شخصی حکومتوں میں تلوار کی زبان چلتی ہے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک اور منصب دار نواب طاہر محمد خاں بھی صوبیداری کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

عبدالرسول خاں نے کچھ معززین اور سرداروں کو بیچ میں ڈالا کہ بغیر خون خرابے کے یہ معاملہ نپٹ جائے۔ شیخ فتح محمد نے بھی بہت دوڑ دھوپ کی مگر نواب طاہر محمد خاں اپنی تلوار بے نیام کر چکے تھے۔ انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور لشکر لے کر سرآ پر چڑھ دوڑے۔

عبدالرسول خاں کو بھی مجبوراً ہتھیار اٹھانا پڑے۔ شیخ فتح محمد، مرحوم نواب عابد خاں کے نمک خوار تھے انہیں مجبوراً عبدالرسول خاں کا ساتھ دینا پڑا۔

ابھی گفت و شنید ہو ہی رہی تھی کہ ایک شب عباس قلی خاں تن تنہا سرائی شہر پناہ کے دروازے پر پہنچا۔ جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے فتح محمد بہت محتاط اور ہوشیار رہتا تھا اس کے سوار اور پیادے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

عباس قلی خاں بالا پور کا حاکم اور نواب طاہر محمد خاں کا بیٹا تھا۔ بعض جگہ عباس قلی خاں کو نواب طاہر خاں کا طرفدار لکھا گیا ہے۔ اسے سب ہی پہچانتے تھے۔ فتح محمد کے سواروں نے اسے فوراً گھیر لیا مگر ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

"نواب قلی خاں!"

فتح محمد کے محافظ سردار نے اسے مخاطب کیا:

"آپ کا اس وقت یہاں آنا بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا آپ آنے کا مقصد بیان کرنا پسند فرمائیں گے؟"

حاکمِ بالا پور قلی خاں نے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا:

"جنگ ناگزیر ہو جائے تب بھی صلح کی گفت گو آخری لمحے تک ہو سکتی ہے۔"

"حاکمِ بالا پور نے درست فرمایا۔" محافظ سردار نے کہا:

"مگر آپ کا تنہا تشریف لانا کیا ایک غیر دانشمندانہ فعل نہیں۔ پھر اس وقت جبکہ آپ کے پدر بزرگوار نواب طاہر محمد خاں اور میرے آقا خان عبدالرسول خاں کے درمیان میدانِ جنگ آراستہ ہو چکا ہے۔"

"تمہارا خیال کسی حد تک ٹھیک ہے محافظ سردار۔" حاکمِ بالا پور عباس قلی خاں نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"لیکن ہم آج جنگ کا بگل بجانے نہیں بلکہ امن کی شہنائیاں لے کے آئے ہیں۔ خان عبدالرسول خاں کو ہمارے آنے کی اطلاع دی جائے۔"

"بہتر ہے حاکمِ بالا پور ___ لیکن ___" محافظ سردار نے رک کر حاکمِ بالا پور عباس قلی خاں کے چہرے کو دیکھا۔

عباس قلی خاں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا مگر منہ سے کچھ نہ بولا بلکہ لٹکی ہوئی تلوار

معہ پیٹی کے اتار کر محافظ سردار کی طرف بڑھا دی۔

"خدا کسی بہادر سے اس کی تلوار الگ نہ کرے"۔ اس کے ساتھ ہی قلی خاں نے زہر خند کیا۔

محافظ سردار نے بھی زہر خند کے ساتھ جواب دیا:

"حاکمِ بالا پور مطمئن رہیں۔ ان کی تلوار ان کی نظروں کے سامنے ہی رہے گی"۔

محافظ سردار نے حاکمِ بالا پور کی تلوار ایک دوسرے محافظ کو دی اور اسے تاکید کی:

"میری واپسی تک تم اپنی جگہ سے نہ ہلو گے"۔

پھر وہ پلٹ کر عباس قلی خاں سے بولا:

"حاکمِ بالا پور میرے ساتھ تشریف لائیے۔ میرا خیال ہے کہ خان عبدالرسول خاں آپ کی ملاقات سے انکار نہ کریں گے"۔

محافظ سردار کے اشارے پر شہر کے بڑے دروازے کے اندر کے چھوٹے دروازے کو کھول دیا گیا۔ محافظ سردار اور عباس قلی خاں حاکمِ بالا پور دروازے سے اندر پہنچ گئے۔

عبدالرسول خاں اپنے مرحوم باپ عابد خاں کی حویلی ہی میں مقیم تھا۔ حویلی شہر پناہ سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ دم کے دم میں یہ دونوں وہاں پہنچ گئے۔

محافظ سردار، عباس قلی خاں کو مہمان خانہ کے ناظم کے حوالے کر کے اندر چلا گیا۔ عباس قلی خاں جیسے بددماغ کے لیے یہ تمام باتیں انتہائی توہین آمیز اور نفرت انگیز تھیں اور اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس توہین کا بدلہ ضرور لے گا۔

کچھ دیر بعد حویلی میں جانے والا محافظ واپس آتا دکھائی دیا لیکن وہ اکیلا نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سرا کا نیا صوبیدار عبدالرسول خاں بھی تھا۔

عبدالرسول خاں مہمان خانے میں داخل ہوا تو عباس قلی خاں کو کھڑے ہو کر اس کی تعظیم کرنا پڑی۔

عبدالرسول خاں بہت نیک اور ملنسار آدمی تھا۔ وہ آگے بڑھ کر عباس قلی خاں حاکمِ بالا پور سے بغل گیر ہوا۔

"خان عباس قلی خاں"۔ عبدالرسول نے کہا:

"آپ کے اس وقت، یہاں آنے سے مجھے جس قدر خوشی ہوئی ہے اُسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ دراصل میں نواب، طاہر محمد خاں کی عزت اپنے بزرگوں کی طرح کرتا ہوں مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ

اس وقت مجھے ان کے مقابلہ پہ کھڑا ہونا پڑا ہے ۔۔۔"

"آپ مقابلے پر کیوں کھڑے ہوتے ہیں عبدالرسول خاں!" عباس قلی خاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

"میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ کو جنگ سے باز رکھوں۔ نواب طاہر محمد خاں نے پیش کش کی ہے کہ اگر آپ سرا کی صوبیداری سے دست کش ہو جائیں تو نواب صاحب آپ کو اس سے بڑے علاقے کی صوبیداری دلانے کے لیے کوشش کریں گے۔"

عبدالرسول خاں کو یہ قطع کلامی اور پیش کش دونوں ہی ناگوار گزریں مگر انھوں نے تحمل سے جواب دیا:

"عباس قلی خاں! میں نواب طاہر محمد خاں کی پیش کش شکریے کے ساتھ مسترد کرتا ہوں۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ نواب طاہر محمد خاں سرا کی صوبیداری کا دعویٰ کس بنا پر کر رہے ہیں۔ میرے پدر بزرگوار عابد خاں سرا کے صوبیدار تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ اب شرعی اور قانونی حیثیت سے میں ان کا وارث ہوں اس لیے کہ میں ان کی اولاد ہوں۔ نواب صاحب خواہ مخواہ میرا حق کیوں چھیننا چاہتے ہیں۔ انہیں سرا کی صوبیداری کا حق کس طرح پہنچتا ہے؟"

"خان عبدالرسول خاں!" عباس قلی خاں بولا:

"یہ تسلیم کہ آپ عابد خاں کے بیٹے ہیں۔ یہ بھی تسلیم کہ عابد خاں سرا کے صوبیدار تھے لیکن عابد خاں اب مرحوم ہو چکے ہیں اور سرا کی صوبیداری بھی ان کے ساتھ ہی دفن ہو چکی ہے۔ سرا کا اب کوئی صوبیدار نہیں۔ جتنا حق سرا پر آپ کا ہے اتنا ہی حق نواب طاہر محمد خاں کا بھی ہے بلکہ نواب صاحب کے علاوہ کوئی بھی سردار سرا کی صوبیداری کا دعویدار ہو سکتا ہے۔"

"یہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ نواب صاحب کو کس آسمانی یا سلطانی قانون نے حق دیا کہ وہ سرا کی صوبیداری کا دعویٰ کریں!" عبدالرسول خاں کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔

حاکم بالاپور کی تیوریوں پر بھی بل پڑ گئے۔

وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ عبدالرسول خاں کا منصب دار شیخ فتح محمد داخل ہوا۔ اس نے حاکم بالاپور عباس قلی خاں کو سلام کیا۔ حاکم بالاپور نے فتح محمد خاں کو صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ ایک قدم اس کی طرف بڑھ کر اپنے بازو اس طرح پھیلا دیے جیسے وہ فتح محمد سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ فتح محمد نے بھی بے تکلفی کا اظہار کیا اور عباس قلی خاں سے بغل گیر ہوا۔

پھر حاکم بالاپور عباس قلی خاں نے شیخ فتح محمد کو مخاطب کیا:

"شیخ صاحب۔ آپ کے اہل و عیال بالاپور میں بالکل خیریت سے ہیں۔ میں نے احتیاط کے طور پر آپ کی حویلی پر پہرہ لگا دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ بالاپور میں زیادہ محفوظ ہیں۔ پھر بھی اگر آپ چاہیں تو انہیں آپ کے پاس بھیج دیا جائے۔"

شیخ فتح محمد حاکم بالاپور کو دیکھ کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عباس قلی خاں کی ہمدردیاں نواب طاہر محمد خاں کے ساتھ ہیں مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عباس قلی خاں کے علم میں یہ بات ہے کہ اس کے اہل خانہ بالاپور میں ہیں ۔۔۔ مگر اس وقت، حاکم بالاپور نے جس انداز سے شیخ فتح محمد پر اس بات کا اظہار کیا کہ اس کے اہل و عیال بخیریت ہیں، اس سے شیخ کو فوراً خطرے کا احساس ہو گیا۔

شیخ فتح محمد نے بہت سنبھل کے کہا:

"مجھے حاکم بالاپور کی شرافت اور خاندانی عظمت سے پوری امید ہے کہ وہ ان بگڑے ہوئے حالات میں میرے اہل خانہ کی حفاظت کریں گے۔ اس لیے کہ اختلاف اور جنگ مردوں اور فوجوں میں ہوتے ہیں۔ فریقین کے اہل خانہ دوران جنگ معصوم ہوتے ہیں اس لیے انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونی چاہیے۔"

"کیوں نہیں شیخ صاحب۔ آپ نے بالکل درست فرمایا۔" عباس قلی خاں فوراً بولا:

"پھر ابھی جنگ کہاں ہو رہی ہے۔ میں عبدالرسول خاں کے پاس نواب طاہر محمد خاں کا صلح کا پیغام لے کے آیا ہوں۔ ذرا آپ بھی عبدالرسول کو سمجھائیے، جنگ سے کسی کا بھی بھلا نہ ہو گا۔"

شیخ فتح محمد نے عبدالرسول خاں کی طرف دیکھا۔

عبدالرسول خود بھی شیخ فتح محمد کو اس گفتگو میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا:

"ہاں شیخ صاحب۔ میں اس بات کی تصدیق تو کر سکتا ہوں کہ حاکم بالاپور صلح کا پیغام لائے ہیں لیکن یہ پیغام دراصل ہماری موت کا پیغام ہے۔ نواب طاہر محمد خاں چاہتے ہیں کہ میں سرا کی صوبیداری سے دست کش ہو جاؤں، یعنی اپنا حق چھوڑ دوں اور نواب صاحب کے رحم و کرم پر زندگی گزاروں۔"

"آپ نے حاکم بالاپور کو کوئی حتمی جواب دے دیا ہے کہ نہیں؟" شیخ فتح محمد نے عبدالرسول خاں سے دریافت کیا۔

"جواب تو نہیں دیا لیکن مجھے نواب طاہر محمد خاں کا مشورہ کچھ پسند نہیں" عبدالرسول خاں نے کہا:

"آپ کی کیا رائے ہے شیخ صاحب؟"

"ہاں — مجھے کچھ دیر سوچنے کا موقع تو دیجیے۔"

شیخ فتح محمد گھبرا گیا:

"فی الحال میں آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

"مگر حاکم بالاپور ہمارے جواب کے منتظر ہیں۔" عبدالرسول خاں نے بتایا۔

شیخ فتح محمد نے حاکم بالاپور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"عباس قلی خاں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کل شام تک کا وقت دیدیں تاکہ میں اور صوبیدار عبدالرسول خاں باہم گفتگو کر کے کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اچھی طرح غور فرمالیجیے۔ میں کل شام تک آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔"

"اور —"

حاکم بالاپور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

عباس قلی خاں کے جانے کے بعد عبدالرسول خاں اور شیخ فتح محمد دیر تک اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے رہے۔ وہ مہمان خانے سے اٹھ کر صوبیدار عبدالرسول کے خاص کمرے میں آئے تھے مگر اب تک ان میں بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

"ارے ہاں۔ شیخ صاحب! آپ جس کام کے لیے گئے تھے اس کا کیا بنا؟" صوبیدار عبدالرسول نے چونک کے سوال کیا۔

شیخ فتح محمد بھی خیالوں سے واپس آچکے تھے۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس لی اور بولے:

"صوبیدار عبدالرسول خاں۔ حاکم بالاپور ہم سے زیادہ عقلمند ہے۔ اس نے میرے گھر پر اس قدر سخت پہرہ لگایا ہے کہ وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ میرے اہلِ خانہ گھر سے باہر جھانک بھی نہیں سکتے۔ عباس قلی خاں نے پہرے داروں کو خبردار کیا ہے کہ اگر شیخ کے بیوی بچے بالاپور سے بھاگ نکلے تو ایک پہرے دار کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ مجھے میرے دوستوں نے بالاپور کی سرحد پر جانے سے روک دیا۔ انھوں نے مجھ سے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اگر بیوی بچوں کو حاصل کرنا ہے تو صوبیدار عبدالرسول خاں کو چھوڑ کے نواب طاہر محمد خاں کا ساتھ دو۔ دوسری صورت

میں بال بچوں سے ہاتھ دھو ڈالو۔"

صوبیدار عبدالرسول، شیخ کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئے تو اس نے پوچھا:

"پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا شیخ صاحب؟"

"وہی فیصلہ جس سے میں نے آپ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔" شیخ فتح محمد نے بڑے استقلال سے جواب دیا۔

"یعنی آپ میرا ساتھ دیں گے؟"

"بالکل ساتھ دوں گا۔"

"خواہ آپ کے بچے —"

"ان کا اللہ مالک ہے۔" یہ کہتے ہوئے شیخ فتح محمد کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ کھنکار کر بولے:

"عبدالرسول خاں۔ میں احسان فراموش نہیں۔ عابد خاں کے مجھ پر اس قدر احسانات ہیں جنہیں میں اپنی جان دے کر بھی نہیں اتار سکتا۔ میں ان کی زندگی میں ان کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا — دراصل ان کی زندگی اور ان کا عہد بڑا پُرسکون تھا۔ کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی کہ میں ان کے کچھ تو احسان اتار سکتا۔ پھر وہ چپکے سے چلے گئے اور اب جبکہ ان کے بیٹے پر وقت پڑا ہے تو میں پیٹھ دکھا جاؤں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

صوبیدار عبدالرسول خاں نے متشکر نظروں سے شیخ فتح محمد کو دیکھا۔ شیخ دو ہزار پیادے، پانچ سو سواروں اور فیل، نقارہ، علم کے ساتھ منصب دار تھے لیکن جس دن سے عابد خاں کا انتقال ہوا اور عبدالرسول خاں نے اپنی صوبیداری کا اعلان کیا تھا تو اس کے ساتھ ہی شیخ فتح محمد کو سرا کی افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا تھا۔

صوبیدار عبدالرسول خاں انہیں پہلے ہی بہت مانتا تھا۔ آج شیخ فتح محمد نے اپنے بیوی بچوں کی پروا نہ کرتے ہوئے عبدالرسول کا ساتھ دینے کا جس عزم اور حوصلے سے اعلان کیا تھا اس نے صوبیدار سرا کو ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنا لیا تھا۔

چالاک اور شاطر حاکمِ بالاپور نے دوسرے روز شام تک عبدالرسول خاں کے جواب کا

انتظار کرنے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ اسی رات وہ نواب طاہر محمد خاں سے ملا اور یہ فیصلہ کیا کہ رات کے بقیہ حصے میں لشکر کو تیار کیا جائے اور صبح ہوتے ہی سرا پر حملہ کر دیا جائے۔

ادھر صوبیدار سرا تو مدافعت کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ پھر جب شیخ فتح محمد سالارِ افواجِ سرا نے اپنے غیر متزلزل عزم کا اظہار کیا تو شیخ کے مشورے سے اس نے بھی رات بھر تیاریوں کا حکم دیا۔

شیخ فتح محمد نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سرا میں بیٹھ کے نواب طاہر محمد خاں کے حملے کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی اپنے لشکر کو حرکت دے گا اور پہلے بالا پور پر حملہ کر کے اپنے اہلِ خانہ کو چھڑائے گا اور عباس قلی خاں سے طنزیہ گفتگو کا بدلہ لے گا۔ اس کے بعد نواب طاہر محمد خاں کو اس کے غرور کا مزہ چکھائے گا۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ دونوں طرف رات بھر جنگی تیاریاں ہوتی رہیں اور صبح ہونے سے پہلے ہی دونوں لشکر سرا کی سرحد کے قریب پہنچ چکے تھے۔

بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ نواب طاہر محمد خاں کی زیادتی ہے۔ سرا کا صوبیدار عابد خاں تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس عہدے پر مرحوم کے بیٹے عبدالرسول خاں کا حق بنتا تھا یا پھر وہ شخص سرا کی صوبیداری کا دعویٰ کر سکتا تھا جسے ریاست میسور کی طرف سے صوبے داری کا پروانہ دیا گیا ہو۔

لیکن —

اس وقت راجہ میسور کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ صرف نام کا راجہ تھا۔ تمام اختیارات راجہ کے وزیرِ اعظم کے ہاتھ میں تھے۔ وہ بھی بے بس سا تھا کیونکہ ریاست کے صوبیدار اور منصب دار راجہ میسور کی سیادت تو تسلیم کرتے تھے مگر اس کا کوئی حکم نہ مانتے تھے۔ چنانچہ منصب دار اور صوبیدار وغیرہ آپس میں لڑتے اور جنگ کرتے رہتے تھے۔ جو طاقتور ہوتا وہ دوسرے کو معزول کر دیتا اور راجہ میسور سے اپنے حق میں تقرری کا پروانہ حاصل کر لیتا۔

نواب طاہر محمد خاں اور عبدالرسول خاں کا جھگڑا جس نے اب جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی، کچھ اسی قسم کا تھا۔ صوبیدار عابد خاں کے مرتے ہی نواب طاہر محمد خاں نے سرا کی صوبیداری پر دانت گاڑ دیے۔

عابد خاں کی حیات میں تو اس نے سرا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا مگر ان کے مرتے ہی

وہ شیر کی طرح انگڑائی لے کر اٹھا اور عبدالرسول خاں کو سرا کی صوبیداری سے ہٹ جانے کا پیغام بھیجا۔ یہ پیغام نہیں تھا بلکہ الٹی میٹم تھا۔ نواب طاہر محمد خاں کو اپنی کامیابی کی سو فیصد امید تھی کیونکہ اس کے ساتھ حاکمِ بالا پور عباس قلی خاں بھی تھا۔

سرا کا موجودہ صوبیدار عبدالرسول خاں واقعی ایک کمزور اور کم عقل انسان تھا لیکن اس کا منصب دار جو عابد خاں کے مرنے پر سرا کا سپہ سالار بنایا گیا تھا، وہ شیخ فتح محمد تھا جس کی بہادری اور دور اندیشی کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

شیخ فتح محمد کے بال بچے بالا پور میں رہتے تھے جہاں کا حاکم عباس قلی خاں تھا۔ نواب طاہر محمد خاں نے اسی لیے حاکمِ بالا پور کو عبدالرسول خاں کے پاس بھیجا تھا تاکہ عباس قلی خاں اور شیخ فتح محمد کے درمیان بھی گفتگو ہو سکے۔

حاکمِ بالا پور کو دراصل شیخ فتح محمد سے سودے بازی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ شیخ فتح محمد بھی غافل نہ تھا۔ ابھی چند دن پہلے نواب طاہر محمد خاں نے سرا کی صوبیداری کا جھگڑا کھڑا کیا تھا۔ نواب طاہر کی اپنی کوئی بڑی فوج نہ تھی۔ یہ بات فتح محمد کو معلوم تھی اور اسی وجہ سے فتح محمد نے چاروں طرف اپنے جاسوس دوڑائے تھے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ نواب طاہر محمد خاں کی پشت پر اور کون لوگ ہیں جن کی شہ پر وہ سرا جیسے مضبوط صوبہ پر بزورِ شمشیر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔

شیخ فتح محمد کے جاسوسوں نے اسے جلد ہی اطلاع دی کہ حاکمِ بالا پور عباس قلی خاں، نواب کا حلیف ہے اور جنگ کی صورت میں بالا پور کا لشکر نواب کا ساتھ دے گا۔

بالا پور کا نام سنتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے اس لیے کہ بالا پور میں اس کی بیوی اور دو بچے رہائش پذیر تھے۔ بس وہ اسی وقت بالا پور روانہ ہو گیا مگر جب وہ بالا پور کی سرحد پر پہنچا تو اس کے چند دوستوں نے اسے وہیں روک لیا اور بتایا کہ حاکمِ بالا پور نے اس کے اہلِ خانہ پر سخت پہرہ لگا دیا ہے اس لیے اس کا وہاں جانا موت کو دعوت دینا ہے۔

شیخ فتح محمد نے اپنے دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یہی تاثر دیا کہ وہ واپس سرا جا رہا ہے مگر بال بچوں کا معاملہ اس کے دل سے لگا تھا اور وہ چوکی پہرے کے ڈر سے بالا پور جانے سے نہیں رک سکتا تھا۔

دوستوں سے رخصت ہو کے وہ تھوڑی دور واپس آیا اور راستہ کاٹ کر بالا پور میں داخل ہو گیا۔ فتح محمد سیدھا اس مکان پر گیا جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ گیا تھا۔

وہ یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ مکان پر کوئی پہرہ نہ تھا۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا گھر کے دروازے پہ پہنچ گیا لیکن اسے نہ کسی نے ٹوکا اور نہ باز پرس کی۔

اس وقت اسے اپنے دوستوں پہ سخت غصہ آیا مگر جب مکان کے دروازے پر اس نے تالا لگا دیکھا تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

رات کا وقت تھا اس لیے اسے نہ کسی نے دیکھا اور نہ پہچان سکا۔ اس کے گھر کے قریب ہی ایک قہوہ خانہ تھا۔ اس کا مالک شیخ کا شناسا تھا۔ وہ قہوہ خانے کے مالک کے پاس گیا تو وہ فتح محمد کو دیکھ کر گھبرا گیا اور جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کے کمرے میں لے گیا۔

"شیخ صاحب! آپ نے یہاں آکے بڑی غلطی کی ہے"۔ قہوہ خانے کے مالک نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"گھبراؤ نہیں!" شیخ نے اسے تسلی دی:

"اگر میں پکڑا گیا تو تم پہ کوئی بات نہ آنے دوں گا۔ مجھے جلدی سے بتاؤ کہ میرے گھر والے کہاں گئے یا انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟"

مالک کو ذرا حوصلہ ہوا تو اس نے بتایا:

"آپ کے گھر پر سخت پہرہ لگا تھا شیخ صاحب۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دو سو سوار اور پیادے آپ کے گھر کو گھیرے رہتے تھے!"

"مجھے تفصیل نہ بتاؤ ـــــ" شیخ نے اس کی بات کاٹ دی:

"صرف یہ بتاؤ کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ زندہ ہیں یا ـــــ"

"خدا نہ کرے!"

قہوہ خانے کے مالک نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا:

"پرسوں تک وہ اسی مکان میں تھے۔ پھر اک دم حاکم کا حکم آیا کہ گھر والوں کو یہاں سے نکال کر قید خانہ میں رکھا جائے۔ اسی وقت یہاں سے لے گئے۔ خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔ ظالم! آپ کی بیوی اور دونوں بچوں کو پیدل چلا کر لے گئے ہیں یہاں سے۔"

شیخ فتح محمد نے ایک گہری سانس لی۔ پھر پوچھا:

"قید خانہ کہاں اور کتنی دور ہے؟"

"خدا کے لیے شیخ صاحب۔ وہاں جانے کی کوشش نہ کیجیے۔" قہوہ خانے کے مالک نے

شیخ سے درخواست کی:

"میں کل دن بھر وہیں چکر لگاتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ ضرور آئیں گے اور مجھ سے ضرور دریافت کریں گے اس لیے میں کل ادھر حال چال لینے گیا تھا۔

شیخ صاحب! عجب طرح کا پہرہ ہے وہاں۔ قدم قدم پر مسلح سوار کھڑے ہیں۔ قید خانہ کے چاروں طرف ایک میل دور تک، پہرہ ہی پہرہ ہے۔ آپ وہاں نہ جائیے۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں"۔

قہوہ خانے کے مالک نے لاکھ جتن کیے کہ شیخ فتح محمد ادھر نہ جائیں مگر ان کا دل کب مانتا تھا۔ اس کے پاس سے تو ہوں ہاں کر کے اٹھ گئے مگر بیوی بچوں کی محبت، آخر انہیں ادھر کھینچ ہی لے گئی۔

مگر ـــــ

نتیجہ وہی ہوا جس کا اشارہ قہوہ خانے کے مالک نے دیا تھا۔ وہ تو خیر ہوگئی ورنہ ایک محافظ نے انہیں دشمن کا جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا تھا اور کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ شیخ صاحب کو غصہ، صدمہ اور بے کسی نے ایسا گھیرا کہ ان کے سچ مچ آنسو نکل آئے۔ اس وقت محافظ کو ان پر رحم آ گیا ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔

پھر جب شیخ فتح محمد تھکے ہارے اور ناکام سرا پہنچے تو وہاں اپنے دشمنِ خاص یعنی عباس قلی خاں کو صوبیدار عبدالرسول خاں سے الجھتے ہوئے پایا اور پھر وہ سب کچھ گزرا جس کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔



دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔

انہیں ایک دوسرے کی فوج کو دیکھ کر ذرا بھی حیرانی نہیں ہوئی۔ عباس قلی خاں نے اگرچہ دوسرے دن شام تک کے لیے فتح محمد کو مہلت دی تھی لیکن اس نے یہ وعدہ وفا نہ کیا اور رات کے آخری حصہ میں نواب طاہر محمد خاں اور اپنی فوجیں لے کر سرا کی سرحد کی طرف چل پڑا۔ یہ سراسر دھوکہ بازی تھی لیکن جنگ کی زبان میں اسے حکمتِ عملی کہتے ہیں اس لیے کہ جنگ میں ہر بات جائز ہے۔

صوبیدار عبدالرسول خاں اور شیخ فتح محمد نے بھی ایسی ہی پیچ حرکت کی۔ شیخ نے عباس قلی خاں سے

کل شام تک جواب دینے کی مہلت حاصل کی تھی لیکن اس نے رات ہی کو فوجیں تیار کیں اور سرحد کی طرف چل پڑا مگر جب اس نے سرحد پر نواب طاہر محمد خان اور عباس قلی خان کے متحدہ لشکر کو حرکت کرتے دیکھا تو اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ عباس قلی خان کو دھوکہ باز کس طرح کہتا جبکہ خود اس نے بھی دھوکہ بازی سے کام لیا تھا۔ اس طرح دونوں لشکروں کے کرتا دھرتا دھوکے باز تھے لیکن وہ ایکدوسرے کو زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔

آخر انھوں نے ذرا دن چڑھے ایکدوسرے کو جواب دیا لیکن اپنی زبان سے نہیں بلکہ تیرد شمشیر کی زبان سے اور کمند و تفنگ کی زبان سے۔ دونوں کے پاس بڑے لشکر نہ تھے مگر جنگ اس طرح شروع ہوئی جیسے شیروں اور بھیڑیوں کے غول ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے ہوں۔

نواب طاہر محمد خان نے صوبیدار سراکہ الٹی میٹم دیا تھا اور اب وہ اس الٹی میٹم کی لاج رکھنے کے لیے زبردست جنگ کر رہا تھا۔

صوبیدار عبدالرسول خان کی پوزیشن اس سے زیادہ خراب تھی۔ اس کی صوبے داری صرف اسی صورت میں بچ سکتی تھی کہ وہ نواب عباس قلی خان کے متحدہ لشکر کو میدان سے مار بھگائے مگر یہ مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس کے مقابل برابر سے بھی زیادہ لشکر تھا اس لیے عبدالرسول خان جی توڑ کے لڑ رہا تھا۔

شیخ فتح محمد اسے ناکارہ اور بزدل سمجھتا تھا لیکن عبدالرسول خان اس قدر جرأت و بہادری سے لڑا کہ شیخ فتح محمد عش عش کر اٹھا۔

رہا شیخ فتح محمد خان تو اسے بہادری سے لڑنا ہی نہ تھا بلکہ شجاعت کے جھنڈے گاڑ دینا تھے۔
ایک تو وہ منصب دار سے نیا نیا فوجدار (سپہ سالار) بنا تھا اس لیے اسے اپنی فوجداری کی عزت برقرار رکھنی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے گھر والے بالاپور میں عباس قلی خان کی قید میں تھے۔ ان کی سلامتی اور آزادی کی یہی صورت تھی کہ وہ دشمن کو شکستِ فاش دے کر عباس قلی خان کو قتل کرے اور بیوی بچوں کو آزاد کرائے۔

یہ مختصر فوجوں کی مختصر سی جنگ ایک خونریز جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جنگ صبح ہی سے تیز ہو رہی تھی مگر دوپہر ہوتے ہوتے اس میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سراداوں کا پلّہ بھاری پڑ رہا تھا۔ شیخ فتح محمد کے تابڑ توڑ حملوں نے عباس قلی خان کو بوکھلا دیا تھا

اس کا لشکر پسپا ہونے لگا تھا۔

عباس قلی خان کی فوج میدان چھوڑ گئی تھی لیکن وہ خود اپنے ذاتی محافظوں کے ساتھ میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ شیخ فتح محمد نے اس پہ بہت دباؤ ڈالا تھا اور اس کا دباؤ اب اور زیادہ ہو گیا تھا کیونکہ قلی خان کے گرد صرف نام کے چند سوار رہ گئے تھے۔ آخر شیخ فتح محمد نے اپنا آخری زوردار حملہ کیا اور اپنا گھوڑا اچکا کے اپنے فوجی دستوں سے آگے نکل کر عباس قلی خان کے پاس پہنچ گیا۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شیخ فتح محمد اپنے حریف کو چند ہی لمحوں میں مار کر گرا دے گا یا پھر اسے میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔

لیکن ——

تمام اندازے اور اندیشے غلط ثابت ہوئے۔

عباس قلی خان جس کی اپنی جان شدید خطرے میں تھی، اور وہ کوئی دم کا مہمان نظر آتا تھا، اس عباس قلی خان نے نہ جانے کس زبان میں اپنے محافظوں کو کیا حکم دیا کہ عباس قلی خان کے دس بارہ سواروں نے زین میں اٹکی ہوئی ریشم کی ڈوریاں تیزی سے کھولیں اور ایک ساتھ ان کی بارہ کمندیں ہوا میں لہراتی ہوئی شیخ فتح محمد پہ لہراتے سانپوں کی طرح گریں۔

شیخ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا لیکن وہ ایک ماہر شمشیر زن تھا۔ وہ گھوڑا موڑ کے کمندوں کے پھندوں سے صاف نکل گیا اور دو کمندیں اس کی تلوار کی دھار سے ٹکرا کر کٹ گئیں۔

اب شیخ فتح محمد کو اپنی فکر پڑ گئی۔

وہ اپنے دستوں سے پانچ گز آگے نکل آیا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ تیزی سے اپنے لشکر کی طرف پلٹا لیکن مخالف سواروں کے آٹھ دس کمندوں کے سلسلے لہرا کر پھر اس پر گرے۔ ایک حلقۂ کمند اس کی تلوار کو گھیرے میں لیتا ہوا اس کی کلائی تک پہنچا اور جب وہ کھینچا تو تلوار شیخ فتح محمد کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔

اسی وقت ایک دوسرا حلقہ اس کی گردن کے گرد سانپ کی طرح لپٹ گیا۔ پھر جب اس پہ زور پڑا تو شیخ فتح محمد جو کافی تن و توش کا مالک تھا، گھوڑے سے اچھل کر پہلے زین سے اٹکا۔ پھر زمین پر آ رہا۔

اس کے ساتھ ہی دس بارہ تلواریں ایک ساتھ اس کے جسم پر گریں اور پورا بدن چھلنی ہو

کر رہ گیا۔

شیخ فتح محمد کا لشکر جو بڑی بہادری سے عباس قلی خاں کے لشکر کو دباتا ہوا عباس قلی خاں کے پاس پہنچ چکا تھا اور عباس قلی خاں کے بیشتر دستے پہلے ہی میدان چھوڑ بھاگے تھے، ان دستوں نے اپنے فوجدار اور سپہ سالار شیخ فتح محمد کو گھوڑے سے گرتے دیکھا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے فوجدار کو بچانے کے لیے آگے بڑھتے، انہوں نے اپنے گھوڑوں کا رخ موڑا اور میدان سے بھاگ نکلے۔

ان کی دیکھا دیکھی وہ فوج جو عبدالرسول خاں کے زیرِ کمان بڑی بہادری سے اپنی جگہ جم کر لڑ رہی تھی، اس میں بھی انتشار پیدا ہوا اور عبدالرسول خاں کے روکنے کے باوجود منتشر ہو کر بھاگ نکلی۔

اس طرح عبدالرسول خاں کی صوبیداری کا خاتمہ ہوگیا۔

نواب طاہر محمد خاں، سرا کے نئے گورنر مقرر ہوگئے۔ راجہ صاحب میسور نے بھی نواب طاہر کو صوبیدار سرا کا پروانہ بھیج دیا۔

چونکہ حاکم بالاپور عباس قلی خاں نے نواب طاہر محمد خاں کی کھلے بندوں مدد کی تھی، اس لیے بالاپور کے متصل دس دیہات کی حکومت کا پروانہ اسے بھی مل گیا۔

مثل مشہور ہے کہ مرے پر سو دُرّے۔ شیخ فتح محمد نے میدانِ جنگ میں دشمن سے لڑتے ہوئے جان دی۔ وہ صوبہ سرا پر قربان ہوگئے۔ صوبیدار عبدالرسول سے باندھے ہوئے عہدِ وفا کو نبھا گئے۔ انہوں نے جان دے دی مگر بہادری اور وفاداری پر آنچ نہ آنے دی۔ جنگ سے پہلے انہیں حاکم بالاپور عباس قلی خاں نے بڑے سبز باغ دکھائے۔ لالچ کا ہتھیار بھی استعمال کیا اور اہلِ خانہ کے کمزور پہلو پر بھی وار کیا لیکن وہ جان باز اور وفا کا پیکر یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیوی بچے شدید خطرے میں ہیں، پھر بھی حق سے ناحق نہ ہوا اور آخر اس نے بہادروں کی طرح جان دیدی۔

موت برحق ہے اور ذی روح کو اس کے وقت پر موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن اگر بے وقت موت آئے تو بعض اوقات اس کے بڑے خطرناک اور بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔

حاکم بالاپور عباس قلی خاں نے جب شیخ فتح محمد کے بیوی بچوں کو بے گھر کیا اور قید خانہ میں ڈال کے ان پر سخت پہرہ بٹھا دیا تو اس نیک بی بی نے اس وقت بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ عزت اور ذلت، خدا ہی کے ہاتھ میں اور اسی کی طرف سے ہے۔ وہ مصائب میں ڈال کر انسان کے صبر کا امتحان لیتا ہے۔

اس بی بی نے بہت اچھے دن دیکھے تھے اس لیے وہ ان برے دنوں میں بھی خدا کو نہ بھولی اور صبر و شکر کر کے قید و بند کے دن گزارتی رہی۔

مگر جب شیخ فتح محمد میدانِ جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا اور حاکم بالاپور کو یہ اطمینان ہوگیا کہ قید خانہ میں پڑی ہوئی مظلوم ہستیوں کا کوئی والی وارث نہیں رہا تو وہ اور زیادہ کھل کھیلا۔

شیخ فتح محمد کے اہلِ خانہ بالاپور میں رہائش پذیر تھے اور حاکم بالاپور انہیں قتل بھی کرا سکتا تھا لیکن عباس قلی خاں جس قدر ظالم تھا اتنا ہی دور اندیش بھی تھا۔ اس نے انہیں قتل کرانے کے بجائے اس لیے قید کیا تھا کہ اگر اسے شکست ہوگئی اور شیخ فتح محمد کامیاب ہوا تو وہ ان مقید عورت اور بچوں کی آڑ میں فتح محمد سے سودے بازی کرے گا اور ان کے صلے میں منہ مانگی رقم یا علاقہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

مگر ــــ

قدرت نے جنگ کا فیصلہ بھی اس کے حق میں کر دیا تھا اور شیخ فتح محمد ہمیشہ کے لیے اس کے راستہ سے ہٹ گیا تھا۔ اب فتح محمد کے بیوی بچے اس کے لیے بیکار ہوگئے تھے اور انہیں قید رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

تاہم اس ظالم کو پھر یہ خیال آیا کہ شیخ کے اہلِ خانہ کو قید میں رکھنے پر اس کی کچھ رقم خرچ ہوئی تھی اس لیے پہلے ان سے یہ رقم حاصل کر لے پھر ان کی رہائی کے بارے میں سوچے گا۔

مرحوم فتح محمد کی بیوی مجیدہ بیگم، سرا کے ایک بڑے زمیندار کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے میکے میں بھی اچھے دن دیکھے تھے۔ پھر جب ان کی شادی شیخ فتح محمد سے ہوئی تو بھی انھوں نے خوشیاں ہی دیکھیں۔

شیخ فتح محمد شادی کے وقت سرا کے منصب دار تھے۔ فتح محمد سے ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام شہباز اور چھوٹے کا نام حیدر علی تھا۔ دونوں بھائیوں میں پانچ سال کا فرق تھا۔ شہباز دس سال کا تھا اور حیدر علی صرف پانچ سال کا تھا۔ کہاں وہ سجی سجائی حویلی۔ نوکر چاکر۔ گھر اعلیٰ قسم کے سامان سے بھرا ہوا۔ نہ فکر نہ فاقہ۔ دونوں بھائیوں کے رئیسانہ ٹھاٹ تھے مگر قسمت نے جو پلٹا کھایا تو رئیس سے فقیر ہوگئے۔ حاکم بالاپور نے حویلی ضبط کر کے مجیدہ بیگم، شہباز اور حیدر علی کو

قید میں ڈال دیا۔

حاکم بالاپور عباس قلی خان کا کلیجہ مجیدہ بیگم اور دونوں بچوں کو قید میں ڈال کے بھی ٹھنڈا نہ ہوا اور ان پر مزید ستم توڑنے کے لیے اس نے ایک نیا حربہ استعمال کیا۔

اس نے تینوں قیدیوں کو قید خانہ سے بلوا بھیجا۔

مجیدہ بیگم کا کسی نے سایہ بھی نہ دیکھا تھا۔ حاکم بالاپور نے حکم دیا کہ قیدیوں کو ننگے سر اور ننگے پاؤں پیش کیا جائے۔

سپاہیوں نے اس نیک خاتون کے سر سے چادر بھی کھینچ لی۔ اس طرح اسے بے پردہ کیا گیا۔ بچوں نے سپاہیوں کو روکنے کی کوشش کی تو انہیں مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔

"تیرے شوہر نے صوبہ سرا کے خزانے سے اٹھارہ ہزار روپے غبن کیے ہیں۔ یہ رقم پوری کر ورنہ تیرے لڑکوں کو قتل کر دیا جائے گا۔" عباس قلی خان نے مجیدہ بیگم کو سر سے ننگا ہی نہیں کیا بلکہ اس کے مرے ہوئے شوہر پر چوری کا الزام لگایا۔

مجیدہ بیگم تڑپ اٹھی۔

اس کے شوہر شیخ فتح محمد کی ایمانداری کی قسمیں کھائی جاتی تھیں اور اب اس کے مُردے پہ غبن کا الزام لگایا جا رہا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور رونا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ بےچاری اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

"رونے کی ضرورت نہیں۔"

عباس قلی خان نے اسے ڈانٹا:

"اٹھارہ ہزار روپے کا انتظام کر ورنہ دونوں لڑکوں سے ہاتھ دھو ڈال۔"

شوہر مارا جا چکا تھا۔ اب بچے بھی ہاتھ سے جا رہے تھے۔ مجیدہ نے شرم و غیرت بالائے طاق رکھی۔ باپ دادا کی عزت سے منہ موڑا اور حاکم بالاپور عباس قلی خان کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہو گئی۔

"آپ حاکم ہیں۔ جو کہہ رہے ہیں ضرور سچ ہوگا۔"

مجیدہ بیگم نے خوشامد کا سہارا ڈھونڈا:

"مجھے اجازت دیجیے کہ اپنی حویلی کا سامان بیچ کے سرکار کے اٹھارہ ہزار پورے کروں۔"

"تیری حویلی کے سامان کا حساب منشی نے کیا ہے۔ وہ صرف ایک ہزار کا ہوتا ہے۔ باقی سترہ ہزار کہیں اور سے لا کر پورے کر ورنہ ——" اور عباس قلی خان نے ایک بھیانک قہقہہ لگا کر جملہ پورا کر دیا۔

مجیدہ بیگم دھک سے رہ گئی۔

اس زمانے میں بھی اس کی حویلی میں لاکھوں کا سامان تھا۔ دنیا کی ہر چیز موجود تھی گھر میں۔ سجاوٹ اور آرائش کے سامان میں ایک سے ایک نادر چیز تھی۔ بہت سی چیزیں سونے چاندی کی تھیں۔ پورے بیس سیر چاندی کا سنگاردان تھا جس کے سونے کے فریم میں آئینہ جڑا تھا۔ چالیس پچاس ہزار کے تو مجیدہ بیگم کے زیورات ہی تھے۔ کیا کچھ نہ تھا۔ ایک ہیرے کی انگوٹھی اس نے گرفتاری کے وقت چھپالی تھی۔ باقی تمام زیور جو حویلی میں تھا یا مجیدہ بیگم کے جسم پہ تھا، اسے سپاہیوں نے اتروا کر بحقِ سرکار ضبط کر لیا تھا۔

مجیدہ بیگم ہاتھ مل کے رہ گئی۔

حاکم بالاپور نے جب اٹھارہ ہزار کا الزام لگایا تھا تو اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی تھی۔ غبن کا الزام لگانے کا اسے صدمہ ضرور ہوا تھا لیکن اٹھارہ ہزار تو صرف اس کے گھر کے سامان سے وصول کیے جا سکتے تھے اس لیے اس نے کہہ دیا تھا کہ گھر کا سامان فروخت کر کے رقم پوری کر لی جائے لیکن —— اس ظالم نے تو اس کے پورے اثاثے کی قیمت ایک ہزار روپے لگوائی تھی۔ باقی سترہ ہزار وہ کہاں سے لائے۔ کس سے مانگے۔

"کیا سوچ رہی ہے بڑھیا!"

حاکم بالاپور نے اسے چونکا دیا:

"رقم کا انتظام کرنا ہے یا میں تیرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کے باپ کے پاس بھیج دوں؟"

"نہیں نہیں۔ ایسا نہ کیجیے۔"

مجیدہ بیگم چیخ پڑی:

"میں رقم کا انتظام کر دوں گی۔ آپ مجھے کچھ مہلت دیجیے۔"

"کہاں سے کرے گی انتظام؟" حاکم بالاپور نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا۔

"سرنگاپٹم میں میرا بھتیجا ہے۔ آپ مجھے جانے دیجیے۔ میں پورے سترہ ہزار لا کے ادا کر دوں گی۔"

مجیدہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے درخواست کی۔

"صرف تو جا سکتی ہے۔ تیرے بچے یہیں رہیں گے۔ پندرہ دن میں واپس نہ آئی تو یہ زندہ نہ بچیں گے۔" حاکم بالاپور نے فیصلہ کر دیا۔

مجیدہ بیگم نے یہ شرط بھی مان لی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے والا معاملہ تھا۔

ماں نے دونوں بچوں کو پیار کیا۔

کہتے ہیں کہ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں معلوم ہو جاتے ہیں۔ شہباز اور حیدر علی نہ روئے نہ چیخے بلکہ انھوں نے نہایت خاموشی سے ماں کو رخصت کیا۔

مجیدہ بیگم اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔

"مجھے جانے کی اجازت ہے؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں حاکم بالاپور سے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ شام کو جانا۔"

پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا:

"انہیں لے جاؤ اور شام کو پھر پیش کرنا۔"

سپاہی مجیدہ بیگم اور اس کے دونوں بیٹوں کو قید خانہ واپس لے گئے۔

شام کو تینوں ناکردہ گناہ قیدی اس ظالم عباس قلی خاں کے سامنے پیش کیے گئے۔ عباس دربار لگائے بیٹھا تھا۔

دربار کے ایک طرف دو بڑے بڑے نقارے رکھے تھے۔ نقاروں پہ کھال منڈھی ہوئی نہ تھی بلکہ وہ کھلے ہوئے تھے۔ ایسے نقاروں پر اس وقت چوٹ پڑتی جب کسی بڑی تقریب کا آغاز ہوتا تھا مگر عام طور پہ اس طرح کے نقارے میدانِ جنگ میں لڑائی کے آغاز میں بجائے جاتے تھے۔

مجیدہ بیگم کے دربار میں پہنچتے ہی عباس قلی خاں نے حکم دیا:

"دونوں لڑکوں کو ان کی ماں سے جدا کر دیا جائے اور ماں کو دو سپاہی مضبوطی سے پکڑے رکھیں۔"

حکم کی تعمیل ہوئی۔

مجیدہ بیگم نے بچوں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ جدائی کے وقت رونے دھونے کے بجائے صبر کا مظاہرہ کریں۔ شیخ فتح محمد کے دونوں بیٹے بڑے حوصلے والے اور صابر تھے۔ وہ عباس قلی خاں کا حکم سنتے ہی ماں سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجیدہ بیگم کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں مگر وہ ضبط کیے ہوئے

کھڑی تھی۔

دو سپاہیوں نے دونوں لڑکوں کی کلائیاں مضبوطی سے پکڑ لیں اور دو سپاہیوں نے مجیدہ بیگم کے بازو مضبوطی سے تھام لیے۔

مجیدہ بیگم کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ جب بچوں یا اس نے کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا تو انھیں اس قدر مضبوطی سے کیوں پکڑا گیا ہے۔ اس بے چاری کو علم ہی نہ تھا کہ صیاد نے معصوم بچوں کے لیے ایک ایسا قفس بنوایا ہے جو تاریخ میں کم از کم بچوں کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

دس سالہ شہباز اور پانچ سالہ حیدر علی جب عباس قلی خاں کے روبرو پہنچے تو اس نے گرجدار آواز میں حکم دیا:

"ان لڑکوں کو الگ الگ دونوں نقاروں میں بند کر کے ان پہ کھال چڑھا دی جائے۔"

یہ حکم سن کر مجیدہ بیگم کی چیخیں نکل گئیں۔

اس نے زور لگا کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر سپاہیوں کی اس کے بازوؤں پر گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

شہباز اور حیدر علی کے لیے بھی یہ حکم بالکل غیر متوقع تھا اس لیے وہ بھی کسمسائے لیکن سپاہیوں نے انہیں جتلایا کہ اگر انھوں نے ذرا بھی مزاحمت کی تو وہ انہیں مارنا شروع کر دیں گے۔ اس لیے بچوں نے خود کو قسمت کے حوالے کر دیا۔

مجیدہ بیگم نے وہیں سے بڑے دلدوز لہجے میں فریاد کی:

"اے ظالم! ان معصوم بچوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ تو آخر انہیں کیوں مارنا چاہتا ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ پوری رقم تجھ تک پہنچاؤں گی۔ خدا کے لیے انہیں چھوڑ دے۔ مت مار انہیں۔ اگر مارنا ہی ہے تو انہیں قتل کرا دے۔ انہیں اذیت دے کر تو نہ مار۔ ان کا دم گھٹ جائے گا نقاروں کے اندر۔"

عباس قلی خاں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

"بک بک مت کر شیطان کی خالہ! آنکھیں کھول کے دیکھ۔ نقاروں میں ہوا جانے کے لیے سوراخ کرا دیے گئے ہیں۔ پندرہ دن تک یہ کتے کے پلے نہیں مر سکتے۔ ہاں اگر تو نے رقم لانے میں دیر کر دی تو پھر یہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ضرور مر جائیں گے۔"

مجیدہ بیگم نے نقاروں میں جگہ جگہ سوراخ دیکھے تو اسے اطمینان ہوا۔ اس نے بچوں سے آواز دے کر کہا:

"میرے بہادر بیٹو۔ نہ رونا اور نہ صبر کا دامن چھوڑنا ورنہ میں تمہیں دودھ نہ بخشوں گی"۔

مجیدہ بیگم اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور اسے غش آ گیا اور وہ سپاہیوں کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

"اسے ایک طرف ڈال دو"۔

عباس قلی خاں نے کہا:

"ہم چاہتے تھے کہ تو اپنے لاڈلوں کے نقاروں میں منڈھے جانے کا دلچسپ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتی مگر خیر ــــ"

عباس قلی خاں نہ جانے اک دم کیوں چپ ہو گیا۔ ذرا دیر چپ رہنے کے بعد اس نے حکم دیا:

"لڑکوں کو نقاروں میں ڈال کر جلدی سے کھال منڈھ دو۔ یہ غلیظ کام جلد ختم ہونا چاہیے"۔

شہباز اور حیدر علی نے انتہائی صبر اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ جب انہیں نقاروں پر چڑھا دیا گیا تو ننھے حیدر علی نے کہا:

"ہمیں اندر مت پھینکو۔ ہم خود اس کے اندر کود جائیں گے"۔

اور ــــ

حیدر علی نے جلدی سے نقارے کے اندر چھلانگ لگا دی۔ شہباز بھی فوراً دوسرے نقارے میں کود پڑا۔

سپاہی اور تمام درباری بچوں کی جرأت پر حیران رہ گئے۔ عباس قلی خاں کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

عباس قلی خاں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے حکم دیا:

"عورت کو ہوش آ جائے تو اسے باہر نکال دینا اور کہہ دینا کہ اگر وہ وقت پر نہ پہنچی تو اس کے بیٹے تڑپ، تڑپ کر مر جائیں گے"۔

جب ظلم حد سے بڑھ جائے تو مظلوم کے ہمدرد انہی ظالموں میں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

حاکم بالا پور عباس قلی خاں دربار برخاست کر کے محل میں چلا گیا۔ نقاروں پر کھال منڈھ کر

ان کو بند کر دیا گیا۔

یہ ایک ایسی قید تھی جس کے ذکر سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم انگریزوں کے ظلم و ستم کو روتے ہیں۔ "بلیک ہول" کا شکوہ کرتے ہیں جس میں انگریزوں نے ۱۴۵۔ آدمیوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں ٹھونس کے بھر دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ سب کے سب دم گھٹ کر مر گئے۔

ٹھیک ہے ــــ انگریزوں کا یہ ظلم ایک سیاہ داغ بن کر تاریخ کا حصہ ہو گیا جسے انگریز قوم آج تک نہ مٹا سکی۔

مگر ــــ

وہ تو انگریز تھے۔ انہوں نے ہندوستانیوں پر یہ ظلم کیا تھا مگر اس ظالم عباس قلی خاں نے تو اپنی ہی ہم قوم ایک عورت اور اس کے بچوں کے ساتھ کیا گیا۔ اس کا اختلاف شیخ فتح محمد سے تھا، نہ کہ اس کے بیوی بچوں سے۔

ایسے ہی لوگوں نے مسلمانوں کو بدنام کیا اور انہی لوگوں کی غداریوں سے برصغیر میں مسلمانوں کی عظیم حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اُدھر سپاہی نقاروں کے کام سے فارغ ہوئے اِدھر مجیدہ بیگم کو ہوش آیا۔ چار سپاہی اسے گھیرے کھڑے تھے۔

ہوش میں آتے ہی اس کے منہ سے

"ہائے میرے بچے!"

نکلا اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ایک سپاہی جس کی داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے، وہ ایک قدم مجیدہ بیگم کی طرف بڑھ کے بولا:

"او مائی۔ تُو میری دین کی بہن بھی اور دنیا کی بھی ــــ تُو خاموشی سے یہاں سے چلی جا۔ یہاں سے کچھ دور پر ایک سرائے ہے۔ اس کے مالک سے جا کے کہنا کہ تُو وہی عورت ہے جس کے بچوں کو آج نقاروں میں منڈھوایا گیا ہے۔ وہ تیرے لیے گھوڑے وغیرہ کا انتظام کر دے گا۔ خدا کا نام لے کر سرپٹ نکل جانا اور جہاں سے روپیہ ملتا ہے وہاں سے روپیہ حاصل کر کے جس قدر جلد ہو سکے واپس آ جانا۔ میں اور میرے ساتھی وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے بیٹوں کو نقاروں کے اندر

مرنے نہیں دیں گے۔"

سپاہی کی باتیں سن کے جیسے مجیدہ بیگم کے جسم میں جان آ گئی۔ اس نے سپاہیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں چھلک پڑیں۔

"دیر نہ کر میری بہن!"

اسی سپاہی نے پھر کہا:

"ہم سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تیرے دل کا حال معلوم ہے۔ تیرے لیے ایک ایک پل قیمتی ہے۔"

مجیدہ بیگم نے ایک نظر منڈے ہوئے نقاروں کو دیکھا پھر متشکر نظروں سے سپاہیوں کو دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔





ہندوستان کی قدیم تاریخ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے کہ ہندوستان میں عہدِ قدیم میں تاریخ نویسی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ٹیکسلا جیسی قدیم یونیورسٹی میں بھی تاریخ کا مضمون نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان کے کسی راجہ مہاراجہ کا ذکر مقصود ہوتا ہے تو ہمیں ہندوستان کی ہندو قوم کی دو مذہبی کتابوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

ہندو قوم کی ان مذہبی کتابوں میں ایک کا نام رامائن اور دوسری کتاب مہابھارت کے نام سے مشہور ہے۔

رامائن میں ہندوؤں کے دیوتا رام جنہیں وہ لوگ بھگوان یعنی خدا کہتے ہیں، کا ذکر ہے وہ راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے۔ ان کی سری لنکا (سیلون) کے راجہ راون کے ساتھ جنگ کے واقعات رامائن میں بیان کیے گئے ہیں۔

دوسری کتاب مہابھارت بھی ہندوؤں کے خاندان کوروں اور پانڈوؤں کی جنگ پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کتابوں میں ہندوستان کے دوسرے حصوں اور شہروں وغیرہ کے نام ملتے ہیں اور ان ناموں کو سند مانا جاتا ہے۔

چنانچہ مہابھارت اور رامائن میں اس سرزمین کا ذکر موجود ہے جہاں جنوبی ہند کی ریاست میسور واقع تھی۔ وہی میسور جہاں حیدر علی بہادر اور ان کے فرزند ارجمند ٹیپو سلطان شہید نے اپنے خون سے تاریخِ ہند کے دو باب رقم کیے۔ جن کی سرخی وقت کی گرد کے ساتھ مدھم ہونے کے بجائے تیز اور گہری ہوتی جا رہی ہے۔

میسور کا قدیم نام مہیش منڈلا تھا اور عہدِ قدیم میں وہاں چندر گپت موریہ اور اشوک اعظم کی حکومت تھی۔

اُس زمانے میں سرکاری مذہب "بدھ" تھا چنانچہ بدھ مذہب کے مبلغین مہیش منڈلا بھی پہنچے۔ تاریخی اعتبار سے یہ زمانہ اس قدر تاریک ہے کہ ... ۲۰۰ء تک یہ پتہ نہیں چلتا کہ مہیش منڈلا میں کون کون حکمران ہوتے تھے۔ ... ۳۰۰ء کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہاں بالترتیب شنوا ناس' مہاولی گنگا' چلوکیہ' ہوسے مالا کے خاندان حکمران ہوتے رہے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں ریاست میسور میں چھ ریاستیں شامل تھیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہندو جیانگر کی زبردست ہندو ریاست قائم رہی جو ۳۰۰ سال تک شمالی ہند کے مسلمانوں کو جنوب میں جانے سے روکتی رہی۔

ریاست میسور اور آس پاس کی تمام ریاستیں وجیانگر کی ہندو ریاست کو خراج ادا کرتی تھیں۔ آخر سترھویں صدی عیسوی میں وجیانگر کی عظیم سلطنت پر بیجاپور کے سلطان نے قبضہ کر لیا اور وجیا نگر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

سلاطینِ بیجا پور کی طرف سے اس علاقہ کا ایک گورنر ہوتا تھا جو سرا میں رہا کرتا تھا۔ سرا بنگلور سے ستر میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ سلاطینِ بیجاپور اور سلطنتِ مغلیہ کے صوبیداروں کا صدر مقام رہنے کی وجہ سے اس زمانے میں وہاں ۵۰ ہزار مکانات تھے۔ مغلوں کے آخری گورنر دلاور خاں کا محل مغل طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔

اب بھی اس جگہ ۵۲ مساجد کے آثار نظر آتے ہیں۔ بیجاپور کی مسجد کے علاوہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مسجد اور عیدگاہ اب بھی موجود ہیں۔ یہاں عالمگیر کی ایک بیٹی کا مزار بھی ہے۔ سوائے مسجد اور عیدگاہ کے تمام مساجد' شہر اور دیگر عمارات ویران پڑی ہیں۔ جگہ جگہ کھنڈرات' ٹوٹے ہوئے محلات اور مزارات بڑی خستہ حالت میں ایک وسیع رقبہ میں نظر آتے ہیں۔

۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی فوجیں بیجاپور کی ریاست کو ختم کر کے اس علاقہ پر قابض ہو گئیں۔ عالمگیر نے بیجاپور کے علاوہ اور بہت سا علاقہ بھی فتح کر لیا تھا۔ اس تمام علاقے کو ایک صوبہ بنا کر سرا کو اس کا صدر مقام بنا دیا گیا۔

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد مرہٹوں نے دہلی کے کمزور مغل شہنشاہ سے اس علاقے کا

خراج وصول کرنے کا فرمان حاصل کر لیا تھا۔

انہی تمام ریاستوں کا نام میسور ہوا تھا جہاں نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے یکے بعد دیگرے اپنی شمشیرِ خارا شگاف کے جوہر دکھائے تھے اور نواب حیدر علی' شیخ فتح محمد کا وہی پانچ سال کا بچہ "حیدر علی" تھا جسے حاکم بالا پور نے نقارے میں بند کر کے اوپر سے کھال منڈھوا دی تھی۔

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے جنوبی ہند فتح کیا تو بڑا علاقہ ہونے کی وجہ سے شہنشاہ نے جنوبی ہند کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک صوبہ سرا اور دوسرا صوبہ ارکاٹ۔

۱۷۱۱ء تک یہ دونوں صوبے ایک ہی صوبے دار کے ماتحت رہے اور ان کا گورنر اور صوبیدار سعادت اللہ خاں تھا مگر اسی سن میں سرا کا گورنر امین خاں مقرر ہوا۔ امین خان' سعادت اللہ خاں کی مخالفت کے باوجود اپنی موت تک صوبیدار رہا مگر اس کے بعد دکن کے صوبیدار کی سفارش پر سرا پھر سعادت اللہ خاں کو مل گیا اور سعادت اللہ خاں کی طرف سے طاہر خاں وہاں کا صوبیدار مقرر ہوا۔

ریاست میسور اور اس کی متعلقہ ریاستوں کے پس منظر کا یہ بیان اس لیے ضروری تھا کہ قارئین کو آئندہ پیش آنے والے واقعات کو سمجھنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ اب ہم پھر اپنی اصل کہانی یعنی شیخ فتح محمد کی بیوہ مجیدہ بیگم اور اس کے دونوں قیدی بچوں کی طرف آتے ہیں!



بالا پور کے چند خدا ترس لوگوں کی مدد سے مجیدہ بیگم کو سرنگا پٹم جانے کے لیے ایک تیز رفتار گھوڑا اور راستے کے لیے ایک معقول رقم اور ضروری سامان مہیا کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ مجیدہ بیگم کے ساتھ پانچ سوار بھی کیے گئے جن کا کام مجیدہ بیگم کو بحفاظت سرنگا پٹم پہنچانا تھا۔

مجیدہ بیگم' سرنگا پٹم اس لیے جا رہی تھی کہ وہاں اس کے مرحوم شوہر کے بڑے بھائی شیخ الیاس کا بیٹا حیدر' راجہ میسور کی ملازمت میں تھا اور اس کے حالات بہت اچھے تھے۔

حیدر ایک بار اپنے چچا شیخ فتح محمد سے ملنے آیا تھا تو اس نے اپنے چچا پہ بہت زور دیا تھا کہ وہ سرنگا پٹم آ جائے جہاں وہ راجہ سے کہہ کر اسے اچھی ملازمت دلا دے گا۔ مگر شیخ نے

وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت شیخ فتح محمد کے صرف ایک لڑکا شہباز تھا۔ حیدر علی ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔

مجیدہ بیگم منزلیں قطع کرتی ہوئی اپنے محافظوں کے ساتھ سرنگا پٹم خیریت سے پہنچ گئی۔ حیدر صاحب گھر پر نہیں تھا۔ وہ راجہ کے دربار میں گیا ہوا تھا۔

مجیدہ بیگم نے یہ موقع غنیمت جانا اور بے جھجک راجہ کے محل میں پہنچ گئی۔ وہ یہ سوچ کے راجہ کے محل میں گئی تھی کہ وہ اپنی داستانِ الم اور بالا پور کے حاکم عباس قلی خاں کے ظلم و ستم سے راجہ کو بھی آگاہ کرے گی۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میسور کا اس وقت کا راجہ چامراجہ اُڈیر سوم صرف نام کا راجہ تھا اور سارے اختیارات وزیرِ سلطنت کے پاس تھے۔

مجیدہ بیگم نے راج محل پر پہنچ کر حیدر صاحب کو پیغام بھجوایا کہ قسمت کی ماری اس کی چچی مجیدہ بیگم بالا پور سے آئی ہے اور وہ حیدر صاحب سے فوراً ملنا چاہتی ہے۔

حیدر صاحب راجہ کے پاس بیٹھا تھا چنانچہ مجیدہ بیگم کی آمد کی اطلاع اسے بھی ہوئی۔ اس نے حیدر کے جواب دینے سے پہلے ہی ملازم کو حکم دیا کہ مجیدہ بیگم کو عزت کے ساتھ اس کے پاس لایا جائے۔

چامراجہ اُڈیر اور حیدر صاحب دونوں کو سرا کی صوبیداری کے لیے نواب طاہر محمد خاں اور عبدالرسول خاں کے درمیان ہونے والی جنگ اور شیخ فتح محمد کے اس جنگ میں کام آجانے کی خبر مل چکی تھی۔ چنانچہ مجیدہ بیگم کے آنے پر پہلے راجہ نے اس سے تعزیت کی:

"بیگم فتح محمد۔ ہم تمہارے شوہر کی میدانِ جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے مرنے کی اطلاع سن چکے ہیں۔ ہم چامراجہ اُڈیر سوم اور میسور کی تمام رعایا تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ تمہارے دونوں بچے کہاں ہیں۔ انہیں ہمارے پاس لاؤ۔ ہم انہیں فوج میں اچھا عہدہ دیں گے۔"

"میں راجہ میسور کی ہمدردی کی بہت شکر گزار ہوں۔"

مجیدہ بیگم نے شکریہ ادا کیا اور کہا:

"ان داتا نے میرے شوہر کا غم بانٹ کر میرے زخموں پر مرہم رکھا ہے لیکن اے میسور کے رحمدل راجہ! ابھی میرے آنسو خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ میری دنیا میں حاکمِ بالا پور عباس قلی خاں نے آگ لگا دی۔

مجھ رانڈ بیوہ کے دونوں بچے ہی زندگی کا سہارا تھے لیکن حاکم بالا پور نے انہیں مجھ سے

چھین لیا ہے اور انہیں سسکا سسکا کر مار رہا ہے۔"

"شہباز اور حیدر علی کو کیا ہوا چاچی۔" حیدر صاحب سے برداشت نہ ہوا اور وہ بات کاٹ کے بولا۔

"اے میرے بھتیجے! ان دونوں کے ساتھ وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔" مجیدہ بیگم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

حیدر صاحب جلدی سے اٹھ کر چچی کے پاس گیا اور رقت بھری آواز میں بولا:

"چاچی جلدی بتاؤ۔ اس ظالم نے میرے بھائیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

مجیدہ بیگم سسکیوں کے درمیان بولی:

"حیدر۔ تیرے دونوں معصوم بھائیوں کو حاکمِ بالا پور نے الگ الگ دو نقاروں میں ڈال کر ان پر کھال منڈھوا دی ہے۔"

مجیدہ بیگم کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔

"ہے رام۔ ہے رام۔ اس نے ایسا کیا۔ کیسا کٹھور دل ہے عباس قلی"۔ راجہ بہت متاثر ہوا:

"اس کے لیے کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"مگر چچی۔ اس نے کیوں ایسا کیا۔ ان معصوموں نے کیا بگاڑا تھا اس کا؟" حیدر صاحب کے غم اور غصے سے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

"حیدر بیٹے!"

مجیدہ بیگم نے تفصیل بتائی:

"جب نواب طاہر خاں اور صوبیدار عبدالرسول خاں میں سرا کی صوبیداری کے لیے جھگڑا ہوا تو اس وقت میں اور دونوں بچے بالا پور میں تھے۔ حاکم بالا پور، نواب طاہر خاں کی طرفداری کر رہا تھا۔ اور تمہارے چچا تو تھے ہی عبدالرسول خاں کی طرف۔ مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں بدذات عباس قلی خاں مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے اس لیے میں بالا پور چھوڑنے ہی والی تھی کہ اس ظالم نے ہم سب کو پکڑ کے جیل میں ڈال دیا۔ میں صبر شکر کیے قید خانہ میں پڑی رہی۔

پھر دونوں میں جنگ ہوئی اور تمہارے چچا عبدالرسول خاں پر قربان ہو گئے مگر ہمیں آزاد کرنے کے بعد حاکمِ بالا پور نے تمہارے مرحوم چچا پر اٹھارہ ہزار کا سرکاری قرضہ نکالا اور مجھے بلا کر کہا کہ یہ قرضہ فوراً ادا کرو، ورنہ شہباز اور حیدر علی کو قتل کر دیا جائے گا۔" مجیدہ بیگم کی آواز

بھر آگئی اور گلا رندھ گیا۔

"چاچی — میری اچھی جان" حیدر صاحب نے بڑی محبت سے کہا:

"میں ابھی زندہ ہوں۔ اس کمینے نے آپ کو تنگ کرنے کے لیے یہ اٹھارہ ہزار قرض کا جھگڑا لگایا ہے۔ آپ سیدھی میرے پاس چلی آئی ہوتیں۔ میں اٹھارہ ہزار لے جا کر اس کے منہ پہ مارتا۔"

"حیدر بیٹے۔ میں نے اس سے یہی تو کہا تھا کہ وہ ہمیں سرنگاپٹم جانے دے۔ میں رقم وہاں سے لا کر اس کے حوالے کر دوں گی۔"

مجیدہ بیگم بے چاری ٹھنڈی سانسیں لے رہی تھی:

"مگر اس نے صرف مجھے یہاں آنے کی اجازت دی اور شہباز اور حیدر علی کو نقاروں میں بند کرا کے وہیں رکھا ہے۔"

"ان پہ کیا گزر رہی ہو گی؟" حیدر صاحب نے کہا:

"ان کا تو نقاروں میں خدانخواستہ کرے دم ....."

اور حیدر کے بھی آنسو بھر آئے۔

"بیٹے۔ میں نے یہی کہا تھا اس سے۔" مجیدہ بیگم نے بتایا:

"مگر اس نے کہا کہ نقاروں میں ہوا کے لیے سوراخ کر دیے ہیں۔ بچے دم گھٹ کے نہیں مریں گے مگر بھوک پیاس سے تو مر سکتے ہیں۔ اس نے مجھے صرف پندرہ دن کی مہلت دی ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر اس دوران رقم نہ پہنچی تو خدانخواستہ کرے دونوں —"

مجیدہ بیگم کی پھر ہچکی بندھ گئی۔

"کتنی رقم ادا کرنی ہے اس ذلیل آدمی کو —؟" راجہ نے حیدر صاحب سے دریافت کیا۔

"آپ فکر نہ کیجیے مہاراج۔ میں آج ہی اٹھارہ ہزار لے کر بالاپور جا رہا ہوں۔" حیدر صاحب نے بڑے عزم سے کہا۔

"نہیں نہیں حیدر۔ تم وہاں جانے کی غلطی نہ کرنا۔ ورنہ وہ تمہیں بھی یرغمال بنا لے گا اور پھر بھاری رقم تم سے طلب کرے گا۔ اسے معلوم ہے کہ تم میرے خاص آدمی ہو۔" راجہ اڈیر نے بڑے پتے کی بات کہی۔

حاکم بالاپور سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ حیدر صاحب سے رقم وصول کر کے انہیں بھی قید میں

ڈال دیتا۔

"پھر کیسے بنے گا مہاراج؟" حیدر صاحب نے الجھتے ہوئے کہا:

"رقم تو بہر حال اسے پہنچانا ہی ہے۔"

"ہم اپنے خزانچی کے ہاتھ رقم بھیجیں گے۔" راجہ نے مسئلہ حل کر دیا:

"تم یا تمہاری چچی بالاپور ہرگز نہیں جائیں گی۔"

بس راجہ چامراجہ اڈیر موم نے حیدر صاحب سے اٹھارہ ہزار کی رقم لے کر اپنے خزانچی کے حوالے کی اور اسے حکم دیا کہ:

"پندرہ سواروں کے ساتھ بالاپور جاؤ اور رقم عباس قلی خاں کے حوالے کر کے مرحوم شیخ فتح محمد کے دونوں بچوں کو لے کر جس قدر جلد ہو، واپس آؤ۔"

اس وقت مجیدہ بیگم نے بتایا کہ:

"میرے ساتھ بالاپور سے پانچ سوار حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ انہیں واپس جانے کی اجازت دی جائے۔"

چنانچہ خزانچی کے ساتھ وہ بھی واپس چلے گئے۔



راستہ خراب ہونے کے باوجود سرنگاپٹم کا خزانچی مطلوبہ رقم لے کر آٹھویں دن بالاپور پہنچ گیا۔ راجہ کے خزانچی کو عباس قلی خاں پہچانتا تھا۔ اسے دیکھ کے وہ جل بھن گیا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ بات کہیں بڑھ نہ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

عباس قلی خاں، خزانچی سے گلے ملنے کے لیے مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر خزانچی کے قدم فوراً ان نقاروں کی طرف اٹھنے لگے جو اس نے اپنے دشمن شیخ فتح محمد کی شکست کی یادگار کے طور پر محل کے دروازے پر رکھوا دیے تھے۔

"خزانچی مہاراج۔ ان نقاروں کو ہاتھ نہ لگائیے گا۔" حاکم بالاپور کا پارہ چڑھ گیا:

"اگر مہاراجہ میسور نے ان کے چھوڑنے کا حکم دیا ہے تو بھی میں انہیں رہا نہیں کروں گا۔"

خزانچی نے پلٹ کر جواب دیا:

"عباس قلی خاں۔ ہم نے سنا تھا کہ مسلمان میدانِ جنگ میں شیر ہوتا ہے لیکن گھر پہ آنے والوں

سے تو وہ جھک کے ملتا ہے"۔

عباس قلی خاں شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا:

"دیکھیے نا مہاراج۔ ہم تو خوشی خوشی آپ سے گلے ملنے بڑھے تھے مگر آپ سانپ کے ان بچوں کی طرف بڑھ گئے جو ہمارے دشمن کی اولاد ہیں اور فتح حاصل کرنے کے بعد ہم مقتول کے اہل و عیال کے مالک ہیں"۔

"ٹھیک ہے عباس قلی خاں"۔ خزانچی نے اپنے سواروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"تم لوگ اٹھارہ ہزار کی رقم گن دو"۔

پھر وہ عباس قلی خاں سے مخاطب ہوا:

"ہمارے مہاراج نے آپ کو حکم دیا ہے اور نہ درخواست کی ہے بلکہ منہ مانگی رقم آپ کے حوالے کرنے کا حکم دیا ہے"۔

عباس قلی خاں کے حواس اور غائب ہو گئے۔ اس کا خیال تھا کہ راجہ میسور نے اس سے بچوں کی رہائی کی درخواست کی ہوگی مگر راجہ نے تو وہ پوری رقم اپنے پاس سے بھجوا دی تھی جو اس نے مرنے والے کی بیوہ کو تنگ کرنے کے لیے مانگی تھی۔

سواروں نے پندرہ تھیلیاں جو سونے کے سکوں سے بھری تھیں، عباس قلی خاں کے سامنے پھینک دیں۔

"گن لو عباس قلی خاں۔ پورے اٹھارہ ہزار کی رقم ہے"۔ خزانچی نے انتہائی غصے سے کہا:

"نقاروں کو کھلواؤ تاکہ معلوم ہو سکے کہ مظلوم بچوں کی کیا حالت ہے؟"

"فرض کرو کہ اگر بچے زندہ نہ بچے ہوں تو ۔۔۔؟" حاکم بالاپور نے غصے اور غرور سے کہا۔

"تو پھر یہ ہوگا کہ ہم تم سے لڑتے لڑتے اسی جگہ ختم ہو جائیں گے"۔ خزانچی نے جرأت آمیز لہجے میں کہا:

"اور یہ بھی سن لو عباس قلی خاں کہ جب سرکاری خزانچی اور اس کے تمام محافظوں کے قتل ہونے کی خبر سرنگاپٹم پہنچے گی تو تمہیں میسور کی تمام ریاستوں کے مشترکہ لشکر سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اب بولو۔ کیا کہتے ہو۔"

عباس قلی خاں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس کے بولا:

"نہیں نہیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ راجہ صاحب اگر رقم نہ بھی بھیجتے تو میں انہیں رہا کر دیتا"۔

"عباس قلی خاں"۔ خزانچی نے طیش کے عالم میں کہا:

"یاد رکھو راجے مہاراجے چھوٹوں پر احسان کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے"۔

عباس قلی خاں کے آدمیوں نے تھیلیاں سنبھال لی تھیں۔ خزانچی کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے نقاروں کے کنارے خنجروں سے تراشنے شروع کر دیے تھے۔

اوپر کی کھال کٹی۔

تازہ ہوا کا جھونکا اندر گیا۔

خزانچی نے جو آدھے دھڑ سے نقارے پر جھکا ہوا تھا، اسے محسوس ہوا کہ جیسے سکڑے ہوئے ہاتھ پیروں میں کچھ جنبش ہو رہی ہے۔

اتنی دیر میں دوسرا نقارہ بھی کھولا جا چکا تھا۔

پہلے نقارے میں شہباز اور دوسرے میں حیدر علی بند تھا۔ جب انہیں باہر نکالا گیا تو وہ گٹھڑی کی طرح لپٹے ہوئے تھے۔ نقارے میں صرف بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اتنی ہی جگہ میں وہ دونوں اپنے اپنے ہاتھ اور پیر سمیٹے آٹھ دن سے بھوکے پیاسے پڑے تھے۔

انہیں کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی مگر سمٹے سمٹے ان کے ہاتھ پیر مجہول سے ہو گئے۔ خزانچی نے انہیں فرش پر لٹا کر پہلے ان کے حلق میں پانی کے قطرے ٹپکائے جس سے ان میں کچھ جان آئی۔

"ہے پرماتما! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بچے زندہ ہیں ورنہ میں راجہ کو کیا جواب دیتا"۔ ہندو خزانچی آسمان کی طرف دیکھ کے بڑبڑایا۔

اب تو عباس قلی خاں نے بھی دلداریاں شروع کر دیں۔ اپنے ملازموں کو بچوں کے ہاتھ پیر دبانے پر لگایا۔ پھر وید اور ایک حکیم کو بلا کر بچوں کو دکھایا۔ دونوں کے مشورے سے کھانے اور مالش کرنے کی دوا تیار ہوئی۔

دواؤں کے استعمال سے چار دن بعد شہباز اور حیدر علی چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ ظالم عباس قلی خاں اپنے فعل پر بظاہر اس قدر نادم ہوا کہ اس نے ہاتھ جوڑ کر خزانچی سے معافی مانگی اور خزانچی کے کہنے پر اس نے شہباز اور حیدر علی سے بھی معافی مانگی۔

اب تو اس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ جب پانچویں دن خزانچی بچوں کو لے کر واپس جانے لگا تو وہ اپنی غلطی پر آنسو بہاتا اور کہتا تھا کہ خدا کے لیے اپنی والدہ سے بھی مجھے معافی دلا دینا تاکہ

میری عاقبت سنور جائے ۔



جس وقت شہباز اور حیدر علی سرنگا پٹم پہنچے اور ان کی ماں مجیدہ بیگم نے انہیں زندہ اور سلامت دیکھا تو اس کی خوشی کا کیا ٹھکانہ تھا ۔ دونوں لڑکوں کو ماں نے سینے سے لگا کر اتنا بھینچا کہ وہ خود غش کھا گئی اور دونوں بچے اسے سنبھالنے میں لگ گئے ۔

حیدر صاحب ماں بیٹوں کے اس ملاپ کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے ۔ ان کی نظروں میں بچوں کے باپ اور اپنے چچا شیخ فتح محمد کا چہرہ گھوم کر رہ گیا اس لیے کہ حیدر صاحب کے والد شیخ الیاس اور شیخ فتح محمد کی صورتیں اس قدر ملتی تھیں کہ دونوں جڑواں معلوم ہوتے تھے ۔

حیدر صاحب اس پُرمسرت نظارے کو دیکھنے میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ انہیں اس وقت ہوش آیا جب ان کی چچی دونوں بچوں کے ہاتھوں میں جھول کر زمین پر آ رہیں ۔

حیدر صاحب دوڑ کے وہاں پہنچے ۔ پانی منگایا ۔ حمیدہ بیگم کے منہ پر چھینٹے دیے اور راج محل سے لخلخہ منگا کر چچی کو سنگھایا ۔

مجیدہ بیگم کو کوئی بیماری تو تھی نہیں ، محض شدتِ جذبات سے وہ غش کھا گئی تھیں ۔ سر پر پانی کے چھینٹے اور ناک سے لخلخہ کی خوشبو دماغ میں پہنچی تو الا اللہ کہہ کر اٹھ بیٹھیں ۔ دائیں بائیں دونوں بیٹے اور حیدر صاحب کھڑے تھے ۔

مجیدہ بیگم نے زمین سے کھڑا ہونا چاہا تو بیٹوں نے سہارا دیا ۔ ان کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں مگر یہ خوشی کے آنسو تھے ۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں :

'حیدر صاحب ۔ یہ سب اللہ ہی کے کھیل ہیں ۔ اس نے تمہارا نام میرے ذہن میں ڈالا اور میں سیدھی تمہارے پاس پہنچی ۔ پھر سب ہی کام سیدھے ہو گئے ۔"

شہباز اور حیدر علی یہ تو سمجھ گئے کہ وہ ان کے کوئی عزیز ہیں مگر اصل رشتہ نہ جانتے تھے ۔

ماں نے انہیں تردد میں دیکھا تو کہا :

"تم کیسے بے تمیز لڑکے ہو ۔ بڑے بھائی کو سلام بھی نہیں کرتے !"

چھوٹے یعنی حیدر علی نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا :

'بھائی تم بھی کرو نا سلام انہیں ۔ ماں جو کہہ رہی ہیں کہ یہ بھی ہمارے بھائی ہیں ۔"

پھر دونوں کے ہاتھ سلام کے لیے اٹھے ۔ حیدر صاحب نے انہیں اپنی طرف کھینچا :

'ہاں ہاں ۔ میں تمہارا بھائی ، دونوں کا بڑا بھائی ہوں ۔"

"شہباز اور حیدر علی سنو !"

مجیدہ بیگم نے ان دونوں کو سمجھایا :

'ہم سب تمہارے ان بھائی ، جن کا نام حیدر صاحب ہے ، کے احسان مند ہیں ۔ آج سے حیدر صاحب میرے تیسرے بیٹے ہیں ۔ خبردار کبھی ان کی مخالفت نہ کرنا ۔ ہمیشہ کہنا ماننا اور جہاں ان کا پسینہ گرے ، خون بہانے پر آمادہ ہو جانا ۔"

"بس کیجیے چچی جان ۔"

حیدر صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا :

"میرے تو آگے پیچھے ہے کوئی نہیں ۔ آپ مل گئیں تو مجھے جیسے سارا جہاں مل گیا ۔"



انگریزوں کے لیے تو ہر شخص اس بات پر متفق ہے کہ یہ قوم ہمیشہ سے مکار ، چالباز اور متعصب ہے ۔ اس قوم کو مسلمانوں سے سب سے زیادہ نفرت ہے ۔ خاص سلطنتِ عثمانیہ ترکی اور سلطنتِ خداداد میسور سے تو یہ قوم اس قدر خار کھاتی ہے کہ تحریر اور تقریر میں جہاں بھی اسے موقع ملتا ہے ، یہ زہر اگلنے سے باز نہیں رہتی ۔

سلطنت خداداد میسور کے بانی نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو شہید کے بارے میں انگریز مورخین اور مصنفین نے ایسی ایسی بے ہودہ باتیں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر اس قوم کی خباثت اور گری ہوئی ذہنیت پر افسوس ہوتا ہے ۔

لارڈ ولنشیا لکھتا ہے کہ :

"حیدر علی عربی النسل تھے ۔"

مگر بورنگ جو کہ حد درجہ بورا اور متعصب مورخ ہے وہ کہتا ہے کہ :

"مسلمانوں میں جب کوئی بڑے درجے پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا نسب نامہ تیار ہو جاتا ہے ۔"

"سلطنتِ خداداد" کے سلسلے کا ایک اور مؤرخ کرنل ولکس، جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ حیدر علی کے باپ اور ماں دونوں کو گمنام دکھایا جائے۔ "تاریخ رئیس" میں بھی اسی مورخ کا تتبع کیا گیا ہے۔
بہرحال کرنل ولکس کا خیال ہے کہ:

"حیدر علی کے آباواجداد پنجابی تھے۔"

اور یہی خیال زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ عربی النسل تھے تو ممکن ہے کہ وہ خشکی کے رستے عرب سے آئے ہوں اور پنجاب میں آباد ہو گئے ہوں۔ یوں انہیں پنجابی کہا گیا ہو۔
نواب حیدر علی کے بچپن کے بارے میں تھوڑا سا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آئیے اب حیدر علی کے جوانی میں داخل ہونے سے پہلے ان کے نام و نسب اور خاندان پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلے کی تمام موجود کتابوں کے مطالعہ سے نواب حیدر علی کے خاندانی حالات کا نقشہ اس طرح واضح ہوتا ہے:

"۱۶۲۰ء کے لگ بھگ پنجاب سے ایک قافلہ دہلی پہنچا اور وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد اس نے دکن یعنی جنوبی ہند کا رخ کیا۔
دکن حضرت شاہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ مرجع خلائق ہوتی تھی اور پورا دکن ان کے فیضِ کرم سے مستفید ہو رہا تھا۔
عازم دکن ہونے والا یہ قافلہ عربی النسل یا افغان تھا۔ اس کا سربراہ ایک خدا ترس اور درویش صفت انسان ولی محمد خان تھا۔ دہلی کے قیام کے دوران ولی محمد خان مزاروں اور زیارتوں پر حاضری دینے میں وقت گزارتا تھا۔ اس نے وہیں بابا بندہ نواز کا نام اور ان کی کرامات کا حال سنا۔
پھر اس نام کا ایسا عاشق ہوا کہ دکن پہنچنے پر ان کی درگاہ پر جا کر دم لیا۔
حضرت شاہ بابا بندہ نواز گیسو دراز اپنے پیر کے کہنے پر دہلی سے ہجرت کرکے گلبرگہ تشریف لائے تھے اور یہاں ایک عرصہ تک عقیدت مندوں کو صراطِ مستقیم اور وحدانیت کی تعلیم دینے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے مگر اس درگاہ سے ان کا فیض جب بھی جاری تھا اور اب بھی جاری ہے
چنانچہ ولی محمد نے وہیں اقامت اختیار کی۔
انہیں شاہ گیسو دراز سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کے علم و اخلاق اور درویشی کا یہ اثر ہوا کہ درگاہ کے متولی نے انہیں اپنا خاص مہمان بنا لیا۔ ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا اور درگاہ کے فنڈ سے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کرا دیا۔

پھر متولیٔ درگاہ سے خلوص و پیار اتنا بڑھا کہ انھوں نے اپنی بیٹی ولی محمد خاں کے بیٹے محمد علی خاں کے عقد میں دیدی۔
گلبرگہ اس زمانے میں سلطنت بیجاپور کی حدود میں تھا اور اس کا حکمران محمود عادل شاہ تھا۔
اس کے بعد ڈاکٹر عطش درانی اپنی کتاب 'سلطان شہید' میں لکھتے ہیں کہ شیخ ولی محمد کی عمر نے وفا نہ کی اور گلبرگہ میں آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وفات نے شیخ کے بیٹے محمد علی خاں کا دل گلبرگہ سے اچاٹ کر دیا اور وہ بیجاپور منتقل ہوئے اور محلہ مشائخ پورہ میں رہائش اختیار کی مگر محمد علی خاں وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے کیونکہ بیجاپور پر ایسا زوال آیا کہ وہ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔
محمد علی خاں نے پھر ہجرت کی اور کرناٹک کا رخ کیا۔ وہاں بالا گھاٹ کے قصبہ کولار میں سکونت پذیر ہوئے۔
کولار کا حاکم شاہ محمد دکنی تھا۔ اس نے محمد علی خاں کی بڑی آؤ بھگت کی اور ملکی انتظام میں بھی انہیں شریک کر لیا۔
محمد علی خاں شیخ تھے۔ ان کے دل میں مشائخی کا لپکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اور ان کی اولاد باپ دادا کی اس عبادت اور ریاضت جس نے ان کے خاندان میں مشائخی کا چراغ روشن کیا تھا، اسے زندہ اور تابندہ رکھیں۔ اس لیے ان کا دل کولار کے انتظامی معاملات میں نہ لگتا تھا۔
محمد علی خاں کے چار بیٹے تھے:

۱۔ محمد الیاس
۲۔ فتح محمد
۳۔ محمد امام
۴۔ ولی محمد

یہ چاروں کے چاروں باپ کے بالکل الٹ تھے۔ مجاہدانہ زندگی گزارنے اور درگاہوں پر مجاوری کے بجائے وہ میدانِ زندگی میں اپنے زورِ بازو سے روزی کمانے کو ترجیح دیتے تھے۔ پس ایک دن ان سب نے مل کے مشورہ کیا کہ باپ سے سب کے سب ایک ساتھ ملاقات کریں اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتے ہیں اور انہیں اس زاہدانہ

اور درویشانہ زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ انہیں سپاہیانہ زندگی زیادہ پسند ہے۔

جب چاروں بیٹوں نے باپ کے سامنے اپنا متفقہ فیصلہ اور عندیہ رکھا تو باپ نے وہی جواب دیا جو ایک صوفی منش اور قانع انسان کو دینا چاہیے تھا۔

انہوں نے کہا:

"میرے بیٹو! یہ دنیا فانی ہے۔ اس کی چمک دمک سے دل نہ لگاؤ بلکہ آخرت کے جاودانی خزانوں پر نظر رکھو۔ خدا نے تمہارا مقدر تو روزِ ازل سے لکھ دیا ہے پھر ادھر ادھر کیوں بھاگتے ہو۔ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ بغیر دوڑ دھوپ کے تمہیں مل جائے گا۔"

لڑکوں نے دیکھا کہ باپ تو ٹس سے مس نہیں ہوتے تو وہ چپ چاپ اٹھ آئے۔ انہوں نے سوچا کہ باپ سے بحث کی تو گستاخی کا گناہ اپنے سر لینا ہوگا اور یہ بات ان کو گوارا نہ تھی۔ اس طرح یہ بات آئی گئی ہو گئی۔

مگر ـــ

شاید ان کی قسمت زوروں پر تھی۔ حاکم کولار شاہ محمد دکنی اور لڑکوں کے باپ محمد علی درویش کا آگے پیچھے انتقال ہو گیا۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو کولار میں بھی خاک اڑنے لگی۔ تب چاروں پنچھیوں نے پر پھڑپھڑائے اور جس کا جدھر رخ ہوا اُدھر اڑ گیا۔

شیخ فتح محمد ارکاٹ پہنچے اور نواب سعادت خاں کے پاس ملازم ہو گئے۔ بڑی عزت افزائی ہوئی۔ پنج ہزاری کے منصب پر فائز ہوئے۔

محمد الیاس نے تنجور کا رخ کیا مگر موت ان کے ساتھ ساتھ گئی۔ انہوں نے ۱۷۰۲ء میں انتقال کیا تو راجہ میسور نے ان کے بیٹے حیدر صاحب کو اپنے پاس بلا لیا اور ۴۰۰ پیادوں اور ایک سو سواروں کی جمعداری پر فائز کر کے نائک کا خطاب دیا۔

مشہور ہے کہ فتح محمد نے ارکاٹ میں حسنِ کارکردگی کا خوب مظاہرہ کیا اور علم، نقارہ اور ہاتھی کے حقدار ٹھہرے مگر انہیں یہ ملازمت راس نہ آئی۔ نواب سعادت علی خاں کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے اور بھتیجے میں جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ بھی میسور چلے آئے۔

وہاں نائک حیدر صاحب پہلے سے موجود تھے۔ راجہ نے انہیں بھی نائک کا خطاب دے کے ملازم رکھ لیا مگر یہ دل برداشتہ ہو کر گھر بیٹھ رہے۔

نواب حیدر علی کی پیدائش کے بارے میں بڑے اختلاف پائے جاتے ہیں۔ انگریز مؤرخین کا بیان ہے:

"شیخ فتح محمد نے تین شادیاں کیں۔ ان کی پہلی بیوی کولار میں انتقال کر گئی۔ دوسری بیوی جو اہل نائطہ کی لڑکی تھی، اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی چھوٹی بہن سے شیخ فتح محمد نے شادی کی اور حیدر علی اسی کے بطن سے ہیں۔"

ایک دوسری روایت کے مطابق:

"شیخ فتح محمد نے تنجور کے ایک درویش کی صاحبزادی سے شادی کر لی تھی اور اس کے بطن سے ۱۷۱۹ء میں شہباز اور ۱۷۲۱ء میں حیدر علی پیدا ہوئے۔"

مگر زیادہ درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ حیدر علی کی پیدائش میر اکبر علی خاں نوائط جاگیردار سرا کی صاحبزادی مجیدہ بیگم سے بمقام بودی کوٹہ (ضلع کولار) بمطابق ۱۱۳۴ھ / ۱۷۲۱ء میں ہوئی تھی۔ شیخ فتح محمد اس وقت سرا کے صوبیدار عابد علی خاں کے منصب دار تھے اور انہیں ۲۰۰۰ پیادوں، ۵۰۰ سواروں کے علاوہ ہاتھی، علم اور نقارہ کا اعزاز حاصل تھا۔

خاندانِ حیدر علی کے مختصر تعارف کے بعد ہم پھر اپنی اصل کہانی کی طرف آتے ہیں۔

حیدر صاحب کو چچی اور دو بھائی کیا ملے جیسے پوری دنیا مل گئی۔ انہوں نے شہباز اور حیدر علی کو اس زمانہ کی روایتی تربیت کے لیے فنِ سپہ گری کے دو استادوں کے سپرد کر دیا۔ اس وقت کا معاشرتی ماحول یہ تھا کہ علم کی تعلیم کے بجائے شمشیر زنی، کمند افگنی اور شہسواری وغیرہ کی عملی تربیت سے نوجوانوں کو سنوار کر میدانِ جنگ میں قسمت آزمائی کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

دکھیاری مجیدہ بیگم جب شہباز اور حیدر علی کو میدان میں گھوڑے دوڑاتے دیکھتی تو اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھتیں۔

شہباز اور حیدر علی کی عمروں میں صرف دو سال کا فرق تھا (بعض کتابوں میں ۵ سال لکھے گئے ہیں) لیکن جب شہباز چودہ اور حیدر علی بارہ سال کے ہوئے تو دونوں ہم عمر ہی معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ حیدر علی کا قد شہباز سے کچھ نکلتا ہوا ہی محسوس ہوتا تھا۔ دونوں اگرچہ ہم عمر ہی اور نوجوان تھے لیکن دوسرے جوان انہیں دیکھنے کے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

میسور کے راجہ اڈیرد کے دو وزیر تھے۔ ایک کا نام دیوراج اور دوسرے کا نندراج تھا۔ انہی دونوں کے ہاتھ میں رجواڑے کی باگ ڈور تھی۔

جب دونوں بھائی فنونِ سپہ گری میں طاق اور مشاق ہوگئے تو حیدر صاحب کو فکر ہوئی کہ جوانی کے اس امڈتے ہوئے خون پر بند نہ باندھا گیا تو کناروں سے چھلک کر سیلاب کی صورت نہ اختیار کرلے۔ اس لیے ایک دن بڑی رازداری سے چچی سے عرض کیا:

"پیاری چچی جان! یقین کیجیے کہ میں نے اب تک شہباز اور حیدر علی جیسے مشاق سپاہی اور سوار نہیں دیکھے۔"

ماں نے بیٹوں کی تعریف سنی تو کھل اٹھی۔

"بیٹے حیدر۔ یہ سب تمہاری توجہ اور محنت کا پھل ہے۔"

پھر اس نے حیدر کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا:

"دیکھو حیدر۔ جس طرح میں نے تمہارے سر پہ ہاتھ رکھا ہے اسی طرح تم ان یتیموں کے سر پہ ہاتھ رکھنا تاکہ یہ کچھ بن جائیں۔"

حیدر صاحب بولے:

"آج میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں چچی جان۔ گو کہ ابھی ان کی عمریں کم ہیں مگر فنونِ سپہ گری میں یہ پورے مرد بن چکے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں راجہ یا دونوں وزیروں کے ملاحظے کے لیے پیش کردوں۔ وزیر دیوراج اور نندراج ان دونوں کے بارے میں مجھ سے کئی بار پوچھ چکے ہیں۔"

مجیدہ بیگم نے فوراً جواب دیا:

"لو حیدر بیٹے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے پالا پوسا۔ جوان کیا، ماہرین کو ملازم رکھ کر تربیت دلائی۔ دونوں پر مجھ سے زیادہ تمہارا حق ہے۔"

"چلیے یہ بات تو ہوگئی۔" حیدر صاحب نے کہا:

"راجہ صاحب بیماری سے اٹھے ہیں۔ ان کی صحت یابی کی خوشی میں جشن ہونے والا ہے۔ اس میں شہسواری اور شمشیر زنی وغیرہ کے مقابلے ہوں گے۔ میں اسی وقت انہیں پیش کردوں گا تاکہ ان کی جھجک بھی جاتی رہے اور یہ جی توڑ کے مقابلے کریں۔"

حیدر صاحب کو واقعی دونوں بھائیوں سے بڑی محبت تھی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ دونوں

لڑکے میدان میں آکر اپنے جوہر دکھائیں۔ چنانچہ جب جشن کی تاریخ مقرر ہوئی تو حیدر صاحب نے دونوں وزیروں کے کان میں بات ڈالی۔

"بڑے منتری جی!"

حیدر صاحب دیوراج سے مخاطب ہوا:

"کچھ عرصہ پہلے بالاپور سے میری چچی آئی تھیں۔"

"وہ چچی تو نہیں جن کے دو لڑکے تھے؟" یہ لقمہ دیوراج کے چھوٹے بھائی نندراج نے دیا۔

"جی ہاں وہی لڑکے!"

حیدر صاحب کو بات کرنے کی جیسے اجازت مل گئی:

"انہی دونوں کے لیے میں کہنا چاہتا تھا۔"

"انہیں نوکری پہ لگانا ہے کیا؟" دیوراج نے بات اچک لی۔

"مہامنتری جی۔ آدمی دھیلے کی ہنڈیا لیتا ہے تو ٹھوک بجا کے دیکھتا ہے۔" حیدر صاحب نے بات بڑھائی:

"کھاتے تو اس وقت بھی وہ آپ ہی کا ہیں مگر نوکری کے معاملے میں میں سفارش نہیں کرتا۔ آپ ان کا فن دیکھیے۔ آزمائیے۔ پھر آپ کی مرضی، میسور کی فوج میں ہر ایرے غیرے کو تو جگہ نہیں مل سکتی۔"

"یہ تو تم نے ٹھیک کہا حیدر۔" نندراج نے تائید کی:

"فوج میں فالتو لوگ تو نہ ہونے چاہییں۔"

"بالکل ٹھیک جی۔"

حیدر صاحب کا سینہ چوڑا ہوگیا:

"خدا آپ دونوں بھائیوں کو سلامت رکھے۔ آپ دیکھیں گے انہیں تو خوش ہو جائیں گے۔ دونوں چھلاوہ ہیں چھلاوہ۔"

"اچھا۔ اتنا تیار کیا ہے انہیں؟" دیوراج نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پر آزمائش شرط ہے۔" حیدر نے جواب دیا۔

"پھر دکھاؤ نا انہیں۔" نندراج کا بھی اشتیاق بڑھا۔

"مہاراج چک کرشن راج کے غسلِ صحت کے جشن کے موقع پر پیش کردوں گا۔" حیدر صاحب نے

سینہ پھلا کر کہا:

"منتری جی۔ پہلوان تو اکھاڑے سے ہی ہیں اچھا لگتا ہے۔ وہیں جوہر کھلتے ہیں ان کے۔ شہسواری اور شمشیر زنی دونوں مقابلوں میں حصہ لیں گے وہ۔"

حیدر صاحب وہاں سے اٹھ کے سیدھے چچی کے پاس پہنچے۔ شہباز اور حیدر علی شہسواری کی مشق کر کے اس وقت آئے ماں کے برابر بیٹھے تھے۔ حیدر صاحب خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔

چچی نے دیکھتے ہی پوچھا:

"کیوں حیدر میاں۔ بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ کوئی خوشخبری لائے ہو کیا؟"

"بالکل چچی جان!" حیدر صاحب بیٹھتے ہوئے بولے۔

"حیدر بھائی۔ پہلے ہمارے سلاموں کا جواب تو دیجیے۔" شہباز نے مسکرا کے کہا۔

"جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ دراصل میں اپنے خیالوں میں گم تھا۔ کچھ سن ہی نہیں سکا۔" حیدر صاحب نے محبت سے شہباز کے سر پہ ہاتھ پھیرا:

"تم دونوں میرے جانے ہو مگر میں تمہیں اپنے بیٹے سمجھتا ہوں۔ بس یہ آرزو ہے کہ تم میری زندگی میں کسی مقام پر پہنچ جاؤ۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو حیدر۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے!" چچی نے بڑے خلوص سے کہا۔

"اچھا تم دونوں جاؤ۔ حیدر میاں شاید کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔" مجیدہ بیگم نے بچوں کو اس لیے ہٹانے کی کوشش کی کہ شاید حیدر صاحب کوئی ایسی بات کہنا چاہتا ہو جو بچوں کے سننے کی نہ ہو۔

حیدر صاحب جلدی سے بولے:

"نہیں چچی جان۔ انہیں آپ کیوں بھگا رہی ہیں۔ بات تو انہی کے بارے میں کرنا ہے!"

شہباز اور حیدر علی، جو جانے کے لیے کھڑے ہو چکے تھے، واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

"اچھا حیدر میاں۔ سنا ڈالو وہ خوشخبری جس کی وجہ سے تمہارا چہرہ پھول کی طرح کھلا جا رہا ہے۔" مجیدہ بیگم کو خود بھی بات سننے کی جلدی ہو رہی تھی:

"ہم سب سننے کے لیے تیار ہیں۔"

"ہاں چچی جان۔ خوشخبری یہ ہے کہ منگلوار کو مہاراجہ چک کرشن راج اوڈیر کا جشنِ صحت شروع ہو رہا ہے ــــ"

حیدر صاحب نے چبا چبا کر کہنا شروع کیا:

"اس جشن میں مقابلے ہوں گے۔"

"کس چیز کے مقابلے ہوں گے حیدر بھائی؟" حیدر علی نے بے چینی سے پوچھا۔

"گھڑسواری کے۔ شمشیر زنی اور کمند انگنی کے مقابلے اور ــــ"

"میں حصہ لوں گا حیدر بھائی!" حیدر علی خوشی سے چیخ اٹھا۔

"میں بھی حصہ لوں گا حیدر بھائی!" یہ شہباز کی مسرت سے بھری آواز تھی۔

"افوہ۔ تم دونوں نے تو اودھم مچا دیا۔" مجیدہ بیگم نے انہیں ڈانٹا:

"کسی کی بات نہیں کاٹا کرتے۔ حیدر میاں کو بات تو پوری کرنے دو۔"

"میری چاچی ــــ چچی جان۔ میں نے تو بات پوری کر لی تھی۔" حیدر صاحب ہنس کے بولے:

"جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ جو سننا تھا وہ سن لیا۔ اب آپ ان دونوں کو سمجھائیے کہ یہ مقابلے دراصل ان کا امتحان ہیں زندگی کا پہلا اور آخری امتحان۔ اس میں کامیاب ہوئے تو لوگ ہاتھ چومیں گے سر پہ بٹھائیں گے۔ عزت اور عہدہ پائیں گے۔ خدا نہ کرے ناکام ہوئے تو سپاہیوں میں بھرتی ہو کے عمر بھر سامان اٹھاتے گزرے گی۔

وہاں مہاراج ہوں گے۔ دونوں منتری ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں عوام ہوں گے اور عوام کی کسوٹی کھری اور سچی ہوتی ہے۔ انہیں ثابت کرنا ہوگا کہ ان جیسا پورے میسور میں نہ کوئی شمشیر زن ہے نہ شہسوار۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔"

حیدر صاحب اٹھے اور لپ جھپ کرتے باہر نکل گئے۔ یہ لوگ حیران نظروں سے انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔

جشن کون سا دور تھا۔

تیسرے دن سے جشن شروع ہو گیا۔ آغاز تو دراصل اسی شام کو ہو گیا تھا جس دن حیدر صاحب نے چچی کے پاس جا کر شہباز اور حیدر علی کو مقابلہ کی اطلاع دی تھی۔ دراصل غسلِ صحت کے جشن کا شوشہ حیدر صاحب ہی نے چھوڑا تھا۔ انہوں نے دونوں وزیر بھائیوں کے دماغ میں یہ بات ڈالی

تھی کہ آجکل راج محلوں میں رانیوں نے وزیروں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رکھا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ راجہ میسور کو تو وزیروں نے سونے کے محلات میں قید کر رکھا ہے اور راجہ کے نام پر وزیر ہی حکومت کرتے ہیں۔ یہ راجہ اور رانیوں کی کھلی ہوئی توہین ہے اس لیے ان دونوں وزیر بھائیوں کو ٹھیک کرنا ہوگا۔

یہ خبر سن کر وزیر برادران یعنی دیوراج اور نندراج کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ حیدر صاحب نے جو کچھ کہا تھا اس میں مبالغہ ضرور تھا لیکن کچھ نہ کچھ حقیقت بھی تھی۔

میسور کے اوڈیرہ خاندان کے شجرۂ نسب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خاندان ۱۳۹۹ء سے آج تک حکمران ہے۔ موجودہ راجہ کرشن اوڈیرا اس خاندان کا اٹھارہواں راجہ تھا۔ راجہ کے بجائے وزیروں کی حکومت اس ریاست کا دستور تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے مصر کی فاطمی خلافت کے آخری دور میں فاطمی خلیفہ ہوتے تھے۔ وہ بھی نام کے خلیفہ ہوتے تھے اور حکومت کے تمام اختیارات وزیرِ اعظم کے پاس ہوتے تھے۔

حیدر صاحب نے جب مہامنتری دیوراج اور منتری نندراج کو اچھی طرح گھبرا دیا تو خود ہی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا:

"منتری جی۔ آپ رانیوں کو کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھا کیجیے۔ انہیں اپنے مسئلوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملنا چاہیے کہ وہ سلطنت اور حکومت کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔"

"پھر تمہاری کیا رائے ہے حیدر؟" دیوراج نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ لوگ عقلمند ہیں۔ کوئی ترکیب سوچیے۔"

حیدر صاحب نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا:

"میں نے جو خبریں اور افواہیں سنی تھیں وہ آپ کے گوش گزار کر دیں۔"

پھر ایک لمحہ رکے اور چونک کر اس طرح بولے جیسے اچانک انہیں کوئی بات یاد آ گئی ہو:

"ارے ہاں منتری جی۔ مجھے ایک بات یاد آئی ہے۔ مناسب سمجھیے تو اس پر بآسانی عمل کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ جلدی بتاؤ۔ کس بات پر عمل کیا جا سکتا ہے؟"

نندراج بے چین ہو گیا۔

"پچھلے مہینے ہمارے مہاراج کی طبیعت کچھ خراب ہوئی تھی۔ سرکاری وید اور حکیم دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ پھر مہاراج ٹھیک بھی ہو گئے تھے۔"

"ہاں ہاں۔" نندراج نے الجھتے ہوئے کہا:

"مگر اس بیماری کا ہمارے کام سے کیا تعلق؟"

"منتری جی۔ میسور کے راجہ بیمار ہوئے۔ پھر خدا نے انہیں اچھا کر دیا۔ کیا مہاراج کے اچھا ہونے پر غسلِ صحت نہیں ہوگا۔ جشن نہیں منایا جائے گا اس خوشی کا؟"

"آہاہاہا۔ کیا تدبیر بتائی ہے تم نے حیدر۔ بھئی تم نے تو کمال کر دیا اس وقت۔" نندراج خوشی سے پھول گیا:

"اچھا تو یہ جشن کب سے شروع کیا جائے؟"

"نیک کام میں دیر کس بات کی؟"

حیدر صاحب نے کہا:

"کل پرسوں دو دن انتظام کے لیے اور تیسرے دن سے شروع ہمارا جشنِ صحت یابی مہاراجہ۔"

"اچھا تو یہ سارا انتظام تم ہی کو کرنا ہوگا۔"

نندراج نے ساری ذمے داری حیدر صاحب پر ڈال دی۔

"واہ منتری جی۔ میں نے ترکیب بتائی اور انتظام بھی میں ہی کروں۔" حیدر صاحب بولے:

"یہ تو وہی مثل ہوئی کہ جو راستہ بتائے وہی آگے چلے۔"

"ہاں ہاں۔ تم ہی کو سب کچھ کرنا ہوگا۔ آج ہی سے کام شروع کر دو۔ میں مہاراجہ کو کل یہ بات بتاؤں گا۔"

نندراج، حیدر صاحب پر ذمے داری ڈال کر بہت خوش ہو رہا تھا۔

حیدر صاحب تھا بھی ہر فن مولا۔ سرکار دربار کے سب ہی اہم کام ان کے سپرد کیے جاتے تھے اور یہ ایسا ماہر تھا کہ ادھر کام کے لیے کسی نے زبان کھولی اور حیدر صاحب اسی وقت سے اس کے پیچھے لگ گیا۔

دو منتری بھائیوں کے علاوہ مہاراجہ کے احکامات اور رانیوں کی فرمائشیں سب ہی کچھ حیدر کو کرنا پڑتا تھا۔

اس گفتگو کے دو گھنٹے بعد پورے سرنگاپٹم میں ڈگی پٹ گئی کہ منگلوار کو مہاراجہ صحت کا اشنان کریں گے اور اسی دن سے جشن شروع ہوگا۔ کھیل تماشے، ناچ گانے، زور آزمائی کے مقابلے،

تیراندازی، شہسواری وغیرہ وغیرہ۔ ڈگی والے شہر سے نکل کر دیہاتوں میں پھیل گئے۔ پھر تو کیا شہر اور کیا دیہات، ہر جگہ جشن کا چرچا تھا۔

یہاں پر ایک بات اور بیان کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ میسور کی عظیم ریاست اس وقت سمٹ سمٹا کر صرف بتیس تینتیس گاؤں تک رہ گئی تھی۔ باقی تمام مالیگار باغی ہو گئے تھے اور انھوں نے راجہ کو خراج دینا بند کر دیا تھا۔

مالیگار دراصل جاگیردار ہوتے تھے۔ ان کی جاگیریں ۳۰ میل سے سو سو میل تک پھیلی ہوتی تھیں۔

جاگیرداری کا یہ سلسلہ بہت پرانا تھا۔ یہ جاگیردار حملہ آوروں سے بچنے کے لیے اپنے میں سے ایک کو سردار چن لیتے تھے جو راجہ کہلاتا تھا۔ میسور کے موجودہ خاندان کو ۱۲۹۹ء میں راجہ چنا گیا تھا اور اس خاندان کا پہلا سردار یا راجہ یدورایا وجیا اوڈیرو تھا۔ اس کے نام پر یہ اوڈیرو خاندان مشہور تھا۔

اڑتے اڑتے ڈگی کی خبر راج محل کی داسیوں تک پہنچی۔

پھر کیا تھا۔ وہ اسے لے اڑیں۔ رانی، راج ماتا، مہاراج سب کو نمک مرچ لگا کے خبر سنائی گئی۔ وہ سب پریشان کہ مہاراجہ کے جشنِ صحت کا اعلان محلّوں، گلیوں، شہر اور دیہات میں ہو رہا ہے مگر اس کی اطلاع نہ مہاراجہ کو ہے اور نہ مہارانی کو۔

مہاراجہ نے تو سنی اَن سنی کر دی اس لیے کہ انہیں رقص و موسیقی کا شوق تھا۔ اس سے فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ کسی اور طرف توجہ دیں۔ ہاں مہارانی کی جاسوس عورتیں اور مرد پورے سرنگاپٹم میں پھیلے تھے جو اسے گھڑی گھڑی کی خبریں پہنچاتے تھے۔

مہارانی جو راج رانی کہلاتی تھی، اس نے اپنی خاص داسی (کنیز) کو حکم دیا:

"حیدر صاحب کو فوراً حاضر کیا جائے۔"

حیدر صاحب تو ہر مرض کی دوا تھا اس لیے اسے بلوایا گیا۔ راج رانی ایک عرصہ سے حیدر صاحب کو وزیر برادران سے توڑ کے اپنے ٹولے میں شامل کرنا چاہتی تھی مگر حیدر صاحب بہت کائیاں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دیوراج اور نندراج کا اثر رعایا اور فوج دونوں طاقتوں پر ہے اس لیے وہ رانی کے ہتھے نہ چڑھتا تھا اور راج رانی کی سنجیدہ باتوں کو یوں ہاں میں ٹال جاتا تھا۔

حیدر صاحب راج رانی کے حضور پیش ہوا تو اس نے ڈانٹ پلائی:

"یہ کیا مذاق ہے۔ شہر میں کیسی ڈگی پیٹی جا رہی ہے؟"

"مہاراج کا غسلِ صحت ہونا ہے راج رانی۔ اس کا جشن ہو گا۔" حیدر صاحب نے بے حد معصومیت سے کہا۔

"مگر یہ کیوں اور کس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ ہمیں اس کی خبر کیوں نہیں دی گئی؟" راج رانی نے دوسرا سوال کیا۔

"مہامنتری دیوراج اور نندراج کا حکم ہے راج رانی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ سرکاری جشن نہیں ہے بلکہ اس کا تمام خرچ وہ خود برداشت کریں گے۔" حیدر صاحب نے بڑی سیاسی بات کی۔

خرچ کا نام سن کے راج رانی کا سارا غصہ رفوچکر ہو گیا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر کم از کم ہمیں بتایا تو ہوتا۔" راج رانی نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہ دونوں آج آپ کے پاس آنے والے تو ہیں۔ میں اور کہہ دوں گا ان سے۔" حیدر صاحب نے اپنی جان چھڑائی۔

"نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" راج رانی گھبرا گئی۔

راج رانی ہی کیا، راج محل کے تمام مرد اور عورتیں دیوراج اور نندراج کے نام سے کانپتے تھے۔ مہاراجہ میسور کو ایک مقررہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ جب وہ رقم خرچ ہو جاتی تو مہاراجہ اور راج رانی انہی دونوں بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔



آج منگلوار (سہ شنبہ) ہے۔

ریاست میسور کے دارالسلطنت سرنگاپٹم کو دلہن کی طرح سجایا گیا ہے۔ صبح ہی سے گلی کوچوں میں بھیڑ بھاڑ شروع ہو گئی ہے۔ وزیر بھائیوں کا حکم ہے کہ دکاندار اپنی دکانیں کھول کر بیٹھیں تاکہ جشن میں شرکت کے لیے باہر سے آنے والوں کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ یوں پوری ریاست میں عام تعطیل ہے اور ایک ہفتہ تک کسی کو کاروبار کرنے کی اجازت نہیں۔

بڑے بازار میں تو جگہ جگہ مجمعے لگے ہیں۔ کھیل تماشے والوں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے مجمعے لگائے ہیں۔ ناچ گانا کرنے والیوں کی منڈلیاں چھوٹے چھوٹے شامیانوں کے نیچے دریاں بچھائے ناچ گا رہی ہیں اور آنے جانے والوں کو اشاروں ہی اشاروں میں رجھا رہی ہیں۔

میسور کا موجودہ راجہ کرشن راج اوڈیرہ ۱۷۳۴ء میں جب اس کی عمر صرف تین سال تھی، راج سنگھاسن پر بٹھایا گیا تھا۔ یہ میسور کے راجہ چام راجہ ہفتم کا لے پالک تھا۔ چام راجہ کو میسور کے دونوں وزیر برادران ویوراج اور نندراج نے قتل کرا دیا تھا اس لیے کہ چام راجہ نے وزیر برادران کے اختیارات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔

میسور میں راجہ کے قتل کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی اس لیے کہ رعیت کو معلوم تھا کہ اقتدار کے اصل مالک تو نندراج اور دیوراج ہیں۔ رعیت اپنے مقدمات اور فریادیں وزیر برادران ہی کے

پاس لے جاتی تھی اور وہی ان کی داد فریاد سننے اور مسائل کو حل کرنے کے ذمے دار تھے۔

قتل کیے جانے والا چام راجہ ہفتم بھی انہی حالات میں راجہ ہوا تھا اس لیے کہ وہ بھی اس سے پہلے کے راجہ دُوڈ کرشن راجہ اوڈیرہ کا لے پالک تھا اور دُوڈ کرشن راجہ اوڈیرہ کو صرف راج سنگھاسن پر بیٹھے تین سال ہوئے تھے کہ اسے بھی قتل کر دیا گیا اور مشہور یہ کیا گیا کہ اس نے خود کشی کر لی تھی۔

مختصر یہ کہ موجودہ راجہ کرشن راجہ اوڈیرہ تین سال کی عمر سے راجہ تھا۔ جب وہ سن شعور کو پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ نندراج اور دیوراج کی کوششوں سے راجہ ہوا۔ یہ معلوم ہوتے ہی اس نے وزیر برادران کے سامنے سر جھکا دیا اور ان سے سا [illegible] یا کہ اگرچہ وہ راجہ ہے اور رہے گا لیکن اسے ملکی انتظام و انصرام سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

وزیر برادران کے پاس اقتدار تو پہلے ہی تھا پھر بھی نندراج نے اس خیال سے کہ چڑیا سونے کے پنجرے سے کہیں پھر نہ کر جائے، کرشن راجہ اوڈیرہ کے ہوش سنبھالتے ہی اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ گویا پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔

ریاست میسور کافی مالدار ریاست تھی۔ خزانہ مال و دولت سے بھرا پڑا تھا۔ ریاست میسور کا کسی سے جھگڑا نہ تھا بلکہ آس پاس کی تمام ریاستوں سے دوستی تھی۔ ہاں اگر کوئی پالیگار (جاگیردار) بغاوت کرتا تو میسور کی فوج کو حرکت کرنا پڑتی ورنہ فوج برسوں آرام کیا کرتی۔ ہاں میلوں ٹھیلوں اور شاہی تقریبات کے وقت فوج کے سپرد انتظامات کر دیے جاتے تھے۔

آج کے جشن میں بھی فوجی ادھر ادھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ نوعمر راجہ کرشن اوڈیرہ کو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اشنان (غسل) دیا گیا۔

نندراج اور دیوراج نے اس تقریب پر دل کھول کر روپیہ خرچ کیا تھا۔ راج محل کی کنیزوں کے علاوہ پوری ریاست کے پنڈتوں، دیوداسیوں اور پجاریوں کو اشنان کے لیے بلایا گیا تھا۔ نندراج نے راجہ، راج ماتا اور رانیوں کی خوشنودی کے لیے اشنان کے وقت رقص و موسیقی کا انتظام کیا تھا۔

راجہ پھولا نہ سما رہا تھا۔

راج محل کے اندر اشنان کا جشن دو گھنٹے تک برپا رہا۔ کنیزوں کے علاوہ پنڈتوں اور پجاریوں وغیرہ کو اس قدر انعامات سے نوازا گیا کہ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

پنڈتوں کے راج محل سے رخصت ہونے کے بعد راجہ کو دو گھنٹے کا آرام دیا گیا کیونکہ اسے اب شام تک راج محل کے سامنے والے میدان میں شامیانے کے نیچے بیٹھنا تھا اور کھیل تماشے دیکھنے کے علاوہ کامیاب ہونے والوں میں انعامات بھی تقسیم کرنے تھے۔

راجہ کرشن اوڈیر، نندراج اور دیوراج سے رخصت ہو کے بظاہر اپنی خواب گاہ میں آرام کرنے چلا گیا لیکن جیسے ہی اسے کنیز خاص نے اطلاع دی کہ وزیر برادران محل سے جا چکے ہیں تو نوجوان راجہ نے اپنی محفل فوراً جمالی۔ اس کی رانیاں اس کے گرد آ کے بیٹھ گئیں۔ کنیزیں مورچھل سنبھال کے کھڑی ہو گئیں۔ راج محل کی مغنّیہ نے نغمہ چھیڑ دیا۔

راجہ کرشن اوڈیر کی اصل رانی تو نندراج کی بیٹی تھی لیکن راجہ نے چار پانچ نوعمر کنیزوں کو بھی اپنی محبوبہ بنا کر انہیں تقریباً رانی کا درجہ دیدیا تھا۔

راجہ کی یہ محبوب رانیاں راجہ کی مسند کے ساتھ نہ بیٹھ سکتی تھیں کیونکہ راجہ کے ساتھ بیٹھنے کا صرف نندراج کی بیٹی کو حکم تھا۔

راجہ کرشن اوڈیر کی محبوباؤں کے لیے راجہ کے دائیں بائیں اور پشت کی طرف بہترین قالینوں کا فرش لگایا جاتا تھا جس پر وہ ایک ایک دو دو کر کے بیٹھتی تھیں۔

راجہ کے سامنے گانے یا ناچنے والیوں کے سازندے بیٹھتے تھے۔ پھر جب محفل رنگ پر آنے لگتی تو انہی کنیزوں میں سے دو کنیزیں ساقی گری کے فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ سوائے نندراج کی بیٹی کے راجہ کے مے نوشی کے شغل میں راجہ کی تمام محبوب کنیزیں شامل ہو جاتی تھیں۔

راجہ کرشن اوڈیر کی مہارانی نندی جو راجہ کے وزیر نندراج کی بیٹی تھی، وہ راج محل کی تمام عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھی لیکن راجہ کے ندیدے پن کو کیا کیا جائے کہ اس کی توجہ مہارانی نندی کی طرف کم اور اپنی کنیز محبوباؤں کی طرف زیادہ تھی۔

نندی کو بھی راجہ کی کچھ پروا نہ تھی۔ اس کا محل راجہ کے محل سے الگ تھا لیکن دونوں محلات کے درمیان ایک طویل پختہ راہداری تھی جس نے دونوں محلوں کو ملا رکھا تھا۔

مہارانی نندی نے اپنے محل کا انتظام خود سنبھال رکھا تھا جبکہ راجہ کرشن اوڈیر کے راج محل کی تمام کنیزیں اور غلام نندراج اور دیوراج کے مشورے سے مقرر کی جاتی تھیں۔

رانی نندی نے اپنی کنیزوں اور محافظ پہریداروں کا انتخاب خود کیا تھا جس میں وہ سبحنا کے مشورے سے تبدیلی کرتی رہتی تھی:

سبحنا، ایک سیاہ رنگت، تامل نسل کا مضبوط ہاتھ پیروں کا جوان تھا۔ مہارانی نندی اسے تنہائی میں دیو کہہ کے مخاطب کرتی تھی مگر کنیزوں کے سامنے سبحنا ہی کہتی تھی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ میسور کے وزیر برادران میں ایک تو نندراج تھا جو مہارانی نندی کا باپ تھا اور دوسرا دیوراج تھا جو نندرا کا چچا اور نندراج کا چھوٹا بھائی تھا۔ اسی لیے نندی اپنی کنیزوں کے سامنے اپنے محل کے محافظ دارو غہ سبحنا کو دیو نہیں کہتی تھی مبادا کہ اس کی خبر دیوراج کے کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ مہارانی نندی کو تو کچھ نہ کہتا مگر سبحنا کی زندگی کا خاتمہ ضرور کرا دیتا۔

•

نندراج نے راجہ کرشن اوڈیر کو دو گھنٹے آرام کے لیے دیے تھے مگر وہ رقص و سرود کی محفل جما کے بیٹھ گیا تھا اور مہارانی نندی راجہ کو چھوڑ کے اپنے محل میں چلی گئی تھی۔ اس نے وہاں جاتے ہی دیو (سبحنا) کو بلا کر صلاح مشورے شروع کر دیے۔

دراصل مہارانی نندی اور اس کے چچا دیوراج کے درمیان راج پاٹ کے معاملے پر کچھ اختلاف ہو گیا تھا۔ نندی کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی کیونکہ اس کا حکم اپنے محل کے علاوہ راج محل (راجہ کا محل) پر بھی چلتا تھا۔ وہ مہارانی ہونے کے ساتھ ساتھ میسور کے وزیر نندراج کی بیٹی بھی تھی۔

دیوراج کو مہارانی نندی کی یہ خود سری پسند نہ تھی۔ پھر اس وقت یہ اختلاف اور زیادہ شدید ہو گیا، جب مہارانی نندی نے اپنے محل کی حفاظت کے لیے دو سو سواروں کا دستہ اپنے طور پر ملازم رکھا اور اس دستہ کے اخراجات کے لیے اپنے وظیفے میں اضافہ کرا لیا۔ اس طرح چچا بھتیجی کے اختلافات ذرا کھل کر سامنے آ گئے۔

دیوراج نے مہارانی کے محل کی حفاظت کے لیے فوجی دستہ مقرر کرنے کی شدید مخالفت کی تھی۔ لیکن نندراج کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور نہ صرف دستہ مقرر ہوا بلکہ مہارانی نندی کا وظیفہ بھی بڑھ گیا۔

مقابلہ کا میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ راجہ کے سنگھاسن کے لیے ایک بہت اونچا سٹیج بنایا گیا تھا۔ میدان، راج محل سے کچھ زیادہ دور نہ تھا بلکہ سامنے ہی تھا۔ اس کے باوجود کرشن راجہ اوڈیر ہاتھی پر سوار ہو کر محل سے نکلے۔

راجہ کے ساتھ مہارانی نندی بھی بیٹھی تھی۔ پچھلے دو ہاتھیوں پر مہارانی اور راجہ کی محبوب کنیزیں

سوار تھیں۔

راجہ کے ہاتھی کے دائیں بائیں اور آگے سوار رنگ برنگ کے لباس پہنے گھوڑوں پر اکڑے بیٹھے تھے۔ سب سے آگے کے سوار کے پاس میسور کا جھنڈا تھا۔

اسٹیج کے سامنے نندراج اور دیوراج نے جو گھوڑوں پر سوار تھے، سر خم کر کے راجہ کو سلامی دی اور مہارانی نندی نے سبز رومال ہلا کر سلامی قبول کی۔

راجہ نے خمار آلود نظریں بمشکل کھول رکھی تھیں مگر اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ ہاتھی کو اسٹیج کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا گیا۔ چار پائیدان کی ایک سیڑھی جس پہ گنگا جمنی کام کیا ہوا تھا، ہاتھی سے اسٹیج کے ساتھ لگا دی گئی۔

مہارانی نے سہارا دے کر راجہ کو کھڑا کیا اور ڈولتی سیڑھیاں چڑھ کر دونوں اسٹیج کے اوپر پہنچے۔

راجہ اور رانی کے سنگھاسن پر بیٹھتے ہی نگاڑے (نقارے) پر چوٹ پڑی اور ڈھول تاشے بجنا شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی عوام نے اسٹیج کو گھیر لیا جس کے گرد سپاہیوں نے حلقہ سا بنا رکھا تھا۔ اس حلقے تک پہنچ کر عوام رک گئے اور انہوں نے راجہ رانی کے اوپر سونے چاندی کے سکے پھینکنا شروع کر دیے۔

یہ سکے عام طور پہ اسٹیج سے ٹکرا کر نیچے گرتے تھے جہاں وزیر برادران کے غلام تھیلیاں اور بوریاں لیے کھڑے تھے اور وہ سکے سمیٹ سمیٹ کر ان میں بھرتے جاتے تھے۔ کسی دوسرے کو سکے لوٹنے کی اجازت نہ تھی۔

کافی دیر تک اسٹیج پر سکوں کی بارش ہوتی رہی۔

جب نچھاور کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو وزیر برادران گھوڑوں سے اتر کے زرنگار کرسیوں پر براجمان ہوئے جو حیدر صاحب نے ان کے لیے لگوائی تھیں۔

میدان کے تمام انتظامات حیدر صاحب کے سپرد تھے اور وہ اکیلے اتنے عظیم جشن اور جلسے کا انتظام کر رہے تھے۔

تماشائی اسٹیج کے پاس سے ہٹ کر اپنی اپنی جگہوں پر جا چکے تھے اور بے چینی سے مقابلوں کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر نندراج نے حیدر صاحب کو مقابلے کے آغاز کا حکم دیا۔

حکم پاتے ہی حیدر صاحب نے مقابلہ کے منتظمین (جیوری) کو مقابلہ شروع کرنے کا پیغام

بھیجا۔

سب سے پہلے گھوڑ دوڑ کا انتظام تھا۔

دوڑ میں بیس گھوڑے حصہ لے رہے تھے جن میں شہباز اور حیدر علی بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار دوڑ کے لیے تیار تھے۔

جیوری نے چار چار سواروں کے پانچ گروپ ترتیب دیے تھے۔ حیدر صاحب نے جیوری کو پہلے ہی ہدایات دی تھیں کہ شہباز اور حیدر علی کو الگ الگ گروپوں میں رکھا جائے۔ شہباز پہلے اور حیدر علی پانچویں گروپ میں شامل تھے۔

پہلا گروپ میدان میں لایا گیا۔ چاروں سوار اپنے گھوڑوں کو دوڑ کی لائن پر لے آئے۔ شہباز کا گھوڑا بڑا منہ زور تھا اور بار بار زور کر کے گھوم جاتا تھا۔

جیوری کا ایک جج ہرا رومال ہاتھ میں پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے تیز آواز میں سواروں کو خبردار کیا۔ وہ ایسی جگہ پر کھڑا تھا جہاں اسے دوڑنے والے سوار، جیوری کے ممبران اور مقابلہ کے ناظمِ اعلیٰ دیکھ سکتے تھے۔

جج کے "ہوشیار" کہنے پر گھوڑ سوار اپنے گھوڑوں کو لائن پر روک کے کھڑے ہو گئے۔ تماشائیوں پر سناٹا طاری ہو گیا، جیسے انہوں نے اپنی سانسیں تک روک لی ہوں۔

پھر جج کا رومال والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا۔

لوگوں کی نظریں گھوڑوں اور سواروں پر جم کے رہ گئیں۔ چند ہی لمحوں بعد جج نے ہرا رومال ہلا کر مقابلے کا آغاز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عوام نے اپنے دل پسند سواروں کی ہمت افزائی کرنا شروع کر دی۔

شہباز اور حیدر علی کا یہ پہلا موقع تھا اور انہیں کوئی نہیں جانتا تھا اس لیے شہباز، جو پہلے گروپ میں شامل تھا اس کے حق میں کوئی نعرہ بلند نہ ہوا۔

یہ تقریباً چار میل کی دوڑ تھی۔ دو میل جانا اور دو میل آنا تھا۔ جہاں سے گھوڑوں کو واپس آنا تھا وہ ایک پتھریلا ٹیلہ تھا۔ جیوری کے دو جج وہاں بیٹھے تھے۔ انہیں یہ دیکھنا تھا کہ کون سا گھڑ سوار ٹیلے کا چکر لگا کر واپس گیا ہے۔

اگر کوئی گھوڑ سوار راستہ میں گر جائے یا اسے کوئی اور حادثہ پیش آ جائے اور گھوڑا ٹیلے تک نہ پہنچ سکے تو ٹیلے کے ججوں کے پاس چار تیز رفتار سوار تیار کھڑے تھے جو گھوڑ دوڑ

کے تین گھوڑوں کا چکر لگانے کے فوراً بعد ان کے پیچھے پوری رپورٹ لے کر مقابلہ کے آغاز والی
جیوری کے پاس پہنچ کے انہیں رپورٹ پیش کرتے تھے۔

شہباز جب نقطۂ آغاز سے روانہ ہوا تھا تو اسے کوئی نہیں جانتا تھا لیکن جب وہ ٹیلے کا چکر
لگا کر واپس آ رہا تھا تو ہر ایک کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں کیونکہ شہباز اپنے ساتھیوں سے
تقریباً ایک فرلانگ آگے آ رہا تھا۔

حیدر صاحب نے شہباز کا مشکی (سیاہ) گھوڑا ایک فرلانگ آگے آتا دیکھا تو خوشی سے دیوانے
ہو گئے اور چیخ کر بولے:

شہباز شاباش!

ذرا اور تیز!

بس پالا مار لیا میرے بیٹے نے!

حیدر صاحب کی آواز پر تماشائیوں کو آگے آنے والے گھڑ سوار کا نام معلوم ہو گیا۔ پھر تو
انھوں نے شہباز، شہباز، شہباز کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہباز
کا مشکی گھوڑا مقابلے کا نشان پار کر گیا۔

"شہباز" "شہباز" کے شور سے پہلے ہی کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اس کے پہلے
نمبر پر آنے سے شور میں اور اضافہ ہو گیا۔

لیکن ___

اس شور و غل میں بہت سی تحیر اور تجسس بھری آوازیں بھی ابھر رہی تھیں:

یہ شہباز کون ہے؟

کوئی بھی ہو مگر ہے کمال کا شہسوار۔

گھوڑے تو انچوں اور سروں سے جیتتے ہیں مگر اس نے تو سب کو ایک فرلانگ پیچھے چھوڑ
دیا ہے۔

حیدر صاحب کا بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔

مگر ہے بالکل کمسن۔

اور کیا۔ ابھی مسیں بھیگ رہی ہیں اس کی۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں!

جب شہباز نے دوڑ کا نشان پار کرنے کے بعد گھوڑے کی لگامیں کھینچیں تو وہ منہ زور
نصف میل تک روکے نہ رکا۔

ادھر حیدر صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ شہباز کے گھوڑے کے پیچھے بے تحاشا بھاگے جا
رہے تھے اور زبان پر کچھ اس طرح کے کلمے تھے:

شہباز۔ تو نے بھائی کی لاج رکھ لی۔

سرخرو کر دیا مجھے لوگوں میں۔

وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح وہ آدھے میل تک بھاگتے چلے گئے۔

پھر جب شہباز کا گھوڑا رکا تو اس نے فوراً لگام کو پیڑ کی شاخ میں اٹکایا اور حیدر صاحب کی
طرف دوڑ پڑا۔

حیدر صاحب پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ شہباز بھی پسینے میں ڈوبا ہوا تھا لیکن وہ اسی حالت میں
ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

حیدر صاحب کا شہباز کی تعریف کرتے منہ نہ دکھتا تھا اور شہباز ان کی تعریف کے جواب میں صرف
ایک ہی جملہ کہتا:

"حیدر بھائی۔ یہ سب آپ کی مہربانی اور اللہ کا احسان ہے"۔

اور یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ حیدر صاحب نے دونوں بھائیوں کی تربیت میں پانی کی طرح روپیہ
بہایا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لیے دو مشکی گھوڑے خریدے جن کی پتلی کمر اور شاندار اکڑی
ہوئی گردن دیکھنے کے لائق تھی۔ ان میں سے ایک پر سوار ہو کر شہباز نے اپنے گروپ میں پہلی
پوزیشن حاصل کی تھی۔

دوسرا مشکی گھوڑا حیدر علی کے پاس تھا جس کا گروپ پانچواں یعنی آخری تھا۔

حیدر صاحب اور شہباز میدان میں واپس آئے تو دوسری دوڑ تیار تھی۔ حیدر صاحب نے
جج کو مخصوص اشارہ کیا اور اس نے رومال ہلا کے دوڑ کا آغاز کر دیا۔

دوڑ کا آغاز تو بہت اچھا لگتا ہے مگر گھوڑوں کی واپسی کا انتظار بہت کھلتا ہے۔ دو میل جانا
پھر دو میل واپس آنا۔ اس میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔

دھوپ بھی تیز ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ گرمی کا زمانہ نہ تھا بلکہ اب تو گلابی جاڑے بھی شروع ہو چکے

تھے لیکن وہ پہر سر پر تھی اور حدت بڑھنا ہی تھی۔ میدان میں سائے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شاہی مہمانوں کے اسٹیج پر سایہ تھا یا پھر صرف شامیانے والے دھوپ سے بچے ہوئے تھے۔ یہ شامیانے خاص خاص لوگوں کے لیے تھے۔ عوام بے چارے دھوپ ہی میں کھڑے تھے۔

پہلی دوڑ میں شہباز اول آیا۔ اس کے ساتھ دو نمبر پر آنے والے کا نام بھی لکھا گیا تاکہ وہ دوسری دوڑوں میں بھی حصہ لے سکیں۔

طے یہ تھا کہ دوڑ میں حصہ لینے والے چار چار کے پانچوں گروپوں میں سے اوّل اور دوم آنے والے سواروں کو اگلی دوڑوں میں حصہ لینے کا حق ہوگا۔ پس دوسری، تیسری اور چوتھی دوڑ کے اول اور دوم آنے والے شہسواروں کو الگ کر لیا گیا۔

آخری یعنی پانچویں دوڑ میں شہباز کے چھوٹے بھائی حیدر علی کو حصہ لینا تھا۔ شہباز اپنے محسن حیدر صاحب کی نشست کے پیچھے کھڑا تھا۔

حیدر علی کا قد شہباز سے زیادہ لانبا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر تنے بیٹھے تھے۔ دوڑ کے شروع ہونے سے پہلے حیدر صاحب اور شہباز دونوں کے دل دھڑک رہے تھے لیکن جب دوڑ شروع ہوئی تو حیدر صاحب، شہباز اور تمام تماشائیوں نے دیکھی۔

جج کے رومال ہلاتے ہی حیدر علی نے کچھ اس انداز سے اپنے مشکی گھوڑے کو ایڑ دی کہ وہ ایک لمحے کے لیے اپنے پچھلے دونوں پیروں پر الف ہوا۔ پھر جو اس نے قدم زمین پر جما کے آگے کو حرکت کی تو یوں محسوس ہوا جیسے بندوق سے گولی نکلتی ہے یا پھر بادِ صرصر کا جھونکا جسم سے چھو کر زن سے نکل جاتا ہے۔

حیدر صاحب اور شہباز کے چہروں پر چمک آ گئی۔ شہباز نے جذبات سے مغلوب ہو کر حیدر صاحب کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر کہا:

"حیدر بھائی! دیکھا آپ نے حیدر علی کو!"

حیدر صاحب نے مسکرا کر شہباز کی طرف دیکھا۔

تب تک حیدر علی کا گھوڑا تو آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ باقی تمام گھوڑے دور پر سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد آخری گروپ کے سوار واپس آتے دکھائی دیے مگر ان کی واپسی بھی بالکل اسی انداز کی تھی جس طرح پہلی گھڑدوڑ میں ہوا تھا۔ اس بار حیدر علی کا مشکی گھوڑا دوسروں کو چھوڑ کر ایک

فرلانگ آگے آ رہا تھا۔

حیدر صاحب جوش میں آ کے کھڑے ہو گئے۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

"شاباش حیدر علی — زندہ باد حیدر علی!"

حیدر علی گھوڑے سے اتر کر بھاگتے ہوئے حیدر صاحب کے پاس آئے۔ حیدر صاحب نے ان سے بغل گیر ہونے کے لیے بازو کھول دیے لیکن حیدر علی نے ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر پہلے آنکھوں سے لگایا۔ پھر انہیں بوسہ دیا۔ اس کے بعد اس نے بڑے بھائی شہباز کے ہاتھ چومے حیدر صاحب اور شہباز نے حیدر علی کو گلے لگا کر دعا دی۔

پانچوں گروپوں سے اول دوم سوار الگ کر لیے گئے تھے۔ یہ سب دس سوار تھے۔ اب انہیں پانچ پانچ کے گروپوں میں تقسیم کیا گیا مگر اس طرح کہ شہباز اور حیدر علی الگ الگ گروپوں میں رکھے گئے۔

وقت زیادہ ہو گیا تھا اس لیے فوراً ہی دوڑ شروع کرا دی گئی۔ ان گروپوں میں بھی شہباز اور حیدر علی اول آئے۔

اب آخری دوڑ ہونے والی تھی تاکہ یہ طے ہو سکے کہ دونوں میں اول کون ہے اور دوم کون؟ اس وقت حیدر علی نے حیدر صاحب سے کہا:

"بھائی جان۔ بڑے بھائی سے مقابلہ کرنا سوئے ادب ہے اس لیے میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔"

"حیدر علی! تم بہت عظیم ہو۔" حیدر صاحب نے اس کی تعریف کی اور اس کا ماتھا چوم لیا۔

شہباز اپنے چھوٹے بھائی کے اس خلوص اور ادب سے بہت خوش ہوا۔

دونوں بھائیوں کو میسور سرکار کی طرف سے ایک ایک گھوڑا مع ساز کے دیا گیا۔ پھر مہارانی نندی نے ایک ایک خنجر جس کا قبضہ سونے کا تھا اور غلاف پر سونے چاندی کے تاروں کا کام کیا ہوا تھا، شہباز اور حیدر علی کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ عوام نے دونوں بھائیوں پر سونے چاندی کے سکوں کی خوب بارش کی۔

آج کا مقابلہ ختم ہو گیا۔

دوسرے دن شمشیر زنی کا مقابلہ تھا اس لیے لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ گھڑسواری

کے اس مقابلے نے شہباز اور حیدر علی کو سب سے بڑا انعام یہ دیا کہ ان دونوں بھائیوں کے نام میسور کے عوام کی زبان پر چڑھ گئے۔

عوام میلے ٹھیلوں کو خوب پسند کرتے ہیں۔ اس دن کی گھوڑ دوڑ میں شہباز اور حیدر علی کی وجہ سے انہیں ضرورت سے زیادہ لطف آیا۔ چنانچہ اس شب چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں پر شہباز اور حیدر علی ہی کا ذکر تھا۔

لوگ اس بات پر زیادہ حیران تھے کہ دوڑ جیتنے والے دونوں کم عمر جوان تھے۔ جب ان کا اس عمر میں یہ حال تھا تو پتہ نہیں وہ آگے چل کر کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیں گے۔

پھر عوام میں دوسرے دن ہونے والے شمشیر زنی کے مقابلہ کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک عام آدمی نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا:

"اے کاش! آج کی دوڑ جیتنے والے دونوں جوان کل کے مقابلے میں بھی شریک ہوں۔"

"واہ۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ جو اچھا شہسوار ہو وہ اچھا شمشیر زن بھی ہو۔" دوسرے نے خواہ مخواہ اعتراض جڑ دیا:

"بے شک دونوں نے شہسواری میں بڑی مہارت دکھائی ہے مگر شمشیر زنی کا فن کچھ اور ہے"

"کون کہتا ہے کہ اچھا شہسوار، اچھا شمشیر زن نہیں ہو سکتا۔"

یہ ایک تیسری آواز تھی:

"میں گلبرگہ کے ایک جوان کو جانتا ہوں جو شہسواری اور شمشیر زنی دونوں میں ماہر اور یکتا ہے۔"

بحث میں اتنی تیزی آئی کہ دو پارٹیاں تیار ہو گئیں اور پہلے بحث — تو تو مَیں مَیں میں تبدیل ہوئی۔ پھر پارٹیوں نے آستینیں چڑھا لیں۔

جن کے پاس تلواریں تھیں ان کے ہاتھ تلواروں کے قبضوں پر پہنچ گئے اور جن کی کمر میں خنجر لگے تھے انہوں نے اپنے خنجروں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

یہ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ عام دنوں میں اس پر چار چھ آدمیوں سے زیادہ آدمی بیٹھے دکھائی دیتے تھے مگر اس وقت یہاں پچاس سے زیادہ لوگ موجود تھے جن میں تماشائیوں کی

تعداد زیادہ تھی۔

انہی تماشائیوں میں ایک بزرگ صورت بھی کھڑے تھے۔ ان کی عمر زیادہ نہ تھی کیونکہ داڑھی کے بال، نصف سے زیادہ کالے تھے مگر ماتھے پر سجدہ کرنے کا اتنا گہرا سیاہ دھبہ تھا جس نے انہیں اس عمر میں ہی بزرگ بنا دیا تھا۔

وہ بزرگ لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے۔ لوگوں نے ان کی صورت دیکھ کر جگہ دے دی۔ وہ دونوں پارٹیوں کے درمیان جا کھڑے ہوئے۔ پھر فرمایا:

"میرے دوستو اور بھائیو! کیوں آپس میں سر پھٹول کرتے ہو۔ تم کسی ایسے شخص کو کیوں تلاش نہیں کرتے جو شہسواری اور شمشیر زنی کے فن سے پوری طرح واقف ہو صرف یہی نہیں بلکہ جو آج کے دونوں جوانوں کے پورے خاندان سے واقف ہو۔"

لوگوں نے پہلے تو ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ پھر ایک ہمت کر کے بولا:

"جناب مولانا صاحب۔ اگر آپ کسی ایسے شخص سے واقف ہوں تو ہمیں اس کا پتہ بتائیے تاکہ ہم اس کے پاس جا کر اپنا فیصلہ کرائیں۔"

"میرے بیٹے۔ تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔"

بزرگ مولانا نے سوال کرنے والے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"ایسے چند لوگوں میں سے ایک شخص وہ بھی ہے جو اس وقت تم سے مخاطب ہے۔"

"جی — کیا فرمایا آپ نے؟" سوال کرنے والے نے پوچھا:

"کیا آپ کا اشارہ اپنی طرف ہے؟"

"بالکل۔ بالکل۔" بزرگ نے جواب دیا:

"آپ لوگ غصہ تھوک کے بیٹھ جائیے۔ میں آپ کو ابھی سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔"

سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ باقی کرسیوں اور بنچوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

بزرگ نے کچھ اس طرح گل افشانی فرمائی:

"میرے دوستو۔ حیدر صاحب کلاں کو تو آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے۔ میری مراد اُن حیدر صاحب سے ہے جو ان مقابلوں کے ناظم اعلیٰ اور آج کا مقابلہ جیتنے والے دونوں جوانوں کے بڑے بھائی ہیں۔ اس حقیر کی ان سے پرانی یاد اللہ ہے۔ ہمارے راجہ صاحب کی نظروں میں ان کا بڑا مقام ہے اور ریاست کے دونوں وزیروں یعنی نندراج اور دیو راج صاحب سے ان کا یارانہ ہے

اس ناچیز فقیر کو بھی وہ اکثر وزیروں کی حویلیوں میں لے گئے ہیں۔ ان کی حویلیاں کیا ہیں راج محلوں کو مات ـــــ"

"ہمیں آپ کی داستان نہیں سننا ہے۔ اصل بات بتائیے!" ایک دل جلے نے بیچ کے ان کی بات کاٹ دی۔

دوسرے لوگوں کو بھی ان کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ انہوں نے بھی اعتراض کرنے والے کی ہاں میں ہاں ملائی۔

بزرگ محترم جو اعتراض کرنے والے کو کوئی سخت جواب دینے والے تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ اور بہت سے لوگ بھی اس کے ہمنوا ہیں تو انہوں نے فوراً پینترا بدلا۔

"دوستو۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ اصل بات معلوم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ میں وہی بات بتانے جا رہا ہوں۔"

پھر انہوں نے لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بات آگے بڑھائی:

"ہاں دوستو۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں ہاں یاد آیا راج محل کی بات ہو رہی تھی ـــــ"

اس دل جلے نے انہیں پھر ٹوکا:

"جناب! راج محل پر خاک ڈالیے۔ اصل بات بتائیے ہمیں!"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے"۔

انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اصل بات پر آگئے:

"اصل بات یہ ہے کہ کل کے مقابلے میں بھی یہ دونوں بھائی یعنی شہباز اور حیدر علی اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھائیں گے اور آپ لوگ دیکھیں گے کہ اس میں بھی ان کا نمبر پہلا ہی رہے گا۔"

حاضرین اس اطلاع سے بہت خوش ہوئے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے منتشر ہو گئے۔ مولانا جو اپنی لن ترانیاں سنانا چاہتے تھے، منہ دیکھ کر رہ گئے۔

بزرگ موصوف کا نام ہاتف تھا مگر لوگ ان کی فضول گوئی کی وجہ سے انہیں کاذب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان میں یہ خوبی ضرور تھی کہ وہ بڑی سے بڑی محفل سے، بڑے سے بڑے مجمع اور جلسے میں بے دھڑک گھس جایا کرتے تھے اور موقع پاتے ہی اپنی زبانِ بے لگام کھول دیتے تھے۔ پھر یہ زبان اس وقت تک چلتی رہتی تھی جب تک انہیں مجلس یا جلسہ سے ہاتھ پکڑ کے نکالا نہ جاتا تھا۔

آج کے مقابلہ کے اختتام پر جب حیدر صاحب کلاں، شہباز اور حیدر علی کی کامیابی پر انہیں مبارک باد دے رہے تھے تو ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا تھا:

"دیکھو لڑکو۔ جس طرح تم نے آج کامیابی حاصل کی ہے اسی طرح کل شمشیر زنی کے مظاہرے میں بھی اول آنا"۔

اس وقت ہاتف یا کاذب صاحب، حیدر صاحب کی پشت پر کھڑے تھے۔ چنانچہ انہوں نے موقع سے فوراً فائدہ اٹھایا اور فی الفور سامنے آکر حیدر صاحب کو فرشی سلام کیا۔ ان کی صورت دیکھتے ہی حیدر صاحب کا مزاج برہم ہو گیا مگر انہوں نے ملائمت سے کہا:

"ہاتف نہیں۔ آج نہیں، پھر کبھی تشریف لائیے گا۔ میں ایک ہفتے تک مصروف رہوں گا"۔

حیدر صاحب تو یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے مگر اسی وقت ہاتف کی آواز سنائی دی:

"کوئی بات نہیں شاہ حیدر۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا"۔

حیدر صاحب چلتے چلتے رکے اور واپس آکر بولے:

"ہاتف۔ اپنا دماغ صحیح رکھو۔ میں بادشاہ نہیں۔ ریاست میسور کے راجہ کرشن اوڈیر کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ خبردار۔ آیندہ جو کبھی ایسی بات کہی تو ـــــ"



آج مقابلے کا دوسرا دن تھا۔

ایک طرف کشتی کے اکھاڑے جمے تھے۔ ننگے بدن پہلوان جسم پر اکھاڑے کی مٹی ملے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

دوسری طرف پٹے بازی کے اکھاڑے جمع تھے۔ پٹے بازی کو شمشیر زنی کی ابتدائی صورت کہا جا سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ پٹے باز کے ہاتھ میں تلوار کی جگہ بانس کی ایک چھڑی ہوتی تھی اور لوہے یا گینڈے کی کھال کے بجائے دفتی یا گتے کی گول ڈھال ہوتی جس پر کپڑے کی کئی تہیں لپٹی ہوتی تھیں۔

باقی انداز سارے شمشیر زنی کے ہوتے۔ اسی طرح بانس کی چھڑی کی شمشیر فضا میں لہراتی اور مخالف کے سر پر بجلی جیسی تیزی سے گرتی اور مخالف فوراً پینترا بدل کے وار کو اپنی ڈھال پر روکتا۔ پھر جوابی حملہ کرتا۔

پٹے بازی عوام میں بہت مقبول تھی۔ جنوبی ہند میں یوں بھی سادات کی زیادہ آبادی تھی۔ وہ تعزیہ داری اور علم برداری کرتے تھے۔ تعزیہ کے جلوس میں آگے آگے پٹے بازوں کی ٹولیاں ہوتیں۔ یہ لوگ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے، جلوس کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ شمالی ہند میں خصوصاً لکھنؤ، رامپور وغیرہ پٹے بازی کا رواج تھا جو اب تک قائم ہے۔

آج کا سب سے اہم مقابلہ شمشیر زنی کا تھا۔

شمشیر زنی کے دو اکھاڑے بنائے گئے تھے۔ اکھاڑے کی زمین کو پہلے اچھی طرح صاف کیا گیا۔ پھر اس پر پانی چھڑکا گیا۔ اس کے اوپر بڑی بڑی سوتی دریوں کا فرش بچھایا گیا۔ اس طرح شمشیر زنی کے دو اکھاڑے تیار کیے گئے تھے۔ ایک اکھاڑا راجہ کے اسٹیج کے ذرا دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب۔

شمشیر زنی کے مقابلہ میں ہر ایک حصہ لے سکتا تھا اس لیے شمشیر ہر ایک کی کمر سے لٹکتی نظر آتی تھی اور اسے مردوں کا زیور کہا جاتا تھا۔

مسلمان بچوں کو شمشیر نما لکڑیوں کے سہارے چلنا سکھایا جاتا تھا۔ بچے سکول کی تعلیم کے بجائے شمشیر زن ماہرین سے تربیت حاصل کرتے تھے۔ شاید اسی لیے شیخ فتح محمد کے دونوں بیٹے یعنی شہباز اور حیدر علی علم کا چراغ تو روشن نہ کر سکے مگر شمشیر کا علم ایسا بلند کیا جو تاریخ کا سنہرا باب بن گئے۔

شمشیر زنی کا طریقہ یہ تھا کہ دو شمشیر زن آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ انہیں زرہ بکتر پہننے اور خود لگانے کی اجازت ہوتی تھی۔ بعض شمشیر زن گلے کی حفاظت کے لیے آہنی کڑیوں یا زنجیروں کا ہار بنا کے خود کے نیچے لٹکا لیتے تھے۔ پھر گھڑ دوڑ کی طرح رومال ہلا کر مقابلہ کا آغاز کیا جاتا۔ دونوں شمشیر زن جھپٹ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایک دوسرے پر اس قدر دباؤ ڈالتے کہ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے مقررہ لکیر سے باہر ہو جاتا۔ اس وقت مقابلہ ختم کر دیا جاتا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ دونوں شمشیر زن اپنی جگہ پہاڑ کی طرح جم کے کھڑے ہو جاتے۔ اور ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹتے۔ اس وقت جج یہ دیکھتا کہ کون شمشیر زن زیادہ زخمی ہو گیا ہے اور اگر اسے میدان سے ہٹایا نہ گیا تو اس کی موت ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں جج سیٹی بجا کر مقابلہ ختم کرا دیتا اور زیادہ زخمی ہونے والے کی ناکامی کا اعلان کر دیا جاتا۔

آخر مقابلے کا اعلان ہوا۔

دو دو شمشیر زن آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ یہ محض اتفاق نہ تھا بلکہ حیدر صاحب نے جان بوجھ کے مقابلے کے دونوں مقامات پر شہباز اور حیدر علی کو الگ الگ مقابلے کا آغاز کرنے کے لیے کھڑا کر دیا تھا۔

ان مقابلوں میں دو شمشیر زن کامیاب قرار دیے جاتے جو سب سے زیادہ شمشیر زنوں کو شکست دیتے تھے۔ شہباز اور حیدر علی دونوں کا لباس یکساں تھا۔ ان کے سر پر آہنی زنجیروں کا جھالردار خود تھا اور جسم پر زرہ بکتر۔

دونوں جگہوں پر مقابلہ ایک ساتھ شروع ہوا۔

مقابلہ سے پہلے شمشیر زنوں کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ گھوڑ دوڑ جیتنے والے دونوں نوجوان شمشیر زنی کے مقابلوں میں شریک ہیں ـــ اور وہی مقابلوں کا آغاز کر رہے ہیں۔

شہباز اور حیدر علی دونوں کے مقابل دو مرہٹہ جوان تھے جو انعام کے لالچ میں آئے تھے۔ مقابلہ شروع ہوتے ہی شہباز اور حیدر علی نے اپنے مدِمقابل کی تلوار سے تلوار ٹکرائی مگر جب وہ تلواریں الگ ہوئیں تو دونوں مرہٹہ جوانوں کی تلواریں ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گریں۔

شہباز اور حیدر علی نے مرہٹہ جوانوں کی تلواریں الجھا کر اس انداز سے جھٹکا دیا تھا کہ تلواریں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔

اس طرح شہباز اور حیدر علی نے اپنا مقابلہ جیت لیا۔

اس مقابلے کا فیصلہ اس قدر تیزی سے ہوا کہ عوام کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ انھوں نے تو بس یہ دیکھا کہ شہباز اور حیدر علی کے مدِمقابل خالی ہاتھ کھڑے ہیں اور ان کی تلواریں دور جا گری ہیں۔

دوسرے مقابلے میں بھی شہباز اور حیدر علی کامیاب رہے۔ انہوں نے اس بار بھی اپنے مدِمقابل کی تلوار اپنی تلوار میں الجھا کر اسے دور پھینک دیا تھا۔

عوام شہباز اور حیدر علی کو پہلی بار کچھ زیادہ داد نہ دے سکے تھے مگر اس بار ان دونوں نوجوانوں کے حق میں اس قدر نعرے لگے جیسے طوفان برپا ہو گیا ہو۔

تیسری اور چوتھی بار بھی شہباز اور حیدر علی نے اپنی اسی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ پھر تو اسٹیج کے اوپر بیٹھنے والوں یعنی مہارانی نندی اور راجہ کرشن اوڈیر نے بھی شہباز اور حیدر علی کی تعریف میں زبان کھولی۔ رہے حیدر صاحب تو ان کی خوشی کا کیا ٹھکانہ تھا!

اس کے بعد پھر اس مقابلہ میں اس وقت اور زیادہ لطف پیدا ہوگیا جب شہباز اور حیدر علی نے اپنی اپنی ڈھال الگ رکھ دی اور بغیر ڈھال کے مدمقابل، جو ڈھال لیے ہوئے تھے اُسے مقابلہ کا اعلان کیا۔

دونوں جوانوں کے اس جرأت مندانہ اعلان پر خوب شور ہوا اور ان کی تعریفوں کے پُل باندھے گئے۔ اب مقابلہ ذرا دیر تک ہوتا کیونکہ شہباز اور حیدر علی کو محتاط ہو کر مقابلہ کرنا پڑتا۔ انہیں مدمقابل کا ہر وار تلوار ہی پہ روکنا تھا۔

شہباز اور حیدر علی نے پانچ منٹ کے اندر ہی اندر دونوں مدمقابل کو اس قدر زخمی کر دیا کہ وہ مقابلہ سے نکل گئے۔

اس طرح مقابلوں کو تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور شہباز اور حیدر علی اپنے دس دس مدمقابلوں کو شکست دے چکے تھے۔ ان کی ہر کامیابی پہ میدان اور اسٹیج دونوں جگہوں سے اس قدر شور ہوتا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔

ایک گھنٹہ کے بعد شہباز اور حیدر علی نے اپنی کمالِ مہارت کا ایک اور مظاہرہ کیا۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے اپنے سروں سے خود اتار دیے، جس سے ان کے سر اور گردنیں دونوں غیر محفوظ ہو گئیں۔

یہ بڑا حوصلہ مند مگر انتہائی خطرناک اقدام تھا۔ حیدر صاحب کو یہ تو معلوم ہوا تھا کہ شہباز اور حیدر علی شمشیر زنی میں اس قدر ماہر ہو گئے ہیں کہ اب وہ بغیر ڈھال کے لڑ سکتے ہیں مگر انہیں یہ خبر نہ تھی کہ دونوں بغیر خود کے بھی بڑے سے بڑے شمشیر زن سے لڑ سکتے ہیں۔

عوام بھی نوجوانوں کے خود اتار دینے پر مسرت کے ساتھ ساتھ خوف میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اس مقابلے میں حصہ لینے والے لوگ پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں اس لیے ان سے میں ڈھال اور خود سے آزاد ہو کر لڑنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں مگر یہ فیصلہ شہباز اور حیدر علی کا تھا۔ وہ ان کے فیصلے میں دخل اندازی نہ کر سکتے تھے۔

یہ مقابلہ شروع ہوا تو پورے میدان میں یوں سناٹا چھا گیا جیسے وہاں سرے سے کوئی متنفس موجود ہی نہ ہو۔

مہارانی نندی اور اس کا لاپرواہ شوہر بھی یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے اسٹیج کے اوپر سے آگے کو جھک پڑے۔ میسور کے عوام جنہوں نے شہباز اور حیدر علی کو اپنا ہیرو تسلیم کر لیا تھا وہ ان دونوں کی

زندگی اور کامیابی کی دعائیں مانگنے لگے۔ ہم مسلمان ہیں اور الحمد للہ ہمارا ایمان ہے کہ عزت اور ذلت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور خدا ہر شخص کو وہی دیتا ہے جو اس کے خیال میں اس کے قابل ہے۔

بلاشبہ یہ مقابلہ بڑا سخت تھا۔

بغیر ڈھال کے شہباز اور حیدر علی اپنے مقابل کو پانچ سات منٹ میں شکست دے سکتے تھے مگر اس مقابلے کو آٹھ منٹ سے زیادہ گزر چکے تھے اور اب تک فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حیدر علی کو کامیابی عطا فرمائی۔ وہ بھی اس طرح کہ حیدر علی نے اپنے مقابل کو جھکائی دے کر اس کے شانے پر الٹا اور اس شدت کا وار کیا کہ اس کی تلوار مقابل کا شانہ کاٹتی ہنسلی تک پہنچ گئی۔ مقابل کا ہاتھ جھول گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

پھر تو ایسا نعرہ بلند ہوا کہ جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ حیدر صاحب دوڑ کر حیدر علی کے پاس گئے اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

حیدر علی کی کامیابی کو ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے اور حیدر صاحب، حیدر علی سے جدا بھی نہ ہوئے تھے کہ عوام نے ایک اور نعرۂ تحسین بلند کیا۔

حیدر صاحب نے پلٹ کر دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ شہباز نے بھی اپنے مدمقابل کا الٹے ہی وار سے شانہ اس طرح تراشا تھا کہ تلوار اس کے ہاتھ میں لٹک کے رہ گئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی مہارانی نندی نے چیخ کر حکم دیا:

"مقابلہ فوراً بند کر دیا جائے!"

نندراج اور دیوراج سیڑھیاں چڑھ کر اسٹیج پر پہنچے تاکہ معلوم کریں کہ مہارانی نے ایسا حکم کیوں دیا ہے؟

مہارانی نندی نے اسی طرح چیخ کے کہا:

"وزیر بابا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو عوام کے ہاتھوں قتل کرا دیں۔ یہ میسور کی آن بان اور شان ہیں۔ انہیں سنبھال کے رکھا جائے!"

مہارانی نندی کی بات بالکل صحیح تھی۔

شہباز اور حیدر علی نے ثابت کر دیا تھا کہ میسور میں ان جیسا نہ تو کوئی شہسوار ہے اور نہ شمشیر زن۔ پھر ایسے جواہر ریزوں کو مٹی میں کیوں ملایا جائے۔ جوان بلکہ نوجوان خون ان کی رگوں

میں دوڑ رہا ہے۔ وہ اپنی طاقت سے ایک بار تو پہاڑ کو بھی جنبش دے سکتے ہیں مگر ہیں نوا بھی ناتجربہ کار۔ ابھی میدانِ جنگ کا انہوں نے منہ بھی نہیں دیکھا۔ دشمن کیسا ہوتا ہے، اس کی انہیں بالکل خبر نہ تھی۔ وہ دونوں حیدر صاحب کے چچیرے بھائی تھے ممکن ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے والوں کے ذہن میں حیدر صاحب کا خوف بھی موجود ہو۔

مہارانی نندی کی بات پر جس انداز سے غور کیا جائے وہ درست معلوم ہوتی تھی۔ نندراج اور دیوراج دونوں ہی مہارانی نندی کی خودسری کے خلاف تھے۔ راجہ کرشن اوڈیر کی طرف سے انہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس کا مشغلہ رقص و سرود یا پھر جوان کنیزوں کو اپنی بغل میں جگہ دینا تھا۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی خواہش نہ تھی۔

لیکن ـــ

مہارانی نندی کے تیور کچھ اور تھے۔

گو کہ اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ وہ رانی تھی مگر اسے مہارانی کا خطاب دیا گیا تھا پھر بھی وہ ان تمام مراعات کے باوجود مطمئن نہ تھی۔

وہ کیا چاہتی تھی؟ اس کا اسے خود بھی علم نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ اسے راج محل میں رہنا پسند نہ تھا۔ اس نے راج محل میں رہنا چھوڑ دیا تھا اور اس کی ضد پر اسے الگ رانی محل بنوا کر دیا گیا تھا مگر وہ اب بھی مطمئن نہ تھی۔

مقابلہ ختم کر دیا گیا۔

عوام، شہباز اور حیدر علی کی باتیں کرتے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

نندراج اور دیوراج ایک ہی محل میں رہتے تھے یعنی ان دونوں کا چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا ـــ

اس رات جبکہ حیدر صاحب نے اپنے بھائیوں کی کامیابی کی خوشی میں دوستوں کی دعوت کی تھی اور وہ ان کے درمیان بیٹھا شہباز اور حیدر علی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ اس وقت وزیر برادران ایک خاص الجھن میں گرفتار تھے۔

بات یہ تھی کہ مہارانی نندی نے نندراج کو رانی محل میں فوری طور پر طلب کیا تھا۔

اب نندراج اور دیوراج اس پریشانی میں مبتلا تھے کہ مہارانی نے نندراج کو کیوں طلب کیا ہے اور آیا اسے رانی محل میں تنہا جانا چاہیے یا نہیں؟

مہارانی کی خاص ملازمہ جو مہارانی کی رازدار سہیلی بھی تھی، اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا تھا کہ

نندراج، ذرا دیر بعد راج محل پہنچ جائیں گے۔

نندراج کوئی بہانہ بھی کر سکتا تھا۔ وہ مہارانی کی خاص کنیز سے یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ مہارانی کو اس وقت کیا کام پڑ گیا جس کے لیے اس نے نندراج یعنی ریاست میسور کے مردِ آہن کو طلب کیا ہے؟

نندراج نے مہارانی کی خدمت میں اسی کنیز کو اپنا جاسوس بنا کر بھیجا تھا جو وہاں جا کر مہارانی کی جاسوسی کرنے کے بجائے اس کی کنیزِ خاص بن گئی تھی۔

مہارانی نندی، نندراج کی بیٹی تھی۔ نندراج نے راجہ کرشن اوڈیر سے اس کی سیاسی شادی کی تھی تاکہ راجہ ہاتھ پیر نہ نکال سکے اور اگر راجہ ہاتھ پیر نکالے یا اس کا دماغ خراب ہونے لگے تو وہ اپنی بیٹی کی مدد سے اس کی عقل ٹھکانے لگا سکے۔

نندراج نے اپنے خیال میں یہ قدم اپنے مفاد میں اٹھایا تھا لیکن یہ الٹا ہو گیا۔ مہارانی نندی بہت جلد راج محل کے تمام حالات سے واقف ہو گئی۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا کہ نندراج نے راجہ سے اس کی شادی سیاسی بنا پر کی ہے۔

اس انکشاف نے اسے نندراج سے باغی کر دیا۔

مہارانی نندی کو ہر قسم کا عیش و آرام میسر تھا۔ پھر بھی وہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتی تھی۔ وہ نندراج کے اختیارات سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ نندراج کی دشمنی اسے بہت مہنگی پڑے گی۔ جب نندراج اسے ایک ناکارہ اور نااہل مرد کے حوالے کر سکتا تھا تو اپنے مفاد کی خاطر وہ اسے قتل بھی کر سکتا تھا۔

پھر بھی اقتدار کی ہوس نے اسے تمام خطرات سے بے پروا کر دیا تھا اور وہ رات دن ایسی ترکیبیں سوچتی رہتی تھی جس سے اسے طاقت حاصل ہو اور وہ وزیر برادران کے اقتدار کو ختم کر کے ملکی انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لے۔

یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا رانی نندی سمجھ رہی تھی۔

اس کا اختیار اپنے محل تک محدود تھا۔ اپنے محل کا داروغہ اس نے لڑ جھگڑ کر اپنی مرضی کا رکھا تھا سمبھا، جسے کنیزیں دیو کے نام سے پکارتی تھیں، سیاہ رنگت اور اچھے ہاتھ پیروں کا مالک تھا، میسوری فوج میں وہ ایک سپاہی بھرتی ہوا تھا اور کئی سال بعد اسے نائیک کا عہدہ حاصل ہوا تھا۔ مہارانی نندی نے اسے کہیں دیکھا تھا اور قوی الجثہ ہونے کی وجہ سے سمبھا اسے پسند آ گیا تھا۔ پھر

رانی نے باپ سے ضد کر کے سجنا کو اپنے محل کا داروغہ بنوا دیا۔

سجنا بڑی بے تکلفی سے محل کے اندر بھی جاتا تھا۔ اس پر کوئی روک ٹوک یا پابندی نہ تھی۔ کنیزیں اور دوسرے غلام اس سے سہمے سہمے سے رہتے تھے کہ وہ محل کا داروغہ ہونے کے علاوہ مہارانی نندنی کا منہ چڑھا ملازم تھا۔

کنیزیں دبی زبان سے کہتی تھیں کہ سجنا کو مہارانی کی خوابگاہ کے اردگرد گھومتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ مہارانی کی کنیز خاص سورج مکھی دراصل نندراج کی جاسوس تھی جسے اس نے مہارانی کی جاسوسی پر مقرر کیا تھا لیکن مہارانی نے اس پر انعام واکرام کی بارش کر کے اسے اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ اب وہ مہارانی کی رازدار سہیلی تھی۔

پھر —

ایک دن ایسا ہوا کہ سورج مکھی اور سجنا میں چل گئی۔

سجنا کو اپنی داروغگی اور مہارانی کی حمایت کا زعم تھا اس لیے اس نے یہ جاننے کے باوجود کہ سورج مکھی بظاہر مہارانی کی کنیز مگر دراصل وہ نندراج کی جاسوس ہے، سجنا نے سورج مکھی کو دوسری کنیزوں کے سامنے اس قدر ذلیل کیا کہ وہ رو پڑی۔

وہ سجنا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ مہارانی سے سجنا کی شکایت کرنا دیوار سے سر پھوڑنے کے مترادف تھا۔ اس وقت تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی مگر اس کے دل میں سجنا کی طرف سے گرہ پڑ گئی۔

چند دن بعد سورج مکھی نے مہارانی سے ماں کے پاس جانے کے لیے چھٹی مانگی۔ اس کی ماں مرنگا پٹم کے شہر میں رہتی تھی۔

مہارانی نے اسے چھٹی دیدی۔

اس چھٹی کے دوران سورج مکھی اپنے پرانے آقا کے پاس پہنچی اور اشاروں کنایوں میں سجنا کے بارے میں لگائی بجھائی کی۔

"مالک۔ آپ نے سجنا کو داروغہ بنا کر اچھا نہیں کیا"۔ سورج مکھی نے بات چھیڑی۔

نندراج نے اسے چونک کر دیکھا۔

سورج مکھی کھلے لفظوں میں سجنا کی غیبت پر آمادہ تھی اور چالاک نندراج یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے باغی ہونے والی یہ کنیز آج رانی محل کے داروغہ کی شکایت کیوں کر رہی ہے۔

"جو کچھ کہنا ہے کھل کے کہہ سورج مکھی"۔

نندراج نے سخت لہجے میں کہا:

"مگر یہ یاد رکھ کہ تو نے اپنا وقار میری نظروں میں کم کر دیا ہے"۔

"مالک! میری طرف سے دل صاف کر لیجیے"۔

سورج مکھی نے جرأت سے کہا:

"میری طبیعت ایسی نہیں کہ آپ کو خوش کرنے کے لیے جھوٹی اور من گھڑت باتیں آپ تک پہنچایا کروں۔ میرے خیال میں یہ خبر اہم تھی اس لیے آپ تک پہنچا دی"۔

"ٹھیک ہے"۔

نندراج نے اسے طرح دی:

"اب بتاؤ۔ سجنا کا کیا حال ہے؟"

سورج مکھی نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ ملا کر سجنا کی خوب خوب برائیاں کیں۔ نندراج نے اس کی باتیں بڑی بے دلی سے سنیں۔ شاید اس لیے کہ اسے ان باتوں کا علم دوسرے ذرائع سے ہو چکا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کی آزاد خیالی اور بے محابہ بے باکی کو خوب جانتا تھا اس لیے اسے یہ خبر کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔

"کیا رانی محل پر ریاست کا کوئی اور کارندہ بھی آتا ہے؟" نندراج نے یونہی پوچھ لیا۔

سورج مکھی فوراً سمجھ گئی کہ نندراج نے اس کی بات کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی اس لیے اس شاطر کنیز نے فوراً پینترا بدلا اور سنبھل کے بولی:

"مالک۔ رانی محل پر ابھی تک کوئی اہم آدمی تو نہیں آیا لیکن ایک شخص کا نام مہارانی اور سجنا کی گفتگو میں اکثر سنا جاتا ہے۔ شاید کوئی فوجی افسر ہے وہ"۔

فوجی افسر کے نام پر نندراج گھبرا گیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟ تم نے یاد نہیں رکھا اس کا نام!"

"مالک۔ مجھے ٹھیک سے تو یاد نہیں"۔

سورج مکھی پیشانی پر انگلیاں رکھ کے بولی:

"اس کا نام — اس کا — گھنشام — نہیں نہیں گنگا رام ہے اس کا نام"۔

گنگا رام کے نام پر نند راج اچھل پڑا۔

"گنگا رام!"

نند راج نے حیرت اور پریشانی سے کہا:

"ٹھیک ہے۔ کیا اس کا نام گنگا رام ہے؟"

"مالک۔ مجھے تو یہی نام یاد پڑتا ہے۔"

سورج مکھی نے سوکھے منہ سے کہا:

"کیا اس نام کا کوئی آدمی ہماری فوج میں ہے؟ اس نے بات کو طول دینے اور الجھانے کے لیے نند راج سے الٹا سوال کر دیا۔

"اری پگلی! تو ہماری رانی نندی کی خاص کنیز ہے اور اتنا بھی نہیں جانتی۔" نند راج نے محبت انداز میں اسے ڈانٹا:

"گنگا رام میسور کے لشکر کا فوجدار ہے۔"

"ہائے رام۔ فوجدار ہے وہ۔"

سورج مکھی نے کمال ہوشیاری سے حیرت کا اظہار کیا:

"پھر تو مالک دال میں کچھ ضرور کالا ہے۔ سجنا ہفتے میں ایک بار اس سے ملنے ضرور جاتا ہے۔"

"اچھا میں دیکھوں گا دونوں کو۔"

نند راج نے فیصلہ کن انداز میں کہا:

"اب تم جا سکتی ہو۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔"

نند راج ایک نئی الجھن میں پھنس گیا تھا۔

وہ سجنا کی طرف سے قطعی فکرمند نہ تھا اس لیے کہ رانی نندی کے سجنا سے جائز یا ناجائز کسی طرح کے بھی تعلقات میسور کی ریاست پر اثر انداز نہ ہوتے تھے۔ ریاست کا مطلب خود اس کا اپنا اقتدار تھا مگر سورج مکھی کی زبان سے گنگا رام کا تذکرہ خطرے کی گھنٹی تھی۔

لطف کی بات یہ تھی کہ گنگا رام بھی نند راج ہی کا پروردہ تھا اور نند راج نے میسور کی فوج پر بالواسطہ قبضے کے لیے گنگا رام کو آگے بڑھایا تھا اور وہ اس وقت میسور کا فوجدار تھا۔

فوجدار کا عہدہ تقریباً سپہ سالار کا ہوتا تھا۔ چونکہ سپہ سالار کی حیثیت سے نند را

اور دیو راج دونوں بھائی مشہور تھے اس لیے گنگا رام کو فوجدار کا عہدہ دیا گیا تھا اور اس کے سپرد فوج کا انتظام و انصرام تھا۔

گنگا رام کا باغی ہونا دونوں بھائیوں کے لیے بہت خطرناک تھا۔ نند راج نے اس سلسلے میں فوراً دیو راج کو اپنے اعتماد میں لیا۔

دیو راج بھی اس خبر سے گھبرا گیا اور اس نے نند راج کو ایک بالکل نیا مشورہ دیا۔

"بھائی نند راج۔ میری مانو تو اس معاملہ کو جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دو۔" دیو راج نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"وہ کس طرح؟"

دیو راج نے پوچھا:

"جو کہنا ہے صاف صاف کہو!"

"بھائی نند راج۔ بات بالکل صاف ہے۔" دیو راج نے بڑے استقلال سے کہا:

"دیکھو بھائی۔ راج نیتی میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ نہ بھائی بھائی کا اور نہ باپ بیٹے کا۔ اگر تمہیں یقین ہے کہ ہماری رانی نندی نے اس کالے بھینسے اور گنگا رام کے ساتھ مل کر ہماری جڑیں کاٹنے کی کوشش کی ہے تو پھر تم بھی انہیں اپنی بچت کی خاطر ان کی جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دو۔"

نند راج نے حیرانی سے دیو راج کو دیکھا:

"تمہارا مطلب ہے کہ نندی، سجنا اور گنگا رام تینوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے؟"

"صرف یہی تین نہیں۔ اگر ہمارے راستے میں تین سو یا تین ہزار بھی آ جائیں تو ہمیں ان کو راستے سے ہٹانا ہی پڑے گا۔"

دیو راج کا انداز فیصلہ کن تھا۔

نند راج نے اس سے اور کچھ نہ کہا بلکہ وہ دو دن اور دو راتیں اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ اس نے اپنے جاسوسوں کو بلا کر فرداً فرداً ایک ایک سے فوجدار اور رانی محل کے معاملات کے بارے میں صدہا سوالات کیے مگر کوئی بھی گنگا رام اور رانی محل کے درمیان کسی تعلق کو نہ بتا سکا۔ رانی محل کی جاسوس کنیزوں اور غلاموں نے قسمیں کھا کر کہا کہ انہوں نے گنگا رام یا اس کے کسی ہرکارے کو رانی محل میں آتے نہیں دیکھا۔

بھی بیان ان جاسوسوں کا تھا جنہیں وزیر برادران نے فوجدار گنگارام کی جاسوسی پر مقرر کیا تھا۔ انہوں نے بھی قسمیں کھا کر کہا کہ گنگارام کے پاس رانی محل کا نہ تو کوئی قاصد آیا اور نہ کبھی گنگارام نے رانی محل جانے کا ارادہ کیا۔

نندراج کی ان تحقیقات نے اسے رانی نندی کی طرف سے کسی حد تک مطمئن کر دیا اور اس کی نظروں میں سورج مکھی کی اطلاع مشکوک ہوگئی۔ پھر بھی مہارانی نندی اور سجنا کا معاملہ ابھی درمیان میں تھا۔

نندراج کو سجنا اور مہارانی نندی کے تعلقات پر اعتراض نہ تھا بلکہ اصل اعتراض اس پر تھا کہ نندی نے اس قدر بد احتیاطی کیوں برتی کہ بات کنیزوں اور غلاموں میں پھیل گئی۔ اب اگر یہ بات رعایا تک پہنچی تو اس سے رانی محل کے ساتھ ساتھ وزیر برادران بھی بدنام ہوں گے۔ کیونکہ ایک تو نندی، نندراج کی بیٹی تھی۔ دوسرے ریاست کی پوری انتظامیہ بھی نندراج ہی کی تھی۔

کچھ روز سوچ بچار کے بعد ایک دن نندراج، رانی محل پہنچ گیا۔

پورے رانی محل میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی اور ہر شخص سوالیہ نشان بن کے رہ گیا۔

نندراج کیوں آئے ہیں؟

کس کی شامت آنے والی ہے؟ وغیرہ وغیرہ، ہزاروں سوالات پیدا ہو رہے تھے۔

رانی محل کے باسیوں کے دل میں خوف ابھر رہا تھا۔ مہارانی نندی کی کئی کنیزوں نے بھاگ کر اسے ایک ساتھ اطلاع دی۔

"مہارانی۔ نندراج تشریف لا رہے ہیں۔"

"ان کے چہرے سے غصہ ٹپک رہا ہے مہارانی!"

"بڑے جلال میں ہیں نندراج جی!"

کنیزوں نے اپنے اندازے مہارانی کے سامنے اگل دیے اور مہارانی کی یہ کیفیت کہ وہ منہ کھولے ہکا بکا ایک ایک کو دیکھ رہی تھی، جیسے اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی ہو۔

اس کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے اور جس دن سے وہ بیاہ کے آئی تھی بس راج محل کی ہو کر رہ گئی تھی۔ سوائے ایک آدھ بار کے وہ میکے نہ گئی تھی اور نہ میکے والوں نے اس کی کوئی خبر

لی۔ وہ اس لیے پریشان تھی کہ چار سال بعد یہ دوسرا یا تیسرا موقع تھا کہ اس کا باپ نندراج، جسے پوری ریاست کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا، اس سے خود ملنے آ رہا تھا اور بغیر کسی اطلاع کے۔

مہارانی ان خیالوں میں گم تھی کہ نندراج سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیا۔ داروغہ رانی محل سجنا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سی کنیزیں بھی تھیں۔

مہارانی نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر نندراج کا استقبال کیا:

"سو سو پرنام وزیر بابا۔ آج تو میرے محل کی قسمت جاگ اٹھی"۔ رانی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

نندراج کے قدم رک گئے۔

اس نے پتری (بیٹی) کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی:

"سدا سہاگن رہو نندی"۔ اس نے جواب میں رسم پوری کر دی۔

نندی نے جیسے نندراج کا جواب سنا ہی نہیں۔ وہ پھر خیالوں میں گم ہوگئی تھی۔

نندراج نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر بولا:

"کیا سوچ رہی ہو نندی۔ اندر چلنے کو نہیں کہو گی؟"

نندی شرمندہ سی ہوگئی۔ سنبھل کے بولی:

"وزیر بابا۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ قدم بڑھایئے۔ رک کیوں گئے آپ!" نندی نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بوکھلاہٹ چھپائی۔

نندی کی خواب گاہ پہ پہنچ کر نندراج نے کہا:

"میرے پیچھے آنے والوں کو رخصت کر دو۔ میں تمہارے پاس پہنچ چکا ہوں"۔

نندی نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور ساری بھیڑ چھٹ گئی۔

نندراج، مہارانی کی آراستہ خوابگاہ میں داخل ہوا۔ پوری خواب گاہ مختلف قسم کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔

نندی ایک چاندی کے سٹول پہ بیٹھ گئی اور باپ کو چھپر کھٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اس پہ آرام سے بیٹھیے وزیر بابا"۔

نندراج چھپر کھٹ کے کونے پر بیٹھ گیا۔

"ایک کام آن پڑا ہے تم سے"۔ نندراج نے ایک دم بات شروع کر دی۔

"میں آپ کے کس کام آ سکتی ہوں وزیر بابا۔ جان حاضر ہے۔ آپ حکم دیجیے"۔ نندی نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔

"بالا پور کے قلعہ دیونہلی کا محاصرہ ہو رہا ہے۔ ایک نئی فوج تیار ہو رہی ہے وہاں کے لیے۔ مضبوط جوان بھرتی کیے جا رہے ہیں اس کے لیے ــــ" نندراج نے رک کر مہارانی نندی کا منہ دیکھا۔

مہارانی نندی ایک ذہین عورت تھی مگر نہ معلوم اس وقت کس الجھن میں تھی کہ نندراج کا اشارہ نہ سمجھ سکی۔

اس نے ذرا حیرانی سے پوچھا:

"وزیر بابا۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں آپ کے لیے؟"

"بھائی دیوراج کا خیال ہے کہ ــــ" نندراج پھر رکا۔ وہ نندی سے کسی قسم کا جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا:

"ان کا خیال ہے کہ تمہارے محل کا داروغہ ایک لمبا چوڑا جوان ہے۔ اسے کچھ دنوں کے لیے لام (محاذ) پر بھیج دیا جائے"۔

نندی کی سمجھ میں اب ساری گفتگو اور اندازِ گفتگو آ گیا۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر بے حد ضبط کر کے بولی:

"آپ مالک ہیں وزیر بابا۔ جس کو چاہیں رکھیں جس کو چاہیں نکالیں۔ مجھ میں کیا طاقت کہ میں آپ کے حکم کو ٹالوں!"

نندی کا لہجہ بہت جلتا ہوا تھا۔

"یہ بات نہیں نندی!" نندراج نے بھی مصلحتاً تحمل سے کام لیا:

"نہیں تمہاری مرضی کے بغیر اسے نہیں لے جاؤں گا۔ یہ ایک ملکی ضرورت ہے۔ سجنا ایک کڑیل جوان ہے۔ شمشیر زنی اور شہسواری بھی جانتا ہے۔ چار پانچ آدمیوں پر بھاری پڑتا ہے اسی لیے ہم نے یہ سوچا تھا کہ سجنا کو دیونہلی کے محاذ پر آزمایا جائے۔ اگر مفید ثابت ہو تو اس کو ترقی دی جائے۔ محل کا داروغہ تو بس عمر بھر داروغہ ہی رہ جاتا ہے"۔

نندراج کا لہجہ مشفقانہ تھا اس لیے نندی نے بھی جھگڑا کرنا مناسب نہ سمجھا اور جواب میں نرمی سے بولی:

"وزیر بابا۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ سجنا کا دیونہلی جانا اس کے مستقبل کے لیے بہتر ہے تو پہلے آپ اس کا بدل میرے پاس بھیجیے۔ میں اُسے پسند کر لوں تو آپ اسے بلوا لیجیے گا"۔

نندی نے انکار نہیں کیا تھا اس لیے نندراج نے زیادہ زور دینا مناسب خیال نہ کیا ــــ اسی وقت ایک کنیز نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔

نندی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا:

"بابا چلیے پہلے کھانا کھا لیجیے پھر باتیں ہوں گی"۔

نندراج کھانے کے معاملے میں بہت محتاط تھا۔ اس کے سینکڑوں نہیں ہزاروں دشمن تھے۔ وہ کسی کی دی ہوئی چیز چکھتا بھی نہ تھا مگر نندی نے کچھ ایسے خلوص اور پیار سے کہا کہ اسے اپنی قسم توڑنا پڑی۔

وہ نندی کے ساتھ کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے کھانا شروع کیا تو بے ساختہ اسے نندی کی ماں یعنی اپنی بیوی کا خیال آ گیا۔ وہ اسی قسم کے کھانے پکاتی تھی۔

اس خیال کے آتے ہی نندراج کے سخت دل میں نندی کے لیے ایک اور نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔

نندراج کھانے سے فارغ ہوا اور بغیر کچھ اور گفتگو کیے وہاں سے روانہ ہو گیا، حالانکہ نندی نے اسے تھوڑی دیر اور بٹھانے کی بیحد کوشش کی۔



اس واقعہ کو چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ نہ نندراج نے رانی محل میں کوئی دوسرا آدمی بھیجا اور نہ رانی نندی نے سجنا کو محل سے ہٹایا۔

اس دوران نندراج اور مہارانی نندی میں کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ نندراج کو اپنے ریاستی جھگڑوں سے ہی چھٹی نہ ملتی تھی کہ وہ کسی اور طرف دیکھتا۔

اور ــــ مہارانی نندی اپنے رنگ میں مگن تھی!

پھر اس دن شمشیر زنی کے مقابلہ میں اتفاقیہ نندراج، دیوراج اور نندی اور راجہ کرشن اور سب آمنے سامنے ہو گئے تھے۔ رانی نے اسٹیج کے اوپر سے چیخ کر حکم دیا تھا کہ شمشیر زنی کا کام ختم کر دیا جائے اور اس آواز پر نندراج اور دیوراج دونوں ہی اسٹیج کے اوپر یہ معلوم کرنے گئے تھے کہ آخر مہارانی مقابلہ کیوں بند کرا رہی تھی۔

یہ ایک مختصر ملاقات یا محض آمنا سامنا تھا یا پھر اس کے بعد اچانک رانی نندی کا یہ فوری بُلاوا تھا۔

رانی کا پیغام لانے والی سورج مکھی تھی جس کی شاطرانہ چالوں کی ایک جھلک ابھی دکھائی گئی ہے۔ سورج مکھی گو کہ نندراج کی جاسوس تھی لیکن اس نے سجنا اور فوجدار گنگا رام کے گٹھ جوڑ کے بارے میں جو کچھ اطلاع دی تھی وہ سچ ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے نندراج نے اب اس سے کوئی سوال نہ کیا تھا اور یہ کہہ کر اسے واپس بھیج دیا تھا کہ وہ رانی کے پاس تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہے۔

نندراج نے احتیاط کے طور پر دیوراج کو اپنے رانی محل جانے کی اطلاع کرا دی تھی اور اس تاکید کے ساتھ کہ اگر اسے رانی محل میں زیادہ دیر ہو جائے تو وہ دریافتِ حال کے لیے وہاں پہنچے۔ ان دونوں بھائیوں نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ جب دو میں سے کوئی ایک تنہا کہیں جائے تو دوسرا اس کا خیال رکھے۔

نندراج کا رانی محل پر پُرجوش استقبال ہوا۔ رانی نندی اپنی تمام کنیزوں کے ساتھ محل کے صدر دروازے پر اس کی منتظر تھی۔
نندراج پہنچا تو رانی نے اسے بڑے ادب سے جھک کر پرنام کیا۔ پھر اس کے پیر چھونے کے لیے جھکی۔

ہندو مذہب اور تہذیب میں کسی کے پیر چھونے کا مطلب ہوتا ہے کہ پیر چھونے والا اس کی بزرگی اور عظمت کا دل سے معترف ہے۔
شادی کے بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ رانی نندی نے باپ کے پیر چھونے کی کوشش کی مگر نندراج نے اسے پیروں کی طرف جھکتے دیکھ کے فوراً اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"
نندراج نے اسے ٹوکا:
"یہ ٹھیک ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں لیکن تم اس ریاست کی مہارانی ہو اور میں اس ریاست کا ادنیٰ خادم"۔
نندراج نے اسے پیر چھونے سے تو روک دیا مگر وہ سخت پریشان تھا کہ مہارانی آج اس پہ اس قدر مہربان کیوں ہے۔ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔
"کیا مہارانی ہونے سے بیٹی اور باپ کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے؟" نندی نے بڑے الھڑپن سے کہا۔
نندراج خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ نندی کے الفاظ اسے کانوں میں سرسراتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور مسکرایا:
"یہ تمہاری تابعداری ہے نندی۔ ورنہ رانی مہارانی تو ایشور کو بھی بھول جاتی ہیں"۔
نندراج نے سر جھکا کر پیچھے کی طرف دیکھا تو اسے سجنا کہیں نظر نہ آیا۔ حالانکہ چھ ماہ پہلے کی ملاقات میں وہ نندراج کے پیچھے پیچھے مہارانی کی خواب گاہ تک گیا تھا۔
"آج سجنا نظر نہیں آ رہا۔ کیا بات ہے؟" نندراج کی زبان سے اک دم نکلا۔ حالانکہ سجنا کی موجودگی یا غیر موجودگی سے اس پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔
"وہ بہک گیا ہے وزیر بابا"۔ نندی نے مختصر جواب دیا کیونکہ وہ دونوں خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔
مہارانی نندی نے باپ کو پھر چھپر کھٹ پر بٹھایا اور اس کے سامنے چاندی کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کنیزوں نے فوراً سامنے پڑی ہوئی میز پر خشک میووں سے بھری گنگا جمنی تھالیاں سجا دیں۔
نندی نے ایک تھال باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:
"وزیر بابا۔ آپ آج کچھ فکرمند معلوم ہوتے ہیں؟"
نندراج کھسیانا سا ہو گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔
نندراج واقعی فکرمند ہو گیا تھا۔ نندی کا اک دم اسے بلانا سجنا کے متعلق اس کے بدلے ہوئے خیالات۔ پچھلی مرتبہ اس نے سجنا کو اپنے محل میں روکنے کی ضد کی تھی مگر آج وہ اس سے بیزار نظر آ رہی تھی۔ نندراج کے لیے یہ فکر ہی کی بات تھی۔ اس نے سنبھل کر بات بنائی:

"رانی تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ میں فکرمند ہوں اور مجھے فکرمند رہنا پڑتا ہے۔ اتنی بڑی ریاست۔ سارے انتظامات مجھے اور دیوراج ہی کو تو کرنا پڑتے ہیں۔ تم بھی تو کبھی کبھی اپنے محل کی باتوں سے فکرمند ہو جاتی ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"جی جی۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں وزیر بابا۔" رانی کو اعتراف کرنا پڑا۔

"ارے ہاں ۔۔۔"

نندراج کو جیسے کچھ یاد آ گیا:

"تم کہہ رہی تھیں کہ سجنا کچھ بہک گیا ہے۔"

"جی ہاں وزیر بابا۔"

رانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:

"وہ دراصل میری کنیزوں کو پریشان کرنے لگا ہے۔ رانی محل کا داروغہ ہے ناں، اس لیے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ اپنے کو راجہ سمجھنے لگا ہے۔"

"یہ تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے رانی۔"

نندراج نے پیار سے کہا:

"ان چھوٹے لوگوں کو سر پہ نہ چڑھانا چاہیے۔ یہ تو اپنی جگہ پر ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ کہو تو میں اسے تبدیل کر دوں؟"

"ہاں وزیر بابا۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" رانی نے اپنا عندیہ ظاہر کر دیا۔

نندراج نے غور سے رانی کو دیکھا:

"سجنا کو تمہارے محل سے بدلا دیا جائے یا اس کی دنیا ہی بدل دی جائے ۔۔۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"یہ آپ کی مرضی ہے وزیر بابا۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔" مہارانی نندنی نے بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

"خیر۔ یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں۔ جیسا تم چاہتی ہو وہ ہو جائے گا۔" نندراج نے لاپرواہی سے کہا: "ہاں اب بتاؤ تم نے مجھے کیوں بلوایا ہے؟"

"اسی مسئلے کے لیے بلوایا تھا وزیر بابا۔"

اور ۔۔۔ رانی، نندراج کا منہ دیکھنے لگی۔

"ارے واہ ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی!"

نندراج اٹھ کے کھڑا ہو گیا:

"رانی بیٹی! تم نے اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ تم نے کسی کنیز کے ذریعے کہلوا دیا ہوتا۔ میں اسی وقت اس کالے دیو کو گرفتار کر کے بلوا لیتا۔ اچھا اب اجازت دو۔ دیوراج میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے وزیر بابا۔ ذرا دیر بیٹھیے ناں۔"

رانی نے ہاتھ پکڑ کے باپ کو بٹھا دیا:

"مجھے ایک بات اور بھی کرنی ہے۔"

"تو کہو ناں۔ انتظار کس بات کا ہے۔"

"ہیں ۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی جگہ کسی معقول آدمی کو بھیجا جائے۔" رانی نندنی نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔"

نندراج نے سر ہلایا:

"رانی بیٹی تمہیں اس سے زیادہ ذمے دار آدمی دیا جائے گا۔"

"آپ کی نظر میں کوئی ایسا آدمی ہے وزیر بابا۔" اس نے باپ سے سوال کیا۔

"ابھی ۔۔۔ ابھی تو نہیں۔ تم نے کہہ دیا ہے تو ہم دونوں اب اس مسئلے پر غور کریں گے۔ اور کسی ایسے آدمی کو اس جگہ لگائیں گے جسے تم ضرور پسند کرو گی۔" نندراج نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"اگر آپ مجھے کچھ اہمیت دیتے ہوں تو میرے ذہن میں دو ایک نام ہیں۔" رانی کے لہجے میں دبا دبا سا طنز تھا۔

"تم مہارانی ہو نندنی بیٹی!"

نندراج زور دے کر بولا:

"راجہ کرشن اور ڈیرہ کے بعد اس ریاست کی سب سے اہم شخصیت تم ہی تو ہو۔"

"تو آپ یوں کہیے وزیر بابا۔"

نندنی نے رک کر باپ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں:

"آپ شہباز خاں اور حیدر علی، ان دونوں جوانوں کو میرے محل کا داروغہ بنا دیجیے۔ یہ میرا حکم نہیں بلکہ درخواست ہے بابا!"

نندراج کا دماغ گھوم گیا۔

اسے اب معلوم ہوا کہ مہارانی نے اسے اچانک کیوں بلوایا ہے۔ وہ مہارانی کے اس مطالبہ کے مضمرات کو فوراً ہی بھانپ گیا تھا۔

شہباز اور حیدر علی ابھرتے ہوئے شمشیر زن اور شہسوار تھے۔ نندراج نے ان کے مقابلے میں کامیاب ہونے کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان دونوں جوانوں کو مراعات اور احسانات کے ذریعے پوری طرح اپنے قابو میں رکھا جائے کیونکہ ان دونوں کی اٹھان بتا رہی تھی کہ یہ جوان ایک دن سرنگا پٹم کے افق پر آفتاب بن کے چمکیں گے۔

نندراج کو خاموش دیکھ کر مہارانی نے اپنی بات دہرائی:

"وزیر بابا۔ کیا آپ کو مجھ سے اتنی بھی محبت نہیں کہ آپ میری یہ درخواست قبول کر لیں"۔

"یہ بات نہیں ہے نندی!"

نندراج نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے کہا:

"میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ان دونوں جوانوں کے مستقبل کا فیصلہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اب اس فیصلے کو کیسے بدلا جا سکتا ہے؟"

"آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے ان کے لیے؟" رانی نے فوراً سوال کیا۔

"ہم دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا ہے"۔

نندراج نے فوراً جواب دیا:

"شہباز کو ایک ہزار پیادوں اور پانچ سو سواروں کا رسالدار اور حیدر علی کو، جو ابھی بہت کمسن ہے، ایک سو سواروں کے دستہ کا سردار بنا دیا جائے"۔

"مگر وزیر بابا۔ رانی محل کا داروغہ ہونے سے ان کی ترقی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا"۔ رانی نے بیچ ہی میں دخل دیا:

"میں اپنے محافظ دستے کو بھی اپنے داروغہ کے حوالے کر دوں گی"۔

"یہ تو ٹھیک ہے"۔ نندراج پہلو بدل کر بولا:

"مگر یہ سب کچھ تو اسی وقت ممکن تھا، جب شہباز اور حیدر علی سرنگا پٹم میں رہ سکتے"۔

"میں سمجھ نہیں سکی وزیر بابا"۔

رانی الجھتے ہوئے بولی:

"آخر وہ سرنگا پٹم میں کیوں نہیں رہ سکتے۔ کونسی مجبوری انہیں شہر چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے؟"

"مجبوری یہ ہے میری رانی کہ وہ دونوں میسوری لشکر کے ساتھ بالا پور کے قلعہ دیون
پر حملہ کے لیے جا رہے ہیں" نندراج نے آخر رانی پر حملہ کر ہی دیا۔

"مگر اس حملہ کی مجھے یا مہاراج کرشن اوڈیر کو تو کوئی خبر نہیں!" رانی نے بھی پہلو
ل کر جوابی وار کیا۔

نندراج اور دیوراج نے راجہ کو توسنِ شعور تک پہنچتے ہی قابو کر لیا تھا۔ ایک نواس
شادی اپنی بیٹی نندی سے کر دی تھی۔ دوسرے اسے رقص و موسیقی کا اس قدر شوقین
دیا تھا کہ اس شوق کے لیے اکثر وہ کھانا، کھانا ہی بھول جایا کرتا تھا۔

نندراج نے راجہ کے ذہن میں یہ چیز بٹھا دی تھی کہ ریاست میسور میں جو کچھ ہوتا
ہے وہ اسی کے حکم سے اور اس کی بھلائی کے لیے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے راجہ کو
حق ضرور دیا تھا کہ وہ ریاست کے کسی معاملہ کے بارے میں جب چاہے تحقیقات کر
تا ہے مگر راجہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ رقص میں گردش کرتی سڈول ٹانگوں اور جسم کے دوسرے
ضا کو تھرکتے دیکھنے کے بجائے کاروبارِ ریاست کے خشک کام میں مغز کھپائی کرتا۔

پس ـــ

نندراج نے راجہ اور امورِ سلطنت کے اس روایتی اصول کے تحت، رانی نندی کو ایسا جواب
ا جس نے رانی کا منہ پھیر دیا۔

نندراج پھر کھڑا ہو گیا اور پُر رعب لہجے میں بولا:

"مہارانی نندی۔ ہم میں اور راجہ کرشن اوڈیر میں یہ طے پایا تھا کہ ہم ریاستی معاملات کو
اجہ کے کانوں تک اس وقت تک نہ پہنچائیں جب تک کہ وہ خود اس امر کی خواہش ظاہر
کریں"۔

نندراج کا سخت جواب مکمل تھا مگر اس نے اپنے جواب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"یہ بھی سن لو مہارانی نندی! ہم میں اور راجہ میں یہ طے ہوا تھا کہ اگر انہوں نے ہمارے

ہر کام کی تحقیقات شروع کر دیں تو ہم ہرگز انکار نہ کریں گے لیکن ہمیں یہ اختیار ہو گا کہ ہم مہاراجہ کرشن اوڈیر کو مقرر کردہ رقم کے علاوہ ایک پائی زائد نہ دیں گے اور وہ کسی اضافی رقم کا ہم سے مطالبہ نہ کریں گے"۔

نندراج کی اس وضاحت نے مہارانی نندی کی عقل ٹھکانے کر دی۔ رانی نے اپنے باپ اور چچا سے زبانی یہ وعدہ یا معاہدہ کیا تھا کہ وہ اپنے رانی محل کے لیے ایک مقررہ رقم حاصل کیا کرے گی مگر اس نے اپنے اخراجات اس قدر وسیع کر لیے تھے کہ اسے مقررہ رقم جو ملتی تھی وہ آدھے مہینے ہی میں ختم ہو جاتی تھی اور اسے اپنے وزیر باپ سے ہر ماہ اضافی رقم کی درخواست کرنا پڑتی تھی۔

وہ سمجھ گئی کہ نندراج نے مہاراجہ کرشن اوڈیر پر بات رکھ کر دراصل خود رانی کے کان کھولے ہیں۔

مہارانی نندی مزید کوئی بات نندراج سے نہ کر سکی۔ چالاک وزیر نے مہارانی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اسے بہت سی دعائیں دیں اور چلتے چلتے یہ کہہ گیا کہ:

"نندی بیٹی! میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارا مقررہ رقم میں گزارا نہیں ہوتا۔ میں بھائی دیوراج سے بات کر کے اس رقم کو دگنا کرا دوں گا"۔

اور اب تو مہارانی نندی کی زبان لمبے عرصے کے لیے بند ہو گئی تھی۔

دیون ہلی پر حملہ کا ذکر کر کے نندراج نے رانی کو لاجواب کر دیا تھا۔ یہ بات کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھی۔

دیون ہلی کا قلعہ ڈوڈ بالا پور کے حاکم عباس قلی خاں کے ماتحت تھا مگر سرنگاپٹم نے بھی اس قلعہ کا دعویٰ کر رکھا تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ریاست میسور کا رقبہ پہلے ہزاروں میل پر مشتمل تھا لیکن اب یہ ریاست سمٹ سمٹا کے سرنگاپٹم کے صرف ۳۳ گاؤں تک محدود ہو چکی تھی۔ ہر گاؤں کا ایک پالیگار یعنی جاگیردار ہوتا تھا جو اپنی آمدنی سے ایک حصہ راجہ میسور کو بطور خراج دیا کرتا تھا۔ پورے جنوبی ہند میں ایسے ہی پالیگار ہوتے تھے جو اپنے مرکز یعنی راجہ کو کمزور دیکھتے تو فوراً آزادی کا اعلان کر دیتے تھے اور جب ان پر کوئی بڑی طاقت حملہ آور ہوتی تو وہ باجگزار ہو جاتے تھے۔

میسور کی ریاست روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی یہاں راجہ موجود ہونے کے باوجود اقتدار

وزیروں کے ہاتھ میں تھا اور وزیروں کی مصلحت یہ ہوتی کہ وہ قرب و جوار کی تمام بڑی طاقتوں کو خراج دیتے تھے۔ چنانچہ میسور ایک طرف تو نظام الملک کو خراج دیتا اور دوسری طرف مرہٹوں کو بھی خوش کرنے کے لیے انہیں ایک معقول رقم بطور خراج پیش کرتا تھا۔

نندراج اور دیوراج کو ریاست کو وسعت دینے یا اپنی گردن چھڑانے کی فکر نہ تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ ریاست کا کاروبار اسی طرح چلتا رہے اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔

لیکن ـــ

شہباز اور حیدر علی نے شہسواری اور شمشیر زنی کے مقابلوں میں جس مہارت کا ثبوت دیا تھا، اس نے دونوں بھائیوں کے ذہن میں یہ بات ڈالی تھی کہ اگر کوشش کی جائے تو شہباز اور حیدر علی کے سے بہادر جوانوں کے ذریعے ریاست میسور کے وہ علاقے واپس لیے جا سکتے ہیں جو میسور کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر یا تو آزاد ہو گئے تھے یا ان پر مرہٹوں اور دوسری بڑی طاقتوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی نندراج نے بالاپور کے قلعہ دیون ہلی پر قبضہ کی بات سوچی تھی پھر یہ بات اس وقت اور پکی ہو گئی جب رانی نندی نے اپنے محل کے داروغہ بنانے کے لیے شہباز اور حیدر علی کو مانگا تھا۔

نندراج نے رانی نندی کے پاس سے واپس آتے ہی اس سلسلے میں دیوراج سے بات کی۔

"کیوں دیوراج! قلعہ دیون ہلی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ارے خاک ڈالو دیون ہلی پر"۔

دیوراج نے الجھتے ہوئے کہا:

"پہلے رانی محل کی بات سناؤ۔ کیوں بلایا تھا اس نے؟"

"ارے دیوراج۔ رانی محل کی بات ہی سے تو قلعہ دیون ہلی کی بات نکلی ہے"۔ نندراج نے ہنستے ہوئے کہا:

"رانی محل کی رانی مجھ سے شہباز اور حیدر علی کو مانگ رہی تھی۔ دیکھو تو بھلا۔ ہے نا یہ پاگل پن"۔

دیوراج گھبرا گیا:

"کیوں۔ کیوں ـــــ وہ شہباز اور حیدر علی کو کیوں مانگ رہی تھی۔ کیا کوئی نئی چال چلے گی وہ ـــ؟"

"معلوم تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے"۔

نندراج نے جواب دیا:

"مگر میں نے بھی اسے ایسا جواب دیا کہ اُس کا منہ بند ہو کر رہ گیا"۔

"اچھا ـــ بھلا کیا جواب دیا تم نے؟" دیوراج نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے کہا کہ نندراج اور دیوراج نے تو انہیں دیون ہلی کے قلعے پر حملے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ وہ دونوں میسور کا پرچم اس قلعہ پر لہرائیں گے"۔

"مگر وہ قلعہ عباس قلی خاں کے علاقے میں ہے"۔

دیوراج نے اسے بتایا،

"اس سے جھگڑا مول لینا مناسب نہیں"۔

"تم نہیں سمجھ سکے یہ بات دیوراج"۔ نندراج نے کہا:

"میں بتاتا ہوں تمہیں۔ دس سال پہلے شہباز اور حیدر علی کو عباس قلی خاں نے نقاروں کے اندر بند کر دیا تھا اور حیدر صاحب کلاں نے اٹھارہ ہزار کی رقم ادا کر کے انہیں عباس قلی خاں سے چھڑایا تھا۔

اس حملہ میں شہباز اور حیدر علی، عباس قلی خاں سے اپنی اور اپنی ماں کی بے عزتی کا بدلہ لیں گے تم دیکھنا تو ذرا۔ یہ بچے عباس قلی خاں کے لشکر کا منہ پھیر کے رکھ دیں گے"۔

دیون ہلی پر حملہ کی تیاریاں بہت زور شور پر تھیں۔ نندراج نے تلواروں پر صیقل کرنے کا حکم دیا تھا۔ کئی سو نئے گھوڑے خرید ے گئے تھے۔ سپاہیوں اور سواروں کی نئی بھرتی بھی جنگی طور پر کی گئی تھی۔

ان تیاریوں کو سب سے پہلے حیدر علی نے محسوس کیا۔ پھر ایک دن جب حیدر صاحب کلاں اس کے گھر آئے ہوئے تھے تو حیدر علی نے ماں اور بڑے بھائی شہباز کے سامنے اس کا ذکر چھیڑا۔

"حیدر بھائی۔ آجکل لشکر زور شور سے تیار ہو رہا ہے"۔ حیدر علی نے اپنے محسن اور مربی بھائی

کو اطلاع دی۔

"اچھا۔ تم نے کیسے محسوس کیا؟" حیدر صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

"میں اور شہباز بھائی آجکل بیرکوں ہی میں رہتے ہیں"۔

حیدر علی نے بتایا:

"نئی بھرتی شروع ہے۔ بہت سے گھوڑے خرید ے گئے ہیں اور پرانے گھوڑوں کی نعل بندی بھی ہوئی ہے"۔

"اس کا مطلب ہے کہ نندراج کسی سے جنگ چھیڑنا چاہتے ہیں"۔ حیدر صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

حیدر صاحب تھے تو نندراج ہی کے ملازم مگر ان پر بہت سی انتظامی ذمہ داریاں بھی تھیں اور انہیں فوجی بیرکوں میں جانے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فنِ سپہ گری سے دُور ہو گئے تھے۔ اُس دور میں مسلمان یوں بھی ۲۴ گھنٹے کمر کسے فوجی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔ پھر حیدر صاحب کا تو پورا خاندان ہی کسی نہ کسی راجہ یا صوبیدار کی فوج میں کسی عہدے پر تھا۔

"حیدر بھائی۔ میرا تو خیال ہے کہ آجکل ہی میں جنگ ہونے والی ہے"۔ حیدر علی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا:

"وزیر نندراج نے تو تلواروں کو صیقل کرنے کا بھی حکم دیدیا ہے"۔

حیدر علی اور شہباز کی ماں مجیدہ بیگم اگرچہ زیادہ عمر میں بیوہ نہیں ہوئی تھیں لیکن زمانے کے گرم و سرد نے ان کے سر کے بال تقریباً کھچڑی کر دیے تھے۔ وہ بڑی خاموشی سے لڑکوں کی گفتگو سن رہی تھیں ـــ مگر جب حیدر علی نے زور دے کر کہا کہ نندراج نے تلواروں کو صیقل کرنے کا حکم دے دیا ہے تو انہیں بھی یقین آ گیا کہ جنگ واقعی قریب ہے۔ ان کے شوہر فتح محمد بھی ہر جنگ سے پہلے اپنی تلوار کو صیقل کرتے تھے۔

چنانچہ مجیدہ بیگم نے دخل دیتے ہوئے کہا:

"حیدر بیٹے! کیا تمہیں بھی یقین ہے کہ کوئی جنگ ہونے والی ہے؟"

"ہاں چچی جان!"

حیدر صاحب نے حیدر علی کی بات سے اتفاق کیا:

"حیدر علی کہہ رہا ہے ناں کہ نندراج نے تلواریں صیقل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایسا حکم تو صرف جنگ

ہی کے موقع پر دیا جاتا ہے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کے دونوں بیٹے انشاءاللہ میدانِ جنگ میں بھی بہادری کے جھنڈے گاڑیں گے"۔

مجیدہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لی:

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ سپاہی اور سپاہی زادے میدانِ جنگ ہی میں اچھے معلوم ہوتے ہیں"۔

حیدر صاحب بہت دنوں بعد چچی سے ملنے آئے تھے اور ان کا ارادہ شام تک ٹھہرنے کا تھا مگر حیدر علی نے جنگ کی خبر دے کر ان میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔

دراصل انہیں شہباز اور حیدر علی سے شدید محبت ہو گئی تھی۔ ایک تو وہ ان کے چچازاد بھائی تھے۔ دوسرے انھوں نے شہسواری اور شمشیر زنی میں نام پیدا کیا تھا جس سے حیدر صاحب کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ وہ جس محفل میں جاتے وہاں حیدر علی اور شہباز کا ذکر چھڑا ہوا پاتے اور اہلِ محفل ان سے حیدر علی اور شہباز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

حیدر صاحب کلاں نے اپنی گفتگو مختصر کی اور ان سے رخصت ہو کے سیدھے وزیر برادران کے محل میں پہنچے۔

وزیر برادران پہلے ہی حیدر صاحب کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ پھر جب سے ان کے بھائیوں نے مقابلہ کا میدان جیتا تھا، اس وقت سے وزیر برادران کی نظروں میں حیدر صاحب کلاں کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

نندراج مہمان خانے میں اکیلا ہی تھا۔ اس نے حیدر صاحب کلاں کو خوش آمدید کہا۔ حیدر صاحب سلام کر کے خاموش بیٹھ گئے۔

نندراج نے انہیں خاموش دیکھا تو ہنس کے کہا:

"کیا بات ہے حیدر صاحب۔ تم آج خاموش کیوں ہو؟"

"مہاراج!" حیدر صاحب نے بجھے بجھے دل سے کہا:

"آپ چپکے چپکے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں مگر آپ کے اپنے پرانے نمک خواروں کو خبر تک نہ ہوئی۔ کیا آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے؟"

نندراج قہقہہ مار کر ہنس پڑا:

"تو تم اس لیے خاموش ہو!"

"جی مہاراج۔ کیا یہ جاں نثاروں کو نظرانداز کرنے والی بات نہیں ہے؟" حیدر صاحب نے بھرپور انداز میں شکوہ کیا۔

"اچھا تو پھر ہم تمہارا شکوہ ابھی دور کیے دیتے ہیں"۔

نندراج اسی خوش دلی سے بولا:

"یہ جنگ جس کی تیاریاں ہو رہی ہیں وہ تمہاری جنگ ہے۔ اس جنگ کے دولہا تم ہو اور تمہارے دونوں بھائی شہباز اور حیدر علی اس بارات کے شہ بالا ہوں گے۔ کچھ سمجھ میں آیا کہ نہیں؟"

حیدر صاحب کا دل خوش ہو گیا:

"مہاراج۔ یہ آپ لوگوں کی عنایت ہے جو ہم بھائیوں کو اتنی عزت دیتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے انشاءاللہ میں اس جنگ میں جان کی بازی لگا دوں گا"۔

"ہمیں ایسی ہی امید ہے حیدر صاحب"۔

نندراج نے اس کی تعریف کی:

"پھر یہ تمہاری اور تمہارے بھائیوں کی جنگ ہے۔ حیدر صاحب ایک بات یاد رکھو۔ جنگ کا طریقہ یہ ہے کہ اگر دشمن زبردست ہو اور شکست کا امکان ہو تو فوراً مصالحت کی گفتگو کرو مگر اس کی دشمنی دل میں باندھ لو۔ پھر جب تمہیں طاقت حاصل ہو یا پھر دشمن کمزور ہو جائے تو اس سے فوراً بدلہ لے لو"۔

"آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا مہاراج"۔

حیدر صاحب نے نندراج کی تائید کی:

"ہمارے ایک بزرگ شیخ سعدی گزرے ہیں۔ انھوں نے آپ کی اس بات کو ایک حکایت میں بیان کیا ہے۔ آپ کے یہ کہتے ہی مجھے وہ کہانی یاد آ گئی"۔

"اچھا۔ تمہارے بزرگ نے بھی یہی بات کہی تھی"۔

نندراج نے پتہ نہیں اپنی معلومات میں اضافے کے لیے یا پھر اسے جھٹلانے کے لیے پوچھ لیا اور کہا:

"حیدر صاحب۔ ذرا وہ کہانی ہمیں بھی تو سناؤ"۔

"اب سے سوا ڈیڑھ سو سال پہلے برصغیر کے مسلم گھرانوں میں بچے اور بچیوں کی تعلیم کا آغاز ہی

شیخ سعدی کی دو کتابوں گلستان اور بوستان سے کیا جاتا تھا۔ فارسی زبان کی یہ دو کتابیں آج تک
اپنی افادیت اور علمِ اخلاق کے سلسلے میں تر و تازہ ہیں۔

حیدر صاحب نے گلستان اپنے بچپن میں پڑھی تھی۔ اس وقت نند راج کی نصیحت پر انہیں
شیخ سعدی کی وہ حکایت یاد آ گئی جس میں اسی قسم کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

حیدر صاحب نے نند راج کے اصرار پر سعدی کی وہ حکایت بیان کرنا شروع کی:

"مہاراج! وہ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ کے ایک شہر
کا شہر کوتوال بہت ظالم تھا۔ وہ اچھے بھلے آدمیوں پر ظلم توڑتا تھا۔ اس شہر میں ایک
غریب بوڑھا رہتا تھا۔ وہ نیم پاگل سا تھا۔ جب وہ باہر نکلتا تو محلے کے بچے اسے پتھر
اور روڑے مارتے تھے۔

ایک دن شہر کوتوال اس بوڑھے کے پاس سے گھوڑے پر سوار گزرا۔ بوڑھے
پر بچے پتھر برسا رہے تھے۔ شہر کوتوال گھوڑا روک کر کھڑا ہو گیا اور بوڑھے
کا یہ حال دیکھ کر ہنسنے لگا۔

بوڑھے کو شہر کوتوال پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے کہا:

"تو شہر کوتوال ہے۔ بجائے اس کے کہ ان بچوں کو پتھر مارنے سے روکے تُو خود
بھی میرے حالِ زار کا تمسخر اڑا رہا ہے۔"

شہر کوتوال نے ہنستے ہوئے ایک بچے کو اپنے پاس بلایا اور اس کے ہاتھ میں بوڑھے
کو مارنے کے لیے جو پتھر تھا وہ لے لیا۔ پھر بوڑھے کو مخاطب کیا:

"اب کہہ تُو کیا چاہتا ہے؟"

بوڑھا سمجھا کہ شہر کوتوال میری ہمدردی کر رہا ہے۔ اس نے اپنی بات دہرائی:

"اے نیک دل شہر کوتوال۔ تو ان بچوں کو منع کر کہ یہ مجھے پتھر نہ ماریں۔"

بوڑھے کی بات ختم ہوتے ہی شہر کوتوال نے وہ پتھر جو اس نے لڑکے سے لیا تھا
اس بوڑھے کو کھینچ کر مارا اور کہا:

"اے بوڑھے تُو ان بچوں کے لیے ایک تماشہ ہے اور میں اس تماشے کو ختم نہیں
کر سکتا۔"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ دی اور آگے بڑھ گیا۔

بوڑھے کو اپنی بے بسی پر رونا آ گیا مگر اس نے اس پتھر کو جو شہر کوتوال نے
اس پر کھینچ مارا تھا، سنبھال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

کہتے ہیں کہ کچھ ہی دن بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی کوتوال پر بادشاہ کا
عتاب نازل ہوا اور اسے گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔

اس مظلوم بوڑھے کو شہر کوتوال کے قید خانہ میں جانے کا حال معلوم ہوا تو فوراً
قید خانہ پہنچا اور داروغۂ زندان سے اجازت حاصل کر کے شہر کوتوال سے ملنے
کو پہنچا۔

بوڑھے نے دیکھا کہ شہر کوتوال ایک کوٹھڑی میں قید ہے۔ کوٹھڑی میں باہر
کی طرف دروازے کی جگہ لوہے کا کٹہرا لگا تھا۔

اس وقت شہر کوتوال سر جھکائے اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس کی پیٹھ کٹہرے
کی طرف تھی۔

مظلوم بوڑھے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ پتھر نکالا جو شہر کوتوال نے اس پر
کھینچ مارا تھا۔ پس بوڑھے نے شہر کوتوال کا نشانہ لے کر وہ پتھر اتنے ہی زور سے
اس پر کھینچ مارا جتنے زور سے شہر کوتوال نے اسے مارا تھا۔

شہر کوتوال کی پیٹھ پر پتھر لگا تو وہ بلبلا کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا
تو بوڑھا کٹہرے کے باہر کھڑا اُسے گھور رہا تھا۔ شہر کوتوال کٹہرے کے پاس آیا
اور بڑے دکھ سے کہا:

"اے نیک بخت! میں تو قید خانے میں پڑا اپنے کیے کی سزا پا رہا ہوں۔ میں نے
تیرا کیا بگاڑا تھا کہ تو نے پتھر مجھ پر کھینچ مارا؟"

بوڑھے نے کڑک کے جواب دیا:

"اے شہر کوتوال۔ اس پتھر کو اٹھا کر غور سے دیکھ۔ یہ وہی پتھر ہے جو تُو نے
ایک بچے سے لے کر مجھے مارا تھا۔ مگر اس وقت تو شہر کوتوال تھا، میں تیرا کچھ نہیں
بگاڑ سکتا تھا۔ پس میں نے یہ پتھر اٹھا کر سنبھال لیا تھا کہ جب مجھے موقع ملے گا تو
میں یہ پتھر تجھے مار کر اپنا بدلہ لے لوں گا۔"

حیدر صاحب کی زبان سے حسبِ حال کہانی سن کر وزیر نند راج بہت خوش ہوا اور اس

نے ان سے کہا:

"یہ جنگ ڈوڈ بالاپور کے ماتحت قلعہ دیون ہلی کی ہے جس کے لیے ہم نے اس قدر تیاری کی ہے۔ ڈوڈ بالاپور کا حاکم وہی ظالم عباس قلی خاں ہے جس نے اپنی کمینی خصلت سے مجبور ہو کر شہباز اور حیدر علی کو نقاروں میں بند کر کے ان کی جان لینے کی کوشش کی تھی اور اگر تم اٹھارہ ہزار کی رقم شہباز خاں کو نہ پہنچاتے تو آج یہ دونوں ہونہار زندہ نہ ہوتے۔ بس تم یہ سمجھو کہ کہانی کا ظالم شہر کوتوال بالاپور کا حاکم عباس قلی خاں ہے اور وہ مظلوم بوڑھا تمہارے دونوں بھائی شہباز اور حیدر علی ہیں جنہیں عباس قلی خاں نے نقاروں میں بند کر کے مارنے کی کوشش کی تھی۔ اب اگرچہ عباس قلی خاں اس وقت بھی طاقت ور ہے لیکن بھگوان نے تم تینوں کو ایک موقع دیا ہے کہ تم اپنے پرانے دشمن سے بھرپور بدلہ لو اور دیون ہلی پر قبضہ کر کے اس کی طاقت کو زبردست نقصان پہنچاؤ۔"

حیدر صاحب۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم بھائیوں نے دیون ہلی پر قبضہ کر لیا اور عباس قلی خاں نے قلعہ واپس لینے کے لیے جنگ کی تو سرنگاپٹم کی حکومت تمہیں ایک عظیم لشکر مہیا کرے گی جس کے تمام اخراجات ریاستی خزانہ سے ادا کیے جائیں گے۔"

حیدر صاحب پہلے خوش تھے۔ اب تو ان کی اور بھی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے فخریہ انداز میں جوش سے کہا:

"مہاراج۔ اگر خدا کی مرضی شاملِ حال رہی تو ہم دیون ہلی کے قلعہ پر ضرور قبضہ کر کے اسے ریاست سرنگاپٹم میں شامل کریں گے۔"

نندراج نے فوراً جواب دیا:

"اگر سرنگاپٹم کا جھنڈا دیون ہلی کے قلعہ پر تم نے لہرا دیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس قلعہ کے قلعدار تم ہی ہو گے۔"

یہاں پر لفظ مہاراج کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

ہندی زبان میں وہ راجہ جس کے ماتحت بہت سے راجہ ہوتے ہیں وہ مہاراجہ کہلاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اردو میں شہنشاہ ہوتا ہے جس کا مطلب کئی بادشاہوں کا بادشاہ ہوتا ہے مگر اسی ہندی زبان میں ایک لفظ مہاراج ہے جو مہاراجہ ہی سے نکلا ہے۔ مہاراجہ راجاؤں کا راجہ ہوتا ہے لیکن مہاراج اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے پاس ریاست یا سلطنت نہ ہو مگر وہ صاحبِ حیثیت ہو

اور لوگ اس کی عزت کرتے ہوں۔

نندراج اور دیوراج اگرچہ راجہ یا مہاراجہ نہ تھے لیکن صاحبِ حیثیت اور قابلِ احترام ہستیاں تھیں اس لیے انہیں مہاراج کہا جاتا تھا۔

حیدر صاحب نے واپس جا کر شہباز، حیدر علی اور ان کی والدہ مجیدہ بیگم کو جب یہ بتایا کہ مہاراج نندراج۔ دراصل قلعہ دیون ہلی پر حملہ کر کے شہباز اور حیدر علی کے ساتھ کیے گئے ظلم کا بدلہ لینا چاہتے ہیں تو ان لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

مجیدہ بیگم نے بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

"اللہ تعالیٰ نے اگرچہ عفو و درگزر کا بڑا ثواب رکھا ہے مگر اس نے بدلہ لینے کی بھی اجازت دی ہے۔ پھر عباس قلی خاں جیسے ظالم سے بدلہ لینا بھی تو ایک کارِ ثواب ہے اس لیے تم اس ظالم کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتنا اور پورا پورا انتقام لینا۔"

عباس قلی خاں ان دنوں ڈوڈ بالاپور میں تھا۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ سرنگاپٹم کی ریاست جو صرف ۳۲ گاؤں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی وہ اپنی حدود سے نکل کر دیون ہلی کے قلعہ پر حملہ کر سکتی ہے کیونکہ دیون ہلی نہ صرف یہ کہ عباس قلی خاں حاکم بالاپور کے ماتحت تھا بلکہ عباس قلی خاں کا حلیف (ایک بیان کے مطابق باپ) نواب طاہر محمد خاں صوبیدار سرا تھا۔

ناظرین کو یاد ہو گا کہ شہباز اور حیدر علی کے والد شیخ فتح محمد 'سرا کے سابق صوبیدار عابد خاں کے منصب دار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد صوبیدار عابد خاں کا بیٹا عبدالرسول خاں ہوا لیکن نواب طاہر محمد خاں بھی سرا کی صوبیداری کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ظاہر ہے کہ فتح محمد نے عبدالرسول خاں کا ساتھ دیا۔

سرا کے قریب ایک میدان میں عبدالرسول خاں جس کی حمایت پر فتح محمد تھے اور نواب طاہر محمد خاں جس کی حمایت پر عباس قلی خاں تھا، دونوں لشکروں میں شدید جنگ ہوئی۔ عبدالرسول خاں نے شکست کھائی اور شیخ فتح محمد اس جنگ میں کام آئے۔

اس وقت فتح محمد کی بیوہ مجیدہ بیگم اور بچے (شہباز اور حیدر علی) بالاپور میں تھے جس کا حاکم عباس قلی خاں تھا۔

بہرحال سرنگاپٹم کا وزیر نندراج اپنی مختصر مگر مضبوط فوج لے کر دیون ہلی کے قلعہ کی طرف بڑھا۔ فوج کی سرداری حیدر صاحب کلاں کے حوالے تھی۔ شہباز اور حیدر علی اس کے نائب تھے۔ ظاہر ہے کہ سردارِ فوج اور اس کے دونوں نائب ریاستی فوج کے ملازم ہونے کے علاوہ جوشِ انتقام سے بھی بھرے ہوئے تھے۔ ان کا دشمن عباس قلی خاں تھا جو اس قلعہ کا بھی مالک تھا۔ پس حیدر صاحب نے قلعہ کے سامنے پہنچتے ہی عام حملہ کا حکم دیدیا۔

قلعہ میں کافی فوج اور کئی ماہ کا سامانِ رسد تھا۔ قلعہ والوں کو جب معلوم ہوا کہ حملہ آور سرنگاپٹم کا وزیر نندراج ہے تو حاکمِ قلعہ نے اسے کوئی اہمیت نہ دی اور قلعہ کے باہر صف بندی کر کے مقابلہ کرنے پر تیار ہوا۔

سرنگاپٹم کی فوج جو بعد دوپہر قلعہ کے سامنے پہنچی تھی وہ حیدر صاحب سپہ سالار کا حکم پاتے ہی دیون ہلی کے لشکر پر ٹوٹ پڑی جو صف در صف قلعہ کے سامنے دیوار بنی کھڑی تھی۔

سرنگاپٹم کی فوج کا حملہ بڑا شدید تھا۔ میمنہ پر شہباز اور میسرہ پر حیدر علی تھا۔ وسطِ لشکر میں خود حیدر صاحب کلاں فوج کی قیادت کر رہے تھے۔

نندراج ایک اونچی جگہ کھڑا ہوا لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سرنگاپٹم کا دایاں اور بایاں بازو اس شدت سے حملہ آور ہوا کہ دیون ہلی کا لشکر پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔

اس طرح شہباز اور حیدر علی دشمن کو دباتے ہوئے قلعہ کے بہت قریب پہنچ گئے مگر قلبِ فوج جہاں حیدر صاحب موجود تھا وہ اتنی تیزی سے آگے نہ بڑھ سکا، اس لیے کہ دشمن کے قلب میں قلعدار کے علاوہ اس کے بہترین سردار اسے گھیرے ہوئے جنگ کر رہے تھے۔

حیدر صاحب نے بڑھ بڑھ کے کئی بار حملے کیے مگر اس طرف سے اتنی زبردست مدافعت ہوئی کہ قلبِ لشکر میمنہ اور میسرہ کا ساتھ نہ دے سکا اور تھوڑی دیر آگے جا کر اسے رک جانا پڑا۔

حیدر علی اور شہباز نے قلبِ فوج کی یہ کیفیت دیکھی تو حیدر علی نے فوراً شہباز کو پیغام بھیجا کہ قلبِ فوج کمزور پڑ رہا ہے اس لیے آگے بڑھنے کے بجائے دایاں اور بایاں بازو باہم مل کر دشمن کی آدھی فوج کو گھیرے میں لے کر حملہ کریں۔

حیدر علی کی یہ چال کامیاب ہوئی۔ شہباز نے بجائے آگے بڑھنے کے اپنی فوج کو بائیں جانب گھومنے کا حکم دیا۔

یہی کام حیدر علی نے کیا اور وہ اپنے لشکر کے ساتھ دائیں جانب مڑ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد

سرنگاپٹم کا دایاں اور بایاں بازو مل گئے۔ دشمن کا قلب ان کے گھیرے میں آ گیا اور دشمن گھبرا اٹھا۔

دیون ہلی کے قلعدار نے گھیرا توڑنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس وقت قلعدار نے رکابوں پر کھڑے ہو کر قلعہ کی طرف تلوار سے اشارہ کیا۔ جس کے جواب میں قلعہ کا دروازہ پورا کھل گیا اور وہاں سے تازہ دم سوار نکلنا شروع ہوئے۔ ان کا رخ قلبِ فوج کی طرف تھا جو سرنگاپٹم کی فوج کے گھیرے میں تھا اور راستہ بنا کے بھاگنے کی فکر میں تھا۔

قلعہ دیون ہلی سے پانچ سو سوار نکل کے میدان میں پہنچے تو ان کے پسپا ہوتے ہوئے لشکر کو کچھ سہارا ملا۔

تازہ دم سواروں نے سرنگاپٹم کی گھیرنے والی فوج پر زبردست حملہ کیا اور آخر انھوں نے حملہ آوروں کے درمیان راستہ بنا لیا اور اپنے قلبِ فوج تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور ہر طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن پانچ سو لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر قلعہ میں پسپا ہو گیا اور رات ہو جانے کی وجہ سے جنگ رک گئی۔



رات ہو جانے کی وجہ سے دیون ہلی کے محاذ پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ میسور کی فوج نے کوشش کی تھی کہ جنگ کا فیصلہ اسی دن ہو جائے مگر قلعدار دیون ہلی اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بقیہ فوج کو بچا کر قلعہ میں واپس پہنچ گیا۔

میسور کی فوج کو بھی واپسی کا حکم دیا گیا اور شہباز، حیدر علی اور حیدر صاحب کلاں خیموں میں واپس آ گئے۔

میسور کا وزیر نند راج بہت خوش تھا۔ اس کے تینوں مسلمان سرداروں نے میدانِ جنگ میں اپنے آپ کو اہل ثابت کیا تھا۔ دشمن پانچ سو لاشیں چھوڑ کے پسپا ہوا تھا۔ اگر رات نہ ہو جاتی تو میسوری فوجیں آج ہی قلعہ پر قبضہ کر لیتیں۔

نند راج اپنے خیمے میں پہلے ہی واپس آ گیا تھا۔ اس نے آتے ہی آج کے ہیروز یعنی حیدر صاحب کلاں، شہباز اور حیدر علی کو شاباشی اور کسی حد تک کامیابی کی مبارک باد دینے کو طلب کیا۔

نند راج کا ہرکارہ حیدر صاحب کے خیمہ پر پہنچا۔ اسے بتایا گیا کہ حیدر صاحب ابھی میدانِ جنگ سے واپس نہیں آئے۔ پھر وہ شہباز اور حیدر علی کے خیمے پر گیا۔ وہ دونوں بھائی ایک ہی خیمے میں مقیم تھے۔ وہاں سے بھی ہرکارے کو یہی جواب ملا کہ دونوں بھائی ابھی میدانِ جنگ سے واپس نہیں آئے۔

ہرکارے نے واپس جا کر نند راج کو بتایا: "مہاراج۔ ابھی تک تینوں سردار اپنے خیموں پر

واپس نہیں پہنچے۔"

"ارے۔ یہ کیسے ممکن ہے!"

نند راج گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

وہ ہرکارے کو ساتھ لے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا حیدر صاحب کے خیمے پہ پہنچا۔ خیمہ اب بھی خالی تھا۔

نند راج کو وسوسوں نے گھیرنا شروع کر دیا۔

کیا ہوا ان تینوں کو؟

کہاں گئے یہ لوگ؟

"کہیں . . . . . کہیں وہ . . . . . "

مگر نند راج نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ تینوں بہادر اور شجاع ہیں۔ انہیں کوئی نہیں مار سکتا۔ میں نے انہیں اندھیرا ہونے تک لڑتے دیکھا ہے۔

نند راج نے وسوسوں اور برے برے خیالوں سے جتنا ذہن کو صاف کرنا چاہا اتنے ہی خیالات اسے گھیر رہے تھے۔

اس نے تنگ آ کر اپنے خیمے کی طرف قدم اٹھائے کہ معاً اس کی نظر ایک طرف اٹھی۔ کیا دیکھتا ہے کہ خیموں میں جلنے والے چراغوں کی مدھم روشنی میں دس بارہ آدمی کسی کو ایک لمبے بڑے پر ڈالے آ رہے ہیں۔

نند راج کے قدم ادھر کو گھوم گئے اور وہ دو ہی منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔

شہباز اور حیدر علی کی نظر نند راج پر پڑی تو وہ رک گئے۔

"کیا ہوا۔ کون ہے یہ؟" نند راج نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"حیدر بھائی ہیں"۔ شہباز نے جواب میں کہا:

"بہت زیادہ زخمی ہیں"۔

"چلو چلو۔ میرے خیمے میں لے چلو"۔ نند راج آگے آگے چلنے لگا۔

نند راج کے خیمے میں حیدر صاحب کو نرم گدے پر لٹا دیا گیا۔ وہ بے ہوش تھے۔ ان کے کئی زخم آئے تھے۔ خاص کر پہلو کا زخم گہرا تھا جس سے پٹی خون میں بھیگ گئی تھی اور خون پٹی کے اوپر سے رس رہا تھا۔

سوائے چھ سات آدمیوں کے باقی لوگوں کو خیمہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ اس وقت خیمے میں شہباز، حیدر علی اور نندراج کے علاوہ دو اور نائب سردار تھے۔ ان کے علاوہ ایک جراح اور اس کا معاون تھا۔

سب لوگ خاموش اور افسردہ تھے۔ نندراج نے سوالیہ نظروں سے جراح کی طرف دیکھا۔ جراح نے اس سے کہا:

"مہاراج۔ خون بہت بہہ گیا ہے۔ میں نے پہلو کے زخم میں دوا بھر کے عارضی پٹی کس دی تھی مگر خون بند نہیں ہوا ہے۔"

"راستے بھر خون ٹپکتا آیا ہے وزیر اعظم"۔ شہباز نے سسکی بھر کر بتایا۔

"فوراً پٹی بدلو"۔ نندراج نے حکم دیا:

"حیدر صاحب سرنگاپٹم کی ناک ہیں۔ ہمیں ان کی سخت ضرورت ہے"۔

جراح نے پہلو کے زخم کی پٹی کھولی۔ زخم سے خون اب بھی جاری تھا۔ نندراج نے جھک کے زخم کو دیکھا۔

جراح نے بتایا:

"خنجر دل تک پہنچ گیا ہے مہاراج۔ بھگوان ...."

"کچھ مت کہو"۔ نندراج جذباتی ہو گیا:

"حیدر صاحب کی زندگی ہر حالت میں بچنا چاہیے"۔

جراح نے زخم میں دواؤں کا بنایا ہوا ملیدہ بھرا۔ اس وقت حیدر صاحب کے جسم کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور وہ کراہے۔

"کیسے ہو حیدر؟" نندراج نے اپنا کان حیدر صاحب کے منہ سے لگا دیا۔

شہباز اور حیدر علی کے چہروں پر ہلکی سی بشاشت پیدا ہوئی مگر حیدر صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ نندراج سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سب کے چہرے پھر پھیکے پڑ گئے۔

اچانک حیدر صاحب نے سنبھالا لیا اور آنکھیں کھول دیں۔ سب چہرے پھر دمک اٹھے۔ نندراج نے جھک کر کہا:

"حیدر۔ اس جنگ کا سہرا تمہارے سر ہے"۔

حیدر صاحب نے شاید اپنی ساری طاقت جمع کی۔ ان کے چہرے کی تمام رگیں کھنچ گئیں۔ آنکھیں

باہر کو نکل آئیں اور وہ اٹک اٹک کر بولے:

"مہاراج ..... حیدر ..... میسور ..... پہ قربان ..... ہو گیا ..... شہباز ..... حیدر کا ..... خیال ..... رکھیے ....."

پھر اس کی زبان لڑکھڑائی اور سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

شہباز اور حیدر علی "حیدر بھائی" کہہ کر ان پر جھک گئے اور نندراج کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔

حیدر صاحب کلاں، شہباز اور حیدر علی کے محسن اور مربی تھے بلکہ وہ ایک مشفق باپ کے فرائض بھی ادا کر رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کی سپاہیانہ تربیت انہی کی رہین منت تھی۔

شہباز اور حیدر علی آج جس مقام پر تھے، اس میں حیدر صاحب کلاں کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔

حیدر صاحب ریاست میسور کے لیے بے انتہا مفید تھے۔

وہ نندراج اور دیوراج کے وفادار اور ایک لائق فوجی سردار تھے اسی لیے نندراج نے انہیں دیون ہلی کے معرکہ کے لیے سالار مقرر کیا تھا اور اسی لیے نندراج، شہباز اور حیدر علی کے غم میں برابر کا شریک تھا۔

حیدر صاحب کی لاش ان کے خیمے میں پہنچا دی گئی۔

مگر ـــــ

نندراج نے ان کی موت کو راز میں رکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ سوائے چند مسلمانوں کے اور کسی کو حیدر صاحب کی موت کی خبر نہ ہو سکی۔

طے یہ ہوا کہ حیدر صاحب کو خیمہ کے مغربی جانب صبح ہونے سے پہلے دفن کر دیا جائے۔

نندراج نے دوسرا حکم یہ دیا کہ کل فوج کی سرداری شہباز کرے گا۔

ابھی رات زیادہ نہ گزری تھی کہ قلعہ دیون ہلی کی طرف سے کچھ لوگ آتے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی شمعیں تھیں اور اس روشنی میں وہ سفید پرچم لہراتے ہوئے سرنگاپٹم کی فوج کی خیمہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے مگر ان کی رفتار بہت سست تھی۔

ایک لشکری نے دوڑ کر نندراج کو اطلاع دی:

"مہاراج۔ قلعہ سے شمع بردار وفد آرہا ہے۔"

نندراج نے جلدی سے پوچھا:

"کہیں دشمن شب خون مارنے تو نہیں آرہا۔"

لشکری نے اطمینان سے جواب دیا:

"نہیں مہاراج۔ ان کے پاس سفید جھنڈا ہے۔ وہ جھنڈا لہراتے آرہے ہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

نندراج کو اطمینان ہوا۔

اچانک نندراج کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ لشکری کو ساتھ لیے سیدھا حیدر صاحب کے خیمے پر پہنچا۔ شہباز اور حیدر علی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

نندراج نے انہیں اطمینان دلایا:

"ہاں۔ تم لوگوں سے ایک درخواست ہے۔"

"آپ حکم دیجیے۔" شہباز نے کہا۔

نندراج نے بتایا:

"قلعہ سے بات چیت کے لیے وفد آرہا ہے۔ اسے یہ معلوم نہ ہونا چاہیے کہ ہمارا سردارِ فوج آج کی لڑائی میں کام آیا ہے۔"

شہباز اور حیدر علی نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حیدر صاحب کی موت کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے۔

"اگر وفد نے ہمارے سالارِ لشکر سے ملنے کی خواہش کی تو کیا ہوگا مہاراج؟" شہباز کو آخر سوال کرنا ہی پڑا۔

"وہ میں سنبھال لوں گا۔" نندراج جلدی سے بولا:

"تمہیں صرف ایک کام کرنا ہے۔"

"فرمائیے مہاراج۔ کیا کرنا ہے ہمیں؟" شہباز نے پوچھا۔

نندراج نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا:

"کسی طرح حیدر صاحب کو ٹیک لگا کر اس طرح بٹھادو کہ خیمہ کے سامنے سے گزرنے والا

اندر نظر ڈالے تو اسے حیدر صاحب بیٹھے نظر آئیں۔"

شہباز اور حیدر علی اور زیادہ حیران ہوئے۔

"کیا سوچ رہے ہو تم دونوں؟"

نندراج کا لہجہ سخت ہوگیا:

"ہاں یا نہ میں جواب دو۔"

"جی ہاں وزیرِ اعظم۔" شہباز نے جلدی سے جواب دیا۔

"شاباش۔ جلدی کرو۔" یہ کہہ کر نندراج، ہرکارے کو ساتھ لیے واپس ہوا۔

"اب مجھے آنے والے وفد کی جانب جانا ہے۔" نندراج نے راستے میں رک کر ہرکارے سے مخاطب ہوکر کہا:

"محافظوں سے جاکر کہو کہ آنے والوں کو سیدھا میرے پاس لے آئیں۔"

"جی مہاراج۔" ہرکارہ جواب دے کر پلٹا۔

"اور سُن!" نندراج نے اسے روکتے ہوئے کہا:

"وفد کو حیدر صاحب کے خیمے کے سامنے سے گزارنا مگر ذرا دُور سے۔ سمجھ گیا نا؟"

"جی مہاراج۔" ہرکارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی مہاراج کا بچہ۔" نندراج کو غصہ آگیا:

"ہر بات میں جی مہاراج۔ کچھ اور نہیں بول سکتا۔"

ہرکارے نے سنبھل کے جواب دیا:

"میں آنے والوں کو حیدر صاحب کے خیمے کے سامنے سے گزاروں گا مگر ذرا دُور سے۔"

"اچھا بس۔ جا، جلدی جا۔"

نندراج اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔

شمع بردار وفد محافظوں کے قریب پہنچنے والا تھا۔ ہرکارے نے محافظوں کے پاس پہنچ کے بتایا کہ مہاراج نندراج نے حکم دیا ہے کہ آنے والوں کو ان کے خیمے پر لایا جائے۔

"ٹھیک ہے۔" محافظ نے جواب دیا:

"تم وفد کو لے جانا اپنے ساتھ۔"

چند لمحوں بعد شمع بردار وفد محافظوں کے پاس پہنچ گیا۔ محافظوں نے تلواریں کھینچ لیں اور

راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

وفد چار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک بولا:

"ہم جنگ کے لیے نہیں آئے بلکہ اپنے قلعدار کا پیغام سرنگا پٹم کے سالارِ لشکر حیدر صاحب کے لیے لائے ہیں۔"

محافظوں کے سردار نے ہرکارے سے کہا:

"انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

ہرکارہ آگے آگے اور شمع بردار وفد اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وزیر نندراج کے حکم کے مطابق ہرکارہ، وفد کو لے کر حیدر صاحب کے خیمہ کی طرف چلا مگر وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ پتہ نہیں شہباز اور حیدر علی نے حیدر صاحب کی لاش کو اٹھا کے بٹھایا بھی ہے یا نہیں مگر جب یہ لوگ حیدر صاحب کے خیمے کے سامنے سے گزرے تو اندر بہت تیز روشنی ہو رہی تھی۔ خیمے میں سامنے کی طرف حیدر صاحب بڑی شان سے بیٹھے تھے اور دائیں بائیں شہباز اور حیدر علی بڑے ادب کے ساتھ بیٹھے تھے۔

خیمے میں تیز روشنی کے سبب وفد کے آدمیوں کی نظریں بھی خیمے کے اندر تک پہنچ گئیں۔

ان میں سے ایک نے پوچھا:

"اس خیمے میں اتنی زیادہ روشنی کیوں ہے؟"

چالاک ہرکارے نے جواب دیا:

"زیادہ روشنی اس لیے ہے کہ یہ سالارِ لشکر حیدر صاحب کلاں کا خیمہ ہے۔"

ارکانِ وفد نے قدم روک لیے۔

"ہمیں حیدر صاحب ہی سے ملنا ہے۔" ایک نے کہا۔

"ان سے آپ بعد میں ملیے گا۔"

ہرکارے کا دماغ خوب کام کر رہا تھا:

"ہمارے وزیر اعظم لشکر کے ساتھ ہیں۔ پہلے آپ لوگ ان سے ملیں۔ اگر انھوں نے اجازت دی تو آپ کو حیدر صاحب کلاں سے بھی ملا دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے مگر کیا وزیر اعظم نندراج اور دیوراج خود اس لشکر کے ساتھ آئے ہیں؟" وفد کے ایک رکن نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

"صرف وزیر اعظم نندراج تشریف لائے ہیں۔" ہرکارے نے جواب دیا۔

نندراج، وفد کا انتظار کر رہا تھا۔ اطلاع ملتے ہی اس نے وفد کو اندر بلا لیا۔ وفد کے ارکان نے نندراج کو ادب سے سلام کیا۔

"کس لیے آئے ہو تم لوگ؟" نندراج بڑی رعونت سے کہا۔

"ہم قلعدار کا پیغام سالارِ فوج کے لیے لائے ہیں وزیر اعظم"۔ ایک رکن نے کہا۔

"ہم خود سپہ سالار ہیں۔ حیدر ہمارا ماتحت ہے۔ جو کہنا ہے ہم سے کہو۔" نندراج نے اور زیادہ رعونت کا اظہار کیا۔

"مہاراج وزیر اعظم ـــ ہمارے قلعدار نے تو۔ ۔ ۔ ۔" وفد کے ایک رکن نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ نندراج نے اسے ڈانٹ دیا:

"خاموش ہو جاؤ۔" نندراج نے تند لہجے میں کہا؛

پھر پلٹ کر اس نے اپنے ہرکارے کو حکم دیا:

"انہیں بحفاظت ہماری خیمہ گاہ سے باہر پہنچا دو۔"

وفد کی جان نکل گئی۔ وہ گڑگڑانے لگا۔ وفد کے ایک دوسرے رکن نے جلدی سے کہا:

"معاف کیجیے مہاراج۔ میرے ساتھی سے غلطی ہو گئی۔ یہ شکر کیا آپ تو میسور کے مالک ہیں۔ ہمیں عرض کرنے کی اجازت دیجیے"۔

"اجازت ہے۔" نندراج غرور سے اکڑ گیا۔

رکن نے کہنا شروع کیا:

"مہاراج۔ ہمارے قلعدار، قلعہ آپ کے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں بشرطیکہ ان کی چند معمولی شرطیں قبول فرمائی جائیں۔"

"شرطیں بیان کی جائیں۔"

"پہلی شرط یہ ہے کہ قلعہ کے تمام لوگوں کی جان بخشی فرمائی جائے۔ کسی کو قتل نہ کیا جائے۔" وفد نے شرطیں بتانا شروع کیں۔

"دوسری طرف بیان کی جائے"۔

"جو قلعہ سے نکل کے جانا چاہے اسے نہ روکا جائے"۔

یہ دوسری شرط تھی!

"تیسری شرط بیان ہو۔"

"جو اپنا سامان ساتھ لے جانا چاہے اسے نہ روکا جائے۔"

"اور ــــ"

"اور کوئی شرط نہیں مہاراج۔" وفد نے اعلان کیا۔

نندراج نے بڑی تمکنت سے فیصلہ دیا:

"تمام شرطیں منظور کی جاتی ہیں ـــ مگر ہر شخص اپنا اسی قدر سامان لے جا سکتا ہے جتنا وہ خود اٹھا سکتا ہو۔ باقی سامان یہیں چھوڑنا ہوگا۔

قلعہ صبح ہونے سے پہلے خالی کر دیا جائے اور قلعہ کی چابیاں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہمیں پہنچ جانی چاہییں۔

جو لوگ قلعہ میں ٹھہرنا چاہیں، وہ ہماری رعیت ہوں گے اور ان کی جان و مال کے ہم ذمہ دار ہوں گے۔"

قلعہ والوں کی تمام شرائط تسلیم کر لی گئی تھیں۔ رات ہی میں قلعہ خالی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ نندراج نے اپنے سوار قلعہ کے تمام دروازوں پر مقرر کر دیے تھے تاکہ کسی شرط کی خلاف ورزی نہ ہو۔

شہباز اور حیدر علی، حیدر صاحب کلاں کو دفن کرنے کے بعد اپنے دستوں کے ساتھ قلعہ کے پہرے پر پہنچ گئے۔ ان کا پہرہ دروازوں سے دُور پر تھا۔

صبح ہونے سے پہلے ہی قلعہ کی چابیاں نندراج کو پہنچا دی گئیں۔

دھوپ پھیلتے ہی سرنگاپٹم کی فوج فاتح کی حیثیت سے دیون ہلی کے قلعہ میں داخل ہوئی۔ قلعہ میں مستقل رہائش پذیر لوگوں نے قلعہ نہیں چھوڑا تھا۔ یہ لوگ یا تو تجارت پیشہ تھے یا پھر کاشت کار۔ قلعہ کے باہر دور دور تک زرخیز زمین پر کاشت کاری ہوتی تھی۔

ان لوگوں نے فاتح فوج اور میسور کے وزیر نندراج کا شاندار استقبال کیا۔ اسے ہار پہنائے اور پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔

نندراج کو سرنگاپٹم واپسی کی بہت جلدی تھی کیونکہ اس زمانہ کی ریاستیں کاغذی ناؤ ہوتی تھیں۔ کوئی بھی طاقتور حملہ کر کے ان پر قبضہ کر سکتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے نندراج نے دیون ہلی پر قبضہ

کیا تھا۔

واپسی سے پہلے نندراج نے ایک مختصر سی تقریب منعقد کی جس میں فوجی سالاروں کے علاوہ قلعہ کے کچھ معززین کو بھی مدعو کیا گیا۔

اس تقریب میں نندراج نے حیدر علی کے بڑے بھائی شہباز کو دیون ہلی کا قلعہ دار مقرر کیا۔ سب نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ خاص کر حیدر علی کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ اس کی بوڑھی ماں کی یہی خواہش تھی کہ اس کے دونوں بیٹے سپہ گری میں نام پیدا کریں۔

نندراج نے دیون ہلی سے واپسی سے پہلے ہی چار تیز رفتار سواروں کے ذریعے دیوراج، مہاراجہ اور مہارانی نندی کو جنگ جیتنے اور قلعہ پر قبضہ کی اطلاع بھجوا دی تھی۔ اس خبر سے سرنگاپٹم والوں کو جس قدر خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ میسور کی یہ ریاست جو صرف ۳۳ گاؤں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اس پر تو آئے دن حملے ہوا کرتے تھے۔ اس میں کسی پر حملہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر دیون ہلی پر حیدر صاحب مرحوم اور دونوں بھائیوں شہباز اور حیدر علی نے تلوار کے ایسے جوہر دکھائے تھے جس نے قلعہ والوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

قلعہ پر قبضہ ہونے میں نندراج کی عقلمندی کا بھی دخل تھا۔ کسی جنگ میں سالارِ فوج کا مارا جانا فوج کے حوصلے پست کر دیا کرتا ہے اور دشمن کا لشکر حوصلہ مند ہو جاتا ہے۔ نندراج نے بڑی عقلمندی سے حیدر صاحب کلاں کی لاش کو زندہ ظاہر کرنے کی جو حکمتِ عملی اپنائی تھی اس نے سالارِ فوج کی موت کو عام نہ ہونے دیا، جس سے ایک طرف تو نندراج کی فوج کے حوصلوں پر کوئی منفی اثر نہ پڑا اور دوسرے دیون ہلی والوں کو حقیقت کا پتہ ہی نہ لگ سکا ورنہ ممکن تھا کہ دوسرے دن بھی شدید جنگ ہوتی اور کس کے حق میں فیصلہ ہوتا اس کا پہلے سے اندازہ نہ کیا جا سکتا تھا۔

حیدر صاحب میدانِ جنگ میں زخمی نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ واقعہ میدانِ جنگ سے واپسی پر پیش آیا تھا۔

میدان میں اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے جنگ رک گئی تھی اور دونوں طرف کے لشکری اپنی اپنی فرودگاہ کی طرف واپس ہو رہے تھے۔ حیدر صاحب کلاں، شہباز اور حیدر علی کے ساتھ واپس آ رہے تھے کہ اندھیرے میں حیدر صاحب کسی چیز سے ٹکرا گئے۔

انہوں نے جھک کر ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی زخمی ہے جو اس وقت تک زندہ تھا۔ حیدر صاحب کو خیال آیا کہ شاید وہ انہی کا کوئی لشکری ہے اس لیے انہوں نے اپنی تلوار شہباز کو پکڑا دی اور اس

زخمی کو اٹھانے کی کوشش کی۔

حیدر صاحب نے زخمی کو اٹھا کر اپنے سہارے بٹھایا پھر حیدر علی سے کہا کہ وہ اس کی ٹانگیں پکڑے تاکہ دونوں مل کے اسے خیمہ گاہ تک لے جا سکیں۔

مگر ــــ

ٹھیک اسی وقت وہ واقعہ پیش آیا جس نے حیدر صاحب کی جان لے لی۔

وہ زخمی جسے حیدر صاحب نے سہارا دے کر بٹھایا تھا دراصل قلعہ کی فوج سے تعلق رکھتا تھا جو قلعہ کی طرف بھاگنے کے بجائے دوسری طرف نکل آیا تھا۔ اس نے جب کئی آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو مردہ بن کر لیٹ گیا۔

بے شک وہ کچھ زخمی تھا مگر اس کے ہوش و حواس درست تھے اور جسم میں طاقت تھی۔ پھر جب حیدر صاحب نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا اور کسی سے اس کی ٹانگیں پکڑنے کو کہا تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے سوچا کہ اس طرح تو وہ پکڑا جائے گا۔ اس لیے اس نے بیٹھے بیٹھے ہی تیزی سے کمر سے خنجر کھینچا اور حیدر صاحب کے پہلو میں اتار دیا اور اٹھ کے بھاگ پڑا۔

حیدر صاحب صرف اتنا ہی کہہ سکے:

"حیدر علی۔ یہ بچ کے نہ جانے پائے"۔

حیدر علی نے حیدر صاحب کلاں کی زبان سے اتنا سنا تو پورا واقعہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ شہباز کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں، وہ تو پیچھا نہ کر سکا مگر حیدر علی چھریرے بدن کا چھ فیٹ سے اونچا جوان تھا۔ اس نے پانچ قدم سے زیادہ حملہ آور کو بھاگنے نہ دیا اور اس کی گردن دبوچ لی۔

حیدر علی کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر دوسرا اس کے اس ہاتھ پر تھا جس میں خنجر دبا تھا لیکن اس کی گردن پر حیدر علی کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ چند ہی لمحوں بعد حملہ آور کی سانس رک گئی اور جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

حیدر علی نے اسے ٹٹول کر دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔

حیدر علی اسے گھسیٹتا ہوا اس جگہ لے آیا جہاں حیدر صاحب زمین پر پڑے تھے اور شہباز گھبرایا ہوا ان کی سانس تلاش کر رہا تھا۔

یہ وقت بہت نازک تھا اور ایک ایک لمحہ قیمتی، اس لیے حیدر علی نے حملہ آور کی لاش کو تو وہیں چھوڑا اور حیدر صاحب کلاں کو پشت پر لاد کر خیمہ میں لے آیا ــــ مگر دل پر خنجر لگنے اور زیادہ خون

بہ جانے کی وجہ سے حیدر صاحب جانبر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

دیون ہلی کے قلعہ پر قبضہ کا جشن سرنگاپٹم میں پورے ایک ہفتے تک منایا جاتا رہا۔ وزیر نندراج کا وقار دوبالا ہو گیا۔ مہاراجہ کرشن اوڈیرا اور مہارانی نندی کے دماغ میں وزیر برادران سے چھٹکارا حاصل کرنے کا جو خیال پیدا ہو رہا تھا وہ چکنا چور ہو کر رہ گیا۔ یہ خبر جب مرہٹوں، نواب ارکاٹ اور نظام تک پہنچی تو ان کے کان بھی کھڑے ہوئے۔

دیون ہلی کے قلعہ کی فتح نے ریاست میسور کے لیے مزید فتوحات کا راستہ کھول دیا اور ۳۲ گاؤں پر مشتمل یہ چھوٹی سی ریاست انتیس ہزار پانچ سو (۲۹۵۰۰) مربع میل کی ایک عظیم الشان ریاست میں تبدیل ہو گئی۔

مگر ان تفصیلات اور فتوحات میں جانے سے پہلے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میسور کے راجہ کرشن اوڈیرہ کے خاندان کی اس رومان انگیز داستان کا کچھ تذکرہ کیا جائے جو اس ریاست کی بنیاد اور اساس بنی۔

محبت کی یہ دلچسپ داستان کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

قدیم تاریخ بتاتی ہے کہ شمالی ہند کے صوبہ یوپی کے شہر دوارکا میں دو بھائی رہتے تھے جن کے نام وجیا رایا اور کرشن رایا تھے۔ دوارکا شہر ہندوؤں کا ایک مذہبی مقام ہے۔ دوارکا اور ہردوار وغیرہ ہندوؤں کی نظر میں اسی طرح مقدس ہیں جس طرح مسلمانوں کے لیے اجمیر شریف اور کلیر شریف متبرک ہیں۔

وجے رائے اور کرشن رائے (وجیا رایا اور کرشن رایا) پر خدا معلوم کیا افتاد پڑی کہ دونوں بھائیوں کو اپنا شہر دوارکا ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا۔ ان بھائیوں کا ہندوؤں کی مشہور ذات "ٹھاکر" سے تعلق تھا۔

ہندو مذہب میں چار ذاتیں مشہور ہیں:

۱۔ برہمن
۲۔ ٹھاکر
۳۔ ویش

۴۔ شودر

برہمنوں کے ذمے مذہبی کاموں کی ذمے داری ہوتی ہے۔

ٹھاکر سپاہیانہ زندگی پسند کرتے ہیں۔

ویش تجارت پیشہ یعنی بنیے ہوتے ہیں۔

باقی رہے شودر تو ان کا شمار کسی میں نہیں ہوتا۔ ہندو مذہب کے فلسفہ کے مطابق شودر صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اوپر کی تینوں ذاتوں یعنی برہمن، ٹھاکر اور ویش کی خدمت کریں۔ چنانچہ زمانۂ قدیم سے آج تک ہندوؤں کی یہی ذاتیں موجود ہیں اور اسی سے ہندو معاشرہ عبارت ہے۔

راجاؤں مہاراجاؤں کے زمانہ میں، مندروں اور تمام مذہبی امور کے مالک برہمن یا پنڈت ہوتے ہیں۔ راج گدی ہمیشہ ٹھاکروں کے حصے میں رہی اور تجارت اور دوسرے مالی امور پر ویش قابض رہے۔ شودر سدا سے نجس اور ملیچھ ہیں۔ ان کی بستیاں الگ ہوتی ہیں۔ مندروں میں یہ داخل نہیں ہو سکتے۔ تعلیم حاصل کرنے کی انہیں ممانعت ہے۔ ایک زمانے میں تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی شودر (جسے اچھوت کہا جاتا ہے) تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر انڈیل دیا جاتا۔ فی زمانہ بھارت میں شودروں نے لڑ بھڑ کے کچھ آزادی حاصل کر لی ہے مگر ہندو معاشرہ میں اب تک انہیں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکا اور وہ پہلے ہی کی طرح آج بھی اچھوت ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلمان قوم چھوت چھات کی اس لعنت سے پاک ہے کیونکہ اسلام میں خدا کی نظر میں وہی معتبر اور اعلیٰ مقام کا حقدار ہے جو جس قدر زیادہ متقی ہے۔ اسلام میں کوئی درجہ بندی نہیں، سوائے تقویٰ کے۔ مسلمان کا تعلق خواہ کسی علاقہ، ذات یا برادری سے ہو، اس کی شادی کسی بھی خاندان میں ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ ایک مذہبی نکتہ اور الگ بحث ہے۔

وہ چودھویں صدی عیسوی یعنی ۱۳۹۹ء کا زمانہ تھا جب وجے رائے اور کرشن رائے شمالی ہند سے جنوبی ہند پہنچے۔ یہ تو پتہ نہ لگ سکا کہ انہوں نے یہ طول طویل ہزاروں میل کا سفر کتنے برسوں میں طے کیا۔ اس زمانے میں نہ تو آج کی طرح ذرائع آمد و رفت تھے اور نہ سفر محفوظ تھا۔ لوگ پیدل یا گھوڑوں پر سفر کرتے مگر سفر سے پہلے انہیں ہفتوں بلکہ مہینوں ایسے قافلوں کا انتظار کرنا پڑتا جو ان کی منزل مقصود کی طرف جا رہے ہوں۔ اس قافلہ میں کئی کئی سو آدمی ہوتے۔ سالار قافلہ

پیشہ ور سپاہیوں کی خدمات حاصل کرتا۔

اس طرح مسلح پہرے میں قافلہ ایک منزل سے دوسری منزل پر پہنچتا تھا۔ پھر بھی اکثر ڈاکو اور رہزن قافلوں پر حملہ آور ہوتے اور بڑی مشکل سے قافلوں کو بچایا جاتا تھا۔

بہرحال وجے رائے اور کرشن رائے منزلیں مارتے اور تکلیفیں اٹھاتے میسور پہنچ گئے۔ آج کے سرنگاپٹم کے مضافات میں ہڈناڈ اور کارگ ہلی نام کے معمولی سے دیہات ہیں مگر ۱۳۹۹ء میں یہ دیہات اچھی خاصی ریاستیں تھیں۔ ان کی سرحدیں آپس میں ملتی تھیں اس لیے آئے دن ریاستی فوجوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

وجے رائے اور کرشن رائے ٹھاکر ہونے کی وجہ سے سپاہیانہ زندگی پسند کرتے تھے۔ یوں بھی دونوں خوبصورت اور جوانِ رعنا تھے۔ لڑکیوں کی ان پر پڑنے والی نظریں لمحوں کے لیے ان کے چہرے پر رک کے رہ جاتی تھیں۔ راستہ میں کئی بار ایسا ہوا کہ اگر وہ ذرا احتیاط سے کام نہ لیتے تو ان کا یہاں تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا —— مگر دونوں بھائیوں نے طے کر لیا تھا کہ جب تک انہیں کوئی سکون کا ٹھکانہ نہیں مل جاتا اس وقت تک وہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں گے۔

وجے اور کرشن نے دوارکا سے یہاں تک کئی گھوڑوں پر سفر کیا تھا۔ یہ گھوڑے یا تو بھاگتے بھاگتے دم دے دیتے تھے یا چوری ہو جاتے تھے۔ دونوں بھائی بہت تیز گھوڑے بھگاتے اور ان کی یہ دوڑ سورج نکلتے ہی شروع ہو جاتی اور وہ گھوڑے کو اس وقت تک نہ روکتے جب تک رات کے اندھیرے میں انہیں راستہ دکھائی دینا بند نہ ہو جاتا۔ یا پھر گھوڑا ٹھوکر کھانے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے کسی نے ان کے کان میں کہہ دیا ہو کہ شمال سے چلے ہو تو جنوب میں جا کر دم لینا۔ وہ میسور نے نواح میں بھی رکنے کا نام نہ لیتے، اگر ان کو راستے میں ایک واقعہ نہ پیش آ گیا ہوتا۔

جنوبی ہند کا بیشتر علاقہ سطح مرتفع ہے۔ زمین پتھریلی اور ناہموار ہے۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور وہ شام سے پہلے کسی آبادی میں پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کے کئی گھوڑے ویرانے میں رات بسر کرنے سے قزاقوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اس لیے انہوں نے اب آبادیوں میں راتیں گزارنا شروع کر دی تھیں۔

انہوں نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی۔

اسی وقت انہیں سامنے سے چند آدمی تلواروں سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے نظر آئے۔ ان کی رفتار تو تیز تھی ہی، وہ دم کے دم میں وہاں پہنچ گئے۔ انہیں آتا دیکھ کر کھنچی ہوئی تلواریں رک

کے رہ گئیں۔

وجے اور کرشن نے اپنے طور پر جنگ اور اس کی وجہ کا کچھ کچھ اندازہ ضرور کر لیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف ایک کمسن مگر بہت پھرتیلی لڑکی اور اس کا ایک ساتھی ہے جبکہ دوسری طرف پانچ بھاری بھرکم سوار ہیں۔ ایک آدمی زمین پہ گرا ہوا ہے۔

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس کمسن اور خوبرو لڑکی کو پانچ سوار اغوا کرنا چاہتے ہیں اور لڑکی اپنے ساتھی سوار کے ساتھ زبردست مدافعت کر رہی ہے۔

وجے نے فوراً اپنی لمبی تلوار کھینچ لی۔ کرشن نے بھائی کی تقلید کی۔ اب دونوں بھائی شمشیر بکف اپنے گھوڑے بڑھا کر لڑکی کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔

لڑکی کے پریشان چہرے پہ رونق آ گئی اور اس نے بڑے جوش سے مخالف سواروں پر حملہ کر دیا۔

وجے اور کرشن بھی لڑائی میں شریک ہو گئے۔ اب لڑکی، اس کا ساتھی سوار اور یہ دونوں بھائی سب ملا کر چار ایک طرف تھے اور دوسری جانب پانچ مسٹنڈے سوار تھے جن کے رنگ تقریباً سیاہ تھے۔

دوبارہ لڑائی بالکل خاموشی سے شروع ہوئی۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور جنگ شروع ہو گئی۔

اسی وقت نہ معلوم ایک سوار اور کدھر سے آ گیا اور وہ مخالف سواروں کے ساتھ شامل ہو کر لڑنے لگا۔

جنوبی ہند کے لوگ عام طور پر چھوٹی اور خمدار تلواروں کو استعمال کرتے تھے اور شمال میں لمبی اور سیدھی تلواروں کا رواج تھا۔ وجے اور کرشن ایسی ہی تلواروں سے لڑ رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کے لیے یہ قسمت آزمائی کا بہترین موقع تھا۔ انہوں نے لڑکی کے کپڑوں اور ہاتھ میں ہیرے کی کئی انگوٹھیوں سے یہ تو اندازہ کر لیا تھا کہ اس کا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے ہے۔ اب اگر وہ لڑکی کو حملہ آوروں کے چنگل سے چھڑا کر اس کے گھر تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ان کی تقدیر کے بند دروازے کھل سکتے ہیں ورنہ اتنی دور سے آنا بے کار ہو جائے گا۔

وجے اور کرشن نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ پھر دونوں مخالف سواروں پر اس زور سے حملہ آور ہوئے کہ دو مخالف سوار زین سے لٹک گئے۔ ان میں یقیناً گھبراہٹ پیدا ہوئی ہو گی لیکن

وجے اور کرشن نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور دوسرا حملہ کر دیا۔

اس حملہ سے زین سے تو کوئی نہ لٹکا مگر مزید دو سوار شدید زخمی ہوئے۔ انہوں نے فوراً اپنے گھوڑے گھمائے اور سرپٹ بھاگے۔

اب صرف دو باقی رہ گئے تھے جو میدان چھوڑنے کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ادھر وجے اور کرشن مسلسل حملے کر رہے تھے جس سے زخمی ہو کر باقی دونوں بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب میدان بالکل صاف تھا۔

گھبرائی ہوئی لڑکی کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور وہ وجے اور کرشن کے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر کھڑی ہو گئی۔

لڑکی نے وجے سے کچھ کہا مگر وجے اس زبان سے واقف نہ تھا اس لیے سمجھ نہ سکا۔ جنوب کے علاقے میں دکھنی، مرہٹی اور تامل زبانیں بولی جاتی تھیں۔ یہ تینوں زبانیں اس قدر ملی جلی تھیں کہ ایک ہی زبان معلوم ہوتی تھیں۔

وجے اور کرشن شمال کے رہنے والے تھے جہاں بھاشہ اور اڑیسہ کی اوری زبان کثرت سے بولی جاتی تھی۔

وجے رائے نے اندازہ لگایا کہ لڑکی اس کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ پھر لڑکی کے ساتھی نے کچھ ایسے اشارے کیے جس سے وجے اور کرشن کی سمجھ میں یہ آیا کہ یہ لڑکی کسی ریاست کی مہارانی ہے۔ یہ سمجھتے ہی وجے اور کرشن جلدی سے گھوڑوں سے اترے اور اپنی وہ خون آلود تلواریں جو ابھی ابھی انہوں نے نیام میں ڈالی تھیں، مع نیام کے اپنے ہاتھوں پر رکھ کر بڑے ادب سے مہارانی کو پیش کر دیں۔

یہ دونوں بھائیوں کی طرف سے اظہارِ اطاعت تھا۔

اس کے جواب میں مہارانی بھی گھوڑے سے اتر پڑی۔ پہلے اس نے وجے کی تلوار، جو وہ اپنے ہاتھوں پر لیے کھڑا تھا، اٹھائی اور مسکراتے ہوئے وجے کی کمر میں لگا دی۔ یہی عمل اس نے کرشن کے ساتھ دہرایا۔ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وجے اور کرشن جست کر کے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور مہارانی کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے بھگانے لگے۔

قدرت کا بھی کیا اچھا انتظام ہے کہ اگر اتفاق سے دو آدمی ایسے مل جائیں جو ایک دوسرے

کی زبان نہ جانتے ہوں تو بھی وہ کچھ زبان سے اور کچھ اشاروں سے اپنا مقصد ایک دوسرے کو سمجھا دیتے ہیں جس طرح آج پاکستان سے عرب امارات یا یورپ کے ممالک کو جانے والے پاکستانی کرتے ہیں۔

مہارانی اور اس کا ساتھی سوار آگے آگے اور ددارکا سے آنے والے وجے رائے اور کرشن رائے ان کے پیچھے شام کے دھندلکے میں گھوڑے بھگاتے چلے جا رہے تھے کہ انہیں سامنے سے آتا ہوا سواروں کا ایک دستہ دکھائی دیا۔

آنے والے جب قریب آئے تو مہارانی نے اپنا گھوڑا روک لیا اور گھوڑے سے اتر کر سب سے آگے آنے والے سوار کی طرف زور زور سے چلاتی ہوئی دوڑی۔

آنے والے سوار نے بھی اپنا گھوڑا روکا اور اتر کے وہ بھی چیختا ہوا لڑکی کی طرف بڑھا۔ وجے اور کرشن حیران نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر جب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے تو وجے نے کرشن کو بتایا:

"ارے آنے والا سوار مرد نہیں، عورت ہے" وجے نے بڑی مسرت سے کہا۔

جواب میں کرشن نے بھی انکشاف کیا:

"وہ عورت بوڑھی ہے۔ شاید اس کی لڑکی کی ماں جسے ہم مہارانی سمجھ رہے تھے"۔

"ٹھیک اندازہ لگایا تم نے"۔

وجے نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا:

"مہارانی دراصل وہ بوڑھی عورت ہے اور ہمیں ملنے والی یہ لڑکی اس کی بیٹی یعنی راجکماری ہے"۔

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو چھیڑا:

"ابھی توقع لگانے کی ضرورت نہیں وجے۔ کیا پتہ راجکماری شادی شدہ ہو یا اس کا کوئی منگیتر موجود ہو۔ پھر ہمیں ابھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔ ایسی باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے"۔

وجے رائے، کرشن رائے اور راجکماری کا ساتھی اپنے گھوڑوں سے اتر کر راسیں پکڑے، ماں بیٹی کے اس ملاپ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ مہارانی اور راجکماری دونوں ان لوگوں کی طرف بڑھیں۔

یہ لوگ سمجھ گئے کہ راجکاری نے مہارانی کو جنگ کی پوری تفصیل بیان کی ہوگی اور اب مہارانی شاید

انہیں "شاباشی" دینے آ رہی تھی۔

ان کا خیال ٹھیک تھا۔

مہارانی ان کے قریب آئی تو راجکماری کے ساتھی سوار نے اسے سلام کیا۔ مہارانی نے شاید اپنی زبان میں اس کی تعریف کی۔

وجے اور کرشن نے سوار کو سلام کرتے دیکھ کر اس کا طریقہ اور انداز ذہن نشین کر لیا۔ چنانچہ جب مہارانی ان دونوں کی طرف بڑھی تو انہوں نے بھی بالکل سوار ہی کی طرح مہارانی کو سلام کیا اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔

مہارانی کو شاید ان کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ اس نے دونوں کی کمر تھپکی دے کر شاباشی دی اور راجکماری سے اپنی زبان میں کچھ کہا جسے دونوں بھائی بالکل نہ سمجھ سکے مگر مہارانی کی بات پر راجکماری جس انداز سے شرمائی، اس نے وجے رائے کو کسی اور ہی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ☺

مہارانی نے واپسی کا حکم دیا۔ تمام لوگ خاموشی سے مہارانی کے پیچھے چلنے لگے۔ دو تین گھنٹوں کی مسافت کے بعد دور پر روشنیاں چمکتی دکھائی دیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب آبادی قریب ہے۔

کچھ دیر بعد یہ لوگ آبادی میں پہنچ گئے۔ ہر طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور سامنے ایک بہت بڑا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔

آگے بڑھے تو دروازے کے ساتھ فصیل بھی نظر آئی۔ یقیناً یہ کوئی قلعہ تھا لیکن فصیل قد آدم سے زیادہ اونچی نہ تھی۔

قلعہ کے دروازے پر سخت پہرہ تھا۔ کئی فوجی دستے پرے باندھے کھڑے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے محاذ پر جانے کے لیے تیار ہیں۔

مہارانی اور راجکماری کو دیکھ کر لشکریوں نے سلامی دی اور صدر دروازہ کھول دیا گیا۔ ان لوگوں کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا گیا۔

ددارکا کے دونوں بھائیوں کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی مشکل پیش نہ آئی کہ کیا لشکری اور کیا وہاں کے عوام سب کے چہروں پہ خوف سا طاری تھا۔ وہ سب کھوئے کھوئے سے اور گھبرائے گھبرائے دکھائی دے رہے تھے۔

وجے راٹے اور کرشن راٹے کو ایک بڑے کمرے میں ٹھہرایا گیا جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ راجکماری کے ساتھ والے سپاہی کو بھی ان دونوں کے ساتھ ہی قیام کرنے کا حکم ہوا تھا۔

اس سپاہی کو اجنبیوں کے ساتھ ٹھہرنے کا حکم مہارانی نے دیا تھا شاید اس لیے کہ ان کے میل جول اور باتوں سے دونوں طرف کے حالات ایک دوسرے کو معلوم ہو سکیں گے لیکن وجے اور کرشن ایک گھنٹے تک سر مغزی کرنے کے باوجود اس سے کچھ معلوم نہ کر سکے اور نہ اپنے حالات پوری طرح بتا سکے۔

کھانے کے بعد انھوں نے پھر گفتگو شروع کی جس میں زبان سے زیادہ اشاروں سے کام لیا گیا۔ ان کی تمام رات اسی کوشش میں گزر گئی مگر اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وجے راٹے اور کرشن راٹے کو اس ریاست کے بارے میں تمام موٹی موٹی باتیں معلوم ہو گئیں۔

اس ریاست کا نام ہڈناڈ تھا۔ جن لوگوں سے ان کی جنگ ہوئی تھی وہ برابر کی ریاست روگ ہلی کے سرحدی محافظ تھے۔

ریاست ہڈناڈ کا راجہ ان دنوں سخت بیمار تھا اور اس کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ریاست کا تمام انتظام مہارانی کے ہاتھ میں تھا اور اس کی بیٹی راجکماری دیواجی منی راجہ کی واحد اولاد اور ولیعہدِ ریاست تھی۔

دوارکا کے اجنبیوں کو یہ بھی بتایا گیا کہ ہڈناڈ اور روگ ہلی میں پرانی دشمنی ہے اور آئے دن جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔

وجے راٹے نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ راجکماری دیوجی منی ابھی تک کنواری کنیا ہے اور مہارانی نے اس کا کہیں رشتہ طے بھی نہیں کیا ہے۔

وجے راٹے اور کرشن راٹے کے لیے یہی باتیں کافی تھیں۔ انہیں اس وقت اور زیادہ اطمینان ہوا جب سپاہی نے انہیں بتایا کہ ان دونوں کی بہادری اور راجکماری دیواجی منی کی سفارش پر مہارانی نے دونوں بھائیوں کو سرکاری رہائش گاہ یعنی راج محل کے محافظوں میں ملازم رکھ لیا گیا ہے۔

دوسرے دن وجے راٹے اور کرشن راٹے کو راج محل میں مہارانی کے سامنے پیش کیا گیا۔

وہاں راجکماری دیواجی منی بھی موجود تھی۔ وہ وجے راٹے کو بار بار چور نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے وجے کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا مگر کرشن کا خون خشک ہو رہا تھا۔ اسے خطرہ پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں مہارانی اپنی بے احتیاط بیٹی کی نظریں نہ پڑھ لے اور پھر ان دونوں کو پہلی ہی ملاقات میں راج محل سے بے عزت کر کے نکال دیا جائے مگر بلائے آمد ولے بخیر گذشت۔

ایک ہفتے کی محنت سے وجے راٹے اور کرشن راٹے مقامی زبان سمجھنے اور بولنے لگے۔ مہارانی نے وجے راٹے کو اپنے ذاتی محافظ دستوں کا سردار بنا دیا اور کرشن راٹے کو اس کا نائب مقرر کیا گیا۔

دونوں بھائی بڑی تندہی اور خلوص سے ریاست کے کاموں میں [illegible] رہے تھے۔ وجے نے ریاست ہڈناڈ کی اردگرد کی ریاستوں کے حالات معلوم کرائے تو اسے معلوم ہوا کہ سوائے روگ ہلی کی ریاست کے اور کوئی ریاست ہڈناڈ سے زیادہ طاقتور نہیں ہے اور روگ ہلی ہی ہڈناڈ کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

وجے راٹے نے تمام صورت حال مہارانی کے سامنے رکھی اور درخواست کی کہ ریاست کی فوجوں میں فوری اضافہ کیا جائے ورنہ روگ ہلی کا راجہ جس کا نام ہی راجہ روگ تھا کسی بھی وقت ریاست ہڈناڈ پر حملہ کر سکتا ہے۔

مہارانی نے وجے راٹے کو بتایا کہ خزانے میں اتنی رقم نہیں ہے کہ مزید فوج کے اخراجات برداشت کیے جا سکیں۔ اس کے ساتھ ہی مہارانی نے وجے راٹے کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ راجہ روگ ہڈناڈ پر حملہ نہیں کر سکتا۔

وجے راٹے نے حیران نظروں سے مہارانی کو دیکھا:

"مہارانی۔ روگ ہلی اور ہڈناڈ کے سرحدی دستوں میں جنگ ہوتی رہتی ہے۔ اس دن روگ ہلی کے سواروں نے راجکماری کو گرفتار اور اغوا کرنے کی کوشش کی، اس کے باوجود آپ فرماتی ہیں کہ راجہ روگ ہڈناڈ پر حملہ نہیں کر سکتا جبکہ میری اطلاع کے مطابق راجہ روگ کی طاقت ہماری فوجی قوت سے دوگنی ہے اور وہ کسی وقت بھی ہڈناڈ پر قبضہ کر سکتا ہے؟"

وجے راٹے کا انداز استفہامیہ تھا۔

مہارانی سوچ میں پڑ گئی۔

وجے رائے نے محسوس کیا کہ مہارانی کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہے، اس لیے اس نے بات ختم کرنے کے لیے کہا:

"مہارانی فرماتی ہیں تو میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ راجہ رودگ ہڈناڈ پر حملہ نہیں کر سکتا ورنہ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ـــــ اور مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر ہم اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے تو اس سے ہمیں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے"۔

مہارانی نے سوچا کہ وجے رائے جو اس قدر خلوص اور محنت سے ریاست کے لیے کام کر رہا ہے، اس کے دل میں بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے اس لیے اس نے مجبوراً وہ راز اُگل دیا، جسے وہ اب تک چھپا رہی تھی۔

"وجے رائے!" مہارانی نے اسے مخاطب کیا:

"تمہارے خدشے اور وسوسے اپنی جگہ درست ہیں اور ہم بھی اپنی جگہ درست ہیں مگر تم جیسے وفادار اور جاں نثار سے ہم وہ راز نہیں چھپانا چاہتے جس کی بنا پر ہمیں یقین ہے کہ راجہ رودگ اس وقت تک ہڈناڈ پر حملہ نہیں کر سکتا جب تک وہ ہماری طرف سے بالکل ناامید نہ ہو جائے یا ہم اسے صاف جواب نہ دیدیں"۔

وجے رائے کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ مہارانی کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

مہارانی نے ذرا رک کے کہا:

"وجے رائے۔ اصل بات یہ ہے کہ راجہ رودگ نے راجکماری دیواجی منی کے لیے اپنی شادی کا پیغام بھیجا ہے ـــــ"

یہ سنتے ہی وجے رائے کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

مگر ـــــ

اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور کہا:

"پھر آپ نے کیا جواب دیا راجہ رودگ کو؟"

"یہ تو ہم بعد میں بتائیں گے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا ہمیں یہ پیغام مان لینا چاہیے؟" مہارانی نے وجے رائے سے سوال کر کے اسے گھبرا دیا۔

وجے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ مہارانی نے اسے خاموش دیکھ کر کہا:

"وجے رائے۔ ہم نے تم سے سوال کیا ہے۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"جی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" وجے رائے بوکھلا کے بولا:

"راجہ رودگ آخر راجہ ہے۔ رودگ ہلی ہماری ریاست سے بڑی ریاست ہے۔ رہا اس کی صورت، شکل، کردار اور ذات برادری کا معاملہ، اس کے بارے میں تو آپ کو علم ہوگا ہی۔ اگر راجکماری دیواجی منی کو یہ رشتہ پسند ہو تو ـــــ" وجے رائے کہتے کہتے رک گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"نہیں وجے رائے!"

مہارانی نے شاہانہ انداز میں کہا:

"دیواجی منی اگر پسند بھی کرے تو ہم یہ رشتہ نہیں کر سکتے"۔

"ٹھیک ہے مہارانی جی۔ آپ کا حکم ہی چلنا چاہیے"۔

وجے رائے نے سنبھل سنبھل کے کہا:

"راجہ رودگ میں ضرور کوئی عیب ہوگا!"

"تم عیب کی بات کرتے ہو۔ اس میں وہ عیب ہے جو دھونے سے نہیں دھل سکتا۔" مہارانی کا لہجہ بہت سخت ہو گیا تھا:

"ہاں وجے رائے۔ ذرا یہ تو بتاؤ تمہاری ذات کیا ہے؟"

مہارانی کا سوال بڑا اچانک تھا۔ وجے رائے پریشان ہو گیا مگر فوراً سنبھلا اور بولا:

"مہارانی جی۔ ہمارے دیس میں تین ذاتیں اونچی ہوتی ہیں۔ ایک برہمن، دوسری ٹھاکر اور تیسری ویش۔ ایک چوتھی ذات بھی ہوتی ہے مگر وہ ہمارے برابر کی نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے سامنے کھڑی بھی نہیں ہو سکتی"۔

"کیا تمہارے دیس میں پنچ ذات نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے مہارانی۔ میں اسی کا ذکر کر رہا ہوں"۔ وجے نے جواب دیا:

"اس پنچ ذات کو ہم شودر کہتے ہیں۔ ان کا سایہ بھی پڑ جائے تو ہم ناپاک ہو جاتے ہیں"۔

"تو پھر سمجھ لو کہ راجہ رودگ ہلی اسی پنچ ذات سے ہے"۔

مہارانی نے اطمینان سے کہا:

"وہ دراوڑ ذات کا ہے جو اپنے آپ کو بھارت کے اصلی باشندے کہتے ہیں۔ جو بہت کھو تو جیسے کالا دیو۔ اندھیرے میں کوئی دیکھے تو ڈر جائے"۔

"اچھا۔ تو یہ بات ہے"۔

وجے رائے خوش ہو گیا:

"دراوڑ، کول اور بھیل کو تو ہمارے دیس میں بھی نیچ ذات سمجھا جاتا ہے"۔

"تم نے اپنی ذات نہیں بتائی وجے؟" مہارانی نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں ٹھاکر ہوں مہارانی"۔

وجے رائے نے بڑے فخر سے کہا:

"ہمارے دیس میں یہ ذات راجاؤں، مہاراجاؤں کی کہلاتی ہے۔ ٹھاکر یا تو راجہ ہوتے ہیں یا پھر سردارِ لشکر۔ شمشیر زنی اور شہسواری ہمارا پیشہ ہے۔ سچ پوچھیے تو ہم دونوں بھائی جنوب میں اسی لیے آئے ہیں کہ فوج میں ملازم ہو کے بہادری کے جوہر دکھائیں"۔

"ہم تم سے خوش ہوئے وجے رائے"۔

مہارانی نے کمال مسرت سے کہا:

"ہمارا خاندان بھی صدیوں سے راجہ ہوتا چلا آیا ہے۔ ہم نے تمہیں فوجی ملازمت میں لے لیا ہے۔ وقت آنے پر تمہاری شمشیر زنی کے جوہر بھی دیکھیں گے۔

تم جانتے ہو وجے! کہ ریاست کے مہاراجہ بہت دنوں سے بیمار ہیں۔ وید اور طبیب نا امیدی کا اظہار کر رہے ہیں۔ راجہ رودگ نے ہمیں راجکماری کے لیے ایک سال پہلے پیغام بھیجا تھا۔ مہاراجہ اس وقت بھی بیمار تھے۔ ہم نے انکار کرنے کے بجائے کہلوا دیا تھا کہ مہاراجہ بیمار ہیں۔ ان کو تندرست ہو لینے دو کیونکہ ان کی مرضی کے بغیر ہم راجکماری دیواجی منی کی شادی کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جب سے اب تک ہم اسے ٹالتے چلے آ رہے ہیں مگر اب وہ بہت زور دے رہا ہے۔ یہ روز روز کے سرحدی جھگڑے اسی وجہ سے ہوتے ہیں۔

ہمارے پاس اتنی دولت نہیں کہ ہم بڑی فوج تیار کر سکیں۔ ادھر راجہ رودگ کے تیور ٹھیک نہیں معلوم ہوتے۔ وہ لڑائی کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے"۔

وجے رائے نے جب یہ باتیں اپنے چھوٹے بھائی کرشن رائے کو بتائیں تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔ سوال یہ تھا کہ بڑی فوج تیار کرنے کے لیے رقم کیسے اکٹھی کی جائے؟ مہارانی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے پاس رقم نہیں ہے۔

وجے رائے اور راجکماری دیواجی منی میں روز ہی ملاقات ہوتی تھی مگر وہ رسمی باتوں تک محدود

رہتی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ ان میں محبت کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ یہ تعلق تو دونوں میں پہلے ہی روز پیدا ہو گیا تھا، جب وجے رائے اور کرشن رائے نے راجکماری کے ساتھ مل کر رودگ ہلی کے حملہ آوروں کو مار بھگایا تھا۔ اس کے باوجود دونوں کی زبانوں پر اب تک تالے پڑے تھے مگر یہ تالے اس دن ٹوٹ گئے جب راجکماری نے وجے رائے کو راج محل میں بلایا اور اسے اپنے کمرۂ خاص میں لے گئی۔

یہ راجکماری کی شب خوابی کا کمرہ تھا۔ پورے کمرے میں بھینی بھینی اور سحر انگیز سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

کمرے کو نوادرات اور خوبصورت رنگین تصویروں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ کمرے کی ہر چیز میں ایک نفاست تھی جس سے راجکماری کی نفاستِ طبع کا پتہ چلتا تھا۔

ان چیزوں کے علاوہ راجکماری دیواجی منی کی حسین قربت نے وجے رائے کو بے خود سا کر دیا تھا۔

"وجے رائے۔ تم نے مہارانی سے تمام باتیں سن لی ہیں؟" راجکماری نے وجے کو ایک زرنگار اسٹول پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی راجکماری۔ مجھے ہڈناڈ اور رودگ ہلی کے تمام حالات معلوم ہو گئے ہیں"۔ وجے رائے نے جواب دیا۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کس بارے میں راجکماری؟" وجے نے وضاحت چاہی۔

"اس بارے میں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" راجکماری نے قدرے شرماتے ہوئے کہا۔

"ان حالات میں میری سمجھ میں صرف دو صورتیں آتی ہیں"۔

وجے رائے نے کہا:

"پہلی صورت یہ ہے کہ ہڈناڈ کو اپنی فوج میں اضافہ کر کے اسے دگنی کر دینا چاہیے"۔ وجے کے لہجے میں خلوص ہی خلوص تھا۔

"لیکن فوج کی نئی بھرتی کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟"

راجکماری بے بسی سے بولی:

"مہاراج ایک سال سے بیمار ہیں۔ آدھے سے زیادہ گاؤں نے خراج دینا بند کر دیا ہے۔"

"رقم حاصل کرنے کے لیے راجکماری کو بھیک مانگنا ہوگی۔" وجے نے بے دھڑک کہہ دیا۔

راجکماری اس مشورہ پر چیخ اٹھی:

"وجے۔ وجے تم ہڈناڈ کی راجکماری کو بھیک مانگنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں نے تم سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں مگر تم نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔"

"راجکماری۔ راجکماری آپ کو کیا ہو گیا ہے!"

وجے کو افسوس ہوا کہ اس نے ایک سنجیدہ بات کو مذاق کے انداز میں کیوں کہا۔

"آپ مجھے غلط نہ سمجھیے۔ آپ بھیک مانگنے جائیں گی تو میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ ایک کاسہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ دوسرا میرے ہاتھ میں اور تیسرا کاسہ مہارانی کے ہاتھ میں ہوگا۔"

"کیا ۔۔۔ کیا کہا تم نے! مہارانی، ہڈناڈ کی راج ماتا گلی گلی بھیک مانگنے جائیں گی۔ تم تو پاگل ہو گئے ہو۔ میں نے تمہیں بہت اچھا سمجھا تھا۔ تمہارے لیے کیا کیا سوچا تھا میں نے مگر تم نکلے۔ دور ہو جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں نے تم سے بہت سی امیدیں باندھ لی تھیں۔ اپنے دل میں جگہ دی تھی لیکن تم نے مجھے مایوس کیا ۔۔۔"

"راجکماری۔ میں آج ہی آپ کے حکم کی تعمیل میں جا رہا ہوں۔ راج محل ہی سے نہیں بلکہ میں ہڈناڈ کو بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔"

وجے راٹھے جذباتی ہوتا چلا گیا:

"میں نے بھی آپ سے بہت سی امیدیں باندھی تھیں۔ آپ پر جان دینے کی بھی قسم کھائی تھی لیکن آپ نے بھی مجھے سخت مایوس کیا۔ بھیک مانگنے سے میری مراد یہ ہرگز نہ تھی کہ آپ فقیروں کی طرح ہر در پر ہاتھ پھیلائیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ عوام سے فوج کی تیاری کے لیے روپیہ حاصل کیا جائے۔ اس کے لیے چاہے ہمیں جھوٹ بولنا پڑے، کسی کو فریب دینا پڑے یا مذہب کے نام پر بھیک مانگی جائے۔ جنگ اور محبت میں ہر بات جائز ہے راجکماری۔ رقم اور صرف رقم اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ورنہ آپ دیکھیں گی کہ آج نہیں تو کل راجہ روگ آپ کی ریاست پر زبردستی قبضہ کر لے گا۔"

راجکماری دیوا جی منی، وجے راٹھے کی جذباتی باتوں سے بہت متاثر ہوئی مگر بھیک مانگنے والی بات اب تک صاف نہ ہوئی تھی۔

"وجے راٹھے۔" راجکماری نے نرم لہجے میں کہا:

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں لیکن ہمیں بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اپنی رعایا سے کہیں گے کہ ہمیں نئی فوج تیار کرنی ہے اور اس کے لیے رقم چاہیے۔ عوام ہماری ضرور مدد کریں گے۔"

"راجکماری۔ آپ کی یہی سوچ غلط ہے۔"

وجے راٹھے نے مضبوط لہجے میں کہا:

"فوج کے نام پر آپ کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی اور جس دن راجہ روگ کو معلوم ہوا کہ ہڈناڈ میں نئی فوج کی بھرتی ہو رہی ہے وہ اسی دن حملہ کر کے ہڈناڈ کے ساتھ ساتھ آپ پر بھی قبضہ کر لے گا۔"

"پھر تم کس طرح رقم اکٹھا کرو گے؟" راجکماری نے بے بسی سے کہا۔

وجے راٹھے نے ادھر ادھر دیکھا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا:

"راجکماری! اس کی ترکیب یہ ہوگی کہ مہاراجہ اور مہارانی کی طرف سے اعلان ہوگا کہ ریاست میں کالی دیوی یا بھگوان شیو کا ایک عظیم الشان مندر بنایا جا رہا ہے، اس کی تعمیر کے لیے ہر شخص دل کھول کے چندہ دے۔ پھر دیکھیے گا کیا ہوتا ہے!"

"تمہیں یقین ہے کہ اس طرح ہمیں فوج کے لیے رقم حاصل ہو جائے گی؟" راجکماری نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ضرور جمع ہوگی رقم ۔۔۔" وجے راٹھے نے بڑے استقلال سے کہا:

"مگر یہ رقم کارندوں کے ذریعے جمع نہیں کی جائے گی بلکہ رقم کی وصولی کے لیے اعلان کیا جائے گا کہ مہارانی، راجکماری دیوا جی منی اور ریاست کے تمام سرکاری عہدے دار خود عوام کے پاس جائیں گے اور ان سے شکریے کے ساتھ چندہ وصول کریں گے۔"

"یہ ترکیب تو اچھی ہے مگر کیا ہم کامیاب ہوں گے؟" راجکماری اب تک بے یقینی کی کیفیت کا شکار تھی۔

"راجکماری۔ یقین کیجیے، جب آپ یا مہارانی ہڈناڈ، کالی دیوی یا شیو کے نام پر چندہ مانگیں گی

تو پھر کوئی ظالم ہی ہوگا جو چندہ دینے سے انکار کر سکے گا"۔ وجے رائے نے بڑے اعتماد سے کہا
"تم کس قدر عقلمند ہو وجے!"
راجکماری نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا:
"میں تو یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ شمالی علاقہ کا کوئی آدمی اتنا عقلمند بھی ہو سکتا ہے"۔
"راجکماری ——"
وجے رائے نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:
"میں نے بھی کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ جنوبی ہند میں آپ جیسی خوبصورت راجکماری بھی ہو سکتی ہے"
راجکماری دیواجی منی نے شرما کے نظریں جھکا لیں۔

ریاست ہڈناڈ (بعض کتابوں میں اسے ہڈناٹو لکھا گیا ہے) اس دن جشن کا سماں پیش کر رہی تھی جب مہارانی ہڈناڈ اور راجکماری دیواجی منی ہاتھوں میں بڑے بڑے تھیلے لے کر کالی دیوی اور شیو کے نام پر رعایا سے چندہ مانگنے نکلیں۔

کالی دیوی ہندو مذہب کی زبردست دیوی ہے جو جنگ و جدل، جور و ستم اور موت کی دیوی کہلاتی ہے۔ اسی طرح بھگوان شیو کو خدا کا اوتار بلکہ خدا (بھگوان) سمجھا جاتا ہے۔

ہندو آواگون کے قائل ہیں یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے والے فوراً ہی کسی دوسری شکل میں پھر دنیا میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ شکل کتے، بلی اور سوئر کی بھی ہو سکتی ہے۔

اس دن سے پہلے ایک ہفتہ تک اعلانچی نے پوری ریاست ہڈناڈ میں ڈگی پیٹی تھی کہ بھگوان شیو اور کالی دیوی کے عالی شان مندر ہڈناڈ میں تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ اس مقدس کام میں حصہ لینے کے لیے عوام سے اپیل کی گئی تھی اور یہ اعلان ہوا تھا کہ چندہ کی رقم کسی سرکاری افسر کو نہ دی جائے بلکہ چندہ وصول کرنے کے لیے مہارانی ہڈناڈ اور راجکماری دیواجی منی عوام کے پاس خود .... چل کر آئیں گے تاکہ چندہ لینے اور دینے والوں کو برابر کا ثواب ہو۔

اس اعلان سے لوگوں میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا۔ اور وہ اس دن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے جس سے مہارانی اور راجکماری کی چندہ مہم شروع ہونے والی تھی۔

چندہ مہم راج محل ہی سے شروع ہو گئی تھی۔

سب سے آگے مہارانی ہڈناڈ تھی۔ اس کے ساتھ ایک ملازم ایک خالی بوری پکڑے چل رہا تھا اس کے پیچھے راجکماری دیواجی منی تھی۔ راجکماری کی ایک داسی دکنیزا ایک ریشمی تھیلا لیے اس کے ساتھ تھی۔

ان دونوں کے بعد وجے رائے اور کرشن رائے تھے جو خود اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے جھولے لیے ہوئے تھے۔

راج محل کی سیڑھیوں ہی سے چندہ دینے والوں کا ہجوم شروع ہو گیا تھا جس میں راج محل کی داسیاں اور غلام بھی پیش پیش تھے۔

چندہ مانگنے والے مجمع کے درمیان بنائے گئے راستے سے گزر رہے تھے اور ہر چھوٹے بڑے کو سلام کر کے بوری یا تھیلا اس کے سامنے کر دیتے تھے اور جس سے جو ہو سکتا تھا وہ تھیلے میں ڈال دیتا تھا۔ مہارانی اور راجکماری کی بوریاں ریاست کے بڑے بازار تک پہنچتے پہنچتے ہی تانبے، چاندی اور سونے کے سکوں سے بھر گئیں اور انہیں نئی بوریاں منگوانا پڑی تھیں۔

چندہ کی یہ مہم دوپہر تک جاری رہی۔

مہارانی اور راجکماری دیواجی منی کا بدن تھکن سے چور چور ہو گیا تھا مگر انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ چندہ دینے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کے گھروں میں شاید ایک ہی وقت چولہا جلتا ہو گا۔

دوسرے دن پھر یہ مہم شروع ہوئی مگر اس جگہ سے جہاں تک کل چندہ وصول کیا گیا تھا۔ امیروں کا تو کہنا ہی کیا، غریب عوام نے بھی اس چندہ مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک تو چندہ کالی دیوی اور بھگوان شبو کے نام پر مانگا جا رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ چندہ مانگنے والوں میں راج ماتا اور ریاست کی وارث راجکماری دیواجی منی آگے آگے تھیں۔ آج بھی یہ مہم دوپہر تک جاری رہی۔ پھر کل پر اٹھا رکھی گئی۔

یہ چندہ مہم ایک ہفتے تک جاری رہی۔

اس عرصہ میں مہارانی اور راجکماری اپنی ریاست کے کونے کونے تک پہنچ گئی تھیں۔ راج محل میں چندہ کی رقم کے کئی ڈھیر لگ گئے تھے۔

مہارانی نے اتنی کثیر رقم ریاست کے خزانے میں بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر وجے رائے اور

کرشن رائے کے مشورہ سے یہ مہم ایک ہفتہ کے بعد یہ کہہ کر بند کر دی گئی کہ اگر تعمیر کے لیے مزید رقم کی ضرورت پڑی تو چندہ مہم دوبارہ شروع ہو جائے گی۔

دوارکا کے دونوں بھائیوں نے اس کام میں جان لڑا دی تھی۔ مہارانی اور راجکماری کو سورج نکلنے سے پہلے جگانا اور انہیں مہم کے لیے تیار کرنا، یہ انہیں کا کام تھا۔

وجے رائے کو اس دوران راجکماری دیواجی منی کی قربت حاصل رہی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وجے کو راج محل میں مہارانی اور راجکماری سے گفتگو کرتے اور آیندہ دن کا پروگرام بناتے آدھی آدھی رات بیت جاتی۔ اس وقت مہارانی وجے رائے کو اپنی طرف سے حکم دیتی کہ وہ اپنے گھر، جو فصیل کے ساتھ غلام گردش میں تھا، جانے کے بجائے راجکماری کی خوابگاہ کے برآمدے میں سو جائے۔

دوسرا بھائی کرشن رائے اگرچہ بے لوث خدمت انجام دے رہا تھا مگر اس کام میں بھائی کے ساتھ اس کا مستقبل بھی سنورنے کی امید تھی۔ اس لیے دونوں بھائی رات دن بیلوں کی طرح کام میں جتے رہتے۔ آخر ہڈناڈ والوں کی محنت پھل لائی۔ وجے رائے کی دور اندیشی سے ہڈناڈ کے دیہاتوں سے سپاہی بھرتی ہونا شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہڈناڈ کی فوج کی تعداد دگنی ہو گئی، اور اس فوج کے لانے کے انتظامات کیے جانے لگے۔

مہارانی اور راجکماری نے تمام انتظامات وجے رائے پر چھوڑ دیے تھے یعنی وجے رائے ایک طرح سے ہڈناڈ کے سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا تھا۔

کام کے ساتھ ساتھ وجے رائے اور راجکماری دیواجی منی کا عشق بھی زوروں پر تھا۔ مہارانی کو اس کا علم تھا مگر وہ بھی ڈھیل دے رہی تھی اس لیے کہ وجے رائے سے بہتر داماد اسے کہاں مل سکتا تھا۔

ادھر وجے رائے اس دھن میں لگا تھا کہ کسی طرح راجہ روگ کا ہڈناڈ پر منڈلاتا ہوا منحوس سایہ دور کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب ہڈناڈ کی نئی فوج خاموشی کے ساتھ ہڈناڈ میں داخل ہو جائے اور پہلے سے موجود فوج کے ساتھ آ ملے۔

وجے رائے نے یہ انتظام کیا تھا کہ باہر سے بھرتی ہونے والے سپاہی دس دس پانچ پانچ کر کے ہڈناڈ میں داخل ہوں اور راجہ روگ کو اس کی خبر نہ ہو سکے۔

نئے سپاہیوں کے آنے کی رفتار بہت سست تھی لیکن وجے رائے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے آنے والوں کی اس تعداد میں اضافہ نہیں کیا۔

ایک دوسری مشکل یہ بھی تھی کہ بڑی تعداد میں سپاہیوں کو ہڈناڈ لانے سے راز افشا ہونے کے علاوہ ان کی رہائش کا بھی مسئلہ تھا۔ وجے راٹھے نئی فوج کو پرانی فوج کے قریب مگر عملاً اس سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔

آخر وجے راٹھے نے ہڈناڈ سے صرف ایک میل دور بے حد محفوظ اور دشمن سے پوشیدہ وہ جگہ ڈھونڈ نکالی جو جنگل سے گھری ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے ایک برساتی نالا بھی گزرتا تھا اور بڑے بڑے غار تھے جن میں فوجی چھپائے جا سکتے تھے۔

ایک ہفتہ کی کوشش سے اس جگہ کو فوجیوں کی رہائش کے قابل بنا دیا گیا اور نئے فوجیوں کے آنے کا سلسلہ تیز ہو گیا۔

وجے راٹھے نے فوری ضرورت کے لیے ۲۰۰ بہترین سپاہیوں کی رہائش کا انتظام راج محل کے بالکل قریب کر دیا جو آواز دینے پر بھی راج محل میں داخل ہو سکتے تھے۔

وجے راٹھے کے تمام انتظامات بڑی تیزی سے مکمل ہو رہے تھے اور اس نے راجکماری کو یقین دلا دیا تھا کہ ہفتہ دو ہفتہ بعد ہڈناڈ فوجی حیثیت سے اس قدر مضبوط ہو جائے گا کہ جو راجہ روگ کے حملے کا منہ توڑ جواب دے سکے بلکہ جوابی حملہ بھی کر سکے مگر ایک مثل مشہور ہے کہ:

تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ

یعنی آدمی تدبیر کرتا ہے اور تقدیر اس پر ہنستی ہے۔

یہی حال وجے راٹھے کی کوششوں کا ہوا۔

وجے راٹھے پر کیا راجکماری اور کیا مہارانی سب ہی اعتماد کرتے تھے۔ مہاراجہ ہڈناڈ جو ایک زمانے سے صاحبِ فراش تھا، اس نے وجے کی خدمات کا حال سنا تو اس نے وجے راٹھے کو بلا کر شاباش دی۔

وجے راٹھے نے مہارانی کو بتا دیا تھا کہ ہڈناڈ کی مصیبت ایک ہفتہ بعد ختم ہو جائے گی۔ مہارانی اس بات سے بہت خوش تھی اس لیے کہ وہ راجہ روگ کے خوف سے ہر دم ڈرتی رہتی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی ایک نیچ ذات سے بیاہی جائے اور ہڈناڈ کی ریاست راجہ روگ کی ماتحت ہو جائے۔

مگر ہوتا وہی ہے جو اُوپر والا کرتا ہے۔

مہاراجہ ہڈناڈ جو اتنے دنوں سے بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا، ایک شام اس کی طبیعت زیادہ خراب

ہوئی اور نصف شب کے قریب وہ اس دنیا کو چھوڑ گیا۔

راجہ اگرچہ معذور اور مجہول پڑا تھا لیکن مہارانی کو یہ تو سہارا تھا کہ اس کا پتی، اس کا سرپرست موجود تھا۔ اب تو اس کی دنیا بالکل اجڑ کے رہ گئی تھی۔ وہ بیوہ اور راجکماری یتیم ہو گئی تھی۔ وجے اور کرشن ان کے غم میں شریک تھے مگر وہ دونوں ان ماں بیٹی کو سوائے تسلیاں دینے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے۔

راجہ ہڈناڈ کی موت تو ایک قیامت تھی ہی۔

مگر۔۔۔

اسی رات صبح ہونے سے صرف ایک گھنٹہ پہلے کاروگ کے راجہ روگ نے ہڈناڈ پر چڑھائی کر دی۔

یہ اس کے کمینے پن کی انتہا تھی کہ راج محل میں راجہ ہڈناڈ کی لاش پڑی تھی۔ پوری ریاست سوگ منا رہی تھی اور اس نے اس غم آلود فضا کو انسانی خون سے رنگین کر دیا تھا۔

تمام سرحدی محافظ مارے جا چکے تھے اور قبل اس کے کہ ہڈناڈ کی سرکاری فوج مقابلے پر آتی، کاروگ کی فوجوں نے انہیں گھیرے میں لے کر ہتھیار رکھوا لیے۔ ہڈناڈ بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا۔

مہارانی اور راجکماری، مہاراجہ کی لاش کے پاس سر جھکائے بیٹھی تھیں اور وجے راٹھے کا دماغ بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ راج محل کو دشمن کی فوجوں نے گھیر لیا تھا اور ہڈناڈ کی راج گدی پر راجہ روگ براجمان تھا۔

"مہارانی!" ایک دم وجے راٹھے چیخ پڑا۔

مہارانی اور راجکماری نے مرجھائے ہوئے چہرے اوپر اٹھائے۔ ان کی آنکھیں ویران تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

"کیا بات ہے وجے راٹھے۔ چیخ کیوں رہے ہو؟" مہارانی نے برا سا منہ بنایا۔

"آپ ذرا دوسرے کمرے میں چلیے۔"

وجے نے درخواست کی:

"میں نے چھٹکارے کی ایک تدبیر سوچی ہے۔"

"وجے راٹھے۔ قسمت خراب ہو تو سب تدبیریں الٹی ہو جاتی ہیں۔" مہارانی نے ایک ٹھنڈی

سانس لی اور اٹھ کے کھڑی ہوگئی۔

راجکماری بھی ان کے ساتھ ہولی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک وجے رائے، مہارانی اور راجکماری کو سمجھاتا رہا۔ پھر جب وہ باہر آئے تو ان کے چہرے کچھ شاداب دکھائی دے رہے تھے۔

وجے رائے نے فوراً کرشن رائے کو بلوایا۔ تھوڑی دیر اس سے گفتگو کرنے کے بعد اس نے ریاست کے چار پانچ قابلِ اعتماد آدمیوں کو بلوایا اور انہیں جلدی جلدی ضروری ہدایات دینے لگا۔

دوپہر سے پہلے پہلے وجے رائے نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔

پھر اس نے پہلا قدم اٹھایا۔

وجے رائے نے مہارانی اور راجکماری دیواجی منی کو اپنے ساتھ لیا اور اس محل کی طرف روانہ ہوا جہاں راجہ کاروگ قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔

یہ محل راجہ کا دربار محل کہلاتا تھا۔ یہاں اس کی مسند لگی تھی اور وہ ہر ہفتہ شاہانہ دربار لگایا کرتا تھا۔

وجے رائے نے مہارانی کے ملازم اور راجکماری کی ایک کنیز کے ذریعے راجہ کاروگ کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ ہڈناڈ کی مہارانی، راجہ کاروگ کے سلام کو تشریف لا رہی ہیں۔

راجہ کاروگ کو پہلے تو یقین نہیں آیا۔

مگر —

جب مہارانی کی سواری دربار محل کی سیڑھیوں پر آ کر رکی اور پہریدار نے اندر آ کر اسے اطلاع دی کہ ہڈناڈ کی مہارانی تشریف لائی ہیں اور راجہ کے حضور آنے کی خواہشمند ہیں تو وہ گھبرا گیا اور اٹھ کے فوراً باہر کی طرف چلا۔ اس کے ساتھ اس کے ارکانِ ریاست اور سالارِ افواج بھی باہر کی طرف چل پڑے۔

مہارانی اور راجکماری دیواجی منی، شاہی سواری سے اتر کر دربار محل کی سیڑھیوں پر کھڑی تھیں وجے رائے کے علاوہ ان کے ساتھ صرف ایک کنیز تھی۔ راجہ کاروگ مہارانی کو اس عالم میں دیکھ کر سراپا نیاز بن گیا۔

"اے ہڈناڈ کی مہارانی! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی۔ مجھے بلوا لیا ہوتا۔" راجہ کاروگ نے بڑے ادب سے کہا۔

مہارانی نے وجے رائے کو اشارہ کیا۔

وجے رائے نے اپنا سر مہارانی کی طرف کر دیا۔ مہارانی نے آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہا۔ یا پھر راجہ روگ کو دکھانے کے لیے منہ چلاتی رہی۔ کچھ دیر مہارانی کی بات سننے کے بعد وجے رائے نے سیدھے ہو کر کہا:

"اے کاروگ کے راجہ!"

وجے رائے نے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ کہنا شروع کیا:

"مہارانی ہڈناڈ فرماتی ہیں کہ انہیں راجہ روگ کا پیغام راجکماری دیواجی منی کے لیے مل گیا تھا اور ہم نے آپ کو جواب بھجوا دیا تھا کہ مہاراجہ کے صحت مند ہوتے ہی راجکماری کی شادی ان سے کر دیں گے۔ لیکن راجہ روگ نے راجاؤں کے نیت نیم (دستور) کے خلاف ہم پر حملہ کر دیا اور حملہ بھی اس موقع پر کیا جب ہڈناڈ کے مہاراجہ کی لاش ان کے محل میں پڑی ہے۔ آخر انہیں ہمیں ذلیل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر انہیں راجکماری کی ضرورت تھی تو ہمارے پاس کہلوا دیا ہوتا۔ ہم اسی دم راجکماری کو جیسی بیٹھی ہوتی ویسی ہی بھجوا دیتے۔ کیا راجاؤں کی شادیاں اسی طرح ہوا کرتی ہیں؟"

راجہ روگ غصے میں بھرا بیٹھا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ راجکماری دیواجی منی کو بالوں سے پکڑ کر اپنے محل لے جائے گا مگر جب وجے رائے کے ذریعے اس نے مہارانی کی باتیں سنیں تو اسے بڑی ندامت ہوئی۔

وہ نظریں نیچی کر کے بولا:

"میں مہارانی ہڈناڈ سے بے حد شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ مہارانی کا حکم ہو تو میں اپنی فوج لے کر ابھی واپس چلا جاتا ہوں۔"

وجے رائے نے پھر اپنا کان مہارانی کے قریب کر دیا۔ پھر جب مہارانی کچھ کہہ چکی تو وہ مہارانی کی طرف سے جواب دیتے ہوئے بولا:

"مہارانی فرماتی ہیں کہ راجہ کاروگ نے اگرچہ ہم پر چوروں کی طرح حملہ کر کے ہماری فوج سے ہتھیار چھین لیے ہیں مگر ہم ان کے ساتھ راجاؤں والا سلوک کریں گے۔ ہم اپنے ہونے والے داماد کو نہ تو ذلیل کریں گے اور نہ خالی ہاتھ جانے دیں گے۔ ہم راجکماری

دیواجی منی کو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ہم راجکماری کو راجہ کاروگ کی رانی بنانے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکے تھے مگر راجہ کی بیماری نے ہمیں بدحواس کر رکھا تھا۔

راجہ کاروگ اپنی ہونے والی رانی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ اس بیچاری کی تقدیر میں یہی تھا کہ دھوم دھام سے رخصت ہونے کے بجائے وہ ہڈناڈ سے خالی ہاتھ جائے۔"

اسی وقت مہارانی نے سسکیاں بھرنے کی اداکاری کی۔

اور ــــ

راجکماری دیواجی منی نے سر پر پڑی چندری کو تھوڑا سا ہٹا کر اپنا چاند سا چہرہ راجہ کاروگ کو دکھایا۔

وہ راجکماری کی خوبصورتی کا چرچا سن چکا تھا۔ اب اس کی ایک جھلک دیکھ کر بالکل ہی ریشہ خطمی ہو کر رہ گیا۔

پس ــــ

راجہ کاروگ جو مرنے والے راجہ ہڈناڈ کی مسند پر بڑے رعب سے بیٹھا تھا، اپنی جگہ سے اٹھ کر مہارانی کے سامنے پہنچا۔ پھر اس نے جھک کر مہارانی کے پیر چھوئے اور گڑگڑایا:

"مہارانی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ میں راجکماری کو ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جاؤں گا بلکہ اسے دھوم دھام سے بیاہوں گا اور راجکماری کاروگ کی مہارانی بن کے یہاں سے رخصت ہوگی۔"

مہارانی نے ایک زوردار ٹھنڈی سانس لی اور وجے رائے فوراً اس کی طرف جھک گیا۔ چند لمحوں بعد سیدھا ہو کر بولا:

"مہارانی فرماتی ہیں کہ دل تو ہمارا بھی یہی چاہتا تھا کہ راجکماری کو راجکماری کی طرح رخصت کریں۔ سوائے راجکماری کے ان کے اور کون اولاد ہے جس کی خوشی وہ دیکھیں گی۔ یہ سب کچھ اور ہڈناڈ کا راج پاٹ سب راجکماری ہی کا ہے اور یہ سب ان کے ساتھ ہی کاروگ جائے گا مگر راجہ کاروگ نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔"

"مہارانی۔ ایسی بات نہ کہیے اب۔"

راجہ کاروگ جلدی سے بولا:

"راجکماری کی شادی راجکماریوں کی طرح ہوگی۔ آپ جس طرح اور جیسے چاہیں گی ویسے ہی ہوگا۔"

وجے رائے نے مہارانی کی طرف دیکھا:

"فرمائیے مہارانی۔ آپ کیا چاہتی ہیں۔ راجکماری کی شادی کس طرح ہونا چاہیے۔"

پھر خود ہی مہارانی کی طرف جھک گیا۔ مہارانی نے وجے سے کچھ کہا۔ اور وجے نے راجہ کاروگ کے سامنے اسے یوں بیان کیا:

"مہارانی فرماتی ہیں کہ راجہ کاروگ دو روز تک ہمارے مہمان رہیں۔ اس دوران مہاراجہ ہڈناڈ کے کریا کرم سے ہم فارغ ہو جائیں گے۔ پھر راجہ کاروگ اسی محل سے بارات چڑھائیں اور خوب دھوم دھام سے دلہن کو ہمارے راج محل میں آئیں۔ کچھ ناچ رنگ، کچھ کھیل تماشے ہوں۔ غریبوں میں خیرات بٹے۔ قیدی آزاد ہوں۔ دونوں ریاستوں کے معززین اکٹھے ہوں تو سب کی عزت بڑھے گی اور راجکماری خوشی خوشی رخصت کی جائے گی۔"

"اس طرح نہیں مہارانی۔"

راجہ کاروگ نے کہا:

"میں ابھی اپنا قبضہ اٹھا کر کاروگ واپس جا رہا ہوں۔ آپ لوگ اطمینان سے مہاراجہ کا کریا کرم کیجیے۔ پھر جب آپ لوگ اس صدمہ کو بھول جائیں تو میں دھوم دھام سے بارات لے کر آؤں گا اور راجکماری کو بیاہ کے لے جاؤں گا۔ میں راجکماری سے بھی بہت شرمندہ ہوں اور ان سے معافی مانگتا ہوں۔"

وجے رائے مستقل طور پر مہارانی کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس نے جواب دیا:

"مہارانی فرماتی ہیں کہ ہم نے راجہ کاروگ کو اپنی زبان سے مہمان کہا ہے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر آئے مہمان کی مہمان نوازی کیے بغیر واپس کر دیں۔ پھر راجہ کاروگ راجکماری دیواجی منی کو لینے آئے تھے۔ دو تین دن راجہ کاروگ مہمان رہیں۔ پھر ہم راجکماری کو ان کے ساتھ ہی رخصت کر دیں گے۔ ہمیں شادی کی کوئی تیاری نہیں کرنی۔ سب کچھ تیار ہے۔ راجہ کاروگ اگر چاہیں تو وہ ریاست سے سامان منگا سکتے ہیں اور جنہیں شادی میں شریک کرنا چاہیں انہیں بلا سکتے ہیں۔"

راجہ کاروگ اور زیادہ خوش ہو گیا۔

اس نے مہارانی کی مہمان نوازی قبول کر لی اور ریاست ہڈناڈ پر جو خوف و دہشت طاری تھی وہ ختم ہو گئی۔

پوری ریاست میں اعلان کر دیا گیا کہ دونوں ریاستوں میں صلح ہو گئی ہے اور بہت جلد

راجکماری دیوا جی منی کی شادی راجہ کاروگ سے ہوگی۔

راجہ کاروگ نے فوراً محاصرے اور جنگ کی کیفیت کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ ہڈناڈ کی فوج کو فوجی بیرکوں میں گھیر لیا گیا تھا، وہ گھیرا ختم کر کے ان کے ہتھیار بھی انہیں واپس کر دیے گئے۔

کاروگ کے قابض سپاہی اب ہڈناڈ کے کوچہ و بازار میں گھومتے پھرتے اور خریداری کرتے نظر آنے لگے۔

راجہ کاروگ نے اپنے تمام دور و نزدیک کے رشتہ داروں کو شادی میں شرکت کے لیے بلوا لیا۔ مہارانی نے ایک ادھ محل جو سامان کے گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اسے نئے آنے والے مہمانوں کے لیے خالی کرا دیا۔

اب یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ مہارانی، راجکماری اور وجے رائے جس بے سروسامانی کے عالم میں راجہ کاروگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، ان کی واپسی اس کے برعکس بڑے تزک و احتشام سے ہوئی۔ ریاست کاروگ کا فوجی بینڈ اور ڈھول تاشے مہارانی اور راجکماری کی سواریوں کے آگے گانے بجاتے چل رہے تھے۔ خود راجہ کاروگ اور اس کے مصاحبین اس جلوس میں شامل تھے۔

راجہ کاروگ انہیں راج محل تک پہنچا کے واپس آیا۔ دشمنی، دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی اور شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے تھے۔

مہاراجہ ہڈناڈ کا کریا کرم دو دن میں ہو گیا۔

ہندو مذہب میں مرنے والے کو ٹھکانے لگانے کے تین طریقے ہیں:

جلا دینا

بہا دینا

اور دفن کر دینا۔

راجہ ہڈناڈ کا ہندوؤں کے اس فرقے سے تعلق تھا جس میں مردے جلائے جاتے ہیں۔ چنانچہ راجہ ہڈناڈ کو میدان میں ایک اونچے چبوترے پر لٹا کر اس پر خوشبودار لکڑیاں چنی گئیں۔ پھر اسے

آگ دکھا دی گئی۔

اب کوئی بات ایسی نہ تھی جو راجکماری دیوا جی منی اور راجہ کاروگ کی شادی میں حائل ہو سکتی۔ اس بیچ وجے رائے نے مہارانی کے فرستادہ کے طور پر راجہ کاروگ سے ملاقات کی اور اس سے شادی کی تاریخ، مہمانوں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔

راجہ کاروگ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا چنانچہ بغیر کسی بحث مباحثے کے تمام باتیں طے ہو گئیں۔

شادی کا دن اگلا منگلوار طے ہوا اور بارات کے ساتھ آنے والوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار مقرر ہوئی۔ عورتیں اور بچے ان کے علاوہ تھے۔

منگلوار کو صرف تین دن باقی تھے اس لیے اتوار ہی سے شادی میلہ شروع ہو گیا۔ بازاروں اور میدانوں کی رونق بڑھ گئی۔ ناچنے گانے اور کھیل تماشے والوں کی منڈلیاں (طائفے) ہڈناڈ پہنچنا شروع ہو گئے اور پیر کی رات تک ہڈناڈ کے تمام بازار اور میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئے۔

راج محل کے سامنے شادی کے لیے ایک بہت بڑا پنڈال بنایا گیا جس میں کم و بیش چار ہزار آدمی بیک وقت سما سکتے تھے۔

پنڈال کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ وجے رائے نے مہمانوں کے گلے میں ڈالنے کے لیے پھولوں کے علاوہ چاندی کے تاروں کے ہار بھی تیار کرائے تھے۔

منگلوار کو بڑی دھوم دھام سے دربار محل سے راجہ کاروگ کی بارات چڑھی۔ کالا بھجنگ راجہ کاروگ رنگین لباس میں لنگور دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر اگر سفیدی تھی تو صرف اس کی آنکھوں یا دانتوں میں تھی۔ باقی تمام چہرہ شب دیجور کی طرح سیاہ تھا۔

بارات میں ریاست کاروگ کے تمام معززین، سرکاری افسر، فوجی سردار اور راجہ کے قریبی عزیز شامل تھے۔

دھوم دھام سے گاتی بجاتی اور ڈھول تاشے پیٹتی راجہ کاروگ کی بارات دربار محل سے جب راج محل پہنچی تو پنڈال کے سامنے وجے رائے، کرشن رائے کے علاوہ تمام معززینِ ہڈناڈ اس کے استقبال کرنے والوں میں موجود تھے۔

ہر باراتی کے گلے میں ایک ایک پھولوں کا ہار اور ایک ایک چاندی کے تاروں کا ہار ڈالا گیا۔ عورتوں کے لیے الگ پنڈال میں انتظام کیا گیا تھا، انہیں وہاں پہنچا دیا گیا۔

بارات کا استقبال کرتے ہوئے اس وقت ذرا سی ناگوار صورت پیدا ہوئی جب استقبال کرنے والوں نے ان باراتیوں پر اعتراض کیا جو کمر میں تلوار لٹکا کر بارات میں آئے تھے۔

استقبال کرنے والوں نے اعتراض کیا کہ مہمان، تلوار پنڈال کے باہر رکھ کے اندر داخل ہوں۔ بعض مہمانوں نے تلواریں اتارنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔

اسی وقت وجے رائے نے وہاں پہنچ کر گرجدار آواز میں کہا:

"معزز مہمانو۔ آپ بارات میں تشریف لائے ہیں، میدانِ جنگ میں نہیں جا رہے کہ تلوار لے کر جائیں۔ یہ تو دوستوں کی محفل ہے، یہاں پیار و محبت کے پھول کھلنا ہیں، یہاں تلوار کا کیا دخل؟"

وجے رائے کی اس بات کو باراتیوں نے سراہا اور تلوار بند باراتیوں نے اپنی تلواریں وجے کو پیش کر دیں۔

وجے رائے نے مسکرا کر تلواریں لے لیں اور اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیں اور مہمانوں کو تسلی دی کہ واپسی پر ان کی تلواریں ان کے سپرد کر دی جائیں گی۔

اس طرح بات رفع دفع ہو گئی اور باراتی پنڈال میں پہنچ کے اطمینان سے بیٹھ گئے۔

راجہ کاروگ کے لیے آگ کے الاؤ کے پاس ایک شاندار مسند لگائی گئی تھی آگ کا الاؤ اس لیے روشن کیا گیا تھا کہ ہندوؤں میں شادی کے وقت پنڈت آگ میں، لونگ، الائچی اور مختلف قسم کی خوشبوئیں، اشلوک پڑھتے ہوئے، ڈالتے جاتے ہیں۔

مہمانوں کو پنڈال میں بیٹھے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن راجکماری دیوا جی منی اور مہارانی اب تک پنڈال میں نہ آئی تھیں۔ مہمانوں میں بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ بار بار ایک دوسرے سے دلہن کے اب تک نہ آنے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔

راجہ کاروگ سب سے زیادہ پریشان تھا۔ وہ بار بار اپنے خادمِ خاص کو باہر بھیجتا کہ وجے رائے کو ڈھونڈ کے لائے تاکہ اس سے راجکماری کے نہ آنے کا سبب معلوم کیا جائے۔ غلام ہر بار واپس آ کر ایک ہی جواب دیتا:

"وجے رائے کہیں نظر نہیں آتے۔"

پھر انتظارِ بسیار کے بعد وجے رائے پنڈال میں داخل ہوا۔

راجہ کاروگ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ دوسرے مہمان بھی اسے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے

مگر۔۔۔

ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

کیونکہ وجے رائے کے ساتھ ساتھ کاروگ والوں کی موت بھی آ گئی تھی۔

وجے رائے کے داخل ہوتے ہی چند لمحوں کے اندر پنڈال کو ہڑناڈ کے فوجیوں نے نہ صرف گھیر لیا بلکہ ہار پہنے ہوئے مہمانوں پر ہلہ بول دیا۔

یہ وہی فوجی تھے جنہیں تین دن پہلے راجہ کاروگ کے حکم سے نہتا کر دیا گیا تھا اور پھر جب راجکماری سے اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تو ہڑناڈ کے ان فوجیوں کو آزاد کر کے ان کے ہتھیار بھی انہیں واپس کر دیے گئے تھے۔ وہی فوج اس وقت ریاست کاروگ سے آئے ہوئے مہمانوں کا صفایا کر رہی تھی۔

وجے رائے کی تدبیر نے نہ صرف راجکماری کو راجہ کاروگ کے غلیظ پنجوں سے بچا لیا تھا بلکہ ہڑناڈ کی ریاست بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔

راجہ کاروگ کا سر قلم کر کے نیزے پر چڑھا دیا گیا۔

وجے رائے نے صرف پنڈال والوں کا ہی صفایا نہیں کرایا بلکہ اس کے نئے بھرتی کیے ہوئے فوجیوں نے جنہیں شادی کے ہنگاموں میں دو دن پہلے ہڑناڈ میں بلوایا گیا تھا، راجہ کاروگ کے فوجیوں کے گرد بڑی خاموشی سے گھیرا ڈال لیا تھا۔ پھر جب پنڈال پر حملہ ہوا تو وجے رائے کا بھائی کرشن رائے جو نئی فوج کی کمان کر رہا تھا، اس نے کاروگ کے فوجیوں پر حملہ کر دیا۔

کاروگ کے فوجی اس اچانک حملے سے بدحواس ہو گئے۔ اسی وقت انہیں اپنے راجہ کا سر نیزے پر نظر آیا۔ نصف کے قریب وہ پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ راجہ کا سر دیکھ کر باقیوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور وہ میدان چھوڑ بھاگے۔

وجے رائے واقعی ایک بہترین جرنیل ثابت ہوا۔

اس نے راجہ کاروگ اور اس کی نصف سے زیادہ فوج کا خاتمہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنی پوری فوج کے ساتھ اسی وقت کاروگ کی طرف کوچ کیا۔

دونوں ریاستوں کی سرحدیں تو ملی ہوئی تھیں۔ وجے رائے چند گھنٹوں میں کاروگ کی سرحد

داخل ہوگیا۔

ہڈناڈ سے بھاگ کے آنے والے سپاہی کارُوگ کے باقی سپاہیوں کو ہڈناڈ میں ان پہ اور ان کے راجہ پہ گزرنے والی قیامت کا حال بیان کر ہی رہے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ وجے راٹے کا لشکر کارُوگ میں داخل ہوگیا ہے اور تیزی سے راجہ کے محل کی طرف آرہا ہے۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ریاست کارُوگ کا راجہ نیچ ذات سے تعلق رکھتا تھا مگر اپنی زبردست فوج کی وجہ سے اونچی ذات کے ہندوؤں کو دباتے ہوتے تھا اور پاس پڑوس کی ریاستوں پر اکثر حملے کرتا رہتا تھا۔

راجہ کارُوگ کے قتل ہوجانے سے کارُوگ کے لشکریوں میں بددلی پھیل گئی۔ آدھی فوج تو ہڈناڈ میں ختم ہوگئی تھی۔ رہی باقی آدھی فوج تو اس نے جب ہڈناڈ کی فوج کے آنے کی خبر سنی تو گھبرا کر کارُوگ سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

اب کارُوگ کے اونچی ذات کے ہندوؤں کی بن آئی۔ انھوں نے ہڈناڈ کی فوج کا شاندار استقبال کیا اور وجے راٹے نے کارُوگ پر قبضہ کرکے اسے ہڈناڈ میں شامل کرلیا۔

اس طرح وجے راٹے اور ہڈناڈ کی راجکماری دیواجی منی کا رومان پروان چڑھا اور اگلے مہینے کو اس خوبصورت جوڑے کی شادی ہوگئی۔

مہارانی نے راجکماری دیواجی منی کی طرف سے وجے راٹے کو ہڈناڈ اور کارُوگ کا راجہ بنادیا اس قابل جرنیل نے اپنی زندگی میں بڑے سے کارہائے نمایاں انجام دیے اور ریاست ہڈناڈ کو بہت وسعت دی۔

وجے راٹے کے راجہ ہونے سے ہڈناڈ کی ریاست اس کے خاندان میں منتقل ہوگئی۔ جنوبی ہند میں وجیانگر کی بہت بڑی ہندو سلطنت تھی۔ وجے راٹے وجیانگر کا باجگزار راجہ ہوگیا اور جب تک یہ سلطنت برقرار رہی، ہڈناڈ اس کے ماتحت رہی مگر جب وجیانگر پر زوال آیا تو ہڈناڈ کے چھٹے راجہ تمراج اوڈیرہ دوم نے آزادی کا پرچم بلند کیا اور ۱۵۶۱ء میں سرنگاپٹم کو راجدھانی بنا کر ایک آزاد سلطنت قائم کرلی۔

اس کے بعد مسلمانوں کی میسور میں آمد شروع ہوگئی اور سرنگاپٹم کی اوڈیرہ حکومت، مسلما

سلطنت بیجاپور کی باجگزار ہوگئی۔

سرنگاپٹم اور بیجاپور کا یہ تعلق ۱۶۸۰ء تک برقرار رہا۔ پھر جنوب پر سلطنتِ مغلیہ کے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا قبضہ ہوگیا اور سرنگاپٹم کے اوڈیرہ خاندان کے چودھویں راجہ چک دیوا راجہ اوڈیرہ مغل سلطنت کے ماتحت ہوگیا۔

چک دیوا راجہ اوڈیرہ کے زمانے میں ۱۶۹۶ء میں مرہٹوں نے سرنگاپٹم پر حملہ کردیا لیکن سرنگاپٹم کی فوجوں نے سخت مدافعت کی اور مرہٹوں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

اس زمانے میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر جنوبی ہند میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے وہاں ایک شہر اپنے نام پر "اورنگ آباد" بسایا تھا جہاں اس نے اپنا عارضی صدر مقام بنایا تھا۔

چک دیوراجہ اوڈیرہ بڑا جہاندیدہ تھا۔ اس نے دربارِ عالمگیری میں اثر رسوخ پیدا کرنے کے لیے شہنشاہ کو بہت سے تحائف بھیجے۔ اس کے جواب میں شہنشاہ عالمگیر نے اسے جگ دیوا کے خطاب سے نوازا۔ اور وہ چک دیوا سے جگ دیوا ہوگیا۔

شہنشاہ نے راجہ کو نوبت اور نقارہ رکھنے کا بھی حکم دیا اور راجہ کے بیٹھنے کے لیے ہاتھی دانت کا ایک تخت بھیجا۔ یہ تخت میسور میں اب تک موجود ہے۔

جب دہلی کی مغل سلطنت زوال سے دوچار ہوئی تو نوابوں اور راجاؤں نے آزاد ہونا شروع کردیا۔ حاکم سرا نواب بن بیٹھا اور سرنگاپٹم کے راجہ اوڈیرہ نے بھی آزادی کا اعلان کردیا۔ پھر ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

۱۷۲۴ء میں ارکاٹ کے پہلے نواب سعادت اللہ خاں نے سرا کے نواب کی مدد سے سرنگاپٹم پر حملہ کیا اور ایک کروڑ تاوان وصول کیا۔

اس کے دو برس بعد مرہٹوں نے سرنگاپٹم پر یلغار کردی اور بہت سا مال و دولت لے کر واپس ہوئے۔ ان حملوں نے سرنگاپٹم کو بہت کمزور کردیا۔

۱۷۲۸ء میں راجہ کے انتقال کے بعد وزیروں نے اس کے ایک تین سالہ متبنیٰ بچے کو گدی نشین کردیا اور نظامِ سلطنت خود سنبھال لیا اور اس طرح وہاں وزیر برادران کی حکومت شروع ہوگئی۔

ہڈناڈ کے اس دلچسپ رومان اور سرنگاپٹم کی مختصر تاریخ کے بعد ہم پھر اپنی اصل کہانی کی طرف لوٹتے ہیں یعنی اس دور میں آتے ہیں جب قلعہ دیونہلی کے خونیں معرکہ میں حیدر صاحب

کلاں کام آئے اور ان کی جگہ حیدر علی کے بڑے بھائی شہباز کو قلعہ دیون ہلی کا قلعدار مقرر کیا گیا۔

آئندہ صفحات میں ہم اس سے آگے کے حالات بیان کریں گے۔





قلعہ دیون ہلی کے معرکہ میں حیدر علی اور شہباز نے جوانمردی اور شجاعت کے نئے باب کھولے تھے۔ نند راج اپنے انتخاب پہ بہت خوش تھا۔ دیون ہلی پہ فوج کشی کے وقت اس نے حیدر صاحب کلاں کے علاوہ حیدر علی اور شہباز کا خود انتخاب کیا تھا۔ پھر جب اس انتخاب کا نتیجہ فتح کی صورت میں نکلا تو نند راج کا سینہ اور چوڑا ہو گیا۔

شہباز کو دیون ہلی پہ بہادری کے صلہ میں وہاں کی قلعداری مل گئی۔ یہ اس کے لیے ایک بہترین صلہ تھا۔ اسے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ وزیر نند راج نے اسے تو نواز دیا لیکن حیدر علی کو بغیر کوئی انعام دیے سرنگا پٹم واپس لے گیا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ نند راج کے دل میں حیدر علی کے لیے کس قدر جگہ ہے اور وہ اسے کس عہدے پر فائز کرنا چاہتا ہے۔

سرنگا پٹم واپس آتے ہی نند راج کو مہاراجہ میسور کا پیغام ملا:

"مہاراجہ میسور کرشن راجہ اوڈیر نے آپ کو سلام دیا ہے اور اس بات کی خواہش کی ہے کہ آپ اپنے ساتھ دیون ہلی کے فاتح حیدر علی کو لے کر راج محل تشریف لائیے۔"

یہ پیغام راجہ میسور نے اپنے خاص ملازم کے ذریعے نند راج کو بھیجا تھا۔ مہاراجہ نے حیدر علی کو پہلے ہی فاتح دیون ہلی کا خطاب دے دیا۔ اس میں بہت کچھ حقیقت تھی لیکن اس فتح میں شہباز اور حیدر صاحب کلاں کا بھی حصہ تھا۔ شہباز کو اگرچہ انعام مل گیا تھا لیکن حیدر علی کلاں تو اس معرکہ میں اپنی جان ہی گنوا بیٹھا تھا، اسی وجہ سے نند راج نے حیدر علی کو "فاتح دیون ہلی" کا خطاب

نہیں دیا تھا۔

"فاتح دیون ہلی" کے الفاظ دراصل مہارانی نندی کے منہ سے نکلے تھے جس نے یہ الفاظ اپنے شوہر مہاراجہ میسور کرشن راجہ اوڈیر کے منہ میں ڈال دیے تھے۔

مہارانی نندی، حیدر علی کو کس قدر پسند کرتی تھی اس کا اظہار پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب حیدر علی اور شہباز نے شہسواری اور شمشیر زنی کے مقابلے جیتے تھے۔

پھر اس کے بعد مہارانی نندی کی محبت کا اظہار اس سے ہوتا تھا جب اس نے اپنے باپ یعنی وزیر نندراج سے فرمائش کی تھی کہ شہباز اور حیدر علی کو اس کے محافظ دستوں کا سردار مقرر کیا جائے۔

مہارانی کی دلچسپی صرف حیدر علی سے تھی، شہباز کا نام اس نے محض اس لیے لیا تھا کہ اس کے دل کا چور نہ پکڑا جائے۔

اب یہ تیسرا موقع تھا جب مہارانی نے پھر حیدر علی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی۔

دیون ہلی کی فتح کی اطلاع آتے ہی مہارانی اپنے محل سے چل کر راج محل تک گئی تھی۔ یہ اتفاق کم ہی ہوتا تھا اس لیے کہ مہاراجہ کو شراب و شباب کی محفلوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ مہارانی کی طرف توجہ دے سکے۔

مہارانی کو بھی مہاراجہ کی کچھ ایسی فکر نہ تھی۔ اس نے مہاراجہ کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی اپنی رہائش راج محل کے بجائے دوسرے محل میں اختیار کر لی تھی اور مہاراجہ اس بات پر ناراض ہونے کے بجائے خوش ہوا تھا۔

مہارانی نے مہاراجہ کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا:

"مہاراج کو دیون ہلی کی فتح مبارک ہو۔"

مہاراجہ نے بھی محبت کا اظہار کیا۔ اس نے مہارانی نندی کو آغوش میں کھینچ لیا۔ پھر مسکراتے ہوئے اس سے بولا:

"مہارانی کو بھی فتح مبارک ہو۔"

مہارانی مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی آغوش سے نکل گئی۔ مہاراجہ کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ مہارانی کا دماغ الٹنے لگا تھا۔ پھر بھی اس نے وضعداری نبھاتے ہوئے کہا:

"مہاراج۔ یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا کہ بڑے بھائی شہباز کو تو دیون ہلی کا قلعدار بنا دیا گیا اور حیدر علی کو کچھ بھی نہ ملا۔"

"یہ شکوہ تمہیں اپنے باپ سے کرنا چاہیے۔" راجہ نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ اس نے مہارانی پر طنز کیا۔

مہارانی نندی کو بھلا اتنی برداشت کہاں تھی، اس نے فوراً جواب دیا:

"میں نے وزیر بابا سے اس وقت بھی شکوہ نہیں کیا تھا جب انہوں نے میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیا تھا۔"

مہارانی کا جواب ترکی بہ ترکی تھا مگر مہاراجہ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا، اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا بلکہ خوشامد پہ اتر آیا:

"ارے مہارانی۔ بُرا مان گئیں۔ میرے کہنے کا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ تم جانتی ہو کہ میرا کسی بات پر اختیار نہیں۔ سب کچھ نندراج اور دیوراج کے پاس ہے۔ وہ جسے کیا دیتے ہیں۔ یہ پوچھنے یا اعتراض کرنے کا مجھے حق نہیں۔"

مہاراجہ نے بڑی سادگی سے حقیقت کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ دیوراج اور نندراج کا احسان مند تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی مہربانی تھی کہ انھوں نے تین سال کے اس ننھے بالک بچے کو میسور کی ریاست کا راجہ بنا دیا تھا۔

"مہاراجہ کے کیا اختیارات ہیں اور کیا نہیں، اس پر مہاراج نے کبھی غور ہی نہیں کیا!" مہارانی ایسے ایک دوسرے راستے پر چلی:

"آپ ایک بار اپنے اختیارات کا اظہار کرنے کی کوشش تو کیجیے۔"

"وہ کس طرح۔ تم بتاؤ ہمیں؟" مہاراجہ نے سادگی سے پوچھا۔

"آپ بابا نندراج سے پوچھیے کہ شہباز کی بہادری کے ساتھ ساتھ حیدر علی کی شمشیر نے بھی تو قلعہ دیون ہلی کی جنگ میں جوہر دکھائے تھے۔ پھر اسے نظر انداز کیوں کیا گیا؟"

"ٹھیک ہے۔ نندراج کو سرنگا پٹم واپس آنے دو، ان سے یہی سوال کیا جائے گا۔"

مہاراجہ نے مہارانی کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مہارانی واپس چلی جائے گی مگر مہارانی نے ایک اور سوال اٹھایا:

"آپ کے خیال میں حیدر علی کو کیا انعام دینا چاہیے؟"

راجہ کرشن اوڈیر سوچ کے بولا:

"انعام دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک نقد رقم اور دوسرا انعام خطاب یا گاؤں جاگیر میں دیا جاتا ہے

تمہارے خیال میں کیا انعام ملنا چاہیے حیدر علی کو؟"

"واہ واہ مہاراج۔ آپ نے خوب کام کیا!"

مہارانی نندی نے ہنس کر کہا:

"جو سوال میں نے آپ سے کیا، وہی آپ نے مجھے لوٹا دیا۔"

"بات یہ ہے مہارانی کہ ہم تم الگ الگ تو ہیں نہیں۔"

راجہ کرشن اوڈیر کے انداز سے خوشامد جھلک رہی تھی:

"جو تم کہو۔ وہی انعام دیا جائے۔"

مہارانی نندی نے ہونٹوں پر انگلی رکھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو، پھر کہا:

"میرے خیال میں حیدر علی کو فاتح دیون ہلی کا خطاب دینا چاہیے۔"

"ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ بڑا مناسب انعام ہے۔" مہاراجہ نے مہارانی کی رائے پر فوراً صاد کر دیا۔

اسی گفتگو کا نتیجہ تھا کہ جب وزیر نند راج اور حیدر علی دیون ہلی سے واپس آئے تو راجہ نے نند راج کو پیغام بھیجا:

"مہاراجہ میسور راجہ کرشن اوڈیر نے آپ کو سلام دیا ہے اور خواہش کی ہے کہ آپ اپنے ساتھ فاتح دیون ہلی حیدر علی کو لے کر راج محل تشریف لائیے۔"

وزیر برادران نند راج اور دیو راج کی شان کے یہ بات خلاف تھی کہ راجہ اوڈیر انہیں جس وقت بلوائے وہ اسی وقت دوڑے چلے جائیں۔ دیو راج کو بلاوا کم ہی آتا تھا۔ راجہ اوڈیر کو معلوم تھا کہ سلطنت کے تمام اختیارات نند راج کے ہاتھ میں تھے اس لیے دیو راج کو بلانا ہی بیکار تھا۔

نند راج نے راجہ کے ہرکارے کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ:

"ہم چند ضروری کام نمٹانے کے بعد مہاراجہ میسور کے محل آئیں گے۔"

نند راج، راجہ کے ہر بلاوے پر اسی قسم کا جواب بھجوایا کرتا تھا۔ جس وقت راجہ کا ہرکارہ جواب لے کر واپس پہنچا تو راج محل میں مہاراجہ کے ساتھ مہارانی نندی بھی موجود تھی۔

"کیا جواب دیا وزیر بابا نے؟" ہرکارے کے بولنے سے پہلے ہی مہارانی نندی نے جھٹ سے سوال کر دیا۔

ہرکارے نے جواب دیا: "انہوں نے فرمایا ہے کہ چند ایک ضروری کام کرنے کے بعد

راج محل آئیں گے۔"

مہارانی نندی کا دماغ بھنّا کے رہ گیا:

"وزیر بابا بھی عجیب آدمی ہیں۔ انہیں کسی کے وقت کا احساس ہی نہیں ہے۔ کیا ہم بیکار بیٹھے ہیں!"

"ذرا احتیاط سے بولو مہارانی!"

راجہ کرشن اوڈیر نے منہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا:

"تمہیں معلوم نہیں کہ اس محل کے چپے چپے پر تمہارے وزیر بابا کے جاسوس موجود ہیں۔"

"میں نہیں ڈرتی کسی جاسوس واسوس سے۔" مہارانی نے بگڑ کے کہا:

"جاسوس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"تمہارا نہیں بگاڑ سکتے لیکن میرا تو بیڑا کر سکتے ہیں آپ کے وزیر بابا۔" راجہ کرشن اوڈیر نے ایک اور حقیقت کا اظہار کیا۔

اسی وقت ایک نوکرانی بھاگتی ہوئی آئی:

"مہاراج ــــ وہ ــــ وہ آ گئے۔"

"کون آ گیا ــــ تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے!" مہارانی نے اسے ڈانٹ دیا۔

نوکرانی حواس مجتمع کر کے بولی:

"وہی آئے ہیں مہاراج ــــ وہی، مہارانی کے وزیر بابا۔"

"ارے!" مہاراجہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا:

"کیا وزیر نند راج تشریف لا رہے ہیں؟"

"جی ہاں مہاراج۔ وہی وہی۔ بالکل وہی آ رہے ہیں۔" نوکرانی نے جواب دیا۔

راجہ کرشن اوڈیر بڑے بڑے قدم اٹھاتا وزیر نند راج کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ مہارانی نندی جو بہت بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہی تھی، وہ بھی راجہ کے پیچھے چل رہی تھی۔

وزیر نند راج محل میں داخل ہو کے ایک راہداری سے گزر رہا تھا جب مہاراجہ اور مہارانی اس کے استقبال کو آتے ہوئے دکھائی دیے۔

نند راج نے مہاراجہ کے ہرکارے سے کہہ دیا تھا کہ وہ چند ضروری کام انجام دینے کے بعد آئے گا لیکن یہ اس کا ایک روایتی جواب تھا جس سے اس کی تمکنت کا اظہار ہوتا تھا، ورنہ وہ ہرکارے کے

واپس ہوتے ہی راج محل کی طرف چل پڑا تھا۔

نندراج کو صرف راج محل کی ریشہ دوانیوں ہی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا بلکہ اسے نامدوں کی بغاوت کا بھی ہر دم دھڑکا لگا رہتا تھا۔

راجہ کرشن اوڈیر نشے میں دھت تھا مگر نند راج کی صورت دیکھتے ہی اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے سلام کرنے میں پہل کی۔

نندراج جواب دے کے اس کے ساتھ ہو لیا۔ مہارانی نندی نے بھی وزیر بابا کو سلام کیا اور اب وہ بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

نندراج اگرچہ مہمان کی حیثیت سے آیا تھا یا پھر ایک وزیر کی حیثیت میں، لیکن وہ مہاراجہ اور مہارانی سے آگے آگے چل رہا تھا اور تمام لوگ اس سے دو قدم پیچھے تھے۔

نندراج جب کبھی راجہ سے ملنے راج محل آتا تو ہمیشہ اس کی خوابگاہ میں بیٹھتا تھا۔ راجہ اوڈیر کو اس کی یہ عادت معلوم تھی، اس لیے اس نے اپنی خوابگاہ میں اپنے چھپر کھٹ کے برابر ایک گدے والی کرسی بچھوا دی تھی۔ نندراج اسی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا۔ آج بھی وہ خوابگاہ میں پہنچ کر اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔

نندراج نے مسکراتے ہوئے کہا:

"مہاراجہ میسور کے کیا حال چال ہیں؟"

"بس آپ کی کرپا ہے۔ بڑے عیش سے گزر رہی ہے"۔ راجہ کرشن بھی مسکرایا۔

"یہ آج مہارانی کیسے دکھائی دے رہی ہیں اس محل میں!" نندراج نے دلچسپی سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔

مہارانی نندی چیخ کے بولی:

"کیوں وزیر بابا۔ کیا میرا اس محل میں آنا آپ نے بند کر دیا ہے؟"

"اچھا۔ تو یہ چھوکری تو آل کو ڈانٹ رہی ہے"۔

نندراج آج خوب ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا:

"میرا اختیار ہو تو میں تمہارے محل میں تالا لگوا دوں اور تمہیں مہاراجہ میسور کے محل میں رہنے پر مجبور کر دوں"۔

"آپ سب کچھ کر سکتے ہیں وزیر بابا"۔ مہارانی نندی گھبرا گئی:

"مگر کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ آپ کی بیٹی ایک الگ محل میں پوری شان و شوکت سے رہے"۔

"یہی بات تو مجھے کوئی قدم اٹھانے سے روکتی ہے"۔

نندراج میں سنجیدگی پیدا ہونے لگی۔ پھر اس نے راجہ کرشن اوڈیر کو مخاطب کیا:

"ہاں مہاراج۔ آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے۔ خیریت تو ہے"۔

مہاراجہ نے مہارانی کی طرف دیکھا۔ دراصل وہ بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ مہارانی نے نظریں نیچی کر لیں۔

"تم دونوں ایک دوسرے کو کیوں دیکھ رہے ہو؟"

نندراج نے پھر کہا:

"بتاؤ۔ کیا چاہیے۔ کس چیز کی ضرورت ہے؟"

نندراج کا خیال تھا کہ راجہ کرشن اوڈیر کو کسی ایسی چیز کی ضرورت پڑی ہو گی جو وہ ملازمین کے ذریعے طلب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مہارانی کی وہاں موجودگی سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ آج کل دونوں میں میل ملاپ ہوتا ہے۔

آخر راجہ اوڈیر نے ہنس کر کہا:

"آپ نے سب کچھ تو دے رکھا ہے۔ اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کو حیدر علی کے سلسلے میں تکلیف دی ہے"۔

"ارے ہاں!" نندراج نے پہلو بدلا:

"یہ حیدر علی کو فاتح دیون ہلی کا خطاب کس نے دیا ہے؟"

راجہ کرشن اوڈیر بوکھلا گیا:

"وہ ــــ وہ ہم دونوں نے دیا ہے"۔ اس نے مہارانی کو اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ بھی اس کی تائید کرے۔

مہارانی نے تائید کر دی:

"وزیر بابا۔ کیا حیدر علی اس خطاب کے قابل نہیں ہے؟"

"مہارانی نندی!" نند راج نے بڑے پیار سے کہا:

"حیدر علی کے لیے یہ خطاب بہت معمولی ہے۔ وہ تو اس سے کہیں بڑے خطاب کا مستحق ہے۔ دوسری بات یہ کہ حیدر علی کو "فاتح دیون ہلی" کا خطاب نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس سے

دو ہستیوں کی دل آزاری اور دل شکنی ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ حیدر علی نے دیون ہلی میں بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن اس کے دونوں بڑے بھائی یعنی حیدر علی کلاں اور شہباز بھی شجاعت کے اس معرکے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ حیدر علی کلاں نے تو اپنی جان بھی گنوا دی۔ فاتح دیون ہلی دراصل مرنے والا ہی ہے"۔

"وزیر بابا۔ ایک بات تو بتائیے"۔

مہارانی نندی نے جرأت دکھائی:

"حیدر علی اور شہباز، دونوں میں سے کون زیادہ بے جگری اور جوانمردی سے لڑا تھا؟"

"تمہارا یہ سوال بے موقع ہے مہارانی!" نندراج نے ناگوار لہجے میں کہا:

"دونوں بھائیوں میں بہت محبت ہے۔ اس قسم کی باتوں سے ان میں اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہ اختلاف ریاست میسور کے لیے کسی طرح مفید نہیں۔

ہم نے شہباز کو قلعہ کی سرداری اس لیے نہیں سونپی کہ وہ حیدر علی سے زیادہ بہادر ہے۔ وہ عمر میں حیدر علی سے پانچ سال بڑا ہے۔ وہ ذمہ داری اٹھا سکتا ہے جبکہ حیدر علی کو سرنگا پٹم میں اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ مزید تجربہ حاصل کرے"۔

"وزیر بابا۔" مہارانی نندی نے اور زیادہ جرأت دکھائی:

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ حیدر علی کو اس کی بہادری کا صلہ ملنا چاہیے"۔

"میری بیٹی مہارانی نندی! نوجوان حیدر علی کو صلہ دینے سے کس نے انکار کیا ہے؟" نندراج نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا:

"فاتح دیون ہلی کا خطاب اس لیے بھی مناسب تھی کہ اس قلعہ کا حاکم اس وقت شہباز ہے اور ہم اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے۔

شاید تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ حیدر علی کو ہم نے محافظ دستوں کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا ہے۔ یہ عہدہ اس خطاب سے بہت بڑا ہے جو تم اسے دینا چاہتی ہو"۔

"یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا وزیر بابا"۔

مہارانی نندی خوش ہوگئی:

"آپ نے تو میرا دل خوش کر دیا!"

"زندہ باد حیدر علی خاں"۔

راجہ کرشن اوڈیر نے فوراً نعرہ لگایا:

"آپ نے اس کی جوانمردی کا بالکل صحیح صلہ دیا ہے"۔

"کس کی جوانمردی کا؟" نندراج نے ایک دم پلٹ کر پوچھا۔

"حیدر علی کی جوانمردی کا"۔ راجہ کرشن اوڈیر نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"صرف حیدر علی نہیں بلکہ حیدر علی خاں"۔

نندراج مسکرایا:

"مہاراج نے حیدر علی کو "خان" کا خطاب دے کر اسے "حیدر علی خاں" بنا دیا۔ مجھے یہ خطاب پسند آیا۔ آج سے اسے حیدر علی خاں کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ تمام سرکاری درباری کاغذوں میں اس کا اندراج ہوگا"۔

اس طرح ــــ

مہاراجہ میسور کی طرف سے حیدر علی کو حیدر علی خاں بنایا گیا اور وزیر نندراج نے حیدر علی خاں کو محافظ دستوں کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا۔ ان دستوں میں تمام محلات کے محافظ اور دونوں وزیروں کے محافظ دستے بھی شامل تھے۔

نندراج نے چلتے چلتے اپنی بیٹی مہارانی میسور سے کہا:

"ایک بار مہارانی نے خواہش کی تھی کہ حیدر علی کو ان کے محل کا محافظ بنا دیا جائے۔ آج ہم نے حیدر علی کو تمام محلات کا محافظ بنا دیا ہے۔ مہارانی اب تو خوش ہوں گی"۔

"جی وزیر بابا۔ میں بہت خوش ہوں"۔ مہارانی نندی نے بجھے دل سے جواب دیا۔

اس نے تو یہ خواہش کی تھی کہ وہ مہارانی کے محل کا محافظ سردار ہو کر ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہے۔

مگر ــــ

نندراج نے اسے تمام محافظ دستوں کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر کے حیدر علی خاں کو اس سے بہت دور کر دیا تھا۔



حیدر علی خاں کے آباو اجداد کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس گھرانے کو تصوف اور درویشی سے نہ صرف اُنس رہا ہے بلکہ بعض بزرگوں نے تو اپنی تمام زندگی ہی درویشی میں گزار دی۔

ان کی قناعت کا یہ عالم تھا کہ جہاں بیٹھ گئے بس وہیں کے ہو رہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ انسان کی تقدیر میں جو رزق لکھا جا چکا ہے وہ بغیر کسی کوشش یا حرکت کے خود اس کے پاس پہنچ جائے گا۔

آیئے۔ حیدر علی خاں کے خاندان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

حیدر علی خاں کی پیدائش ۱۷۲۱ء میں ہوئی۔ اس کی پیدائش سے پورے ایک سو سال پہلے یعنی ۱۶۲۰ء میں پنجاب سے آنے والا ایک قافلہ دہلی کے راستے جنوبی ہند کے اس شہر کی طرف رواں دواں تھا جہاں حضرت شاہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ مرجع خلائق بنی ہوئی تھی۔

ایک روایت کے مطابق اس قافلہ میں ایک افغان خاندان بھی تھا جس کا سربراہ ولی محمد خاں ایک درویش صفت اور صوفی منش انسان تھا۔

ولی محمد خاں کو حضرت بندہ نوازؒ سے اس قدر عقیدت تھی جو انہیں دہلی سے گلبرگہ کھینچ لائی تھی۔ اس زمانہ میں گلبرگہ سلطنت بیجاپور کے ماتحت تھا اور بیجاپور کا حکمران محمود عادل شاہ تھا۔

بیجاپور، گلبرگہ سے اسّی میل جنوب مغرب میں واقع تھا۔ ولی محمد خاں درگاہِ بندہ نواز پہنچے تو پہلی ہی ملاقات میں درگاہ کے متولی، ولی محمد خاں کی درویشی اور علم و اخلاق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنا مہمان بنا لیا۔ یہی نہیں بلکہ متولی نے ان کے اخراجات کے لیے درگاہ شریف سے ایک معقول ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کرا دیا۔

متولی اور ولی محمد خاں میں تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ متولی نے اپنی بیٹی، ولی محمد کے بیٹے کے عقد میں دے دی۔

بیٹے کے عقد کے بعد ولی محمد خاں نے گلبرگہ میں مستقل رہائش کا فیصلہ کیا اور اپنی مشائخی کی بساط بچھا دی۔ ولی محمد خاں کی مشائخی ابھی چمکی بھی نہ تھی کہ اوپر سے بلاوا آ گیا اور وہ دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئے۔

باپ کے بعد محمد علی خاں کا دل گلبرگہ سے اچاٹ ہو گیا اور وہ معہ اہل و عیال گلبرگہ چھوڑ کر بیجاپور چلے گئے اور وہاں خلہ مشائخ اورہ میں رہائش اختیار کر لی۔

اس زمانے میں بیجاپور کا حکمران محمود عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ تھا۔ جس طرح ولی محمد خاں نے گلبرگہ کو دائمی مسکن بنانا چاہا مگر خدا کو منظور نہ تھا اس لیے انہیں اوپر اٹھا لیا گیا، اسی طرح کا واقعہ محمد علی خاں کے ساتھ پیش آیا۔ انھوں نے بیجاپور کو مسکن بنانے کا قصد کیا تو بیجاپور پر زوال آ گیا اور اس درویش خاندان کو ایک مرتبہ پھر ہجرت کرنا پڑی اور محمد علی خاں اپنے بال بچوں کے ساتھ کرناٹک منتقل ہو گئے اور وہاں بالا گھاٹ کے قصبہ کولار میں سکونت اختیار کی۔ کولار کے حاکم شاہ محمد دکنی نے محمد علی خاں کی بڑی آؤ بھگت کی اور انتظامِ حکومت بڑی حد تک ان کے سپرد کر دیا۔

شاہ محمد دکنی نے انتظامِ سلطنت محمد علی خاں کے حوالے تو کر دیا مگر وہ ٹھہرے درویش صفت اور صوفی منش۔ ان کی خواہش تھی کہ خاندانی درویشی اور مشائخی جو ان کے باپ دادا نے بڑے تقویٰ اور ریاضت کے بعد حاصل کی تھی، وہ برقرار رہے۔ وہ خود تو صوفی تھے ہی، بیوی بھی درگاہِ گیسو دراز کے متولی کی بیٹی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان کی اولاد بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتی مگر حساب بالکل الٹا ہوا۔

اس صوفی گھرانے میں چار بیٹے پیدا ہوئے:

محمد الیاس

فتح محمد

محمد امام اور

ولی محمد

مگر باپ کی روش پر ایک بیٹا بھی نہ گیا بلکہ وہ درویشی اور مشائخی سے سخت باغی تھے۔ ان کے دل میں مجاہدانہ زندگی بسر کرنے کی تڑپ تھی۔ وہ شمشیر و سناں کے شیدائی تھے اور درگاہوں پر مجاوروں کے بجائے کارزارِ حیات میں زورِ بازو کے بل بوتے پر شہرت اور ناموری کے خواہاں تھے۔

پس چاروں بیٹوں نے ایک دن آپس میں مشورہ کیا کہ سب مل کے باپ کے پاس چلیں اور ان سے مشائخی سے نکل کے سپاہیانہ زندگی گزارنے کی اجازت حاصل کریں۔

باپ نے ان کا مطالبہ بڑے تحمل سے سنا مگر ان کا جواب خالص درویشانہ تھا۔ انہوں نے بیٹوں کو نصیحت کی:

"میرے بیٹو۔ اچھی طرح یاد رکھو۔ جاہ و جلال اور دنیا داری کی ہوس ایک ایسی چنگاری ہے جو جاودانی نعمتوں کے ذخائر کو دیکھتے ہی دیکھتے خاکستر کر دیتی ہے۔ پھر تم اس دنیائے دنی کے پیچھے کیوں بھاگتے ہو۔ ہر ایک کا مقدر روزِ اوّل لکھا جا چکا ہے اور جو کچھ تمہیں ملنا ہے وہ بغیر دوڑ دھوپ کے تمہارے پاس پہنچ جائے گا کیونکہ پیش آنی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے۔"

درویش باپ کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ دیا مگر مجاہدانہ زندگی کے شیدائی بیٹوں پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔

پھر یہ اتفاق ہوا کہ ادھر ان کے باپ نے انتقال کیا اور ادھر ان کا مربی حاکم کولار شاہ محمد دکنی بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ باپ کے دم سے ان کی جو عزت تھی وہ ختم ہو گئی۔ بیٹوں کو اب کوئی روک ٹوک بھی نہ تھی اس لیے محمد علی خاں کے چاروں بیٹے تلاشِ روزگار میں ادھر ادھر بکھر گئے۔

اس طرح دوسرے بیٹے فتح محمد خاں نے نواب ارکاٹ کی ملازمت اختیار کی اور پنج ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔

خیال رہے کہ یہی فتح محمد خاں، حیدر علی خاں کے والد بزرگوار تھے۔ بڑے بھائی محمد الیاس نے تنجاور میں ملازمت کی۔ پھر ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حیدر صاحب، وزیر برادران کی خواہش پر میسور آئے اور انہیں ۵۰ پیادوں اور ایک سو سواروں کی جمعداری پر مامور کیا گیا۔ انہیں نائیک کا خطاب بھی عطا ہوا۔ یہی حیدر صاحب کلاں معرکہ دیون ہلی میں کام آئے اور شہباز کو قلعہ دیون ہلی کا قلعدار کا عہدہ دیا گیا۔

فتح محمد خاں نے نواب ارکاٹ سعادت اللہ خاں کے یہاں اپنی حسنِ کارکردگی اور بہادری کا ایسا مظاہرہ کیا کہ علم، نقارہ اور ہاتھی کے حقدار ٹھہرے مگر یہ عزت اور شہرت چند روزہ ثابت ہوئی نواب سعادت اللہ خاں کی وفات پر اس کے بیٹے اور بھتیجے میں ارکاٹ کے لیے تلواریں کھنچ گئیں اور فتح محمد خاں دل برداشتہ ہو کر میسور چلے گئے۔ جہاں ان کے بھتیجے حیدر صاحب کلاں ایک بڑا مقام حاصل کر چکے تھے۔

حیدر صاحب کلاں کی سفارش پر فتح محمد خاں کو وہاں ملازمت مل گئی اور نائیک کا خطاب عطا ہوا۔ مگر انہیں یہ ملازمت راس نہ آئی اور وہ ملازمت کو خیرباد کہہ کے گھر بیٹھ رہے۔

ارکاٹ میں قیام کے دوران فتح محمد خاں نے تنجاور کے ایک درویش کی صاحبزادی سے شادی کر لی تھی۔ اس طرح ان کے باپ محمد علی خاں کی شادی درگاہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے متولی کی بیٹی سے ہوئی تھی اور بیٹے فتح محمد خاں نے ایک درویش کی صاحبزادی سے شادی کر کے درویشی اور مشائخی کا سلسلہ قائم رکھا۔

فتح محمد خاں کی اس بیوی (درویش زادی) مجیدہ بیگم سے پہلے شہباز اور پھر پانچ سال بعد حیدر علی پیدا ہوئے۔

حملاتِ حیدری کا مصنف حیدر علی کے نام اور پیدائش کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"حیدر علی کے والد فتح محمد نے ایامِ حمل میں اپنی بیوی مجیدہ بیگم کو حیدر علی شاہ درویش کی خدمت میں بھیجا اور فرزند کی دعا چاہی۔ حیدر علی شاہؒ نے دعا دی کہ انشاءاللہ فرزند بلند بخت وارجمند پیدا ہوگا اور یہ کہ اس کا نام میرے نام پر رکھا جائے۔ چنانچہ بچے کی پیدائش پر اس کا نام 'حیدر علی رکھا گیا۔'"

اس تفصیل کا بیان اس لیے کیا گیا کہ اس خاندان میں مشائخی اور درویشی شروع ہی سے پائی جاتی تھی اور نہ چاہنے کے باوجود یہ صفت کسی نہ کسی طور اس خاندان میں پیدا ہو جاتی تھی۔

حیدر علی کے دادا کی شادی بندہ نواز گیسو درازؒ کی درگاہ گلبرگہ کے متولی کی بیٹی سے ہوئی۔

حیدر علی کے والد فتح محمد خاں نے تنجاور کی ایک درویش زادی مجیدہ بیگم سے کی۔

پھر جب حیدر علی کی شادی کا وقت آیا تو ان کے عقد میں ایک پیرزادہ شاہ میاں کی صاحبزادی آئیں۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

حیدر علی خاں کے والد فتح محمد خاں نے اگرچہ باپ کا مسلک یعنی درویشی اور مشائخی اختیار نہیں کیا تھا لیکن درویشوں اور مشائخ سے میل ملاپ ان کے معمولات میں داخل تھا۔ جس وقت وہ سرا کے صوبے دار عابد علی خاں کے منصب دار تھے اور دو ہزار پیادہ اور ۵ سوار معہ فیل و نقارہ اور علم پر سرفراز تھے، اس وقت بھی یہ درویشوں اور پیروں کے پاس جایا کرتے تھے۔

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ فتح محمد خاں نے دوسری اولاد کے لیے سرا کے ایک درویش حیدر علی شاہ کے دروازے پر دستک دی اور انہیں کی دعاؤں سے حیدر علی پیدا ہوئے۔ ان حیدر علی شاہ کی فرمائش پر حیدر علی کا نام رکھا گیا تھا۔

اسی زمانے میں سرا میں پیرزادوں کا ایک خاندان آباد تھا جس سے فتح محمد خاں کے گھر سے

تعلقات تھے۔ فتح محمد خاں ہفتہ میں ایک بار ضرور پیرزادہ خاندان میں جاتے تھے۔

حیدر علی کی عمر اس وقت چار سال کی تھی اور فتح محمد اکثر اسے اپنے ساتھ پیرزادوں کے ہاں لے جایا کرتے تھے۔

پیرزادہ شاہ میاں اس وقت اس خاندان کے سربراہ تھے اور ان کی بڑی صاحبزادی حیدر علی کی تقریباً ہم عمر تھی۔ یہ بچی اکثر مردانے میں آجاتی اور حیدر علی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ کھیلنے لگتی تھی۔

اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حیدر علی سن شعور کو پہنچنے کے بعد کبھی پیرزادہ شاہ میاں کے گھر گئے ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ جب ان کے بڑے بھائی شہباز، اقتدار دیون ہلی سے سرنگاپٹم پہنچ کے کہا:

"حیدر علی۔ میں تمہاری شادی کر رہا ہوں۔"

تو حیدر علی نے شرما کے سر جھکا لیا۔

خیال رہے کہ شہباز، حیدر علی سے پانچ سال بڑے تھے اور ان کی شادی اس وقت ہو چکی تھی۔ شادی ہونے کے بعد انسان یوں بھی بزرگ ہو جاتا ہے۔ پھر حیدر علی کے والد کا انتقال ایک عرصہ پہلے ہو گیا تھا اور شہباز اب اس کے باپ کی مانند تھے۔

حیدر علی کی خاموشی کو شہباز نے نیم رضامندی سمجھا اور یہ صحیح بھی تھا۔ حیدر علی کی عمر انیس سال کی ہو چکی تھی اور جوش جوانی سے اس کی رگ رگ پھڑکتی تھی۔ مگر اس جوانی پر شرافت کے پہرے بیٹھے تھے اور حیدر علی بھول کے بھی شادی کا نام نہ لیتے تھے۔

اب شہباز نے دوسرا سوال کیا:

"حیدر علی۔ تمہیں یاد ہو گا کہ سرا میں قیام کے دوران ہمارے پدر بزرگوار، پیرزادہ شاہ میاں کی حویلی پر اکثر جایا کرتے تھے۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے شہباز بھائی۔" حیدر علی نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"میں نے ان کی بڑی بیٹی کے لیے تمہارا پیغام دیا ہے۔" شہباز نے یہ کہہ کر شاید حیدر علی کو ایک عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا مگر وہ کچھ پوچھ بھی نہ سکتا تھا۔

شہباز نے خود ہی انکشاف کیا:

"پیرزادہ شاہ میاں نے تمہارا رشتہ منظور کر لیا ہے۔ اب تمہارا کیا خیال ہے۔"

"میرا کیا خیال ہے شہباز بھائی۔ آپ نے جو کیا وہ ٹھیک ہی ہو گا۔"

حالانکہ حیدر علی اس رشتہ سے بہت خوش تھا۔

"مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ تم نے میری بات رکھ لی۔"

شہباز نے حیدر علی کو گلے لگا لیا۔

مصنف سلطنت خداداد کہتے ہیں کہ:

"جب حیدر علی کی عمر ۱۹ سال ہوئی تو نند راج وزیر میسور نے پیرزادہ شاہ میاں، ساکن سرا کی لڑکی سے حیدر علی کی شادی اپنے خرچ پر کرا دی۔"

مختصر یہ کہ حیدر علی کی شادی خواہ ان کے بھائی شہباز نے کرائی ہو یا وزیر میسور نے اپنے خرچ پر کرائی ہو، یہ شادی اس قدر دھوم دھام سے ہوئی گویا یہ محافظ دستوں کے افسر کی نہیں بلکہ کسی شہزادے یا راجکمار کی شادی تھی۔ شادی میں ہر طرح کے تکلفات ہوئے اور شان و شکوہ کا مظاہرہ کیا گیا۔

حیدر علی کی شادی کے سلسلے میں ایک بات بہت مشہور ہے۔

حیدر علی کے خسر شاہ میاں ایک بزرگ اور اللہ والے تھے۔ جب حیدر علی کا رشتہ ان کے گھر طے ہو گیا تو پیرزادہ شاہ میاں نے لڑکے والوں سے کہا کہ:

"شادی کی رسومات نہایت سادگی سے ادا کی جائیں۔"

مگر شہباز یا نند راج نے شاہ میاں کی بات نہ مانی اور رؤسا کی شادیوں سے بھی زیادہ اہتمام کیا گیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ میاں کی لڑکی یعنی دلہن نے یا اس کی سہیلیوں نے شادی کے دوران اس قسم کی ہندوانہ رسمیں ادا کیں جن کا مسلمان گھرانوں میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس بات سے ناراض ہو گیا اور جب حیدر علی کے پہلی اولاد پیدا ہوئی جو ایک بچی تھی تو زچہ خانہ ہی میں حیدر علی کی بیوی پر فالج گرا اور اس کا نچلا دھڑ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔

حیدر علی باوجود چھ فیٹ کا لمبا چوڑا جوان ہونے کے بڑا بردبار اور صابر انسان تھا۔ اس نے خدا کی مرضی پر سر جھکا دیا اور لوگوں کے لاکھ کہنے پر بھی دوسری شادی کے لیے رضامند نہ ہوا۔

ایک بیان کے مطابق حیدر علی کو اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت تھی۔ بیوی کو مفلوج ہوئے چھ سال گزر گئے مگر حیدر علی کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔

تب ——

ایک رات خود اس کی بیوی نے حیدر علی کو سمجھایا:

"میرے سرتاج۔ آپ کب تک انتظار کرتے رہیں گے کہ میں پہلے کی طرح ایک بار پھر اچھی بھلی عورت ہو جاؤں گی۔ میرا مرض لاعلاج ہے۔ ویدوں اور حکیموں نے بہت سر مارا مگر حکمِ خداوندی میں کون دخل دے سکتا ہے۔ آپ ابھی جوان ــــ"

"بیگم۔ ایسی باتیں مت کرو۔"

حیدر علی نے اس کی بات کاٹ دی:

"کیا لوگوں کی بیویاں بیمار نہیں ہوتیں۔ آج نہیں تو کل اللہ تمہیں شفا دے گا۔"

"نہیں میرے سرتاج۔"

بیوی نے خوشامدانہ رویّہ اختیار کیا:

"ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ آپ مجھ لاچار کے ساتھ اپنی جوانی کو کیوں برباد کرتے ہیں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہوں اور یہ خدا اور اس کے رسولؐ کا حکم بھی ہے۔"

"مگر بیگم ــــ میں نے کب ــــ" حیدر علی نے کچھ کہنا چاہا مگر بیوی نے روک دیا:

"بس بس۔ جو میں نے کہہ دیا وہی ہوگا۔ آپ کو میری قسم ہے اب انکار نہ کیجیے گا۔"

باہر والوں کا تو پہلے ہی دوسری شادی کے لیے زور پڑ رہا تھا۔ اب بیوی نے خود نہ صرف پیش کش کی بلکہ حیدر علی کو دوسری شادی کے لیے مجبور کر دیا۔

ممکن ہے کہ ہندوانہ رسم و رواج کے برتنے سے واقعی اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا ہو۔ ایک طرف تو پیرزادوں کی لڑکی، دوسری طرف باجا گاجا، ناچ رنگ اور آتش بازی، یہ تمام شیطانی مشاغل ہیں جو ہم مسلمانوں نے اپنے اوپر مسلط کر رکھے ہیں اور آج انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کے اثر سے دور ہونے کے باوجود ہم اب تک پرانی رسموں کو برت رہے ہیں۔

اس دور میں تو ہندو کلچر کا اتنا اثر تھا کہ بچے کی پیدائش پر مسلمان گھرانے بھی ہندو پنڈتوں سے نوزائدہ کی جنم کنڈلی بنواتے تھے۔ اور پنڈتوں کی پیش گوئیوں پر یقین کرتے تھے۔ خود حیدر علی کے والد فتح محمد خاں نے اس کی پیدائش پر بڑی خوشی منائی تھی اور پنڈتوں کو جمع کر کے اس کی جنم کنڈلی بھی تیار کرائی تھی۔

پھر جب پنڈتوں نے جنم کنڈلی سے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ بچہ اپنے باپ کے لیے

حد درجہ منحوس ہے۔

فتح محمد نے پوچھا:

"یہ نحوست کس طرح دور ہو سکتی ہے؟"

پنڈت نے بے دھڑک جواب دیا:

"حضور۔ اگرچہ صاحبزادہ بلند اقبال ہے لیکن، بس یہ والد کی جان کا صدقہ ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس شیر خوار کو شیر مرگ پلا دیا جائے اور ابدی نیند کے پنگھوڑے میں سُلا دیا جائے۔"

ممکن تھا کہ فتح محمد کے قدم بہک جاتے اور وہ جوتشیوں کی باتوں میں آ کر اس لعلِ بے بہا کو ضائع کر دیتے لیکن قدرت نے اس بچے کی پرورش کا ذمہ خود لے رکھا تھا۔ چنانچہ فتح محمد نے بڑے حوصلے اور جرأت سے کہا:

"میں اس بچے کی نحوست جھیلنے کو تیار ہوں لیکن اس کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔ جو کچھ ہونا ہے وہ مشیتِ ایزدی سے ہوگا اور جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے۔"

فتح محمد نے بڑے ناز و نعم سے حیدر علی کو پالنا شروع کیا۔

کہتے ہیں بچے کے پاؤں پالنے میں۔ یعنی بچہ بچپن ہی سے اپنے مستقبل کا پتہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ حیدر علی جب تین سال کے ہوئے تو باپ کی تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ ان کی والدہ نے والد سے کہا کہ:

"صاحبزادے ابھی سے سپاہی بننے کی فکر میں ہیں۔"

فتح محمد بہت خوش ہوئے مگر افسوس کہ وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور جب حیدر علی صرف پانچ سال کے تھے تو ان کا انتقال ہو گیا۔

حیدر علی تعلیم نہ حاصل کر سکے۔ اس زمانے میں تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ بھی کم تھی لیکن قدرت نے ان کی پرورش کی ذمے داری لی تھی اس لیے وہ سپہ گری کی تربیت میں ایسے مشاق ہوئے کہ دونوں بھائیوں جیسا نہ کوئی شہسوار تھا اور نہ شمشیر زن۔ دیون ہلی کا معرکہ اس کا کھلا ہوا ثبوت تھا۔

حیدر علی کو سیکورٹی فورس کی افسری کے علاوہ فوجوں کی جمعبندی کا کام بھی سونپا گیا تھا۔ وہ اپنی مفلوج بیوی کے مجبور کرنے پر شادی کے لیے تیار ہو گئے۔ بڑے بڑے امرا انہیں رشتہ دینے پر تیار تھے مگر حیدر علی زیادہ سے زیادہ وقت لینا چاہتے تھے' اس خیال سے کہ شاید بیمار

بیوی تندرست ہو جائے اور وہ دوسری شادی کے جھگڑے سے دور رہیں۔

اسی دوران بائیں گھاٹ میں نائروں کی بغاوت کی شورش پیدا ہوئی۔

نندراج کی نظروں میں تو حیدر علی سمائے ہوئے تھے۔ اس نے حیدر علی کو تیاری کا حکم دیا۔ وہ تو میدانِ جنگ کے شیدائی تھے اور ایسے مواقع کے منتظر رہتے تھے۔ چنانچہ نندراج، حیدر علی خاں اور ایک معقول لشکر کے ساتھ بائیں گھاٹ پہنچا اور حیدر علی نے اپنی شمشیرِ خارا شگاف کے جوہر دکھانا شروع کر دیے۔

یہ بڑی زبردست شورش تھی۔ اگر حیدر علی جیسا جرنیل اس محاذ پر نہ پہنچتا تو سلطنتِ میسور کا تختہ بھی الٹ سکتا تھا۔

حیدر علی نے بڑی پھرتی اور تیز رفتاری سے اپنے چھوٹے سے لشکر کو پورے علاقے میں گردش دی اور بغاوت کی آگ کو مزید بھڑکنے سے روک دیا۔

اس محاذ پر حیدر علی خاں کے اصل جوہر کھلے کیونکہ وہ خود ہی کمانڈر تھے اور خود ہی سپاہی۔ جہاں کمان کی ضرورت ہوتی وہاں حیدر علی خاں کی نظر پہنچ جاتا اور جہاں سپاہی کی جگہ خالی ہوتی وہاں حیدر علی خاں ایک جانباز سپاہی کی طرح سینہ سپر ہو جاتا۔ نندراج ان کے جوہر دیکھ کر عش عش کر اٹھا۔

حیدر علی خاں نے شورش کو بڑھنے سے تو روک دیا تھا مگر اس پر پوری طرح قابو پانے کے لیے ایک طویل عرصہ اور چھوٹی بڑی کئی جنگوں کی ضرورت تھی۔

ادھر نندراج، سرنگا پٹم سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے ہر وقت بغاوت کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

حیدر علی بڑا ذہین تھا۔ اس نے نندراج کی بے چینی کا اندازہ کر لیا۔

"وزیرِ محترم!" حیدر علی نے ادب سے کہا:

"آپ چاہیں تو سرنگا پٹم تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

"مگر ـــ" نندراج ہچکچاتے ہوئے بولا:

"یہاں کی بغاوت ابھی پوری طرح فرو نہیں ہوئی۔ تم اکیلے رہ جاؤ گے حیدر علی خاں!"

شاندار استقبال کیا گیا۔

وزیر برادران نے شہر سے باہر آ کر اسے خوش آمدید کہا۔ نندراج نے حسبِ عادت اسے گلے لگایا۔

دوسرے دن مہاراجہ اور مہارانی نے راج محل میں حیدر علی خاں کو ایک پُر تکلف ضیافت دی۔ جس میں وزیر برادران اور بعض معزز شہریوں کے علاوہ شہباز نے بھی شرکت کی۔

شہباز، نندراج سے مشورہ کے لیے دیون ہلی سے آیا ہوا تھا۔ اس تقریب میں وزیر برادران کی طرف سے حیدر علی خاں کو نمایاں خدمات کے صلے میں ہاتھی، علم، نقارہ، پالکی اور پرچم کے اعزازات سے نوازا گیا۔

میسور کے یہی سب سے بڑے اعزاز تھے۔ ان اختیارات کے تحت حیدر علی اپنی "خصوصی فوج" بھی بھرتی کر سکتا تھا۔

حیدر علی خاں نے فوراً چار ہزار پیادوں پر مشتمل ایک دستہ اور پانچ سو سواروں کا خاص دستہ بھرتی کیا۔ ایک روایت کے مطابق وزیر برادران نے نائروں کی بغاوت فرو کرنے کے صلے میں حیدر علی کو ڈنڈیگل کا گورنر نامزد کر دیا تھا۔

ماڈرن میسور کا مصنف لکھتا ہے:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت میسور میں حیدر علی خاں سے بڑھ کر منظم اور جری افسر کوئی نہ تھا۔"

حیدر علی خاں کی مفلوج بیوی کو بھی ان کے اس اعزاز سے بہت خوشی ہوئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ حیدر علی خاں ابھی ایک کڑیل جوان ہے اور ابھی وہ اس عمر کو نہیں پہنچا جب مرد بغیر بیوی کے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس بار اس نے حیدر علی خاں کی دوسری شادی کے لیے اس قدر اصرار کیا کہ اسے "ہاں" کرنا ہی پڑی۔ دوسری طرف وزیر برادران اور شہباز بھی اس پر دوسری شادی کے لیے بے حد زور دے رہے تھے۔

روایت ہے کہ حیدر علی خاں کی مفلوج بیوی نے اس کے لیے دوسری بیوی کا خود انتخاب کیا تھا۔

اس طرح پہلی بیوی کی رضامندی اور خواہش پر حیدر علی خاں نے حاکم گرم کنڈا میر معین الدین خاں کی صاحبزادی فاطمہ بیگم عرف فخر النساء سے ۱۷۴۵ء / ۱۱۵۸ھ میں عقد کیا۔

یہ خاتون میر رضا علی خاں کی ہمشیرہ تھی۔ حیدر علی نے اس عقد کے وقت کوئی خاص اہتمام نہ کیا اور

"میں اکیلا نہیں ہوں وزیرِ محترم!"

حیدر علی نے بڑے استقلال سے جواب دیا:

"آپ بے فکر ہو کر تشریف لے جائیے۔ سرنگا پٹم میں آپ کی موجودگی یہاں میرے ساتھ رہنے سے زیادہ ضروری ہے۔"

نندراج نے آگے بڑھ کر حیدر علی خاں کو گلے لگایا:

"میرے بچے۔ میں نے تم سے جتنی امیدیں باندھی تھیں، تم ان پر پورے اترے ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم میں اعلیٰ سپاہیانہ اور قائدانہ صلاحیت کے علاوہ حالات کا صحیح اندازہ لگانے کی قابلیت اور ذہانت بھی موجود ہے۔"

"مجھے تو آپ نے بنایا ہے وزیرِ محترم۔"

حیدر علی خاں نے شکر گزار نظروں سے نندراج کو دیکھا:

"میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کے معیار پر پورا اتروں۔ آپ سرنگا پٹم پہنچیے۔ میں یہاں کے حالات درست کر کے جلد از جلد آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

لیکن حیدر علی کو اس شورش پر پوری طرح قابو پانے میں تقریباً دو سال لگ گئے تاہم اس جنگ سے حیدر علی خاں کو تجربہ بہت حاصل ہوا۔

نائر باغیوں نے حیدر علی کے خلاف جنگ کا ہر طریقہ آزمایا۔ وہ میدان میں جم کے لڑے اور گوریلا انداز کی لڑائی بھی لڑے۔ انھوں نے حیدر علی کے لشکر پر کئی بار شب خون مارے۔ انہیں پریشان کرنے کے لیے باغیوں نے بیک وقت دور اور نزدیک کئی کئی محاذ کھول دیے مگر وہ حیدر علی خاں کو زچ نہ کر سکے۔

حیدر علی خاں چھلاوہ تھا، شرارہ تھا۔ بگولہ تھا۔ صبح کو ایک محاذ پر تو دوپہر کو دوسرے پر اور شام کو تیسرے محاذ پر نظر آتا۔

کچھ ہی دنوں بعد نائروں میں مشہور ہو گیا کہ حیدر علی خاں انسان نہیں بلکہ جنّات میں سے ہے یا پھر جنات اس کی مدد کرتے ہیں۔

آخر حیدر علی خاں کی بہادری اور حسنِ سلیقگی نے نہ صرف نائروں کی شورش کا پوری طرح خاتمہ کر دیا بلکہ اس علاقے کے لوگوں کے دلوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔

حیدر علی خاں فتح و نصرت کے جھنڈے اڑاتے دارالسلطنت سرنگا پٹم میں داخل ہوئے تو ان کا نہایت سادگی سے رسمِ نکاح ادا کی گئی۔

میسور کے شیر دل سلطان ٹیپو کی والدہ محترمہ بی بی فاطمہ بیگم تھیں، جس کی سلطنتِ خداداد نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی تھی اور جس کی بہادری اور جرأت نے رہتی دنیا تک کے لیے ایک تابناک مثال قائم کی تھی۔

ان واقعات کو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ کرناٹک میں ابتری پھیل گئی۔ اس ابتری کی وجہ یہ ہوئی کہ نواب نظام الملک ناصر جنگ نے کرناٹک پر چڑھائی کر دی۔

ریاست میسور، نظام الملک ناصر جنگ کی حلیف تھی۔ نواب ناصر جنگ نے راجہ میسور کرشن اوڈیہ اور اپنے باجگزار دوسرے پالیگاروں (زمینداروں) کو اطلاع دی کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ کرناٹک پہنچ جائیں۔

کرناٹک ان دنوں دوست محمد چندا صاحب کے زیرِ تسلط تھا اور اسے فرانسیسیوں کی حمایت حاصل تھی چنانچہ اس نے بھی اپنے حلیفوں کو بلوا لیا۔

سرنگا پٹم سے نندراج اور جواں عمر و جوانمرد سردار حیدر علی خاں، لشکر کے ساتھ کرناٹک کی طرف روانہ ہو گئے۔ نواب ناصر جنگ کی فوجیں بھی بڑے طمطراق سے وہاں پہنچیں۔

اب ایک طرف کرناٹک کا دوست محمد چندا صاحب اپنے فرانسیسی حمایتیوں کے ساتھ صف آرا ہوا تو دوسری طرف ناصر جنگ اپنے حلیفوں کے ساتھ فرانسیسیوں اور چندا صاحب کے مقابلہ پر صف آرا ہوا۔ ناصر جنگ کے ساتھ میسور کی فوج حیدر علی خاں کی سرداری میں میسرہ پر متعین تھی اور میمنہ پر دوسرے پالیگاروں کی فوجیں تھیں جن میں کرنول کے افغان بھی شامل تھے۔

دونوں لشکروں کو میدانِ جنگ میں آمنے سامنے صف بند ہوئے تین دن ہو گئے تھے مگر جنگ شروع نہ ہوئی۔

دراصل چندا صاحب کسی وجہ سے جنگ کو التوا میں ڈال رہا تھا۔ اس نے ایک مصالحتی وفد نواب ناصر جنگ کے پاس بھیجا جا رہا تھا اور صلح کی گفتگو ہو رہی تھی۔

حیدر علی خاں نے دشمن فوج اور اس کی ترتیب کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اسے سو فیصدی امید تھی کہ نواب ناصر جنگ کو فتح حاصل ہو گی۔ حیدر علی خاں نے زور دے کے یہ بات نندراج سے کہی تھی۔

نندراج کسی اور ہی خیال میں تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ جنگ نہ ہو بلکہ صلح ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ صلح کی بات چیت چندا صاحب کی طرف سے شروع ہوئی تھی، اس لیے امکان یہی تھا کہ چندا صاحب کچھ علاقہ دے کر نواب ناصر جنگ سے جان چھڑا لے گا۔

نندراج اس علاقے پر دانت لگائے ہوئے تھا جو صلح کی صورت میں نواب ناصر جنگ کو ملنے والا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب حیدر علی خاں نے نندراج سے کہا کہ وہ نواب ناصر جنگ کو فوراً جنگ شروع کرنے کا مشورہ دے تو نندراج نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ نواب ناصر جنگ سے بات کرے گا لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا اور صلح کا انتظار کرتا رہا۔

انسان کی ہر سوچی ہوئی بات یا اندازہ صحیح نہیں ہوتا۔ نواب ناصر جنگ کو شکست بھی ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں میں صلح ہو جائے اور نندراج کو کوئی قلعہ یا زمین کا کوئی قطعہ مل جائے لیکن اس معاملے میں نندراج اور حیدر علی خاں دونوں کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔

دونوں طرف سے سفیر آتے جاتے رہے اور بات طول کھینچتی چلی گئی۔ پھر اسی دوران ایک شب چند افغان سپاہی نواب ناصر جنگ کے خیمے میں گھس گئے اور اسے قتل کر دیا۔

نواب ناصر جنگ کے قتل کے ذمے دار دراصل فرانسیسی تھے۔

یورپ کی یہ دونوں قومیں یعنی فرانسیسی اور انگریز پرلے درجے کے مکار اور دھوکے باز ہوتی ہیں۔ جب انہیں میدانِ جنگ میں اپنی موت نظر آتی ہے تو فوراً مکاری اور عیاری پر اتر آتے ہیں۔

فرانسیسیوں کو معلوم ہو گیا تھا بلکہ چندا صاحب نے خود ان کو بتایا تھا کہ نواب ناصر جنگ کے ساتھ میسور کی فوج بھی ہے جس کا سردار وہ نوعمر لڑکا ہے جس نے دیون ہلی کے معرکہ میں شجاعت اور جوانمردی کا ایک ناقابلِ یقین کارنامہ انجام دیا تھا۔

فرانسیسی یہ سن کے اور زیادہ پریشان ہوئے اور انھوں نے فوراً مکاری کا سہارا لیا۔ انھوں نے کڑپہ اور کرنول کے افغانوں کو نواب ناصر جنگ کے خلاف بھڑکایا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان افغانوں کو رشوت دی گئی اور انھوں نے نواب ناصر جنگ کو فریب سے قتل کر دیا۔

بہر حال ـــ نواب کا قتل ہونا تھا کہ اتحادی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ جدھر جس کا منہ اٹھا وہ ادھر

بھاگ پڑا۔

نندراج پہلے ہی سرنگاپٹم واپس جا چکا تھا۔ حیدر علی بہت پریشان تھے کہ وہ کیا کریں۔ میدانِ جنگ سے بھاگنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ نواب ناصر جنگ کی فوج سامانِ جنگ میدان میں چھوڑ کے بھاگ چلی تھی۔ نواب ناصر جنگ جنگی اخراجات کے لیے چالیس (یا چار) اونٹوں پر شاہی خزانہ بار کر کے لایا تھا۔ یہ بات حیدر علی کے علم میں تھی۔

اس خزانہ پر فرانسیسیوں نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔

حیدر علی خاں نے سوچا کہ اگر وہ بھی میدانِ جنگ سے خالی ہاتھ واپس گئے تو مہاراجہ کرشن اوڈیر، وزیر برادران اور اہلِ سرنگاپٹم کیا سوچیں گے؟

یہ بات ذہن میں آتے ہی حیدر علی خاں اپنی فوج کے ساتھ ان فرانسیسیوں پر ٹوٹ پڑے جو خزانے سے لدے اونٹ ہنکائے لیے جا رہے تھے۔

فرانسیسی اپنے آپ کو فاتح سمجھ بیٹھے تھے۔ انھوں نے اس حملے کو حیران نظروں سے دیکھا۔ پھر جلدی سے فوج کو ترتیب دے کر مقابلے پر آ گئے۔

مگر ـــ

حیدر علی کا مقابلہ کرنا لوہے کے چنے چبانا تھا۔ حیدر علی نے انہیں کاٹ کے رکھ دیا اور وہ خزانہ کے اونٹ چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

سرنگاپٹم میں نواب ناصر جنگ کے مارے جانے کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ وزیر برادران سخت پریشان تھے۔ اسی عالم میں حیدر علی خاں، حیدر آبادی خزانے کے اونٹوں کے ساتھ سرنگاپٹم پہنچا۔ وزیر برادران خصوصاً نندراج کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

کسی نے یہ خبر راج محل میں راجہ تک پہنچا دی کہ حیدر علی خاں میدانِ جنگ سے کامیاب اور ایک بڑا خزانہ لے کر واپس آیا ہے۔

راجہ کو ایسا جوش آیا کہ وہ اسی وقت ہاتھی پر سوار ہو کے حیدر علی خاں کو مبارک باد دینے پہنچ گیا۔

اس وقت خزانہ اونٹوں پہ سے اتارا جا رہا تھا۔ اس خزانے میں اشرفیوں سے بھرے سینکڑوں

تھیلے تھے۔

راجہ نے ہاتھی سے اتر کر اپنے جنرل کو گلے سے لگایا۔ پھر جب اس کی نظر اشرفیوں کے تھیلوں پر پڑی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

راجہ نے نندراج سے درخواست کی کہ حیدر علی خاں کو خزانے سے لدے آدھے اونٹ دے دیے جائیں جبکہ نندراج نے حیدر علی خاں کو خزانے سے لدے تین اونٹ حوالے کیے۔ اگر خزانہ چار اونٹوں پر بار تھا تو خزانے کا بیشتر حصہ اسے دیا گیا تھا۔ حیدر علی خاں نے یہ خزانہ اپنے لشکر میں تقسیم کرا دیا۔



حیدر علی خاں کو اس کامیابی کے سلسلے میں مہاراجہ میسور کرشن اوڈیر نے راج محل میں دعوت پہ بلایا۔ یہ پیغام حیدر علی کو اس وقت پہنچایا گیا جب وہ نندراج کی حویلی میں مقیم تھا اور ڈنڈیگل واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔

مہاراجہ نے اس دعوت میں نندراج اور دیوراج کو بھی مدعو کیا تھا۔ انکار کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لیے حیدر علی خاں نے مہاراجہ کی دعوت قبول کر لی۔

"حیدر علی خاں۔ اگر تم نے دعوت سے انکار کر دیا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔" نندراج نے مہاراجہ کے قاصد کے جانے کے بعد کہا۔

"کیوں وزیرِ محترم!" حیدر علی نے حیران نظروں سے نندراج کو دیکھا:

"اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو آپ مجھے پہلے ہی بتا دیتے!"

"بات کچھ ایسی ہی ہے حیدر علی!"

نندراج نے ہنستے ہوئے کہا:

"میری عدم موجودگی میں سرنگاپٹم میں بڑا اودھم مچا تھا مگر دیوراج نے اس پر قابو پا لیا۔ حالات ابھی پوری طرح سدھرے نہیں ہیں۔ ہمیں احتیاط کرنا چاہیے۔"

"وزیرِ محترم! ایسی بات تھی تو آپ نے ہی انکار کر دیا ہوتا۔" حیدر علی نے کہا:

"اگر آپ نے انکار کر دیا ہوتا تو مجھے بھی انکار کا موقع مل جاتا۔"

"خیر چھوڑو اس بات کو —" نندراج نے بات ختم کرنے کے لیے کہا:

"اگر ہم دونوں انکار کر دیتے تو مہاراجہ اور مہارانی اسے ہماری کمزوری پر محمول کرتے۔"

"وزیرِ محترم۔ کچھ تفصیل بتلائیے۔ پتہ تو چلے۔" حیدر علی خاں مفصل حال سننا چاہتا تھا مگر نندراج ٹال مٹول کر رہا تھا۔

"حیدر علی خاں۔ تمہارا فوراً ڈنڈیگل پہنچنا ضروری ہے"۔

نندراج نے اسے نصیحت کی:

"یاد رکھو اگر حاکم اپنے مرکز سے غیر حاضر ہو تو کئی طرح کے فتنے سر اٹھا سکتے ہیں۔ اس وقت تم چلے جاؤ۔ ممکن ہے تمہیں جلد ہی سرنگاپٹم بلایا جائے۔ تم کیل کانٹے سے لیس رہنا۔ میرا پیغام ملتے ہی سرنگاپٹم کے لیے چل پڑنا۔

ہاں ایک بات اور — شہباز کو بھی اطلاع کر دینا کہ وہ بھی سرنگاپٹم آنے کے لیے تیار رہے"۔

"بہتر ہے۔ جو آپ کا حکم"۔

حیدر علی نے جواب دیا:

"میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہاں کے حالات پوری طرح درست کر کے ڈنڈیگل جاؤں"!

نندراج اور حیدر علی ایک ساتھ راج محل گئے۔

حیدر علی نے یہ ضرور محسوس کیا کہ نندراج کی حویلی سے راج محل تک نندراج کے فوجی دستوں کا سخت پہرہ ہے۔

جب یہ دونوں نندراج کی حویلی سے روانہ ہوئے تو اس وقت ان کے آگے ایک فوجی سوار دستہ تھا۔ اسی طرح ان کے پیچھے بھی ایک دستہ چل رہا تھا۔

ان دستوں کے علاوہ راج محل کے صدر دروازے اور اس کے گرداگرد بھی نندراج کے لشکری بڑی مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔

مہاراجہ میسور کرشن اوڈیر اور مہارانی نندی ان دونوں کے استقبال کے لیے راج محل کے صدر دروازے پر موجود تھے۔

نندراج کے ساتھ آنے والے دستوں نے راج محل کے دروازے کی محافظت سنبھال لی۔

مہارانی اور مہاراجہ نے بڑی خوشدلی سے میسور کے دونوں سپوتوں کا استقبال کیا۔

مہارانی اور مہاراجہ نے کچھ دن پہلے نندراج کے خلاف بغاوت کے جو بیج بوئے تھے، اس میں ناکام رہے تھے اور اسی وجہ سے ان کی نظریں نندراج کے سامنے اٹھ نہ رہی تھیں۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ جب وزیر یا وزیروں کے خلاف بغاوت ہوتی تو اس میں مہارانی نندی پیش پیش ہوتی۔ حالانکہ وہ وزیر نندراج کی سگی بیٹی تھی اور نندراج اس کا وقار برقرار رکھنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

کھانے کے دوران مہاراجہ خوب چہکتا رہا مگر مہارانی نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا اور آنکھوں میں عجیب سے بھیانک سائے لہرا رہے تھے۔

دعوت سے واپسی پر نندراج نے حیدر علی کو بتایا:

"حیدر علی خاں! تم جانتے ہو مہارانی نندی میری بیٹی ہے۔ اس کے تابناک مستقبل کے لیے میں نے کرشن اوڈیر سے اس کی شادی کرائی تھی مگر یہ میری ہی مخالف ہے اور ہر دم میری جڑیں کاٹنے پر آمادہ رہتی ہے۔"

حیدر علی خاموش رہا۔ وہ باپ بیٹی کے معاملات میں کیا بولتا۔

ادھر نندراج اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔

"اس نے ایک بار پہلے بھی ایک فوجدار سے سازش کر کے میرا اقتدار ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس بار بھی جب میں تمہارے ساتھ کرناٹک میں تھا تو اس نے فوجدار گنگا رام کو اپنے ساتھ ملا کر سرنگاپٹم اور دوسرے مقامات پر شورش برپا کرنے کی کوشش کی تھی۔"

گنگا رام کے نام پر حیدر علی چونکا۔

"وزیر محترم! اس گنگا رام کو کچھ دن پہلے آپ نے فوجدار کے عہدے پر لگوایا تھا۔"

حیدر علی کی بات میں طنز تو نہ تھا مگر جملہ استفہامیہ تھا۔ نندراج نے ٹھنڈی سانس لے کے جواب دیا:

"ہاں حیدر علی خاں۔ یہ میری ہی غلطی ہے مگر ایسی غلطیاں مجھے کرنا ہی پڑتی ہیں۔ میں نے تمہارے اور شہباز کے لیے کیا نہیں کیا۔ اپنا بیٹا، اپنا بھائی اور دوست بنایا۔ اب اگر تم مجھے دھوکہ دے جاؤ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے کسی نہ کسی پر تو اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ گنگا رام، مہارانی نندی کے ساتھ سازش میں شامل تھا لیکن اس کے

خلاف مجھے کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔"

نندراج کی عدم موجودگی میں جو سازش ہوئی تھی اس کا سرغنہ دراصل گنگا رام ہی تھا۔ نندراج کے سرنگاپٹم سے نکلتے ہی گنگا رام نے مہارانی کو اپنی ایک کنیز کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا:

"مہارانی صاحبہ۔ میں فوراً آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں مگر اس کی خبر نندراج کے جاسوسوں کو نہ ہونی چاہیے۔"

اس پیغام کے جواب میں مہارانی نے راج محل جانے کا بہانہ کیا اور وہاں جانے کے بجائے بھیس بدل کر گنگا رام کے پاس پہنچ گئی۔

چند لمحوں کی گفتگو میں شاطر گنگا رام نے مہارانی کو یقین دلا دیا کہ اگر مہارانی اس کے کہنے پر چلے تو وہ اسے وزیر برادران کی غلامی سے نجات دلا سکتا ہے۔

مہارانی نے فوراً اسے اپنے تعاون کا یقین دلایا اور گنگا رام نے مہارانی سے فرمائش کی کہ اپنے محل کے تمام ملازمین اور پہرے داروں کو فوراً برخاست کر دے۔

اپنے محل میں پہنچ کے مہارانی کے گنگا رام کے کہنے کے مطابق وزیر برادران کے ملازم رکھے ہوئے تمام افراد کو نکال باہر کیا۔

برخاست شدہ نوکر اور نوکرانیاں فریاد لے کر دیوراج کے پاس گئے۔ اس وقت نندراج حیدر علی خاں کے ساتھ کرناٹک گیا ہوا تھا۔

دیوراج نے ہر نوکر کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ ان لوگوں کی گفتگو سے دیوراج کو محسوس ہوا کہ مہارانی اور مہاراجہ کسی کے بہکاوے میں آ کر وزیر برادران سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔

دیوراج نے تحقیق کے لیے مہاراجہ کرشن اوڈیر سے فوراً ملاقات کی۔ وہ اپنے ساتھ پندرہ شمشیر زن لے کر گیا تھا۔ اس نے ان بہادروں کو اپنے ساتھ مہاراجہ کے کمرے تک لے جانے کا ارادہ کیا مگر مہاراجہ کے نئے محافظوں نے دیوراج کے ان پندرہ محافظوں کو اندر جانے کی اجازت نہ دی۔ دیوراج اس پر بہت چراغپا ہوا مگر اسے مہاراجہ سے گفتگو کرنا تھی اس لیے بے خوف و خطر تنہا مہاراجہ کے پاس پہنچا۔

مہاراجہ کرشن اوڈیر کے ساتھ مہارانی نندی بھی وہاں موجود تھی۔ مہاراجہ کا طریقہ یہ تھا کہ وزیر برادران میں سے اگر کوئی ملنے آتا تو وہ بنفس نفیس اپنے کمرۂ خاص یا مہمان خانے کے دروازے پر اس کا استقبال کرتا تھا مگر آج مہاراجہ نے نہ تو اس کا استقبال کیا اور نہ سلام کرنے میں پہل کی۔ ان

اس نے بولنے میں پہل ضرور کی:

"بیٹھو دیوراج!"

مہاراجہ نے اپنے اوپر شاہانہ رعب طاری کرتے ہوئے کہا:

"کہو کیسے آنا ہوا؟"

دیوراج کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے بیٹھنے کے بجائے کھڑے کھڑے اور غصہ میں کانپتے ہوئے کہا:

"اوڈیرو۔ اپنی اوقات مت بھولو۔ یہ گدی ہم نے تمہیں دی ہے۔ یاد رکھو جو دے سکتا ہے وہ واپس بھی لے سکتا ہے"۔

مہاراجہ کرشن اوڈیر تو سہم گیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا مگر مہارانی نندی نے اسے سہارا دیا اور کڑک کر بولی:

"وزیر چاچا۔ کیا قیامت آ گئی ہے کہ تم اس قدر لال پیلے ہو رہے ہو؟"

"مہارانی نندی۔ تم میری بھتیجی ہو اس لیے میں تمہیں کوئی سخت جواب نہیں دیتا"۔ دیوراج نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"مگر میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ محلات کے پرانے ملازموں کو کس نے جواب دیا ہے؟"

"میں نے انہیں نکالا ہے"۔

مہارانی نندی نے اکڑ کر جواب دیا:

"اس لیے کہ وہ تمہارے رکھے ہوئے ملازم تھے۔ وہ ہمارا حکم نہیں مانتے تھے۔ ہم نے انہیں نکال باہر کیا اور اپنی مرضی کے ملازم رکھ لیے"۔

"مہارانی نندی۔ جھوٹ مت بولو۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ مشورہ کس نے دیا۔ تمہارے پیچھے کون ہے اور تم کس کے اشاروں پر چل رہی ہو؟"

مہارانی نے مہاراجہ کی طرف دیکھا۔

مہاراجہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور اسے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ مہارانی نندی نے سنبھل کے کہا:

"مجھے سوائے مہاراجہ کرشن اوڈیر کے اور کون مشورہ دے سکتا ہے۔ ہم دونوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پرانے نوکروں کو ہٹا کر اپنی مرضی کے نوکر رکھ لیے۔ اس میں ناراض ہونے کی

کیا بات ہے؟"

"میری آخری بات سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے"۔

دیوراج نے بڑی تمکنت سے کہا:

"کل صبح تک پرانے ملازم واپس آ جانا چاہییں۔ اس پر عمل ہونا چاہیے"۔

"ہم تمہارے حکم کے پابند نہیں ہیں وزیر چاچا۔ تم نے ہم پر بہت حکومت کر لی۔ اب ہم آزاد ہیں اور تمہیں ہمارا حکم ماننا پڑے گا ــــ"

مہارانی اس کے بعد بھی بولتی رہی۔

مگر ــــ

دیوراج نے اس کا آخری جملہ بھی نہیں سنا اور واپس چل پڑا۔

سرنگاپٹم کی ریاستی فوج کو نند راج اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں صرف محافظ دستوں کے اور کوئی فوج نہ تھی۔ ان دستوں پر دیوراج کو اعتماد نہ تھا۔ اسے اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ مہاراجہ اور مہارانی کس کی شہ پر آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ سرنگاپٹم کا توپخانہ اگرچہ مختصر سا تھا مگر وزیر برادران نے اسے آڑے وقت کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

دیوراج، راج محل سے نکل کر سیدھا توپ خانہ پہنچا۔

تمام توپچی وزیر برادران کے پروردہ اور احسانمند تھے۔ دیوراج کو دیکھتے ہی وہ اس کے قدموں پر جھک پڑے:

"مہاراج۔ ہمیں بھی کبھی خدمت کا موقع دیجیے"۔ ایک توپچی گڑگڑایا:

"اتنے عرصے سے ہم مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ کبھی تو ہم سے کام لیجیے!"

"اگر میں یہ کہوں کہ آج میں تم سے کام لینے ہی کے لیے آیا ہوں تو ــــ" دیوراج نے مسکراتے ہوئے کہا۔

توپچیوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ ان میں سے ایک نے آواز لگائی:

"مہاراج وزیر دیوراج کی جے ــــ"

دوسروں نے اس کی آواز میں آواز ملا کر اس کا جواب دیا۔

دیوراج نے نکرمند انداز میں کہا:

"میں جہاں گولے پھینکنے کو کہوں گا، وہاں پھینکو گے؟"

ان کے سردار نے فوراً جواب دیا:

"مہاراج۔ اگر آپ کہیں گے کہ اپنے گھروں پر گولے پھینکو تو بھی ہم انکار نہیں کریں گے۔ آپ کہہ کے تو دیکھیے۔"

"بس ٹھیک ہے"۔ دیو راج نے مطمئن ہو کر کہا:

"تم توپیں نکالو اور راج محل کے چاروں طرف لگا دو۔ پھر جس طرح میں کہوں اسی طرح کرنا۔"

توپخانہ کے عملے نے بڑی تیزی سے توپیں نکالیں اور راج محل کے چاروں طرف لگا دیں۔

راج محل کے ملازموں نے توپوں کی شکل دیکھی تو ان کی اپنی شکلیں بگڑ گئیں۔ پورے محل میں کہرام مچ گیا۔

مہاراجہ اور مہارانی جو آجکل مہاراجہ کے ساتھ ہی رہا کرتی تھی، ان کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔

مہاراجہ نے فوراً ایک با اعتماد ملازم کو گنگا رام فوجدار کے پاس بھیجا اور اسے توپخانہ کے محل گھیرنے کے احوال سے آگاہ کیا۔

گنگا رام فوجدار بڑا چالاک تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ حالات بگڑ گئے ہیں اس لیے اس نے مہاراجہ کو جواب بھیجا کہ:

"میں دیہات میں فوج اکٹھا کرنے جا رہا ہوں۔ آپ اپنی جگہ پر ڈٹے رہیے۔ میں بہت جلد فوج لے کے واپس آؤں گا اور دیوراج کو اس کی گستاخی کی سزا دوں گا۔"

گنگا رام بڑی خاموشی سے سرنگا پٹم چھوڑ گیا اور مہاراجہ اور مہارانی کی طرف سے اس طرح آنکھیں پھیر لیں جیسے کبھی ان سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

وزیر برادران بہت جہاندیدہ تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مہاراجگانِ میسور کو برسوں سے کس طرح دبائے چلے آتے۔

جس طرح راجے مہاراجے موروثی ہوتے تھے اسی طرح میسور کے وزیروں نے بھی اپنا موروثی حق تسلیم کرا لیا تھا۔ نند راج اور دیوراج کے باپ دادا وزیر تھے اور اب انہوں نے اپنی اولاد کو وزارت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

دیوراج نے توپیں تو فٹ کرا دیں مگر ابھی اس نے گولہ باری کا حکم نہ دیا تھا۔ شاید وہ اس انتظار میں تھا کہ مہاراجہ اور مہارانی کا مزاج درست ہو جائے اور اسے راج محل پر گولہ باری نہ کرانی پڑے مگر مہاراجہ اور مہارانی کو پہلے تو گنگا رام کا سہارا تھا۔ پھر جب اس نے یہ جواب بھیجا کہ وہ

فوجیں اکٹھی کرنے جا رہا ہے اور مہاراجہ محاذ پر ڈٹا رہے، تو اس وقت مہاراجہ اور مہارانی کی رائے یہ ٹھہری کہ گنگا رام کے کہنے کے مطابق انہیں دیوراج کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنے چاہییں۔

مہارانی نندی نے تو اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ دیوراج، راج محل پر گولہ باری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ محل میں خود اس کی بھتیجی اور میسور کے مردِ آہن نند راج کی بیٹی موجود ہے۔ دیوراج میں یہ ہمت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ مہارانی نندی کو ہلاک کر سکے۔

مگر ــــ

اس وقت مہارانی نندی کا چہرہ فق ہو گیا جب راج محل کے پائیں باغ میں پہلا گولہ گرا۔

اس گولے سے اگرچہ کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا اور صرف چند درخت اور زمین جل کے رہ گئی تاہم مہارانی کی عقل ٹھکانے آ گئی۔

مہارانی نندی بھاگ کے مہاراجہ کی خوابگاہ میں گھس گئی۔

"کرشن اب کیا ہو گا۔ کیا ہو گا اب کرشن؟" مہارانی نندی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور اس کی زبان سے الفاظ بہت مشکل سے نکل رہے تھے۔

مہاراجہ میسور نے بھی پہلے گولے کی آواز سن لی تھی اور اپنے بستر پر اوندھا پڑا کانپ رہا تھا۔ اس نے مہارانی کی آواز سنی اور مزید دبک گیا۔

اسی وقت توپوں کے گولوں کی اس طرح بارش شروع ہو گئی جیسے راج محل میدانِ جنگ بن گیا ہو۔

دونوں کے چہرے پہلے فق ہوتے تھے۔ پھر زرد پڑے تھے اور اب ان پر سیاہی پھیل گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے گٹھری بنے پڑے تھے۔

راج محل کی ہر راہداری میں قیامت برپا تھی۔ کنیزیں اور غلام ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ جو راہداری، جو کونا انہیں جائے امن محسوس ہوتا وہ ادھر ہی کو بھاگ اٹھتے مگر دور سے ہی کسی توپ کا گولہ ان کے قریب آ کے گرتا اور انہیں دوسری جگہ بھاگنا پڑتا۔

خیر تو یہی تھی کہ اب تک کوئی گولہ راج محل کے کسی کمرے یا راہداری کے اندر نہیں گرا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے توپچی راج محل کے ان حصوں میں تاک تاک کے گولے پھینک رہے ہیں جہاں راج محل کے باسیوں کا کم ہی گزر ہوتا تھا۔

دو گھنٹے کی مسلسل گولہ باری سے راج محل کی اصل عمارت تو محفوظ رہی لیکن اس کے باغات،

سبزہ زار، روشنیں اور غلام گردش کے تمام مکانات زمیں بوس ہو گئے۔

پھر اک دم گولہ باری بند ہو گئی۔

لیکن ـــ راج محل سے کوئی شخص باہر نہ نکلا، اس ڈر سے کہ کہیں دوبارہ گولے گرنا نہ شروع ہو جائیں۔ راج محل کے باسیوں پر اس قدر دہشت و خوف طاری ہو گیا تھا کہ ایک دوسرے سے بات بھی نہ کر رہے تھے۔

مہاراجہ اور مہارانی نندی خواب گاہ کے ایک کونے میں دم سادھے کھڑے تھے۔ غلام گردش کے تمام لوگوں نے (غلام اور کنیزیں) غلام گردش تباہ ہونے کے بعد راج محل کی راہداریوں میں پناہ لے لی تھی۔

لطف کی بات یہ تھی کہ راج محل کے چاروں طرف گولے گرے تھے مگر محل کی چہار دیواری اور صدر دروازہ بالکل محفوظ تھے۔ ان پہ ایک گولہ بھی نہیں گرا تھا۔

گولہ باری رکنے کے چند ہی منٹ بعد مہاراجہ کی ایک کنیز نے اندر آ کر بتایا،

"صدر دروازے کا ایک سپاہی، وزیر دیوراج کا پیام لے کر آیا ہے"۔

مہاراجہ اور مہارانی نے اس اطلاع پہ بھگوان کا شکر ادا کیا۔ مہارانی نے کہا:

"سپاہی کو فوراً اندر بھیجو"۔

کنیز باہر گئی اور سپاہی کو ساتھ لے کر پھر آ گئی۔ سپاہی نے حسب دستور مہاراجہ اور مہارانی کو جھک کے سلام کیا۔

"کس کا پیغام ہے۔ کیا پیغام ہے؟" مہارانی نندی نے دریافت کیا۔

سپاہی نے جواب میں کہا:

"وزیر دیوراج نے ایک بند گاڑی بھیجی ہے اور کہا ہے کہ مہاراجہ اور مہارانی اس گاڑی میں بیٹھ کر فوراً ان کے پاس پہنچ جائیں"۔

دیوراج نے اپنے اقتدار اور طاقت کا تھوڑا سا نمونہ دکھا کر مہاراجہ اور مہارانی دونوں کو اپنے حضور طلب کیا تھا۔ ان کی جان تو پہلے ہی نکل رہی تھی۔ اس پیغام نے ان کے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیے۔

"دیوراج ہمیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دے گا"۔ مہارانی نے خیال ظاہر کیا۔

مہاراجہ میسور کرشن اوڈیر نے اس میں اضافہ کیا: "دیوراج ہم دونوں کو قتل بھی کر

سکتا ہے"۔

مہاراجہ اور مہارانی کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

مہاراجہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا:

"نندی! جلدی فیصلہ کرو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

مہارانی کا دماغ صحیح ہو گیا تھا۔ وہ بولی:

"ہمیں خود کو دیوراج کے رحم و کرم پہ چھوڑ دینا چاہیے"۔

مہارانی نندی نے شاید زندگی میں پہلی بار صحیح فیصلہ کیا تھا ورنہ صاف ظاہر تھا کہ جو راج محل کے چاروں طرف گولے پھنکوا سکتا تھا اس کے لیے راج محل کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کے لیے صرف زبان ہلانا تھی۔

"تو پھر چلیں"۔ مہاراجہ نے مہارانی کی طرف دیکھا۔

"ضرور چلنا چاہیے۔ کبھی کبھی زہر بھی تریاق بن جاتا ہے"۔ اور مہارانی نندی آگے آگے چلنے لگی۔

محل کی بیرونی سیڑھیوں کے نیچے ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی جس کی حفاظت میں سوار کر رہے تھے۔

سواروں نے ادب سے دونوں کو سلام کیا۔ گاڑی بان نے ایک طرف کا پردہ ہٹایا اور مہاراجہ میسور اور مہارانی نندی مجرموں کی طرح گاڑی میں دبک کر بیٹھ گئے۔

گاڑی کا رخ توپخانہ کی عمارت کی طرف تھا۔

دیوراج نے گاڑی آتے دیکھی تو دروازے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ گاڑی بان نے مہاراجہ کو بتا دیا تھا کہ وزیر دیوراج سامنے والے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ آپ سے وہ وہیں ملاقات کریں گے۔

دونوں لرزتے قدموں سے کمرے کے دروازے پر پہنچے تو انہیں دیوراج دروازے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا دکھائی دیا۔

"نمستے وزیر چاچا"۔ مہاراجہ اور مہارانی اندر داخل ہوئے اور آواز ملا کر دیوراج کو سلام کیا۔ مگر ان کی مشترکہ آواز لرز رہی تھی۔

"خوش رہو۔ دونوں کی جوڑی سلامت رہے"۔ دیوراج نے سر گھما کر کہا اور انہیں سامنے

کی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مہاراجہ میسور اور مہارانی نندی بیٹھ گئے مگر سہمے سہمے اور ڈرے ڈرے۔ حالانکہ دیوراج نے دونوں کو سلامتی کی دعا دی تھی۔

"مہاراجہ میسور۔ تمہیں اپنے اختیارات کا اندازہ ہو گیا ہوگا؟" دیوراج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کرشن اوڈیر سے سوال کیا۔

مہاراجہ میسور کو کوئی جواب نہ سوجھا اور اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"تم کہو مہارانی نندی!"

دیوراج نے اس کی طرف دیکھا:

"تمہیں مہارانی بھی ہم دونوں بھائیوں نے ہی بنایا ہے۔ کیا تم بھول گئیں؟"

"وزیر چاچا۔ سب یاد ہے مجھے!" رانی کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"پھر تم نے مجھ سے کیوں گستاخی کی تھی؟"

دیوراج کا لہجہ اک دم سخت ہو گیا:

"ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ جو بنا سکتا ہے وہ بگاڑ بھی سکتا ہے"۔

"بس غلطی ہو گئی وزیر چاچا"۔

نندی گڑگڑانے لگی:

"بس اس دفعہ معاف کر دیجیے۔ آیندہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے گا"۔

"تم کیا کہتے ہو مہاراجہ میسور کرشن اوڈیر"۔ دیوراج سے جو گستاخی ان میاں بیوی نے کی تھی اس کی تلخی اس کے لہجے میں اتر آئی تھی۔

"وزیر چاچا!" نندی کی دیکھا دیکھی مہاراجہ بھی دونوں وزیر برادران کو وزیر چاچا کہنے لگا تھا:

"اصل غلطی تو میری ہے کہ میں نے آپ کے اقتدار کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔ آپ مجھے سزا دیجیے"۔

"کیوں۔ مقابلہ کی طاقت کیا ہوئی؟"

دیوراج نے سخت لہجے میں کہا:

"خطا دونوں کی ہے اور سزا بھی دونوں کو ملنی چاہیے"۔

مہارانی نندی سسکیاں لینے لگی۔ مہاراجہ میسور بھی عورتوں کی طرح آنسو بہانے لگا۔ شاید دیوراج کو ان پر رحم آ گیا۔ اس نے کہا:

"تم دونوں کی خطا معاف ہو سکتی ہے مگر۔۔۔"

دونوں نے گھبرا کے مگر پُر امید نظروں سے دیوراج کو دیکھا۔

مہارانی نے لجاجت سے کہا:

"وزیر چاچا۔ آپ جو کہیں گے وہ ہم کریں گے۔ آپ بس ہمیں معاف کر دیجیے!"

"پھر بتاؤ تمہیں کس نے بہکایا تھا؟"

دیوراج اصل فتنہ پرداز کا نام معلوم کرنا چاہتا تھا۔

راجہ کا جی چاہا کہ وہ گنگا رام کا نام لے دے مگر مہارانی نے اسے اشارے سے روک دیا۔ اس کے دل میں چور تھا جبھی تو وہ نام بتانے سے گریز کر رہی تھی۔

رانی نے بڑے حوصلے سے جواب دیا:

"وزیر چاچا اگر ہمیں کسی نے بہکایا ہوتا تو اس کا نام بتا کر پہلے ہی اپنی جان چھڑا لیتے۔ یہ سب ہماری غلطی تھی۔ ہمیں معاف کر دیجیے!"

دیوراج نے انہیں معصوم سمجھتے ہوئے معاف کر دیا۔ تب مہارانی نے ایک اور پیش بندی کی۔ اس نے دیوراج کے پیروں میں بیٹھ کر کہا:

"وزیر چاچا۔ آپ نے ہمیں معاف کر دیا ہے تو ایک مہربانی اور کیجیے"۔

وزیر دیوراج نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا:

"کہو۔ کیا چاہتی ہو؟"

"وعدہ کیجیے کہ اس کا ذکر وزیر بابا سے نہیں کریں گے"۔ مہارانی نندی نے دیوراج سے التجا کرتے ہوئے کہا:

"وہ بہت سخت ہیں۔ نہ معلوم کیا کر بیٹھیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے"۔

دیوراج نے اسے زمین سے اٹھا کر کہا:

"اچھا نہیں کہوں گا" اس نے جان چھڑائی۔

"نہیں وزیر چاچا"۔ نندی نے ضد کی:

"آپ وعدہ کیجیے مجھ سے!"

"اچھا نہیں کہوں گا نندراج سے۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

"پکا وعدہ ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔ پکا وعدہ۔"

وزیر دیوراج نے اپنا وعدہ وفا کیا اور جب نندراج، کرناٹک کی جنگ حیدر علی خاں کے سپرد کر کے سرنگا پٹم سے واپس آ گیا تو دیوراج نے اس سے مہاراجہ اور مہارانی کی اس بغاوت کا کوئی ذکر نہ کیا۔

اس کے باوجود دیوراج کو یہ خیال تھا کہ نندراج سے یہ خبر چھپی نہ رہے گی اور کوئی نہ کوئی اسے ضرور بتا دے گا۔

پھر جب حیدر علی خاں کرناٹک سے نظام حیدر آباد کے خزانے کے اونٹ لے کر سرنگا پٹم آیا تو مہاراجہ اور مہارانی نے اس کے لیے آنکھیں فرشِ راہ کر دیں۔ وہ دونوں حیدر علی سے اس طرح جھک کے ملے کہ حیدر علی کو شرم آنے لگی۔

نندراج نے بھی اپنی بیٹی نندی اور داماد راجہ کرشن اوڈیر کے اس خلوص کو دیکھا اور دھوکہ کھا گیا۔ حیدر علی خاں بھی ایک دن سرنگا پٹم میں قیام کر کے اپنے علاقے ڈنڈیگل واپس چلا گیا۔

کرناٹک کے محاذ پر حیدر علی خاں کے زیرِ کمان ایک تو اس کی اپنی ڈنڈیگل کی فوج تھی اور دوسری سرنگا پٹم کی فوج تھی جو وزیر نندراج اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

ڈنڈیگل واپسی کے وقت حیدر علی خاں صرف اپنی فوج ساتھ لے گیا تھا اور سرنگا پٹم کی فوج سرنگا پٹم ہی میں رہ گئی۔ یہ فوج براہ راست دونوں وزیر بھائیوں کے ماتحت تھی۔

حیدر علی خاں کے ڈنڈیگل جاتے ہی سرنگا پٹم ایک بار پھر شورشوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ نندراج ایک پالیگار کے بیٹے کی شادی میں سرنگا پٹم سے باہر گیا ہوا تھا کہ شہر میں بغاوت پھوٹ پڑی۔

دیوراج سرنگا پٹم میں موجود تھا اسے معلوم ہوا کہ بغاوت دراصل سرنگا پٹم کی اس فوج نے کی ہے جو حیدر علی خاں کے ساتھ واپس آئی تھی۔

اس فوج کا سردار فوجدار گنگا رام تھا جس نے مہاراجہ اور مہارانی کو بھڑکا کے وزیر برادران کے

خلاف شورش برپا کی تھی۔

اس دوسری بغاوت کی ذمہ داری دیوراج پر بھی آتی تھی۔ اگر اس نے نندراج کو بتا دیا ہوتا کہ اس کی عدم موجودگی میں مہاراجہ اور مہارانی نے سرکشی کی تھی جسے راج محل پر توپ کے گولے پھینک کر ختم کیا گیا تھا تو اس اطلاع پر ممکن تھا کہ نندراج نے فوجدار گنگا رام کو ہٹا دیا ہوتا کیونکہ وہ شورش کے وقت سرنگا پٹم سے بھاگ گیا تھا اور شورش کے بعد سرنگا پٹم واپس آ کر اس نے دیوراج سے معافی مانگ لی تھی۔

بغاوت صرف سرنگا پٹم ہی میں نہیں بلکہ پورے میسور میں پھیل گئی تھی۔ گنگا رام اگرچہ پہلی شورش کے وقت سرنگا پٹم سے بھاگ گیا تھا لیکن اس نے دارالسلطنت سے دور رہ کر مختلف پالیگاروں کو وزیر برادران کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کر لیا تھا تاہم حیدر علی خاں کے سرنگا پٹم آنے سے اس نے بغاوت کو چند دنوں کے لیے روک دیا تھا۔

اب گنگا رام کے لیے میدان صاف تھا۔

حیدر علی خاں ڈنڈیگل واپس جا چکا تھا۔ نندراج سرنگا پٹم سے باہر تھا۔ مرہٹوں سے ساز باز کر کے اس نے انہیں سرنگا پٹم کے قریب بلوا لیا تھا۔

مرہٹے اس راستے پر سخت پہرہ دے رہے تھے جدھر سے نندراج کے واپس آنے کا امکان تھا۔ سرنگا پٹم کی فوج جو کرناٹک سے واپس آئی تھی اس کا اصل فوجدار گنگا رام ہی تھا۔ اسے فوج کو وزیر برادران کے خلاف بھڑکانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ حالانکہ اس فوج کو حیدر علی خاں نے حیدر آباد کے خزانے سے اپنے ذاتی سپاہیوں کی طرح برابر کا حصہ بھی دیا تھا۔

گنگا رام نے بغاوت کا علم بلند کر کے سب سے پہلے راج محل پر قبضہ کیا۔ مہاراجہ اور مہارانی اس کے پہلے ہی سے حلیف تھے۔ گنگا رام نے راج محل پر اس لیے قبضہ کیا کہ عوام میں دہشت پیدا ہو اور وہ بغاوت کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کریں۔

دوسرا کام دیوراج کی گرفتاری تھی۔ دیوراج کے جاسوس گنگا رام کی بغاوت کے بارے میں کوئی اطلاع نہ دے سکے مگر انہیں میسور کی سرحدوں پر مرہٹوں کے آنے کی خبر مل گئی تھی اور انہوں نے یہ خبر فوراً دیوراج کو پہنچا دی تھی۔

گنگا رام کا ایک فوجی دستہ دیوراج کو گرفتار کرنے اس وقت پہنچا جب دیوراج اپنے ایک خاص قاصد کو اپنا خط دے کر نندراج کے پاس بھیج رہا تھا۔ اس نے اپنے قاصد کو فوراً روانہ کر دیا۔ پھر

اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے اپنی گرفتاری دیدی۔

"ننّد راج کو گنگارام کی بغاوت کا پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ وہ سرنگاپٹم واپسی کا ارادہ کر رہا تھا کہ دیوراج کا قاصد اس کے پاس پہنچا۔

دیوراج نے اس سے استدعا کی تھی کہ وہ سرنگاپٹم بہت غور و فکر اور انتظامات کے بغیر ہرگز واپس نہ آئے اس لیے کہ میسور آنے والے تمام راستوں پر مرہٹوں نے پہرے بٹھا دیے ہیں۔ گنگارام نے مرہٹوں کا تعاون اس شرط پر حاصل کیا تھا کہ اگر وہ سرنگاپٹم کا وزیر مقرر ہو گیا تو وہ انہیں ریاست کی نصف آمدنی بطور خراج ادا کیا کرے گا۔

نندراج، دیوراج کا خط پا کر اور زیادہ ہوشیار ہو گیا۔ اس نے اپنے میزبان پالیگار کو تو یہ تاثر دیا کہ وہ سرنگاپٹم جا رہا ہے مگر وہ وہاں سے چل کے ایک دوسرے پالیگار کے پاس پہنچا جو اسے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد آدمی تھا اور نندراج کی دوستی کا دم بھرتا تھا۔ اس نے نندراج کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دونوں دوست بڑے تپاک سے ملے۔

"مہاراج نندراج۔ میں نے صبح کی پرارتھنا میں دعا مانگی تھی کہ بھگوان میرے دوست نندراج کو اپنی حفاظت میں رکھے اور اسے میرے پاس بھیج دے۔" نندراج کے دوست نے بڑی محبت کے ساتھ کہا۔

نندراج ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اس نے جواب دیا:

"بھگوان نے تمہاری دعا تو قبول کر لی مگر دوست! حالات کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔"

"مہاراج نندراج کو فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔" دوست نے سینہ تان کر کہا۔

"مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے دوست۔"

نندراج نے ٹھنڈی سانس لی:

"شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ دیوراج کو گرفتار کر لیا گیا ہے!"

"مہاراج نندراج۔ سرنگاپٹم کی اصل طاقت تم ہو۔ تمہاری موجودگی میں گنگارام زیادہ دن تک سرنگاپٹم پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔" دوست کی بات بالکل درست تھی لیکن اس وقت وہ بے دست و پا تھا۔

نندراج نے اپنے دوست کو بتایا:

"میں اس وقت بالکل مجبور ہوں۔ سرنگاپٹم پر گنگارام کا قبضہ ہے۔ سرکاری فوج اس کے قبضے میں ہے۔ میرے پیارے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ سرنگاپٹم جانے کے تمام راستوں کو بند کر دیا گیا ہے۔"

اس کے دوست نے بات کاٹی:

"تمام راستے کیسے بند ہو سکتے ہیں مہاراج نندراج۔ اگر آپ وہاں جانا چاہیں تو جب تک میں خود راستے نہیں دوں گا، تو میں آپ کو سرنگاپٹم تک اپنے فوجی دستے کے ساتھ پہنچا سکتا ہوں۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ میرے دوست۔" نندراج نے افسردگی سے کہا:

"تمہیں حالات کی سنگینی کا پوری طرح علم نہیں۔ اس وقت پوری ریاست کو مرہٹوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ گنگارام نے مرہٹوں سے معاہدہ کر لیا ہے۔ ان حالات میں سرنگاپٹم جانا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا مہاراج۔"

اس کا دوست بھی فکرمند ہو گیا:

"حالات خراب ہی نہیں، مخدوش ہیں مگر میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر کسی نے آپ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اسے میری لاش پر سے گزرنا ہو گا۔"

نندراج نے آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا:

"پرماتما کا شکر ہے کہ اس نے مجھے صحیح مقام پر پہنچایا۔ اب میں یہاں بیٹھ کے اطمینان سے کام کر سکوں گا۔"

"مہاراج نندراج۔ اگر ناگوار نہ ہو تو میں ایک مشورہ دوں۔"

"تم میرے محسن ہو دوست۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" نندراج نے بڑے پیار سے کہا۔

"میں نے سنا ہے آپ نے حیدر علی خاں اور شہباز پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ کیا اس موقع پر وہ آپ کا ساتھ نہیں دے سکتے؟"

"تم نے ٹھیک کہا دوست۔ اس صحیح مشورے کے لیے میں تمہارا شکرگزار ہوں۔" نندراج بہت خوش نظر آنے لگا تھا:

"اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے پاس آنے سے میرا مقصد کیا تھا۔ میں تمہارے جیسے ایک دوست کی شادی میں آیا تھا۔ وہیں مجھے دیوراج کا خط ملا۔ اس نے مجھے سرنگاپٹم آنے سے روک دیا۔

اس نے لکھا کہ اگر میں ادھر کا رخ کروں تو پوری تیاری کے ساتھ۔
ظاہر ہے کہ اس تیاری کے لیے مجھے سکون اور وقت درکار ہے مگر اس شادی کے گھر میں نہ مجھے سکون مل سکتا تھا اور نہ میں وہاں ٹھہرنا مناسب خیال کرتا تھا اس لیے میں نے وہ گھر فوراً چھوڑ دیا اور تمہاری پناہ میں آ گیا۔"

"نہ مہاراج نندراج۔ ایسا نہ کہیے"۔ دوست نے جواب دیا:
"یہ پناہ گاہ نہیں آپ کا گھر ہے۔ آپ یہاں رہ کر پوری تیاری کیجیے اور جب آپ کو پوری طاقت حاصل ہو جائے تو آپ سرنگاپٹم پر دھوم دھڑکے سے حملہ کیجیے۔ میں اور میری فوج آپ کے ساتھ ہوگی"۔

"پرماتما تمہیں ہمیشہ سکھی رکھے میرے دوست!"
نندراج نے اطمینان کا سانس لیا:
"میں حیدر علی خاں اور شہباز کو خط لکھ رہا ہوں۔ وہ دونوں بڑے وفادار بچے ہیں۔ اس وقت میرے ضرور کام آئیں گے"۔
وزیر نندراج نے حیدر علی خاں کو ایک طویل خط لکھا جس میں اس نے میسور کے اوڈیر خاندان کی پوری تاریخ بیان کی مگر موجودہ راجہ کرشن اوڈیر کی تخت نشینی کی پوری تفصیل رقم کی۔ آخر میں مہاراجہ میسور کا گنگا رام سے سازش کر کے وزیروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا، دیوراج کی گرفتاری اور اپنی دربدری کا حال تحریر کیا۔
نندراج نے حیدر علی خاں کو لکھا کہ اب اس کی مدد یا تو آسمان کا پرماتما کر سکتا ہے یا دنیا کا حیدر علی خاں۔

اس نے بند الفاظ میں حیدر علی خاں پر اپنے کیے ہوئے احسانوں کا بھی ذکر کیا اور لکھا کہ اگر تم خلوصِ دل سے میری مدد کرنا چاہتے ہو تو شہباز کو بھی اپنے ساتھ لے کر میرے پاس فوراً پہنچنے کی کوشش کرو۔

حیدر علی خاں اپنے محسن اور مربی کا خط پڑھ کر بے حد متاثر ہوا اور اقتدار کے آنے جانے کا خیال کر کے وہ رونے لگا۔ کہاں وہ نندراج جس کے اشارۂ ابرو سے پالیگاروں کی جاگیریں ختم ہو جاتی تھیں۔ جس کی نخرگھوں سے راج محل میں زلزلہ آ جاتا تھا ـــ وہی نندراج آج حیدر علی خاں سے مدد کا طلب گار ہوا تھا اور اس طرح جیسے سائل کسی کے دروازے پر دستک کرتا ہے۔

حیدر علی خاں نے اسی وقت ایک قاصد شہباز کے پاس بھیجا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ فلاں مقام پر پہنچ کر اس کا انتظار کرے۔
اس نے بڑے بھائی شہباز کو زور دے کر کہلوایا کہ اگر ہم نے اس وقت اپنے محسن کا ساتھ نہ دیا تو احسان اور مروّت کے الفاظ بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ مسلمانوں کو تاریخ احسان فراموشوں کے نام سے یاد کرے گی۔
شہباز کے پاس حیدر علی خاں کا قاصد پہنچا اور اس نے میسور کا حال بیان کر کے حیدر علی کے جوش و جذبہ کی تفصیل بیان کی تو شہباز اسی وقت اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج کو دو گھنٹے کے اندر اندر تیار ہونے کا حکم دیا۔
پھر ـــ وہ شام سے پہلے پہلے اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا جس جگہ پہنچ کے اسے حیدر علی کا انتظار کرنا تھا۔
شہباز نے اپنی طرف سے بہت جلدی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ حیدر علی کو اس سے زیادہ لشکر لے کے آنا ہے اس لیے اس کے آنے میں تاخیر ہوگی اور اسے حیدر علی خاں کے آنے کا دو تین دن انتظار کرنا پڑے گا مگر جب شہباز مقامِ مقصود پر پہنچا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
حیدر علی خاں معہ اپنے لشکر کے وہاں موجود تھا۔

دونوں بھائیوں نے مشورہ کر کے صرف چار گھنٹے کے لیے فوجوں کو آرام دینے کا فیصلہ کیا۔
ان چار گھنٹوں کے دوران ان کی فوجوں کے رسالدار اور حوالدار وغیرہ اپنے اور اپنے ماتحت لشکریوں کے اسلحہ کو دیکھتے رہے اور آرام کا وقت ختم ہوتے ہی دونوں لشکر سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو گئے۔
حیدر علی خاں نے روانگی سے قبل دو تیز رفتار قاصدوں کو دو اطراف میں روانہ کیا۔ ایک قاصد کو وزیر نندراج کے پاس اس اطلاع کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہے اور کوئی فکر نہ کرے۔ حیدر علی خاں مناسب وقت پر اس کے پاس آئے گا اور اپنی خدمات کا ذکر کرے گا۔
حیدر علی خاں نے دوسرا قاصد سرنگاپٹم گھیرنے والے مرہٹہ سردار کے پاس بھیجا تھا۔ اسے

یہ پیغام دے کر بھیجا گیا تھا کہ ریاست میسور کی سرزمین اور خاص کر سرنگا پٹم حیدر علی خاں اور شہباز کے لیے اسی طرح متبرک اور پاک ہے جس طرح ماں کی گود ہوتی ہے۔ مرہٹہ سردار کو معلوم ہونا چاہیے کہ میسور کے دو بیٹے یعنی حیدر علی خاں اور شہباز آغوشِ مادر کی طرف آ رہے ہیں اور بہتر ہے وہ سرنگا پٹم کا محاصرہ اٹھا کر فوراً اپنے مقام کی طرف واپس جائیں ورنہ انہیں حیدر علی اور شہباز کی تلواروں سے ٹکرانا پڑے گا۔

اللہ اللہ! فتح محمد کے دونوں بیٹوں کی کیا شان تھی اور اتنی سی عمر میں ان کا کیا دبدبہ تھا کیا رعب تھا۔

جب مرہٹہ سردار کو حیدر علی خاں کا پیغام ملا تو وہ سرنگا پٹم کا محاصرہ ختم کر کے اپنے مستقر کی طرف واپس ہو گیا۔

اب حیدر علی خاں اور شہباز کے لیے راستہ صاف تھا۔ چنانچہ دونوں اپنے اپنے لشکر کے ساتھ بغیر کسی مدافعت کے سرنگا پٹم کی حدود میں داخل ہو گئے۔

حیدر علی خاں سرنگا پٹم کی سرحد میں صرف داخل ہوا، آگے نہیں بڑھا اور وہیں پر پڑاؤ ڈال دیا۔

حیدر علی خاں جس قدر بہادر شمشیر زن تھا اتنا ہی بڑا مدبر اور متحمل مزاج بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم خونریزی ہو۔ گنگا رام اپنے باغی لشکر کے ساتھ اس کے سامنے آ کے خیمہ زن ہوا۔

حیدر علی خاں اور شہباز کا خون یقیناً کھول اٹھا ہو گا مگر حیدر علی نے تحمل کا ثبوت دیا اور پہرہ چوکی درست کر کے گنگا رام کی طرف سے پہل کا انتظار کرنے لگا۔

گنگا رام کے زیرِ کمان اگرچہ ایک بڑی فوج تھی۔ ریاستی فوج کے علاقہ میسور کے اندر اور باہر کے بہت سے پالیگار اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ گنگا رام کی حمایت میں اس کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔

حیدر علی دو دن تک خاموش رہا۔

اس دوران اس نے اپنے طور پر اعلان کرا دیا کہ جو باغی واپس آ جائیں گے انہیں معاف کر کے ان کے عہدے پر برقرار رکھا جائے گا۔

یہ اعلان اگرچہ حیدر علی نے اپنے لشکر میں کرایا تھا لیکن اعلان کا ایک ایک لفظ دوسری جانب پہنچ گیا۔ سودا بیچنے والوں کو حیدر علی نے لشکر گاہ میں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ دودھ

دہی والے، سبزی اور اجناس فروخت کرنے والے اور سوداگروں کے بھیس میں گنگا رام کے آدمی حیدر علی کے لشکر میں چکر لگاتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے ذریعے حیدر علی کا معافی کا اعلان گنگا رام کی فوج تک پہنچا۔

اعلان کے تیسرے دن سے میسور کے لشکری ایک ایک دو دو کر کے حیدر علی کے کیمپ میں آنے لگے۔ اس کے بعد ان کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔

گنگا رام اس صورتِ حال سے کافی پریشان ہوا مگر جنگ میں پہل کرنے یا شب خون مارنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔

حیدر علی نے ایک ہفتے تک یہی حکمتِ عملی برقرار رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گنگا رام اپنا ٹھاٹ لے کر دو میل پیچھے ہٹ گیا۔

حیدر علی نے صرف اتنا کیا کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ اس مقام پہ چلا گیا جہاں گنگا رام مورچے لگائے پڑا تھا۔

اب اس نے ایک اور اعلان کیا۔

یہ اعلان گنگا رام اور ان پالیگاروں کے نام تھا جو اپنی فوجیں لے کر گنگا رام کی مدد کو آئے تھے۔ اعلان یہ تھا کہ جو پالیگار گنگا رام کا ساتھ چھوڑ دے گا وہ حیدر علی کا دوست ہو گا۔ اسی طرح گنگا رام کے لیے یہ اعلان کیا گیا کہ اگر وہ بغاوت سے توبہ کر کے حیدر علی کے پڑاؤ میں آ جائے تو حیدر علی نہ صرف اس کی جان بخشی کر دے گا بلکہ اسے فوجدار کے عہدے پر بھی برقرار رکھے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ گنگا رام منہ چھپا کے کسی طرف نکل جائے۔ اس کی تلاش نہ ہو گی اور اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ گیا تو اسے قتل نہ کیا جائے گا۔

حیدر علی خاں کے دوسرے اعلان نے باغیوں میں بہت بددلی پیدا کر دی۔ پالیگار یہ سوچنے لگے کہ اگر گنگا رام انہیں چھوڑ کے کسی اور طرف نکل گیا تو حیدر علی انہیں اور ان کے علاقوں کو پھونک کر رکھ دے گا۔

یہی حال ان لشکریوں کا تھا جو حیدر علی کے ہاتھ سے کرناٹک کے معرکہ میں انعام حاصل کر چکے تھے۔ پس پالیگار اکٹھے ہو کر سیدھے گنگا رام کے پاس گئے اور اس سے فوری طور پر جنگ شروع کرنے کا مطالبہ کیا:

"فوجدار صاحب! اگر آپ متحدہ لشکر چھوڑ کے چلے گئے تو آپ کی جان تو بچ جائے گی مگر ہم

لوگوں کا کیا بنے گا؟" ایک پالیگار نے صاف الفاظ میں کہا۔

دوسرے پالیگار کا لہجہ اور سخت ہو گیا:

"اگر آپ فوراً جنگ نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں واپس جانے دیجیے۔ ہمیں آپ کیوں مروانا چاہتے ہیں؟"

تیسرا پالیگار بالکل ہی بے قابو ہو گیا:

"فوجدار صاحب۔ اگر آپ میں حیدر علی خاں اور شہباز سے مقابلے کی جرأت موجود نہیں تھی تو آپ نے بغاوت کیوں کی۔ کس بھلے مانس نے کہا تھا کہ آپ حیدر علی سے جنگ کریں جس کے سامنے سے فرانسیسی بھی بھاگ گئے تھے؟"

"میں بتاتا ہوں تمہیں اس بغاوت کی وجہ ــــ" ایک اور پالیگار جو گنگارام سے بالکل ہی باغی ہو گیا تھا، بولا:

"یہ سب تریاہٹ اور راج ہٹ کا معاملہ ہے۔ جب یہ دو ہٹیں اکٹھی ہو جائیں تو قیامت کا آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مہاراجہ میسور نے اعلان کیا ہو گا کہ وہ دونوں وزیروں نند راج اور دیوراج کے اقتدار کو نہیں مانتے۔ اس طرح رانی میسور نے ضد کی ہو گی کہ وزیر برادران اسے "مہارانی میسور" کیوں نہیں سمجھتے۔ بس پھر مہاراجہ اور مہارانی کی شہ پر گنگارام نے بغاوت کر دی۔ اگر حیدر علی سے لڑنے کی طاقت نہیں تھی تو پھر بغاوت کا شوشہ کیوں چھیڑا گیا!"

گنگارام نے آخر مجبور ہو کے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس ہفتہ کے دوران گنگارام کے تقریباً دو سو سوار اور پیادے حیدر علی خاں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ گنگارام نے بہت سے اور پالیگاروں کو بھی معہ ان کی فوجوں کے بلوایا تھا مگر بعض تو ٹال گئے اور کوئی جواب نہ دیا اور بعض نے صاف لکھ بھیجا کہ:

"ہماری حیدر علی سے کوئی مخالفت نہیں۔ وہ ایک بہادر سردار ہے۔ اگر اس نے ہمیں بلایا ہوتا تو ہم ضرور اُس کی مدد کو پہنچتے۔"

گنگارام کا دل حیدر علی کا اعلان سنتے ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے لشکر میں بے چینی اور پالیگاروں بھیجے ہوئے خطوط کے سخت جوابات نے اس کے حوصلے اور پست کر دیے۔ پھر بھی اسے اپنے لشکر [illegible] تعداد کا زعم تھا۔ اس کا لشکر حیدر علی کے لشکر سے ڈیڑھ گنا تھا [illegible] اس میں تقریباً وہ تمام پیدل اور سوار شامل تھے جو حیدر علی کی [illegible] داری میں جنگ کرنے کے [illegible] نہ تھے۔

گنگارام کو اطلاع دی گئی تھی کہ حیدر علی اب تک اپنی جگہ پر ٹھہرا ہوا ہے۔
گنگارام نے اس سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ حیدر علی اس کے مقابلے پر آنے سے کترا رہا ہے کیونکہ اس کی فوج کم ہے اور اسے شکست کا خطرہ ہے۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے بعض با اعتماد سرداروں سے بات کی تو انہوں نے فوراً اس کے خیال کی تائید کی۔

انہوں نے اپنے مفاد میں گنگارام کی ہاں میں ہاں ملائی اور گنگارام نے فوراً ہی انہیں اگلے درجے میں ترقی دے دی۔

حیدر علی کے مقابلے پر جاتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کے قریب پہنچنے سے پہلے اس پر شب خون مارے گا پھر آگے قدم اٹھائے گا۔ مگر جب وہ اپنے پڑاؤ سے حیدر علی کی طرف روانہ ہوا تو نصف منزل کا سفر طے کرنے کے بعد ہی اس کے ایک جاسوس نے آ کر اطلاع دی کہ حیدر علی کا لشکر بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور آج رات تک وہ گنگارام کے لشکر تک پہنچ جائے گا۔

اس خبر نے گنگارام کے ہاتھ پیر پھلا دیے اور اس کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس نے لشکر کو رکنے کا حکم دیا اور کچھ سرداروں کو ساتھ لے کر کسی معقول مقام کی تلاش میں نکلا جہاں وہ حیدر علی کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔

اس کی حسبِ مرضی اسے تھوڑی ہی دور پر ایک معقول میدانِ جنگ مل گیا۔ یہ ایک پہاڑی نالہ تھا جس میں تمام سال کچھ نہ کچھ پانی رہتا تھا۔

اس نے نالے کو پار کیا۔ پھر کچھ حصہ چھوڑ کے اپنے مورچے لگا دیے۔

حیدر علی خاں اس تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ شام ہوتے ہی اس کے ہراول دستے نظر آنے لگے۔

گنگارام چاہتا تو حیدر علی کے تھکے ماندے لشکر کو آرام نہ کرنے دیتا اور فوراً اس پر حملہ آور ہو جاتا مگر وہ بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھا۔

حیدر علی خاں نے نالے پر پہنچ کر گنگارام کے لشکر پر نظر ڈالی جو دوسری طرف [illegible] چھوڑ کے مورچے لگائے بیٹھا تھا۔ گنگارام کی پشت پر ایک پہاڑی تھی جہاں اس نے اپنے [illegible]

بٹھا رکھے تھے۔

حیدر علی نے نالے سے تھوڑا ہٹ کے خیمے لگانے کا حکم دیا۔ اس نے خیمے اس طرح لگوائے کہ ان کی ایک دیوار سی بن گئی۔ خیموں کی پشت نالے کی سمت اور کھلا ہوا حصہ دوسری طرف تھا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی خاں اور شہباز جنگی حکمتِ عملی پر غور کرتے رہے۔ پھر نہ جانے انہوں نے کیا طے کیا کہ فوراً ہی تمام روشنیاں گل کر دی گئیں اور پوری خیمہ گاہ پر موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

گنگا رام کو خود بھی شب خون کا خطرہ تھا اس لیے اس نے لشکر کے دائیں بائیں پہرہ لگوا دیا تھا مگر رات خیریت سے گزری اور صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ شب خون کا خطرہ ٹل گیا۔ گنگا رام کے رات کے پہریدار منہ ہاتھ دھونے یا تو نالے کے اندر اتر گئے یا پھر رات بھر کے تھکے ہوئے اپنے خیموں میں جا کے سو گئے۔

گنگا رام انگڑائی لے کے اٹھا ہی تھا کہ اس کے لشکر کے دائیں بائیں سے چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔

وہ گھبرا کے باہر آیا تو اس پر کھلا کہ حیدر علی کی فوج نے سامنے کی طرف خیمے لگا کر اسے دھوکا دیا اور اس دیوار کی آڑ لے کر اس کا پورا لشکر دائیں بائیں سے نالہ پار کر کے اس کے سر پر پہنچ گیا ہے۔

حیدر علی نے حملے کا وقت بھی بہت سوچ کے مقرر کیا تھا۔ اگر وہ رات کو نالہ پار کرتے ہی گنگا رام پر حملہ کر دیتا تو اسے پہلے رات کے پہریداروں سے الجھنا پڑتا۔ اس دوران باقی لشکر تیار ہو کر مقابلے پر آ جاتا۔

حملہ آور فوج کی کمان حیدر علی اور شہباز کے ہاتھ میں تھی۔ حیدر علی نے مقابلہ کی صورت پیدا کرنے کے لیے شہباز کی پوری فوج کو اسی کی کمان میں دے دیا تھا اور شہباز نے گنگا رام کے بائیں جانب سے نالہ پار کیا تھا جبکہ حیدر علی اپنی فوج کے ساتھ دائیں طرف سے نالہ عبور کر کے دوسری طرف پہنچا تھا۔

حیدر علی نے شہباز کو سمجھا دیا تھا کہ وہ نالہ پار کر کے گنگا رام کے لشکر پر اس وقت تک حملہ نہ کرے جب تک دشمن کے محافظ دستے اپنے اپنے خیموں میں واپس نہیں چلے جاتے۔

اس نے یہ بھی تاکید کی تھی کہ خواہ سویرا ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن محافظوں کے جانے سے پہلے ہرگز حملہ نہ ہو۔

صبح کو جب سورج نکل آیا اور دور کا آدمی دکھائی دینے لگا تو حیدر علی خاں حملہ کرنے کے لیے تیار ہوا۔

اس کی جانب کے پہریدار خیموں میں واپس جا چکے تھے۔ یہ حملہ کا بہترین وقت تھا لیکن حیدر علی حملہ نہ کر سکا۔ اسے خود پر جبر کرنا پڑا۔

دراصل رات میں یہ طے ہوا تھا کہ حملہ کا آغاز شہباز کی طرف سے ہوگا اور اس کے حملہ کے بعد ہی حیدر علی بھی دوسری طرف سے اس حملے میں شریک ہو جائے گا۔

شہباز کی طرف سے حملہ کرنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ اُس طرف کے پہرے دار جب پہرہ ختم کر کے خیموں کی طرف واپس جا رہے تھے تو دوسری طرف گنگا رام کے دو لشکری باتیں کرتے ہوئے اس جگہ آ کر کھڑے ہو گئے جہاں پہریدار کھڑے تھے۔ اس وجہ سے انہیں کافی دیر ہو گئی اور دھوپ بھی نکل آئی۔

آخر شہباز نے حملہ کا حکم دیا اور سب سے پہلے اس نے کمین گاہ سے نکل کر ان دونوں باتونیوں پر حملہ کیا جنہوں نے اسے دیر کرا دی تھی۔ اُن میں سے ایک تو چیختا چلاتا بھاگ پڑا مگر دوسرا شہباز کے قابو آ گیا اور جہنم رسید ہوا۔

چند ہی لمحوں میں شہباز کی فوج نالا کے اوپر آ کر دشمن پر حملہ آور ہو گئی۔ دوسری طرف سے حیدر علی بھی نکل کے سامنے آ گیا۔

گنگا رام نے باہر نکلتے ہی حملے کا اندازہ کر لیا تھا اور اس نے چیخ چیخ کے لشکریوں کو تیار ہونے کا حکم دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے لشکری جلدی جلدی تیار تو ہو گئے لیکن اس وقت تک اس کی فوج کے کافی آدمی مارے جا چکے تھے۔

جنگ شروع ہو گئی تھی لیکن کوئی صف بندی نہ تھی۔ جو جس جگہ تھا وہیں کھڑے کھڑے لڑ رہا تھا۔ حیدر علی نے گھوڑوں کو خیمہ گاہ ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ گنگا رام کے پاس گھوڑے تو تھے مگر اتنا موقع نہ تھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو سکے۔

جنگ نے زیادہ طول نہ کھینچا مگر جتنی دیر بھی ہوئی بڑی شدید اور خونریز جنگ ہوئی۔ گنگا رام کے وہ فوجی بے انتہا بہادری سے لڑے جو کرناٹک کے محاذ پر حیدر علی کے ساتھ تھے۔ انہوں نے حیدر علی خاں کے ہاتھ سے اس خزانے میں حصہ بھی پایا تھا جسے حیدر علی نے فرانسیسیوں سے چھینا تھا۔ وہ اس لیے بھی جان توڑ کر لڑ رہے تھے کہ شکست کی صورت میں انہیں معافی ملنا ناممکن تھا۔

دو گھنٹے تک جم کے لڑائی لڑی گئی۔ پھر گنگارام کے وہ لشکری میدان سے کھسکنے لگے جو اُس نے دوسرے علاقوں سے بھرتی کیے تھے۔ وہ تو لوٹ مار کے لیے فوج میں آئے تھے مگر یہاں تو حیدر علی کے سپاہی موت کی طرح ان کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ بھاگتے نہ، تو انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔

گنگارام نے لشکریوں کو بھاگتے دیکھا تو اسے اپنی جان بچانے کی فکر ہوئی۔ حیدر علی خاں نے شہباز کو آواز دی:

"بڑے بھائی! گنگارام بچ کے نہ جانے پائے۔ اسے زندہ گرفتار ہونا چاہیے"۔

شہباز کی تیز نگاہوں نے گنگارام کو تلاش کر لیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور بھاگ کے نکل جانا چاہتا تھا کہ شہباز اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"گنگارام۔ دل کا ارمان نکال لے۔ میں تجھے پہلے وار کرنے کا موقع دیتا ہوں"۔ شہباز نے اسے مقابلے کی دعوت دی۔

گنگارام پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ شہباز کی آواز نے اسے لرزا دیا مگر اسے پہلے وار کا موقع دیا گیا تھا اس لیے اس نے وقت ضائع نہ کیا اور کلائی میں پوری طاقت سمیٹ کر شہباز پر حملہ آور ہوا۔

شہباز نے اس کا وار خالی دیا مگر وہ تجربہ کار تھا، اس نے فوراً ہی پلٹ کے دوسرا وار کر دیا۔ پھر تیسرا اور چوتھا۔ گنگارام نے اپنے مسلسل حملوں سے شہباز کو زخمی کرنے کی بہت کوشش کی مگر شہباز نے ایک بھی زخم نہ کھایا۔

شہباز کو کئی موقعے ملے کہ اگر وہ چاہتا تو گنگارام کے دو ٹکڑے کر سکتا تھا لیکن اسے حیدر علی کے الفاظ بار بار یاد آ رہے تھے کہ:

"گنگارام کو زندہ گرفتار ہونا چاہیے"۔

آخر اسے ایک موقع مل ہی گیا۔

گنگارام شاید تھک گیا تھا۔ اس کا ایک وار شہباز کو بہت ہی بدکا محسوس ہوا تو فوراً ہی اس کے وار کو ڈھال کے بجائے اپنی تلوار پر لینا شروع کر دیا۔ پھر ایک بار اس کی تلوار کو اپنی تلوار میں الجھا کر جو زور سے جھٹکا دیا تو گنگارام کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔

اس کے ساتھ ہی گنگارام، شہباز کے قدموں میں جھک گیا:

"تمہیں اپنے خدا کی سوگند۔ رسولؐ کی سوگند۔ میری جان نہ لو"۔ وہ شہباز کے قدموں پر پڑا

گڑگڑا رہا تھا۔

"گنگارام۔ میں تجھے ماروں گا نہیں بلکہ حیدر علی خاں کے سامنے پیش کر دوں گا"۔

شہباز نے تلوار میان میں کر لی۔

گنگارام کو گرفتار کر لیا گیا۔

جنگ ختم ہو گئی۔

میسور کے جن پالیگاروں نے گنگارام کا ساتھ دیا ان میں سے دو پالیگار میدانِ جنگ میں مارے گئے۔ باقی جان بچا کے بھاگ گئے۔

حیدر علی خاں نے فوراً اعلان کر دیا کہ جو تلوار پھینک دے گا اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔



حیدر علی خاں کی دوسری شادی نے اس کی قسمت پلٹ کے رکھ دی

یہ شادی حیدر علی کی پہلی معذور بیوی کے بے حد اصرار پہ ہوئی تھی۔ فاطمہ بیگم عرف فخر النساء کرم کنڈہ کے نواب میر معین الدین خاں کی صاحبزادی تھیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ حیدر علی خاں کی پہلی شادی میسور کے وزیر سلطنت نندراج اور حیدر علی کے بڑے بھائی شہباز نے بڑی دھوم دھام سے کی تھی لیکن حیدر علی کو یہ شادی راس نہ آئی اور ان کی بیوی ایام زچگی میں احتیاط نہ کرنے کے باعث معذور ہو گئیں۔

چنانچہ دوسری شادی پہ حیدر علی نے انتہائی سادگی اختیار کی۔ شاید خدا کو اس کی یہ سادگی پسند آئی اور اس کا ستارہ بلندیوں کی طرف رواں ہو گیا۔

شادی کے چھ سال بعد یعنی ۱۷۵۱ء میں فاطمہ بیگم کی گود میں وہ لعل بے بہا چمکا جس کا نام ٹیپو سلطان ہے اور جس کی بہادری کے پرچم برصغیر سے نکل کر ایران اور برطانیہ میں بھی گونجنے لگے۔

اسی دوران فوجدار گنگا رام کی بغاوت نے ریاست کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ گنگا رام کو مرہٹوں کی حمایت حاصل تھی۔

دوسری طرف میسور کے راجہ کرشن اوڈیر نے بھی گنگا رام کی بغاوت سے پورا فائدہ اٹھایا وہ ہمہ وقت اپنے بادشاہ گر وزیروں سے نجات حاصل کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا چنانچہ

میسور کے وزیروں کے خلاف گنگا رام کی بغاوت کو راجہ میسور کی پشت پناہی حاصل رہی۔

یہ بغاوت بڑی زبردست تھی۔

پورے ملک میں افراتفری پھیل گئی۔ نندراج پہ سرنگاپٹم کے دروازے بند ہو گئے تھے لیکن اسی وزیر کی عقلمندی اور حیدر علی خاں کی بہادری نے میسور کو تباہی سے بچا لیا۔

نندراج نے حیدر علی سے مدد طلب کی اور حیدر علی نے دو ماہ کے اندر اندر بغاوت کو فرو کر دیا اور گنگا رام کو پابجولاں سرنگاپٹم لایا گیا۔

مرہٹوں اور گنگا رام کا ساتھ دینے والی فوجوں نے ایسی زبردست شکست کھائی کہ مرہٹوں کو سر پہ پیر رکھ کر بھاگتے ہی بنی۔

نندراج فاتحانہ سرنگاپٹم میں داخل ہوا۔ حیدر علی خاں نے باغی گنگا رام کو نندراج کے سامنے پیش کیا۔

حیدر علی نے نندراج سے کہا:

"وزیر محترم۔ آپ کا مجرم حاضر ہے۔ اپنی تلوار سے اس کا سر قلم کر دیجیے"۔

نندراج نے حقارت سے گنگا رام کو دیکھا:

"او نمک حرام۔ تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ ابھی نندراج زندہ ہے اور وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کا شیر دل محسن اور مربی حیدر علی خاں بھی زندہ ہے"۔

گنگا رام گڑگڑایا: "پردھان منتری! میری جان بخشی کر دیجیے۔ زندگی بھر آپ کی غلامی میں رہوں گا"

"یہ اسی غلامی کا نتیجہ ہے کہ تو ہمارے سامنے کھڑا ہوا" نندراج نے غصے سے بولا:

"آخر تجھے بغاوت کی جرأت کیسے ہوئی۔ یہ سبق تجھے کس نے پڑھایا؟"

"مہاراج۔ مجھے مہاراجہ اور مہارانی نے بغاوت کے لیے کہا تھا۔ وہ آپ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔

گنگا رام نے پورا الزام مہارانی اور مہاراجہ کے سر تھوپ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر مہارانی اور مہاراجہ نے تجھے بھڑکایا تھا تو کل تجھے ان ہی کی تلوار سے قتل کروایا جائے گا"۔

پھر نندراج نے حیدر علی سے کہا:

"کل اس دو غلے اور مکار کو راج محل میں پیش کیا جائے۔ ہم مہارانی اور مہاراجہ سے اس کی گردن اڑوائیں گے۔"

"ٹھیک ہے وزیرِ محترم!" حیدر علی نے جواب دیا:

"مگر میرا خیال ہے کہ مہارانی آپ کی بیٹی ہیں اور اس جرم میں وہ بھی شریک ہیں۔"

نندراج نے چونک کر حیدر علی کو دیکھا:

"میرے بہادر سپہ سالار۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہماری بیٹی اس جرم میں برابر کی شریک ہے اس لیے اسے بھی گنگا رام کے برابر سزا ملنی چاہیے۔"

حیدر علی خاں نے جیسے نندراج کو یاد دلایا:

"وزیرِ محترم۔ اگر مہارانی برابر کی شریک ہیں تو مہاراجہ کرشن اوڈیر بھی اس بغاوت میں برابر کے شریک ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے میرے مرتی۔" نندراج نے فوراً کہا:

"جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے کل ہم گنگا رام کے ساتھ ان دونوں کے قتل کا حکم بھی دیں گے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"اس قدر طیش میں نہ آیئے وزیرِ محترم!"

حیدر علی خاں نے مصالحانہ رویہ اختیار کیا:

"ہم اور آپ دونوں ہی ریاست میسور کے ملازم اور راجہ کرشن اوڈیر کی رعیت ہیں اور رعیت اپنے بادشاہ کے قتل کا حکم نہیں دیا کرتی۔"

نندراج کا منہ اتر گیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا:

"اس کم ظرف کو کل راج محل میں حاضر کیا جائے۔"

پھر اس نے حیدر علی کی طرف گھوم کے کہا:

"تم ریاست میسور کے افق پر چمکنے والے ستارے ہو، ہمیں تم پر ناز ہے۔ کل راج محل آ جانا۔ جیسا چاہو گے ویسا ہی کیا جائے گا۔"

حیدر علی خاں گھر پہنچا تو وہاں ایک نیا شگوفہ کھلا دیکھا۔ حیدر علی نے سرنگا پٹم کے محلے

دیوان پیٹھ میں اپنا گھر بنایا تھا۔ وہاں قلعہ نما ایک پرانی حویلی تھی۔ حیدر علی نے اسے ٹھیک کرا کے اس کے گرد فصیل نما اونچی دیوار تعمیر کرا دی تھی اور فصیل کے ساتھ گہری خندق کھدوا کر اس میں پانی بھروا دیا تھا۔

یہ سب اس نے احتیاطاً کیا تھا۔ شخصی حکومتوں میں کسی وقت بھی انقلاب آ سکتا تھا۔ یہ تدبیر اس نے اسی لیے کی تھی۔

حیدر علی خاں نے اپنی حویلی کے باہر ایک گھوڑا گاڑی کھڑی دیکھی جس کی کھڑکیوں پر نہایت قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے۔ گاڑی بان کی نشست پر ایک مضبوط جسم کا سیاہ فام جوان بیٹھا تھا ادھر حیدر علی گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا قد چھ فیٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ چھریرا بدن، چوڑا سینہ، بھرے بھرے بازو، کھلتا ہوا گندمی رنگ، لانبی چمکدار آنکھیں۔

سیاہ فام گاڑی بان کی نظر اس لانبے چوڑے، پُر رعب سوار پر پڑی تو گاڑی سے کود کر کھڑا ہو گیا۔ ہندوؤں کے انداز میں سر جھکا کر حیدر علی کو سلام کیا۔

اسی وقت حویلی کا نیزہ بردار دربان بھاگتا ہوا حیدر علی کے پاس پہنچا اور جھک کے اپنے آقا کو سلام کیا۔ افغان ہونے کے ناطے حیدر علی کی مادری زبان فارسی تھی۔ وہ اگرچہ اَن پڑھ تھا لیکن فارسی کے علاوہ تمام مروجہ زبانیں، دکنی، اردو، کنڑی، تامل، مرہٹی اور تلنگی میں بھی بخوبی گفتگو کر لیتا تھا۔

حیدر علی کا دربان شمالی علاقے کا تھا اور اردو بولتا تھا۔ حیدر علی خاں نے اس سے اردو میں سوال کیا:

"کون آیا ہے؟"

"ایک لڑکی ہے میرے آقا!" دربان نے ادب سے جواب دیا۔

"کس کی لڑکی ہے؟" حیدر علی گھوڑے سے اتر پڑا۔

"جی آقا۔ وہ فوجدار گنگا رام ہے نا۔"

"اس کی لڑکی ہے؟" حیدر علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ اور گھوڑے کی لگام دربان کو پکڑا کے حویلی کے صدر دروازے میں داخل ہوا۔

دربان اس کے پیچھے پیچھے گھوڑا پکڑے آ رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا:

"جی ہاں آقا۔ اس نے بتایا کہ وہ فوجدار گنگا رام کے گھر سے آئی ہے۔ میں نے جا کے بیگم صاحبہ

کو بنایا۔ انہوں نے بلا لیا۔ میں اسے ابھی اندر چھوڑ کے آیا ہوں"۔

دروازے کے اندر تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر حویلی کی راہداری میں جانے کے لیے سیڑھیاں بنی تھیں۔ سیڑھیاں طے کر کے حیدر علی راہداری میں آ گئے۔ راہداری میں تیسرا کمرہ ان کی بیگم یعنی فاطمہ خانم کا تھا۔

حیدر علی کا بیٹا فتح علی ٹیپو آٹھ نو سال کا ہو چکا تھا مگر وہ باپ کے ساتھ مردانہ میں سوتا تھا۔ حیدر علی کی رہائش حویلی کی پشت کے کمروں میں تھی۔ ٹیپو اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ زنانہ حصہ میں آنے کی اسے اجازت نہ تھی۔

جمعہ کے دن ٹیپو، باپ کے ساتھ ماں سے ملنے آتا تھا۔ اس وقت زنانے حصے سے تمام مہمان خواتین کو رخصت کر دیا جاتا تھا۔

حیدر علی اولاد کے معاملے میں بڑا سخت تھا۔ اس نے خود تو تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن ٹیپو کے لیے بہترین استاد مقرر کیے تھے جو مروجہ تعلیم کے علاوہ فنونِ سپہ گری میں بھی اسے تربیت دے رہے تھے۔

یہ اسی تربیت کا اثر تھا کہ جس نے ٹیپو سلطان کو اس کم عمری ہی میں ایک اچھا شہسوار اور شمشیر زن بنا دیا تھا۔ دوسری طرف اس میں سنجیدگی کی ایک لہر بھی سما گئی تھی جس سے ٹیپو اپنی عمر سے کہیں بڑا معلوم ہوتا تھا۔

حیدر علی کہاں تو بیوی کی طرف جا رہے تھے اور کہاں راہداری میں رک گئے۔ ایک لمحہ کچھ سوچا۔ پھر راہداری کی دوسری سمت چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ ان کی اور ان کے بیٹے کی رہائش گاہ کی طرف جاتا تھا۔ حویلی کی دوسری طرف ایک بڑا میدان تھا جہاں ٹیپو سلطان تیر و تفنگ کی تربیت لیا کرتا تھا۔

ٹیپو اس وقت بھی شمشیر زنی کی عملی مشق میں مصروف تھا۔

وہ ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا اور اس کا استاد منعم خان مشکی گھوڑے پر سوار تھا۔ دونوں کی تلواریں آپس میں ملی ہوئی تھیں اور منعم خان، ٹیپو سلطان کو دشمن کی تلوار میں تلوار الجھا کر اس کی تلوار نیچے گرانے کی تربیت دے رہا تھا۔ منعم خان کو خاص طور پر ٹیپو سلطان کی تربیت کے لیے افغانستان سے بلایا گیا تھا۔

منعم خان کی نظر آتے ہوئے حیدر علی پر پڑی تو اس نے سرگوشی کی:

"ٹیپو۔ تمہارے خان بابا آ رہے ہیں!"

ٹیپو نے آہستہ سے اپنی تلوار پیچھے کھینچی اور گھوڑا گھما کر باپ کی طرف چلا۔ حیدر علی راہداری سے اتر کر میدان میں آ چکا تھا۔

"خان بابا۔ آپ اس وقت کیسے آ گئے۔ خیریت تو ہے؟" ٹیپو سلطان نے گھوڑے سے اتر کر سوال کیا۔

"شہزادے بیٹے!"

حیدر علی، ٹیپو کو بچپن ہی سے شہزادے یا سلطان کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے، انہوں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھ کے کہا:

"ہم تمہاری ماں کے پاس جا رہے تھے کہ اچانک خیال آیا کہ یہ وقت عملی تربیت کا ہے۔ بس ہم ادھر چلے آئے"۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں خان بابا"۔

ٹیپو نے بھولپن سے کہا:

"آپ میرا کس قدر خیال رکھتے ہیں!"

"شہزادے۔ ہم تمہارا نہیں، بلکہ اپنا خیال رکھتے ہیں"۔

حیدر علی خان اگرچہ ان پڑھ تھے مگر ان کی صحبت پڑھے لکھے لوگوں سے تھی اس لیے وہ اکثر فلسفیانہ گفتگو کرنے لگتے تھے:

"شاید تم یہ بات نہ سمجھ سکو۔ میں تمہیں دوبارہ سمجھاتا ہوں۔ آج تم بچے ہو اور میں تمہارا بزرگ مگر تم نہ ہمیشہ بچے رہو گے اور نہ میں تمہارا بزرگ رہوں گا۔ کل تمہیں جوان ہونا ہے اور میری خالی جگہ کو پُر کرنا ہے۔ انسان ہمیشہ زندہ نہیں رہتا۔ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک دن یہ دنیا دوسرے کے لیے خالی کرنا ہے"۔

حیدر علی خان کی یہی احتیاط تھی جس نے ٹیپو کو ایک ذمہ دار پیکر میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔

ٹیپو اور منعم خان سے تھوڑی دیر گفتگو کے بعد اسی راستے سے پھر بیوی کے کمرے میں پہنچے۔ جب وہ بیوی کے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے دماغ میں ٹیپو کا خیال سمایا ہوا تھا۔ ایسے وہ اچانک ہی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کی بیوی فاطمہ بیگم گھبرا کے کھڑی ہو گئیں اور حیران نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

فاطمہ بیگم کی حیرانی تو جلد ہی دور ہو گئی لیکن حیدر علی خان اپنی بیوی کے برابر کھڑے ہوئے حسن کے

ایک بیابہ کو دیکھ کر اس قدر حیران ہوئے کہ بے خیالی میں ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

حیدر علی خاں بچپن ہی سے پاک دل اور پاک نظر انسان تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حسن سے نفرت کرتے تھے۔ حسن سے نفرت کون کر سکتا ہے۔ حسن تو نور ہے اور نور ہی خدا ہے۔ یہ ضرور تھا کہ ان کی نظر نے اس قدر خوبصورت دوشیزہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

وہ لڑکی یا دوشیزہ واقعی نور کا پیکر تھی۔ سنگِ مرمر کا تراشا ہوا بدن، دمکتی ہوئی شہابی رنگت، گہری جھیل جیسی شربتی آنکھیں۔ بے پروائی سے شانوں پر بکھری ہوئی زلفیں، متناسب اعضاء اور مناسب قد۔ غرض ہر چیز اس قدر خوبصورت تھی گویا دستِ قدرت نے اسے بڑی فرصت میں بنایا ہو۔

حیدر علی خاں نے اسے کیا دیکھا کہ دیکھتے ہی چلے گئے۔

فاطمہ بیگم سمجھ گئی کہ لڑکی کا حسن واقعی توبہ شکن ہے جس نے حیدر علی جیسے پارسا کو بھی مبہوت کر دیا تھا۔ آخر اس نے اس سحر کو توڑا۔

"میرے سرتاج !" فاطمہ بیگم نے کراری آواز میں شوہر کو مخاطب کیا:

"یہ سیتا منی ہے"۔

فاطمہ بیگم کی آواز حیدر علی خاں کو حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔ وہ سنبھل کے بولے:

"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ یہ گنگا رام کی بیٹی ہے"۔

"یہ آپ کو کس نے بتایا؟" فاطمہ بیگم بڑی حیران معلوم ہوئی تھی۔

"دربان نے مجھے صدر دروازہ پر بتایا تھا"۔ حیدر علی نے مطمئن ہو کے جواب دیا۔

"دربان تو احمق ہے"۔ فاطمہ بیگم چڑ گئی:

"اسے کیا معلوم کہ سیتا منی کون ہے"۔

"کیا مطلب؟" حیدر علی خاں گھبرا گئے:

"کیا یہ وہ لڑکی نہیں جو تھوڑی دیر پہلے تمہارے پاس آئی ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر دربان نے غلط بتایا کہ سیتا منی، گنگا رام کی بیٹی ہے"۔ فاطمہ بیگم نے وضاحت کر دی۔

"کیا یہ گنگا رام کے گھر سے نہیں آئی؟" حیدر علی نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس کے گھر سے آئی ہے مگر اس کی بیٹی نہیں ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" فاطمہ بیگم کے لہجے کی تلخی میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا۔

"میں سمجھا نہیں بیگم!"

حیدر علی جیسے زچ ہو گئے:

"یہ گنگا رام فوجدار کے گھر سے آئی ہے۔ وہ گنگا رام جس نے ریاست میسور سے بغاوت کی اور آج ہی گرفتار ہوا ہے"۔

"یہ سب ٹھیک ہے"؛ فاطمہ بیگم چیخ پڑی:

"مگر سیتا منی گنگا رام کی بیٹی نہیں، بیوی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے میں آپ کی بیوی ہوں"۔

"اوہ۔ یہ بات ہے"۔

حیدر علی خاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پھر انہوں نے سیتا منی کو دیکھتے ہوئے کہا:

"مگر یہ لڑکی اور ۔۔۔ اور وہ گنگا رام ۔۔۔ مگر اس کے تو پہلے ہی بیوی بچے موجود ہیں۔ پھر اس نے اس سے شادی کیسے کر لی؟"

فاطمہ بیگم چیخ کے بولی:

"جیسے آپ نے مجھ سے شادی کی ہے۔ کیا آپ کی پہلی بیوی موجود نہیں؟"

"یہ بات نہیں ہے بیگم!" حیدر علی نے بیوی کو سمجھانے کے لیے کہا:

"ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے مذہب نے بیک وقت چار شادیوں کی اجازت دی ہے بشرطیکہ مرد چاروں بیویوں کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرے اور چاروں کے روٹی کپڑے کا معقول انتظام کر سکے لیکن ہندو مذہب میں مرد ایک وقت میں صرف ایک ہی بیوی رکھ سکتا ہے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کی برادری والے اسے برادری سے خارج کر کے اس کا حقہ پانی بند کر دیں۔ وہ کسی محفل میں نہ جا سکے۔ کوئی اس سے بات بھی نہ کرے"۔

واضح رہے کہ گفتگو تلنگی اور ملی جلی دکنی زبان میں ہو رہی تھی اور سیتا منی ان کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔

حیدر علی خاں کے بارے میں پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ وہ کتابی علم میں اگرچہ بالکل کورے تھے مگر فنِ سپہ گری میں ایسے طاق تھے کہ ان کی تمام کمزوریاں چھپ کے رہ گئی تھیں۔

فاطمہ بیگم بھی کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی اور دوسرے مذاہب کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہ رکھتی تھی۔ شوہر نے جو اسے ہندو مذہب میں شادی کے بارے میں تفصیل بتائی تو اس نے سیتا منی کو گھور کے دیکھا۔

"کیوں سیتا منی۔ تم مجھ سے جھوٹ بولیں۔ گنگا رام نے تم سے شادی نہیں کی؟" فاطمہ بیگم کا لہجہ سخت تھا۔

"جی بیگم صاحبہ۔ گنگا رام نے شادی نہیں کی تھی مگر مجھے بیوی بنا کے رکھا تھا" سیتا منی نے بڑی سادگی سے کہا:

"بیگم صاحبہ۔ میں نے آپ کو پوری بات نہیں بتائی اس لیے آپ ناراض ہو رہی ہیں۔ جب میں پوری کہانی سناؤں گی تو آپ ناراض نہیں ہوں گی"۔

"میں نہیں سنتی تیری گندی کہانی"۔

فاطمہ بیگم کو غصہ آ گیا:

"تو گنگا رام کے ساتھ بغیر شادی کے رہ رہی ہے اس سے گندی بات اور کیا ہو سکتی ہے"۔

سیتا منی نے فاطمہ بیگم سے مایوس ہو کر بڑی امید سے حیدر علی کی طرف دیکھا۔ حیدر علی خاں کو نہ معلوم کیوں اس پر رحم آ گیا۔ نرمی سے بولے:

"بیگم۔ بظاہر تو اس کی تمام باتیں بکواس معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی اس کی بات سن کے تو دیکھو شاید اس کی بھی کوئی مجبوری ہو"۔

"اچھا سنا اپنی رام کہانی۔ کیا نام ہے تیرا۔ ہاں سیتا منی"۔ فاطمہ بیگم پلنگ پر بیٹھ گئیں اور اس کے برابر حیدر علی خاں بھی بیٹھ گئے۔

فاطمہ بیگم نے پہلے تو سیتا منی کو ایک مونڈھے پر بٹھا رکھا تھا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ گنگا رام کی رکھیل (داشتہ) ہے اس وقت سے ان کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اب انہوں نے سیتا منی کو بیٹھنے کا بھی اشارہ نہ کیا حالانکہ مونڈھا وہیں پڑا تھا۔

"بیگم صاحبہ اور سیناپتی جی! آپ بھی میری کہانی سنیے اور انصاف کیجیے کہ میں نے کیا غلطی کی ہے" سیتا منی نے سنبھل کر کہا۔

فاطمہ بیگم نے اسے ڈانٹا:

"وقت خراب نہ کر۔ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ ڈال"۔

اور —

سیتا منی نے مختصراً اپنی کہانی یوں بیان کی:

"باپ کے سوا اس دنیا میں میرا سگا اور کوئی نہیں۔ ماں میرے پیدا ہوتے ہی

مر گئی تھی۔ کام کر کے اس کا پیٹ بھرتی ہوں۔

ایک سال پہلے ایک جوتشی میرے دروازے پر سے گزرا۔ میں باہر بیٹھی تھی وہ مجھے دیر تک دیکھتا رہا پھر پوچھا:

"تیرا باپ کہاں ہے؟"

میں نے کہا: "اندر ہے"۔

وہ میرے گھر کے اندر گیا اور باپ کے سامنے میرا ہاتھ دیکھا پھر زمین پر لکیریں کھینچتا رہا۔ کاغذ پر بھی اس نے کچھ لکھا پھر میرے باپ سے بولا:

"تم بڑے خوش قسمت ہو بابا۔ تمہاری بیٹی رانی بنے گی۔ راج محل میں رہے گی"۔

جوتشی تو یہ کہہ کر چلتا بنا اور میرا باپ میرے سر ہو گیا کہ میں راج محل جاؤں۔ مجھے کیا پتہ کہ راج محل کہاں ہے اور میں وہاں کیسے جاؤں۔

میں راج محل ڈھونڈتی پھر رہی تھی کہ گنگا رام اپنے سواروں کے ساتھ سامنے سے آ گیا۔ میرے دل نے کہا کہ کوئی بڑا آدمی ہے، مجھے راج محل ضرور پہنچا دے گا۔ میں نے اس سے اپنا دکھڑا رو دیا کہ وہ مجھے راج محل پہنچا دے۔ گنگا رام نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے راج محل پہنچا دے گا لیکن مجھے کچھ دیر ٹھہرنا پڑے گا۔

میں کیا بتاؤں بیگم صاحبہ! مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مجھے ایک بڑے سے گھر میں لے گیا اور مجھے بڑے آرام سے رکھا۔ اس نے بتایا کہ راجہ نے کہا ہے کہ وہ چھ ماہ بعد مجھے راج محل میں بلا لے گا۔

اب بیگم صاحبہ پانچ مہینے ہو چکے ہیں۔ اگلے مہینے گنگا رام مجھے راج محل لے جائے گا مگر اب وہ پکڑا گیا ہے۔ میں آپ سے منت کرتی ہوں کہ گنگا رام کو چھوڑ دیں وہ نہ چھوٹا تو مجھے راج محل کون لے جائے گا؟"

سیتا منی سسکیاں لینے لگی۔

"بے وقوف لڑکی"۔ فاطمہ بیگم جھلا اٹھیں:

"وہ تجھے پانچ مہینے سے گھر میں ڈالے ہوئے ہے۔ تجھے ذرا شرم نہیں آتی۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے!"

"بیگم صاحبہ۔ آپ گنگا رام کو چھڑوا دیجیے۔ میں زندگی بھر دعائیں دیتی رہوں گی"۔

کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ بس خوشامد کیے جا رہی تھی۔

حیدر علی خاں اٹھ کھڑے ہوئے:

"عجیب پاگل لڑکی ہے۔ اس سے کہہ دو کہ گنگا رام کل قتل کر دیا جائے گا۔ یہ اپنے باپ کے پاس واپس چلی جائے۔"

فاطمہ بیگم نے سیتامنی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اس سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ گنگا رام اسے دھوکہ دے رہا ہے مگر وہ تو جیسے چکنا گھڑا تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کا حیدر علی خاں کو خطرہ تھا۔

دوسرے دن سیتامنی راج محل کا پتہ پوچھتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ حیدر علی نے نند راج کو سیتامنی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ اگر سیتامنی دربار پہنچے تو اسے اندر نہ جانے دیا جائے۔

چنانچہ نند راج کے سپاہیوں نے سیتامنی کو پکڑ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تاکہ وہ دربار میں پہنچ کر شور نہ مچائے۔

بغاوت کی کم از کم سزا تختہ دار ہوتی ہے۔

گنگا رام کو نہ صرف قتل کرنے کا حکم ہوا بلکہ نند راج نے یہ بھی حکم دیا کہ اس باغی کو مہاراجہ میسور کرشن اوڈیر خود اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے۔

اس دور میں قتل کا عام سا طریقہ یہ تھا کہ مجرم کی گردن لکڑی کے ایک بڑے گول تنے پر رکھی جاتی۔ پھر جلاد ایک بھاری گنڈاسے سے گردن پر ہاتھ مارتا اور گردن تن سے دور جا گرتی۔ مقتول چیخ بھی نہ مار پاتا۔

یوں گنگا رام اپنے انجام کو پہنچ گیا۔



حیدر علی خاں کے حکم سے سیتامنی کو اس کے باپ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کا باپ معذور سپاہی تھا لیکن حیدر علی نے اسے اسلحہ خانہ میں چوکیداری پر لگوا دیا۔ اس کی رہائش کا بھی وہیں انتظام کر دیا گیا۔ اس کے باپ کو تاکید کی گئی کہ سیتامنی کے دماغ سے راج محل کا خیال دور کر کے اس کی کسی معقول جوان سے شادی کر دے۔

والی حیدر آباد نواب ناصر جنگ کو میدانِ جنگ میں ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا تھا۔

اس وقت حیدر علی خاں، نواب ناصر جنگ کی طرف سے والیٔ ارکاٹ چندا صاحب اور فرانسیسیوں کے مقابلہ پر میدان میں موجود تھے مگر نواب کے قتل ہونے سے حیدر آبادی فوجیں تتر بتر ہو گئیں اور چندا صاحب پورے ارکاٹ پر دندناتا پھرتا تھا۔ اس وقت نواب والا جاہ قلعہ ترچنا پلی میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔

چندا صاحب چاہتا تھا کہ جس طرح ناصر جنگ کا پتہ صاف ہوا ہے اسی طرح والا جاہ محمد علی بھی راستے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لیے میدان بالکل صاف ہو جائے۔ اسی لیے اس نے فرانسیسیوں کی مدد سے ترچنا پلی کے قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا اور والا جاہ محمد علی وہاں قید ہو کے رہ گیا تھا۔

حیدر علی خاں، فوجدار گنگا رام کی بغاوت سے فارغ ہو کر ابھی سرنگا پٹم ہی میں تھے کہ ان کے پاس قلعہ ترچنا پلی سے والا جاہ محمد علی کا ایک قاصد پہنچا۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حیدر علی خاں نے اپنے بال بچوں کو سرنگا پٹم کے قریب دیورانی پیٹھ میں ایک محفوظ قلعہ نما حویلی میں رکھا تھا۔ حویلی کے گرد گہری خندقیں کھدی تھیں اور حویلی کے برجوں پر توپیں نصب کر دی گئی تھیں۔

والا جاہ محمد علی کا قاصد حیدر علی خاں کی اسی رہائش گاہ پر ملاقات کے لیے پہنچا تھا۔

ریاست میسور کے کرتا دھرتا وزیر نند راج اور دیو راج تھے مگر اب یہ راز کھلتا جا رہا تھا کہ ریاست میسور کی پشت پر وہ مضبوط فوج ہے جس کا سپہ سالار حیدر علی خاں اور اس کے دوسرے بھائی بند ہیں۔

والا جاہ نے اپنے قاصد کو راجہ یا وزیر برادران کے پاس بھیجنے کے بجائے حیدر علی خاں کے پاس بھیجا تھا۔

ان دنوں حیدر علی اپنے بال بچوں میں چند دن گزارنے کے لیے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے کہ والا جاہ کا قاصد پہنچ گیا۔

"آقا والا جاہ محمد علی نے میسور کے سپہ سالار کو سلامِ شوق بھیجا ہے۔" والا جاہ کے قاصد نے کمالِ ادب سے کہا۔

"سلام پہنچا۔ جواب میں ہمارا سلام پہنچایا جائے۔" حیدر علی خاں نے خالص سپاہیانہ اور کھرے انداز میں جواب دیا۔

قاصد کا خیال تھا کہ حیدر علی اس سے پوچھیں گے کہ اس کے آنے کا سبب کیا ہے مگر حیدر علی دو جملوں میں جواب دے کر خاموش ہو گئے تھے۔ قاصد کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر الفاظ تولتے ہوئے بولا:

"سپہ سالار میسور کو معلوم تو ہوگا کہ والاجاہ آجکل قلعہ ترچناپلی میں بہت تکلیف کے دن گزار رہے ہیں۔"

"معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ حسین دوست چندا صاحب فرانسیسی لشکر کے ساتھ ترچناپلی کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔"

حیدر علی کا لہجہ اب بھی کھردرا تھا۔

"آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے سپہ سالار۔" قاصد نے شاید حیدر علی کی معلومات کی تعریف کی یا پھر خوشامد کا اظہار کیا۔

"اسے والاجاہی قاصد!" حیدر علی کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا:

"کسی ریاست کے سپہ سالار کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرب و جوار کے حالات پر نظر رکھے۔ اگر اس میں اتنی اہلیت نہیں تو اسے ایسی ذمہ دارانہ ملازمت سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔"

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حیدر علی خاں اَن پڑھ ہونے کے باوجود بلا کا ذہین تھا اس نے اپنے طور پر ریاست کے مختلف شعبوں کا انتظام سنبھال لیا تھا اور ایک ایک بات پر نظر رکھتا تھا۔ امورِ حکومت میں وہ بڑا دیانت دار اور چوکس تھا۔ اس نے میسور اور میسور کے اردگرد کے علاقوں، ریاستوں، قصبوں اور شہروں میں اپنے جاسوس اور پرچہ نویس مقرر کر دیے تھے جو اسے ہر اہم خبر سے باخبر رکھتے تھے۔

"بے شک۔ بے شک۔ سپہ سالار نے درست فرمایا۔" اس مرتبہ قاصد نے واقعی اس کی دل سے تعریف کی تھی:

"میرے آقا نے مجھے اسی سلسلہ میں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے ـــــ" قاصد نے رک کر حیدر علی کا چہرہ دیکھا۔ شاید وہ اس کے تاثرات کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

حیدر علی نے فوراً کہا:

"خاموش کیوں ہو گئے قاصد۔ اپنی بات پوری کرو۔ ہم حالات سے پوری طرح واقف ہونا چاہتے ہیں ـــــ"

قاصد نے کہنا شروع کیا:

"آقائے محترم نے ریاست میسور سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنی فوجی طاقت سے ان کے دشمنوں کو شکست دیں۔ چندا صاحب کا دماغ صحیح کرنے اور ترچناپلی کا قلعہ اور اس سے ملحقہ علاقے اس دوستی اور خدمت کے صلے کے طور پر ریاست میسور کی تحویل میں دے دیے جائیں گے۔"

بڑی اچھی پیش کش تھی۔

حیدر علی دل میں بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا:

"ہم والاجاہ کی اس پیش کش کے بارے میں وزیر برادران سے گفتگو کریں گے۔ قاصد کو کل تک اس کا جواب مل سکتا ہے۔ اس وقت تک وہ ہمارے مہمان رہیں گے۔"

قاصد کو امید ہو گئی۔ وہ ایک دن ٹھہرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے فوراً مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

حیدر علی خاں نے اسی وقت وزیر برادران نند راج اور دیو راج کو اپنا ہرکارہ بھیج کر بلوا لیا۔ اس نے جب ان سے والاجاہ کی پیش کش کی تفصیل بیان کی تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ قلعہ ترچناپلی پر ایک زمانہ سے ان کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔

نند راج نے انکسار سے کام لیتے ہوئے کہا:

"حیدر علی خاں۔ اب تم ریاست کے ملازم نہیں بلکہ ہم سب کے مربی اور دوست ہو۔ فوجی طاقت کا ہم سے زیادہ تمہیں اندازہ ہے۔ اس طرح کے معاملات اور فیصلے تم خود ہی کر لیا کرو۔ ہماری رائے لینے کی ضرورت نہیں۔"

حیدر علی اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ وہ یہی معاملہ نہیں بلکہ ریاست کے تمام معاملات میں تقریباً خود مختار رہتے تھے لیکن وہ مصلحتاً اور دور اندیشی کے پیش نظر وزیر برادران کو آگے آگے رکھتے تھے۔ راجہ کرشن اوڈیر نہیں چاہتا تھا کہ میسوری فوجیں سرنگاپٹم سے باہر نکلیں کیونکہ ایک طرف تو مرہٹے میسور پر دانت لگائے بیٹھے تھے، اور دوسری طرف نظام حیدر آباد بھی میسور پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

راجہ میسور کا خیال درست تھا۔

مگر ـــــ

حیدر علی خاں اور وزیر برادران کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ حیدر علی نے قاصد کو یہ کہہ کر ترچناپلی واپس بھیج دیا کہ وہ میسوری فوجوں کے ساتھ والاجاہ کی مدد کو پہنچ رہا ہے۔ راجہ میسور کرشن اوڈیر

کو حیدر علی سے بات کرنے کی ہمت ہی نہ پڑی اور میسوری فوجیں حیدر علی خاں اور نندراج کی سرکردگی میں ترچنا پلی کی طرف روانہ ہو گئیں۔

حیدر علی خاں نے حسبِ روایت ترچنا پلی میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے ۔ ان کا سب سے کامیاب حربہ شب خون ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ ہر رات ترچنا پلی کو گھیرنے والی چنداصاحب اور فرانسیسی فوجوں پر شب خون مارتے اور جو کچھ ہاتھ لگتا وہ سمیٹ لے جاتے۔

حیدر علی خاں کے شب خون اس قدر طوفانی ہوتے کہ دن میں قلعہ سے بیس میل دور رہتے مگر رات ہوتے ہی ان کے تیز رفتار سوار بیس میل کا یہ فاصلہ گھنٹوں میں طے کر کے آندھی و طوفان کی طرح دشمن پہ حملہ کرتے۔ حملہ آور ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے دشمن کی فوج کے ایک طرف سے داخل ہوتے اور دوسرے سرے سے مارتے کاٹتے نکل جاتے۔ ساتھ ہی جو کچھ ان کے ہاتھ لگتا، اٹھا لے جاتے۔

حیدر علی کے ان طوفانی شب خونوں کی بارش نے محاصرہ کرنے والوں کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ اس کے نتیجے میں فرانسیسیوں کی کئی توپیں حیدر علی کے ہاتھ لگیں اور وہ اسے گھسیٹ کر لے گئے۔

انہی شب خونوں کے دوران ایک رات چنداصاحب مارا گیا اور اس کے قتل ہوتے ہی فرانسیسی بھی بھاگ نکلے۔

حیدر علی خاں کی یہ ایک اور بڑی کامیابی تھی لیکن قسمت ساتھ نہ دے تو انسان کیسا مجبور ہو جاتا ہے۔

حیدر علی نے والاجاہ کی عملی مدد کی۔ اس کا محاصرہ ختم کرایا۔ سب سے بڑا دشمن چنداصاحب مارا گیا مگر اس احسان فراموش نے ترچنا پلی پر قبضہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔

نندراج اور حیدر علی کو اس کا افسوس تو ہوا ہی، ساتھ ہی میسوری فوجوں میں بددلی پھیل گئی۔ اس حملہ کے لیے میسور کے خزانے سے ایک بھاری رقم نکالی گئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ یہ نقصان قلعہ ترچنا پلی اور اس کے مضافات پر قبضہ سے پورا ہو جائے گا لیکن الٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔

حیدر علی نے مجبوراً قلعہ ترچنا پلی کا محاصرہ کر لیا۔

نواب والاجاہ کو اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ پہلے وہ چنداصاحب اور فرانسیسیوں سے مدافعت کر رہا تھا اب اس نے حیدر علی سے مدافعت شروع کر دی۔

حیدر علی خاں نے جھلا جھلا کے کئی شدید حملے کیے۔ وہ اپنے ساتھ قلعہ شکن اور فصیل شکن آلات بھی نہ لایا تھا۔ وہ تو نواب کو محاصرے سے نجات دلانے آیا تھا اور اب خود اسے محاصرہ کرنا پڑا تھا۔

حیدر علی خاں بڑے عزم اور حوصلے کا انسان تھا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور قلعہ پر دباؤ بڑھاتا رہا۔ محاصرہ اتنا سخت کر دیا کہ باہر سے قلعے کے اندر پرندہ بھی نہ جا سکتا تھا۔

ترچنا پلی بہت دنوں سے محاصرے کی حالت میں تھا۔ پہلے فرانسیسیوں اور چنداصاحب نے محاصرہ کیا اور اب حیدر علی خاں کا سخت محاصرہ تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ قلعہ کے اندر سامانِ رسد کی کمی واقع ہوئی۔ نواب والاجاہ پریشان ہو گیا اور اس نے محسوس کر لیا کہ حیدر علی بغیر قلعہ پر قبضہ کیے جان نہ چھوڑے گا۔

آخر اس نے حیدر علی خاں کے پاس سفارت بھیجی اور درخواست کی کہ والاجاہ کو معہ فوج اور سامان کے قلعہ سے نکل جانے دیا جائے تو وہ قلعہ کی چابیاں حوالے کر دے گا۔

اس سفارت سے حیدر علی کے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ترچنا پلی کی جنگ اور اس محاصرے میں میسور کا سارا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ قلعہ پر قبضہ کی امید پیدا ہوئی تو حیدر علی خاں کے لشکریوں کے چہرے کھل اٹھے۔

مگر یہاں بھی ایک سازش اٹھ کھڑی ہوئی۔

نندراج سرنگا پٹم سے چلا تھا تو اس کے ساتھ درجن بھر سے زیادہ بڑے بڑے تلک دھاری پنڈت ہو گئے تھے۔ یہ پنڈت شمالی ہند سے آئے تھے۔ راج محل میں ہر وقت دھونی رمائے بیٹھے رہتے تھے۔ مہاراجہ کرشن اوڈیر ویسے ہی ایک وہمی انسان تھا۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی اسے زہر نہ دے دے۔ ان پنڈتوں نے شکر پر جنتر منتر پڑھ کر راجہ کے حوالے کر دی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ کھانا کھانے سے قبل وہ ایک چٹکی شکر کھانے میں ڈال لیا کرے۔ شکر کی برکت سے زہر اس پر اثر نہ کرے گا۔

اس طرح کے شعبدے دکھا کر انہوں نے راج محل پر قبضہ جما لیا تھا۔ مہاراجہ، تمام رانیاں اور محل کے تمام چھوٹے بڑے ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔

مہاراجہ کرشن اوڈیر نے پنڈتوں کو اپنا ہمدرد دیکھا تو ان سے اپنا دکھڑا کہہ بیٹھا اور ان سے کہا کہ وہ کوئی ایسا اپائے کریں کہ وزیر برادران کا خاتمہ ہو جائے اور لگے ہاتھوں حیدر علی خاں کا

کانٹا بھی نکل جائے۔

پھر جب نندراج اور حیدر علی خاں لشکر لے کر ترچناپلی روانہ ہونے لگے تو ان پنڈتوں نے راجہ کرشن اوڈیرا اور رانیوں سے سفارش کرائی کہ گیانی دھیانی پنڈتوں کو نندراج اپنے ساتھ ترچناپلی کے محاذ پر لے جائے تاکہ ان کے اشلوکوں اور عبادت و ریاضت سے میسور کی فوجوں کو فتح حاصل ہو۔

نندراج دھرم کے معاملے میں پنڈتوں کا بہت قائل تھا۔ اکثر حملوں کے وقت اس نے پنڈتوں اور جوتشیوں سے شبھ گھڑی نکلوائی تھی اور اتفاق سے اسے کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ جب سے وہ ان کا اور زیادہ قائل ہو گیا تھا۔

مہاراجہ کرشن اوڈیرنے پنڈتوں کی سفارش کی تو نندراج کی جیسے مراد بر آئی۔ حیدر علی خاں کی وجہ سے وہ پنڈتوں اور جوتشیوں کو جنگ پر لے جانا چھوڑ چکا تھا کیونکہ حیدر علی اس طرح دکھاوے والے جٹادھاری پنڈت پسند نہ کرتا تھا۔ اب جو مہاراجہ نے سفارش کی اور حیدر علی خاں نے نندراج کو بھی نیم رضا دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے۔ پنڈتوں کو ساتھ جانے کی اجازت مل گئی اور پنڈتوں کی یہ پلٹن راستے بھر گاتی بجاتی ترچناپلی پہنچی۔

قلعہ کے محاصرے کے بعد پنڈتوں نے پیشین گوئی کی کہ قلعہ شام تک فتح ہو جائے گا مگر ایک کیا کتنی ہی شامیں گزر گئیں اور قلعہ فتح نہ ہوا۔ مگر پنڈتوں کی زبان پر صرف ایک ہی کلمہ تھا اور وہ کلمہ تھا: "شام تک قلعہ فتح ہو جائے گا۔"

حیدر علی خاں جب ان کی بکواس سنتے سنتے تنگ آ گئے تو انہوں نے نندراج سے صاف کہہ دیا کہ اگر ان پنڈتوں نے فضول باتیں بند نہ کیں تو وہ قتل کرا دیے جائیں گے۔ ان کی موجودگی سے لشکر میں بددلی پھیل رہی ہے۔

نندراج تو پنڈتوں کی مٹھی میں تھا اور وہ انہیں بھگوان سمجھ بیٹھا تھا۔ اس نے حیدر علی خاں کی خوشامد درآمد کر کے اسے اس ارادے سے باز رکھا ورنہ انہیں تو ان کم بختوں پر سخت غصہ آ گیا تھا۔

پھر وہ دن آیا جب نواب والاجاہ نے سفارت بھیجی۔ اور قلعہ حوالے کرنے کی شرطیں پیش ہوئیں۔ نندراج اور حیدر علی خاں میں ان شرطوں پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے یہی بہتر خیال کیا کہ والاجاہ کو مع ساز و سامان کے قلعے سے نکل جانے دیا جائے۔ اس طرح قلعہ ہاتھ آ جائے گا اور میسور والوں کے

سامنے بات بھی رہ جائے گی۔

نندراج گفتگو کے بعد خوشی خوشی اپنے خیمہ میں جا رہا تھا کہ راستے میں اسے پنڈتوں نے گھیر لیا۔

"کیا فیصلہ کیا تم نے مہامنتری؟" گرو پنڈت نے نندراج سے اس طرح سوال کیا جیسے استاد بچے سے سوال کرتا ہے۔

نندراج گھبرا گیا۔ اس نے کہا:

"مہاراج۔ فیصلہ کرنا نہ کرنا ہمارا کام ہے۔ آپ اپنا کام کرتے رہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک کیا ہو جائے گا۔ آخر ہم لوگ تمہارے ساتھ کیوں آئے ہیں؟" گرو پنڈت نے اکڑ کر کہا۔

"نیک کام کے لیے نیک آدمیوں کا ساتھ رہنا اچھا ہوتا ہے اسی لیے ہم آپ کو اپنے ساتھ لائے ہیں۔" نندراج نے انہیں ادب سے سمجھایا۔

"اس کا مطلب ہے ہماری کوئی عزت ہی نہیں۔ نہ کوئی صلاح نہ مشورہ۔ تم نے اور اس مُسلے نے خود ہی سب کچھ طے کر لیا۔" پنڈت نے اس طرح آنکھیں دکھائیں جیسے نندراج اس کا ملازم ہو۔

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" نندراج نے بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بنا کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔" گرو پنڈت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"آخر کیوں۔ جنگ کی حکمت عملی ہم بناتے ہیں۔ جنگ ختم بھی ہم نے کی ہے۔ آپ کا کام صرف پرارتھنا کرنا ہے وہ آپ کرتے رہیے۔" نندراج سخت لہجے میں جواب دے کر آگے بڑھا۔

"نہیں مہامنتری۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

گرو پنڈت راستہ روک کے کھڑا ہو گیا:

"آپ جنگ کیسے روک سکتے ہیں۔ ستاروں سے باتیں ہماری ہوتی ہیں۔ آکاش کا حال ہم جانتے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ اوپر کیا فیصلہ ہوا ہے۔"

"اوپر سے" نندراج کو سخت تاؤ آ گیا:

"اوپر سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"دیکھو نندراج۔ اس دنیا کا کاروبار یونہی نہیں چلتا۔ اس کا چلانے والا اوپر رہتا ہے۔ اس کے بنا پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ تم اوپر والے کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔" گرو پنڈت نے کچھ اس

ڈرامائی انداز میں ہاتھوں کو اوپر نیچے کیا کہ نندراج رعب میں آ گیا۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر اوپر والا کیا چاہتا ہے؟" نندراج لہجے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"اوپر والا کہتا ہے کہ قلعہ ترچناپلی کی چابیاں نہ لی جائیں!" گرو پنڈت نے بے دھڑک کھٹاک سے کہہ دیا۔

"کیا کہا ـــ کیا کہا ـــ" نندراج کو پھر غصہ آ گیا:

"چابیاں کیوں نہ لی جائیں؟"

"مہامنتری۔ یہ میں نہیں کہتا۔ اس کا فیصلہ آکاش پر ہوا ہے۔" گرو پنڈت نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

باقی پنڈت بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ کوئی کچھ کہتا۔ کوئی کچھ۔ نندراج اس صورتحال سے بدحواس ہو گیا۔

گرو پنڈت نے نندراج کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا:

"دیکھو نندراج۔ تم آکاش پر ہونے والی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے مگر یہ جان لو کہ ترچناپلی کا نواب تم سے دھوکا کر رہا ہے۔ اس کی بات پر یقین نہ کرنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ فوج برباد ہو جائے گی اور میسور پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔ ہر طرف آگ لگ جائے گی۔ تمہارا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو گا۔ حیدر علی خاں تمہیں مار ڈالے گا اور میسور پر مسلوں کا قبضہ ہو جائے گا۔"

گرو پنڈت نے نندراج کو ایسا ڈرایا کہ اس کی سٹی گم ہو گئی اور اسے ہر طرف آگ لگی دکھائی دینے لگی۔ اس کے کانوں میں بھیانک آوازیں آنے لگیں اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے حیدر علی خاں خنجر تانے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

نندراج نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور اس طرح دوڑ لگائی کہ اپنے خیمے میں جا کر ہی دم لیا۔ اس کے ملازم پریشان ہو گئے۔ ایک آدمی بھاگ کے حیدر علی خاں کے پاس گیا اور انہیں اپنے ساتھ بلا لایا۔

نندراج نے حیدر علی خاں کو بتایا کہ تمام پنڈت یک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اگر نواب والاجاہ سے صلح ہوئی اور قلعہ کی چابیاں لی گئیں تو میسوری لشکر تباہ ہو جائے گا۔

"آخر اس کی کوئی وجہ؟" حیدر علی خاں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ کہتے ہیں کہ آکاش پر فیصلہ ہو چکا ہے کہ قلعہ ترچناپلی پر قبضہ نہ کیا جائے۔" نندراج نے سوکھے منہ سے کہا۔

"مگر وزیر محترم۔ میں نے قلعہ کا محاصرہ ختم کر دیا ہے۔ تمام دروازے کھل گئے ہیں اور عوام اپنا سامان لے کر قلعہ سے جا رہے ہیں"۔

حیدر علی خاں نے نندراج کو اپنے انتظامات سے آگاہ کیا:

"نواب والاجاہ کا قاصد قلعہ کی چابیاں لیے میرے خیمہ میں بیٹھا ہے۔ میں نے اس سے چابیاں نہیں لی ہیں۔ ان پنڈتوں کو بکواس کرنے دیجیے۔ آپ چل کے چابیاں لیجیے اور والاجاہ کے نکلتے ہی قلعہ پر قبضہ کیجیے۔"

"نہ ـــ نہ ـــ نہ ـــ" نندراج، حیدر علی کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا:

"چابیاں ہرگز نہ لینا۔ ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ میسور کی ریاست ختم ہو جائے گی۔ پھر نہ ہم رہیں گے اور نہ تم ـــ"

"یہ کیا فضول باتیں ہیں وزیر محترم!"

حیدر علی خاں نے تیز لہجے میں کہا:

"آپ ان دھوکے بازوں کے کہنے میں آ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں چابیاں لیجیے اور چل کر قلعہ پر قبضہ کیجیے۔"

"نہیں حیدر علی خاں۔ تمہیں اپنے خدا کی قسم، چابیاں ہرگز نہ لینا ورنہ قیامت آ جائے گی۔" نندراج گڑگڑانے لگا:

"ہم ہندو ہر کام سے پہلے پنڈتوں سے شگون لیتے ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ قلعہ کی چابیاں لینے اور قبضہ کرنے کی شبھ گھڑی ابھی نہیں آئی۔"

حیدر علی خاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

انہوں نے نندراج کو لاکھ سمجھایا مگر اس کی وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ اسی بک بک جھک جھک میں صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی مگر نندراج کی سمجھ میں نہ آنا تھا نہ آیا۔

اس دوران نہ معلوم کس طرح قلعہ میں یہ خبر پہنچ گئی کہ نندراج اور حیدر علی خاں میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور کوئی دم میں میسوری لشکر آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگے گا۔

اس افواہ کے پھیلتے ہی نواب والاجاہ جو اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ قلعہ چھوڑنے والا تھا،

اس نے فوراً حکم دیا کہ شہر سے سامانِ رسد حاصل کر کے قلعہ میں پہنچایا جائے۔ دم کے دم میں سامان سے بھری ہوئی سینکڑوں گاڑیاں قلعہ میں پہنچ گئیں۔

سامانِ رسد کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد دالاجاہ نے قلعہ کے دروازے بند کرنے کا حکم دیا اور وہ توپیں جو برجوں سے اتار کر لے جانے کے لیے گاڑیوں پہ بار کی گئی تھیں، پھر برجوں پر چڑھا دی گئیں اور اب قلعہ پہلے سے کئی گنا زیادہ طاقتور اور مضبوط ہو گیا تھا۔

حیدر علی خاں کو اطلاع ملی کہ قلعہ والے سامانِ رسد قلعہ میں لے گئے ہیں اور اب قلعہ کے دروازے پھر سے بند کر لیے گئے ہیں تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

اس نے خیمے سے نکل کر دیکھا۔ قلعہ کے برجوں پر توپیں نظر آ رہی تھیں اور مسلح سپاہی فصیل پہ پہرہ دے رہے تھے۔

حیدر علی خاں خیمے میں واپس آ کر چیخ پڑا مگر اس کے انداز میں اب بھی نند راج کا احترام پوشیدہ تھا۔

"مہاشے وزیر محترم۔ دیکھیے آپ کے پنڈتوں کی شبھ گھڑی آ گئی۔ قلعہ پر قبضہ کر لیں جا کے"۔

نندراج کا دل ڈوب گیا:

"ہائے یہ کیا ہو گیا۔ مجھے برباد کر دیا ان دھرم کے ٹھیکیداروں نے۔ میں میسور میں جا کر کیا منہ دکھاؤں گا"۔

وہ چیختا چلاتا باہر نکل گیا۔ قلعہ کی چابیاں لانے والے بہت پہلے واپس جا چکے تھے۔ ایک لشکری نے آگے بڑھ کے نندراج کا دامن پکڑ لیا:

"مہامنتری۔ آپ نے ہماری فتح کو شکست میں بدل دیا۔ تین ماہ کی محنت خاک میں مل گئی"۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لشکری!" نندراج نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا:

"یہ میری غلطی ہے۔ میں نے پنڈتوں کا اعتبار کیا اور قلعہ کی چابیاں نہیں لیں۔ مروا دیا ہمیں ان دھرم والوں نے"۔

"مہامنتری۔ یہ پنڈت تو مہاراجہ اور مہارانی کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ان پنڈتوں کو بھیجا ہی اس لیے تھا کہ یہ موقع پا کر آپ کو اور حیدر علی خاں کو قتل کر دیں"۔

لشکری کے اس انکشاف پہ نندراج کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"سب پنڈتوں کو گرفتار کر لیا جائے"۔ اس نے حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد نندراج کو مطلع کیا گیا کہ تمام پنڈت اپنے خیموں سے غائب ہیں۔ نندراج نے ان کی گرفتاری کے لیے چاروں طرف سوار دوڑائے مگر اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے ایک بھی پنڈت گرفتار نہ ہو سکا۔

حیدر علی خاں نے بڑی افسردگی سے نندراج کو بتایا:

"قلعہ پر اب حملہ نہیں ہو سکتا۔ پورا لشکر سرنگاپٹم واپس جانے کی ضد کر رہا ہے"۔

نندراج پر غموں کا پہاڑ تو پہلے ہی ٹوٹ پڑا تھا۔ اس خبر نے اسے بالکل ہی حواس باختہ کر دیا۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا:

"حیدر علی خاں۔ میں سرنگاپٹم واپس نہیں جاؤں گا۔ میری عزت خاک میں مل گئی ہے"۔

لشکر واپس کیا ہوا کہ تتر بتر ہو گیا۔

نندراج بجائے سرنگاپٹم جانے کے ستی منگل چلا گیا جو اس کی جاگیر تھی۔ حیدر علی خاں راستے ہی میں تھا کہ نظام حیدر آباد کی فوجیں بدلہ لینے کے لیے میسور پر چڑھ آئیں۔ انہیں کون روکتا۔ نہ حیدر علی تھے نہ نندراج۔ مہاراجہ کا محل گھیرا گیا تو اس نے انہیں معقول معاوضہ دے کر واپس کیا۔

کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ حیدر آبادی فوجیں واپس ہوئیں تو پونا کا مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ نے خراج کی وصولی کے لیے میسور پر چڑھائی کر دی۔

بالاجی باجی راؤ نے راج محل گھیر لیا اور راجہ سے ایک کروڑ کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ خزانہ میں کیا رکھا تھا۔ جو کچھ تھا وہ نظام حیدر آباد و صلابت جنگ لوٹ لے گیا تھا۔

راجہ میسور ہاتھ جوڑے ہوئے بالاجی باجی راؤ کے سامنے پیش ہوا۔

"راؤ جی"۔ راجہ کرشن اوڈیر نے لجاجت سے کہا:

"میسور کا خزانہ وزیر بھائیوں نندراج اور دیوراج نے خالی کر دیا۔ جو کچھ بچا وہ حیدر علی دبا کے بیٹھ گیا۔ مجھے آپ کا خراج دینا ہے۔ پورا ایک کروڑ دینا ہے مگر مجھے کچھ مہلت دی جائے"۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں مہلت دیں گے"۔ مغرور مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ بڑے غرور سے بولا:

"مگر تمہاری ضمانت کون دے گا۔ ضمانت پیش کرو تو دو ماہ کی مہلت مل سکتی ہے"۔

"دو ماہ تو بہت کم ہیں راؤ جی۔"

راجہ اوڈیرہ گھبرا گیا:

"آپ کو معلوم ہے ترچناپلی پر میسور کی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی ہے۔ آدھا خزانہ اس میں خالی ہو گیا۔ باقی جو رہا تھا وہ نظام صلابت جنگ لوٹ لے گیا۔ مجھے چار ماہ کی مہلت دی جائے۔ میں سرنگاپٹم کا مغربی علاقہ ضمانت کے طور پر آپ کے قبضے میں دینے کو تیار ہوں۔"

بالاجی باجی راؤ کو لالچ نے گھیرا۔ اس نے فراخدلی سے کہا:

"ہم چار مہینے کے بجائے چھ مہینے کی مہلت دینے کو تیار ہیں مگر سرا پر ہمارا گورنر رہے گا۔"

سرا میسور کا سب سے بڑا شہر تھا۔ ایک زمانے تک دارالسلطنت بھی رہ چکا تھا۔ بالاجی نے سرا پر قبضہ مانگا تو راجہ کرشن اوڈیرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

سرا کا علاقہ سب سے زیادہ شاداب اور ترقی یافتہ تھا مگر مرہٹہ سردار کی تلوار راجہ اوڈیرہ کے سر پر لٹک رہی تھی۔ آخر اسے مجبوراً سرا مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا۔

راجہ میسور کے رضامند ہوتے ہی بالاجی باجی راؤ نے ایک دستہ فوج بھیج کر سرا کے صوبیدار کو بلوا لیا جس کا نام نواب دلاور خاں تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ راجہ اوڈیرہ نے خراج کے بدلے سرا مرہٹوں کو دے دیا ہے تو اسے بہت افسوس ہوا مگر کیا کر سکتا تھا۔

بالاجی باجی راؤ بے حد چالاک تھا۔ اس نے نواب دلاور خاں سے کہا:

"دلاور خاں۔ ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں۔ نہ ہم مسلمانوں سے جھگڑا کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے راجہ نے سرا کا قبضہ ہمیں دے دیا ہے۔ ہم بلونت راؤ کو سرا کا گورنر مقرر کرتے ہیں۔ تم پونا کی مرہٹہ سرکار کی طرف سے کولار میں ہمارے جاگیردار رہو گے۔ کہو تم ناراض تو نہیں ہو؟"

نواب دلاور خاں ناراض ہوتا تو تہ تیغ کر دیا جاتا۔ اس نے باجی راؤ کا شکریہ ادا کیا:

"میں مہاراج کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جاگیردار بنایا۔ میں پوری ذمہ داری سے خدمات انجام دوں گا۔ پونا سرکار کو کوئی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔"

سرا کے مرہٹوں کے ہاتھ میں جانے سے میسور کی ریاست سرنگاپٹم تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ریاست کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ وزیر برادران ستی منگل میں منہ چھپائے بیٹھے

تھے۔

حیدر علی خاں بے بس ہو گئے تھے۔ وہ بھی نندراج کے پاس ستی منگل پہنچ گئے۔ اور میسور کو مرہٹوں سے چھڑانے کی تدبیریں شروع ہوئیں۔

بالاجی باجی راؤ نے سرا کا گورنر بلونت راؤ کو مقرر کیا تھا مگر وہ کسی بات پر بلونت راؤ سے ناراض ہو گیا اور اسے معزول کر کے گوپال راؤ کو سرا کا گورنر مقرر کیا۔

گوپال راؤ بڑا ظالم اور لالچی مرہٹہ تھا۔ سرا کا گورنر ہوتے ہی اس نے سرنگاپٹم کا رخ کیا اور راج محل میں پڑاؤ ڈال کے بیٹھ گیا۔

گوپال راؤ نے راجہ کرشن اوڈیرہ سے مطالبہ کیا:

"ایک ماہ کے اندر ایک کروڑ کی مطلوبہ رقم مل جانا چاہیے ورنہ پوری ریاست میسور پر قبضہ کر لیا جائے گا۔"

راجہ کرشن اوڈیرہ نے احتجاج کیا:

"سردار بالاجی باجی راؤ نے ہمیں چھ ماہ کی مہلت دی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس مہلت کو برقرار رکھیے۔ اس مدت میں رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"صوبیدار ہم ہیں۔"

گوپال راؤ بپھر گیا:

"حکم ہمارا چلے گا۔ بالاجی باجی راؤ نے تم سے جو معاہدہ کیا ہم اسے نہیں مانتے۔"

"مگر اتنی جلدی اتنی بڑی رقم کا انتظام —" راجہ کرشن اوڈیر نے عذر خواہی کی کوشش کی۔

مگر — گوپال راؤ نے اسے ڈانٹ دیا:

"چپ رہو۔ جو ہم نے کہہ دیا وہی ہو گا۔"

گوپال راؤ نے فیصلہ کر دیا۔

راجہ کرشن اوڈیر خاموش ہو گیا۔ ایک ماہ میں ایک کروڑ کا انتظام وہ کہاں سے کر سکتا تھا۔ اسے رہ رہ کے نندراج پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں ترچناپلی پر حملہ کر کے نندراج نے سخت غلطی کی تھی کیونکہ اس حملے ہی کی وجہ سے میسور کا خزانہ خالی ہوا تھا۔

ادھر گوپال راؤ نے یہ حرکت کی کہ سوائے دو کمروں کے پورے راج محل پر وہ اور اس کے

لشکری قابض ہوگئے۔ محل کے تمام ملازم مرد اور عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ راجہ اوڈیر کے بجائے گوپال راؤ کی خدمت کریں۔

مہاراجہ اور مہارانی محل کے دو کمروں میں قید ہو کر رہ گئے۔ اس وقت انہیں حیدر علی خاں کا خیال آیا۔ انہیں افسوس ہوا کہ انہوں نے اس بہادر انسان کی قدر نہ کی۔ وہی ایک ہستی تھی جو انہیں اس قید سے رہائی دلا سکتی تھی۔

ریاست میسور کے دونوں نامور سپوت حیدر علی خاں اور نند راج سنی منگل میں مجبور بیٹھے تھے۔ نند راج، راجہ میسور اور میسور کے باسیوں سے شرمندہ تھا کہ اس نے ترچناپلی کے محاصرے میں ریاست کا خزانہ خالی کر دیا۔

وہ، حیدر علی خاں سے بھی شرمندہ تھا کیونکہ حیدر علی خاں کے برادر نسبتی میر مکنو، ترچناپلی کے بے مقصد محاصرے کے دوران مارے گئے تھے۔

مگر — حیدر علی خاں اب تک نند راج کو اپنا محسن سمجھتے تھے۔ انہیں پوری طرح احساس تھا کہ نند راج شرمندگی کی وجہ سے سرنگا پٹم نہیں جا رہا تھا۔

نند راج نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ اس وقت تک سرنگا پٹم نہیں جائے گا جب تک وہ مرہٹوں کو ایک کروڑ روپیہ دینے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ مرہٹے اسی بہانے ریاست کے مختلف حصوں پر قبضہ کرتے جا رہے تھے اور نند راج، دیو راج اور حیدر علی خاں یہ سب کچھ مجبوراً سنتے اور دیکھتے رہے تھے!

پھر حیدر علی خاں نے ایک دن بڑا عجیب فیصلہ کیا۔

"میں ایک نئی فوج بھرتی کروں گا۔" انہوں نے بڑے اعتماد سے نند راج کو بتایا۔

نند راج نے حیران نظروں سے اسے دیکھا:

"نئی فوج کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟"

"رقم میں پالیگاروں سے لوں گا۔" حیدر علی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

نند راج نے انہیں سمجھایا:

"پالیگار طاقتور کو رقم دیتے ہیں۔ اس وقت ہمارا ستارہ گردش میں ہے۔ ان سے امید

نہیں کی جا سکتی۔"

"انہوں نے رقم دینے سے انکار کیا تو میں طاقت استعمال کروں گا۔" یہ کہہ کے حیدر علی خاں نے نند راج کو اور حیران کر دیا۔

"طاقت کہاں ہے جو استعمال کرو گے؟" نند راج مسکرایا۔

"آپ دیکھتے جائیے وزیر محترم!"

حیدر علی خاں نے پُراعتماد لہجے میں کہا:

"میں اس وقت اپنے کام پر روانہ ہوتا ہوں۔ شام تک دیکھیے، کیا نتیجہ نکلتا ہے"۔

نند راج کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ حیدر علی خاں کا منہ دیکھ کے رہ گیا۔

حیدر علی خاں اپنی نشست سے کھڑے ہوئے۔ اور اپنی شمشیر نکال کے ہوا میں بلند کر دی:

"وزیر محترم! میں جا رہا ہوں اور ساتھ میں آپ کے پندرہ محافظ لیے جا رہا ہوں۔"

انہوں نے جواب کا انتظار نہ کیا اور تلوار لہراتے باہر نکل گئے۔ نند راج کے محافظوں نے حیران نظروں سے حیدر علی خاں کو دیکھا۔

"کون کون اس تلوار کا ساتھ دے گا؟" حیدر علی نے تلوار لہراتے ہوئے محافظوں کو مخاطب کر کے کہا۔

حیدر علی شمشیر زنی میں اس قدر شہرت حاصل کر چکے تھے کہ سپاہی ان کی کمان میں لڑنے کی آرزو کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہاں تیس کے قریب محافظ موجود تھے ان میں سے بیس جوانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔

"ہم تیار ہیں آپ کا ساتھ دینے کے لیے"۔ انہوں نے بیک وقت کہا۔

"گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ اور تلواریں بے نیام کر لو!" حیدر علی خاں نے حکم دیا۔

انیس محافظ پلک جھپکتے میں گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ وہاں اس وقت اتنے ہی گھوڑے موجود تھے۔ بیسواں سوار ہاتھ مل کے رہ گیا۔

انیس سواروں کی تلواریں ہوا میں لہرانے لگیں۔

"دوستو!" حیدر علی خاں نے انہیں مخاطب کیا:

"ہمیں ایک نیک کام کے لیے ایک کروڑ کی رقم درکار ہے مگر یہ نیک کام آپ کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے ہے۔ آپ کا کام زبردستی رقم حاصل کرنا ہے خواہ کتنی ہی قتل و غارت گری کرنا پڑے۔ آپ

یہ بات گرہ میں باندھ لیں کہ ہم جتنی رقم لوٹ مار اور جنگ و جدل سے حاصل کریں گے اس کا آدھا حصہ آپ لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا اور حصہ داروں میں میرا شمار نہیں ہوگا۔"

"ہمیں منظور ہے۔"

"ہمارا سردار حیدر علی خاں!"

"ہم لوٹ مار کریں گے۔ سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔"

اس دور میں کسی پر مسلح حملہ کر دینا، آبادیوں کو لوٹنا، قتل و غارت کرنا کوئی جرم نہ تھا بلکہ انہیں آمدنی کے معزز پیشے کہا جاتا تھا۔

حیدر علی خاں نے تلوار لہرائی۔ گھوڑے کی باگیں اٹھائیں اور ان کے پیچھے انیس شمشیر بکف سواروں نے گھوڑے ہوا کے دوش پر دوڑا دیے۔

دو گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد وہ ستی منگل کی ایک آبادی میں پہنچے۔ یہ ایک پالیگار کی جاگیر تھی۔

جس وقت تلواروں کا یہ لہراتا ہوا طوفان پالیگار کی حویلی پر رکا تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ اس کی نظر حیدر علی پر پڑی تو اس کی جان نکل گئی۔

"جاگیردار!"

حیدر علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں:

"ہمیں دو لاکھ روپے فوراً دینا ہیں۔"

پالیگار (جاگیردار) گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

حیدر علی نے دوبارہ کہا:

"سنا نہیں تم نے۔ دو لاکھ فوراً چاہییں۔ اندر جاؤ اور رقم لے کر آؤ۔ پانچ منٹ سے زیادہ لگائے تو گھر کو آگ لگا دی جائے گی اور تمہارے بیوی بچے قتل ہو جائیں گے۔"

پالیگار نے بولنے کی بہت کوشش کی مگر اس کی گھگھی بندھ گئی۔

"اندر جاؤ اور رقم لے کر آؤ۔" حیدر علی خاں کی آواز تیسری بار ابھری۔ پالیگار ہکا بکا منہ کھولے گھر کے اندر چلا گیا۔

پھر جب پالیگار باہر آیا تو اس کے ساتھ پانچ کنیزیں تھیں۔ ہر کنیز کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ ہر تھیلی میں ہزار کی رقم تھی۔ کنیزوں نے تھیلیاں حیدر علی کے سامنے رکھ دیں۔

"بس۔ اتنی سی رقم!" حیدر علی نے پالیگار کو گھور کے دیکھا۔

"گھبرائیے مت خانصاحب۔" پالیگار نے بڑے اطمینان سے کہا:

"آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ آپ کے حوالے کر دیں گے۔"

چنانچہ کنیزیں اندر سے تھیلیاں لاتی رہیں اور چند منٹوں میں وہاں تھیلیوں کا ڈھیر لگ گیا۔

پھر ایک کنیز نے پالیگار سے کہا:

"مالک۔ اب کوئی تھیلی باقی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تم اندر جاؤ۔"

کنیز اندر چلی گئی تو پالیگار نے حیدر علی خاں سے کہا:

"خان صاحب۔ یہ پچاس ہزار کی رقم ہے۔ اس وقت یہی کچھ گھر میں تھا جو حاضر کر دیا۔ کچھ مہلت دی جائے تو رقم اکٹھی ہو سکتی ہے۔"

حیدر علی نے جواب میں کہا:

"ٹھیک ہے۔ ہم ایک ہفتہ بعد پھر چکر لگائیں گے۔ رقم تیار رکھنا۔"

پالیگار گھبرایا ہوا تھا کہ شاید حیدر علی دو لاکھ کا مطالبہ ابھی پورا کرنے کو کہیں گے لیکن حیدر علی جانتے تھے کہ پالیگاروں کے پاس ایک وقت میں اتنی ہی رقم ہو سکتی تھی۔

"اور کوئی خدمت خان صاحب!" پالیگار خوش ہو گیا تھا۔

حیدر علی خاں نے کہا:

"تمہارے چالیس پچاس سوار ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ان سے کہو کہ فوراً تیار ہو جائیں۔"

حیدر علی خاں جب وہاں سے روانہ ہوئے تو پچاس ہزار کی رقم کے علاوہ ۲۵ سوار بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔

تھوڑی دور جا کر حیدر علی خاں نے رقم کا بٹوارہ کیا۔ پچیس ہزار کی تھیلیاں چار سواروں کے ہاتھ نندراج کے پاس ستی منگل روانہ کر دیں اور باقی ۲۵ ہزار سواروں میں برابر برابر تقسیم کر دیے۔ ان ۲۵ سواروں کو بھی برابر کا حصہ دیا گیا جو ابھی ابھی ان کے ساتھ ہوئے تھے۔

"سردار کی فراخدلی سپاہیوں کو جرأت مند بنا دیتی ہے۔"

یہ اس زمانے کا ایک مشہور قول تھا جس زمانہ میں لوٹ مار اور قتل و غارت کر کے رقم اکٹھا کی جاتی تھی اور اسے ایک مہذب اور سپاہیانہ پیشہ گردانا جاتا تھا۔

حیدرعلی خاں نے اسی انداز سے پالیگاروں سے رقم وصول کرنا شروع کر دی۔ وہ ہفتہ میں ایک بار مختصر لشکر کے ساتھ روانہ ہوتے اور شام کو جب واپس ہوتے تو لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ ان کے پاس ہوتا تھا۔

وہ اپنے لشکریوں کو دل کھول کے نوازتے تھے۔ آہستہ آہستہ لشکریوں کو معلوم ہو گیا کہ میسور کے راجہ کرشن اوڈیر نے مرہٹوں کو ایک کروڑ روپیہ مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ کو دینے کا وعدہ کیا ہے اور جب تک یہ روپیہ ادا نہیں ہوتا، مرہٹے میسور پر اور اس کے علاقوں پر قبضہ کیے رہیں گے۔

اس انکشاف کے بعد لشکریوں نے خود اپنے طور پر اپنا آدھا حصہ چھوڑ دیا یعنی جو رقم پالیگار سے وصول ہوتی اس میں ایک چوتھائی حصہ لشکریوں میں تقسیم ہوتا اور باقی تین چوتھائی نندراج کے پاس ستی منگل بھیج دیا جاتا۔

رقم جمع ہونے کی رفتار اگرچہ سست تھی، صبر آزما تھی۔ اکثر جنگ و جدل کے مواقع بھی آئے مگر حیدرعلی نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔

اس سے ایک طرف تو یہ ہوا کہ رقم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور دوسری طرف حیدرعلی کو ایک نئی فوج کی ترتیب میں بڑا فائدہ پہنچا۔

حیدرعلی خاں ہر پالیگار سے رقم کے علاوہ کچھ سوار بھی طلب کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ پالیگار یا چھوٹے چھوٹے زمیندار اور جاگیردار اگرچہ آزاد نہ ہوتے تھے اور انہیں کسی نہ کسی راجہ اور نواب کی ماتحتی قبول کرنا پڑتی تھی لیکن انہیں باقاعدہ فوج رکھنے کی اجازت تھی۔ وہ حسب حیثیت ہر وقت اپنی اپنی فوج تیار رکھتے کیونکہ ہر پالیگار اور راجہ کے درمیان یہ زبانی معاہدہ ہوتا تھا کہ راجہ اپنی جنگی ضرورتوں کے لیے جب بھی فوج طلب کرے گا تو اس کے تمام ماتحت پالیگار اپنی اپنی فوج خود لے کر یا کسی سردار کے ماتحت راجہ کو بھجوا دیں گے۔

یہ کام بڑی خاموشی سے ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ اس کی اطلاع نندراج یا پالیگاروں کے سوا کسی اور کو نہ تھی۔ چونکہ ایک کروڑ کی رقم حاصل کرنا تھی اس لیے سخت جدوجہد اور دوڑ دھوپ کے باوجود حیدرعلی کو رقم جمع کرتے کرتے ایک سال سے زیادہ لگ گیا — مگر وہ خوش تھے کہ اس نے یہ ناممکن کام ممکن کر دکھایا۔

ادھر پالیگار خوش تھے کہ انہوں نے حیدرعلی جیسے جرنل اور بہادر سردار کو مصیبت کے وقت رقم

دے کر اس پر احسان کیا ہے۔

رہے وہ لشکری جو حیدرعلی خاں نے پالیگاروں سے حاصل کیے تھے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ انہیں جس قدر رقم حاصل ہو رہی تھی وہ اسے چار چھ جنگوں میں حصہ لے کر بھی حاصل نہ کر سکتے تھے۔

اس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں مرہٹہ فوج نے جس کا مرکز سرا اور سردار گوپال راؤ تھا، پوری ریاست میسور (ماسوائے سرنگاپٹم) میں اودھم مچائے رکھا۔ مہاراجہ کرشن اوڈیر نے مرہٹوں کو سرا کا قبضہ دیا تھا مگر وہ پوری ریاست پر قابض ہو گئے تھے اور مرہٹہ سپاہی اور فوج جب چاہتی لوٹ مار شروع کر دیتی۔

میسور کی رعیت مرہٹوں کے ہاتھوں بہت تنگ تھی اور دل سے چاہتی تھی کہ وزیر برادران اور حیدرعلی خاں کی حکومت پھر واپس آئے اور ان کو مرہٹوں سے نجات دلائے۔

آخر وہ دن آیا جس کا حیدرعلی خاں ڈیڑھ سال سے انتظار کر رہے تھے۔ وزیر نند راج کا قاصد حیدرعلی خاں کے پاس پہنچ کر گویا ہوا:

"حیدرعلی خاں۔ میرے آقا وزیر نندراج نے ہزاروں، لاکھوں دعاؤں کے ساتھ آپ کو اطلاع دی ہے کہ آپ ستی منگل تشریف لائیں تاکہ میرے آقا آپ کو اپنے سینے سے لگانے کا فخر حاصل کریں۔"

حیدرعلی کی آنکھوں میں مسرت کے موتی چمکنے لگے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ایک ہزار کی تھیلی قاصد کو دی جائے جو یہ نوید مسرت لایا ہے۔

نندراج نے حیدرعلی خاں کی بھیجی ہوئی ایک کروڑ کی رقم میں سے پچاس لاکھ کی رقم مہاراجہ کرشن اوڈیر کے پاس بھجوا دی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ سرا کے مرہٹہ گورنر کو مطلع کرے کہ معاہدہ کی نصف رقم تیار ہے۔ وہ سرا کا قبضہ چھوڑنے کا قصد کرے۔ باقی نصف رقم اسے سرا کا قبضہ چھوڑتے وقت مل جائے گی۔

راجہ کے پاس اتنی رقم پہنچی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ رقم نندراج کے کہنے پر حیدرعلی خاں نے بزور شمشیر پالیگاروں سے وصول کی ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ

نہ رہا۔ اس نے قاصد کے ذریعے نند راج کو فوراً سرنگا پٹم آنے کی دعوت دے دی۔

حیدر علی نے نند راج کے قاصد کو انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کیا اور یہ پیغام دیا کہ وہ اسی ہفتے ستی منگل پہنچ رہا ہے۔

انہوں نے فوراً واپسی کے انتظامات کیے اور جب وہ ستی منگل کو روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ ۴ ہزار سواروں کا ایک مضبوط لشکر تھا۔

نند راج بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔ اس نے ستی منگل سے باہر نکل کے حیدر علی خاں کا استقبال کیا۔

اس ملاقات میں دو دوست، دو مربّی اور دو محسن، ڈیڑھ سال بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ کبھی نند راج، حیدر علی خاں کا محسن و مربّی تھا اور اب نند راج، حیدر علی کو اپنا دوست، محسن اور مربّی کہنے لگا تھا۔

اس ملاقات کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ستی منگل میں راجہ کرشن اوڈیر بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے نند راج کو سرنگا پٹم بلوایا تھا لیکن نند راج وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے راجہ کو اطلاع دی کہ چند دنوں میں حیدر علی خاں ستی منگل آ رہے ہیں اس لیے وہ فی الحال ستی منگل نہیں چھوڑ سکتا۔

راجہ کرشن اوڈیر چونکہ خود بھی حیدر علی کا بے حد احسان مند تھا اس لیے وہ بغیر نند راج کو اطلاع دیے ستی منگل پہنچ گیا۔

نند راج کو اس کی آمد پر بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ اس کے خیال میں ریاست میں ساری گڑبڑ راجہ ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی شبہ تھا کہ مرہٹوں کو خود راجہ نے سرنگا پٹم بلایا تھا لیکن اس کے اس طرح اچانک آ جانے سے نند راج کا دل راجہ کی طرف سے صاف ہو گیا۔

چنانچہ حیدر علی خاں کے استقبال کے موقع پر راجہ اوڈیر بھی موجود تھا اور حیدر علی خاں کی تعریفیں کرتے اس کی زبان نہ تھکتی تھی اور وہ جیسے اپنی آنکھیں حیدر علی خاں کے لیے فرشِ راہ کیے دے رہا تھا۔

دو دن ستی منگل میں قیام کے بعد حیدر علی خاں اور نند راج، راجہ اوڈیر کے ساتھ ہی سرنگا پٹم پہنچے۔ وہاں ریاستی سپاہیوں اور سواروں کو پچھلے تین ماہ سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں اور انھوں نے سرنگا پٹم میں اودھم مچا رکھا تھا اور وہ راج محل کے سامنے بھوک ہڑتال کیے پڑے تھے۔

بھوک ہڑتال شاید ایک جدید اصطلاح ہے۔ تاریخوں میں درج ہے کہ فوج راج محل کے سامنے

دھرنا مار کر بیٹھ گئی تھی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ راجہ نے شاید زندگی میں یہی ایک عقلمندی کی تھی کہ اس نے نند راج کے بھیجے ہوئے روپیوں کو اب تک گوپال راؤ کو منتقل نہیں کیا تھا بلکہ بڑی حفاظت سے خزانے میں محفوظ کر دیا تھا۔

فوج کے مطالبہ (جو کہ جائز تھا) سے نمٹنے کے لیے نند راج اور راجہ کرشن اوڈیر دونوں نے حیدر علی سے پُرزور درخواست کی۔ حیدر علی خاں چونکہ سپاہی اور سپاہی زادہ تھے اور سوار اور پیدل کے سپاہیانہ دماغ کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے انہیں سمجھانے کا وعدہ کر لیا۔

حیدر علی خاں نے نند راج اور راجہ اوڈیر کو دوسری جگہ ٹھہرایا اور خود ۵۰۰ سواروں کو لے کر راج محل کی طرف روانہ ہوئے جہاں فوج دھرنا مارے بیٹھی تھی۔

وہاں پہنچ کے انھوں نے سواروں کو چار پانچ فرلانگ پیچھے چھوڑ دیا اور تنہا راج محل پہنچے۔ وہاں کئی ہزار لشکری جن میں سوار، پیدل اور دوسرے کارکن تھے، بپھرے بیٹھے تھے مگر حیدر علی کو دیکھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے کوئی فیصلہ کرانے کی التجا کی۔

حیدر علی خاں نے انہیں مخاطب کیا:

"ساتھیو! میں بھی تمہاری طرح ایک سپاہی بلکہ خاندانی سپاہی ہوں۔ مجھے تمہارے حالات سن کے بے حد افسوس ہوا۔ راج محلوں کی رونق اور ریاست کی شان دراصل "سپاہی" کی طاقت سے ہوتی ہے اور جو لوگ اپنے لشکر کو خوش نہیں رکھتے وہ کبھی خود بھی خوش نہیں رہ سکتے۔ میری خدمات تمہارے لیے حاضر ہیں مگر اس صورت میں کہ تم مجھے اپنی طرف سے بات کرنے کے پورے اختیارات دو۔"

"ہمیں منظور ہے۔ ہمیں منظور ہے۔"

"حیدر علی خاں جو فیصلہ کریں گے ہم اسے مانیں گے۔"

سپاہیوں کے ان نعروں سے حیدر علی خاں کو حوصلہ ہوا۔ اس نے کہا:

"آپ لوگ جانتے ہیں کہ کئی حملوں اور جنگوں میں بہت رقم خرچ ہوئی۔ جو بچی وہ نظام حیدر آباد لوٹ لے گیا۔ اس لیے آپ کی تنخواہوں کی پوری ادائیگی اس وقت ممکن نہیں لیکن جو کچھ میرے پاس یا خزانے میں ہے اسے میں آپ لوگوں میں تقسیم کرائے دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میرا وعدہ ہے کہ ایک ہی جنگ میں تم لوگوں کے اگلے پچھلے سب قرضے ادا کرا دوں گا۔"

سپاہیوں کو روٹیوں کے لالے پڑے تھے۔ انہیں تین تین چار چار ماہ سے تنخواہیں نہ ملی تھیں۔ حیدر علی خاں نے انہیں امید دلائی تو وہ خوش ہو گئے۔

حیدر علی خاں نے اپنے سواروں کو بلوایا اور ان میں سے دس بارہ سپاہیوں کو ... بھیجا۔ تیس ہزار کی رقم وہاں سے نکالی۔ اس زمانے میں یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ حیدر علی نے پندرہ ہزار کی رقم ان میں تقسیم کر دی۔

سب سپاہی ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ ان میں چھوٹے چھوٹے سردار بھی تھے۔ وہ اکڑ گئے کہ انہیں زیادہ رقم ملنی چاہیے۔ حیدر علی خاں کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے انہیں سختی سے ڈانٹ دیا کہ وہ اسے پہلے ثالث مقرر کر چکے ہیں۔ اب انہیں بولنے کا کوئی حق نہیں۔

اس طرح حیدر علی نے کسی کو پیار سے اور کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کے راضی کر لیا۔ پھر اس نے ان میں سے دو ہزار بہترین سوار اور پیادے اپنے لشکر کے لیے منتخب کر لیے۔

یہ ایک عجیب بات تھی کہ جس وقت حیدر علی خاں اپنے لیے لشکریوں کا انتخاب کر رہا تھا تو ریاستی فوج کے وہ سپاہی جو بغاوت پر آمادہ تھے، حیدر علی کی خوشامد کر رہے تھے کہ وہ انہیں اپنی فوج میں بھرتی کر لے مگر حیدر علی نے صرف اپنی مرضی کے لشکری منتخب کیے۔

شام ہونے تک راج محل کے سامنے سے باغی فوجیوں نے اپنا جمگھٹا ختم کر دیا اور راج محل کے محافظ اور دربان اپنے کام پر واپس آ گئے۔

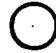
راجہ اوڈیرا اور تمام رانیاں بھی ایک ایک کر کے راج محل پہنچ گئیں۔ نند راج اور دیوراج بھی اپنے ٹھکانوں پر آ گئے اور اسلحہ خانے پر ان کا قبضہ بحال ہو گیا۔

وزیر برادران، راجہ کرشن اوڈیرا اور رانیوں کی سازشوں سے بہت دل برداشتہ تھے۔ وزیر دیوراج تو آئے دن کی ان سازشوں سے اس قدر پریشان تھا کہ وہ دوسرے ہی ہفتے سرنگا پٹم چھوڑ کے نند راج کی جاگیر ستی منگل چلا گیا تھا۔

سرا کا صوبے دار گوپال راؤ تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ نند راج اور حیدر علی خاں سرنگا پٹم واپس آ گئے ہیں۔ نیز حیدر علی نے نئی فوج بھی بھرتی کر لی ہے تو اسے خطرہ محسوس ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ سرنگا پٹم پر حملہ کر کے وہاں کی طاقت کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا جائے۔

پس —

اس نے سرنگا پٹم پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں!



حیدر علی خاں، راجہ کرشن اوڈیرا سے مطمئن نہ تھا کیونکہ وہ چڑھتے سورج کی پرستش کرنے کا عادی تھا۔ جب نند راج اور حیدر علی کو طاقت میں دیکھتا تو ان کی خوشامد میں لگ جاتا۔ جب کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہونے والی ہوتی تو اس سے ساز باز شروع کر دیتا۔ حیدر علی خاں اسی لیے اپنے ارادوں کو راجہ سے پوشیدہ رکھتا تھا۔

مرہٹے اگرچہ سرنگا پٹم پر قابض نہ تھے لیکن ریاست کا سب سے بڑا صوبہ سرا ان کے ہاتھ میں تھا اور ان کے سوار پوری ریاست میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔

نند راج اگرچہ ریاستی معاملات میں دلچسپی کم لے رہا تھا لیکن مرہٹہ طاقت کی روز افزوں ترقی سے وہ بھی پریشان تھا۔ اگر حیدر علی خاں کا دھڑکا نہ ہوتا تو مرہٹے اب تک سرنگا پٹم پر قبضہ کر چکے ہوتے۔

ایک دن اس نے خود ہی پیش کش کی:

"حیدر علی خاں۔ راجہ کرشن اوڈیرا کی آئے دن کی سازشوں سے میں تنگ آ چکا ہوں۔ اس کا کچھ علاج ہونا چاہیے۔"

نند راج کا انداز سوالیہ تھا۔ حیدر علی کو پوچھنا پڑا:

"وزیر محترم! راجہ اوڈیرا کی نظروں میں میری اور آپ کی ایک ہی پوزیشن ہے مگر آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ آپ میرے محسن ہیں اور میری زندگی میں راجہ کرشن اوڈیرا آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"اب میں تمہارا محسن نہیں ہوں میرے دوست۔"

نند راج بے حد جذباتی ہو کر بولا:

"اب تم میرے دوست اور مربی ہو حیدر علی خاں۔ مجھے تمہارا بڑا سہارا ہے۔ اس نادان راجہ کے علاوہ مرہٹوں کا خدشہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ایک کروڑ روپے وصول کرنے آنے ہی والے ہوں گے۔"

حیدر علی خاں کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی:

"وزیر محترم! کیا آپ کا خیال ہے کہ میرے سپاہیوں نے یہ ایک کروڑ روپے جمع کرنے میں اپنا خون اس لیے بہایا کہ اس رقم کو ہم چپ چاپ مرہٹوں کے حوالے کر دیں۔"

نند راج نے چونک کر حیدر علی کو دیکھا:

"میرے دوست۔ میرے فرزند! مجھے تمہارے ارادے کچھ اور ہی دکھائی دے رہے ہیں!"

"آپ کا خیال درست ہے وزیر محترم!"

حیدر علی خاں کی آنکھوں میں خوفناک سائے لہرانے لگے:

"میسور میرا وطن ہے۔ اس کی زمین، اس کی ہواؤں اور فضاؤں سے مجھے محبت ہے۔ انہی کی لوریوں سے میں جوان ہوا ہوں۔ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ میری زمین پر دشمن قبضہ کیے رکھے۔ حالات میں اونچ نیچ ہوتی ہی ہے مگر اب وہ وقت گزر گیا جب میسور کا خزانہ خالی اور فوج بدظن تھی۔ اب خدا ہم پر مہربان ہے۔ جب ہم ایک کروڑ کی رقم جمع کر سکتے ہیں تو مرہٹوں کو اپنے وطن سے کیوں نہیں نکال سکتے؟"

حیدر علی خاں کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں اور اس کا ہاتھ شمشیر کے قبضے پر پہنچ چکا تھا۔

نندراج اس کی باتیں سن کر اور ارادے جان کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ پونا کا مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ اس وقت برصغیر کی ایک اہم طاقت تھی۔ وہ شاہانِ دہلی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔

نندراج جلد ہی پُرسکون ہو گیا اور بولا:

"حیدر علی خاں۔ میں تمہارے کسی ارادے میں مزاحم ہونا نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اگر تم اپنے مشوروں میں مجھے بھی شریک کر لو تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔

میں جانتا ہوں کہ طوفانی ندیوں پر بند باندھنا سراسر حماقت ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے مدمقابل بڑی بڑی طاقتیں ہیں لیکن تمہارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔"

"وزیر محترم!" حیدر علی نے ادب سے کہا:

"آپ کہیں رہیں اور کسی حال میں رہیں۔ میں بغیر آپ کے مشورے کے کوئی کام نہ کروں گا۔ میں سب سے پہلے ان پہاڑی چوہوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جو پاس پڑوس کی ریاستوں کی ہر کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد پھر دوسروں کو بھی دیکھ لوں گا۔ ہر ایک کا دیا ہوا زخم میرے سینے میں موجود ہے اور پرانی یادیں الاؤ بن کر میرے ذہن میں دہک رہی ہیں۔"

اس دوران حیدر علی خاں کا سیکرٹری کھانڈے راؤ آ گیا تھا لیکن حیدر علی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دور ہی روک دیا تھا۔

کھانڈے راؤ حیدر علی کا بڑا پُراعتماد لشکری تھا۔ اس نے ایک کروڑ کی رقم جمع کرنے میں

بڑی پھرتی اور بعض موقعوں پر دوراندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ حیدر علی خاں اسی لیے اسے اپنے خاص کاموں پر لگاتا تھا۔

نندراج اور حیدر علی کی گفتگو تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ حیدر علی نے کھانڈے راؤ کو اشارہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ ہنسے تلے قدم اٹھاتا ان کے پاس آیا اور دونوں کو ادب سے سلام کیا۔

حیدر علی نے اسے نندراج سے ملایا:

"وزیر محترم: یہ جوان بڑا پھرتیلا اور قابلِ اعتماد ہے۔ میں اسے نائب کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھتا ہوں اور ہر اہم کام اس کے سپرد کرتا ہوں۔"

نندراج کے لیے کھانڈے راؤ بالکل اجنبی تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک اسے دیکھا پتہ نہیں کھانڈے راؤ نندراج کے اس انداز سے کیوں گھبرا گیا۔

"قابلِ اعتماد بھی ہے اور چالاک بھی؟" نندراج کے منہ سے ایک دم نکل گیا۔

حیدر علی، نندراج کے اس فقرے پر چونک پڑا۔ وہ اس کے اس خیال کی وضاحت چاہتا تھا مگر کھانڈے راؤ کی موجودگی سے پوچھنے سے گریز کیا۔

پھر وہ کھانڈے راؤ سے مخاطب ہوا:

"ہاں کھانڈے راؤ۔ کیا خبر لائے ہو؟"

"خان آقا۔ گوپال راؤ بڑی زبردست تیاریاں کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اس دفعہ حیدر علی خاں کا کچومر نکال دوں گا"۔ کھانڈے راؤ نے زور دے کر کہا۔

نندراج کو کھانڈے راؤ کا اندازِ گفتگو پسند نہ آیا۔ اس نے اسے ٹوک دیا:

"کھانڈے راؤ۔ سرا کا سوبیدار گوپال راؤ تمہارا عزیز دار تو نہیں!"

"نہیں نہیں جی ــــ وہ مرہٹہ ہے اور میں دراوڑ ہوں"۔ کھانڈے راؤ نے جلدی سے انکار کرتے ہوئے کہا:

"میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔"

"کوئی اور خبر؟"

"نہیں آقا۔ اور کوئی خبر نہیں۔"

"پھر تم جا سکتے ہو۔"

کھانڈے راؤ سلام کر کے چلا گیا۔

"حیدر علی خاں۔ تم نے اس مرہٹے کو کہاں سے پکڑ لیا؟" نندراج کو پکا یقین تھا کہ کھانڈے راؤ مرہٹہ ہے۔

"کھانڈے راؤ مرہٹہ نہیں ہے وزیر محترم!" حیدر علی نے تردید کی کوشش کی۔

"تم نہیں جانتے حیدر علی۔ مرہٹے اس خوبی سے دوسری ریاستوں میں داخل ہوتے ہیں کہ انہیں پہچاننا مشکل ہوتا ہے"۔

نندراج نے مزید بتایا:

"میں اس کی گفتگو ہی سے سمجھ گیا تھا کہ وہ مرہٹہ ہے۔ بہر حال وہ کوئی بھی ہو مگر تمہیں تاکید ہے کہ نہ تو اس پر زیادہ اعتماد کرنا اور نہ اس کو زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کرنا"۔

دوسرے یا تیسرے دن راجہ کرشن اوڈیر نے حیدر علی خاں کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت دی جس میں وزیر برادران اور سرنگا پٹم کے معززین کو مدعو کیا گیا۔

راجہ نے دیوراج کو اپنا آدمی بھیج کر ستی منگل سے خاص طور پر بلوایا۔ دیوراج کچھ دن پہلے ہی اپنی وزارت سے سبکدوش ہو کر سرنگا پٹم چھوڑ گیا تھا۔ بہر حال اس دعوت میں اس نے بھی خاص طور پر شرکت کی۔

حیدر علی خاں تقریب کا مہمانِ خصوصی تھا۔ وہ پوری آن بان سے ضیافت میں شریک ہوا۔ نندراج نے اسے سینہ سے لگا کر اپنے پیار کا اظہار کیا۔

حیدر علی کے ساتھ اس کا نائب کھانڈے راؤ بھی تھا۔ وہ اگرچہ نندراج سے بہت جھک کے ملا۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ نندراج کو اس سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ پورا وقت وہ کھانڈے راؤ کو گھورتا ہی رہا۔

راجہ کرشن اوڈیر نے اس دعوت کا مقصد چھپائے رکھا مگر جب نندراج اور دیوراج آ گئے تو اس نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔

"وزیر برادران نندراج اور دیوراج۔ آپ لوگوں کو یہ معلوم کر کے خوشی ہو گی کہ میں حیدر علی خاں کو میسور کی فوجوں کا سپہ سالارِ اعظم بنانا چاہتا ہوں۔ انہیں فوج کی بھرتی اور برخاست کرنے کے علاوہ کسی بھی دوسری ریاست سے جنگ کرنے یا اس سے صلح کا معاہدہ کرنے کے پورے اختیارات

حاصل ہوں گے"۔

نندراج نے قدرے حیرت سے راجہ کو دیکھا۔

اسے گمان ہوا کہ میسور کا راجہ کرشن اوڈیر واقعی عقلمند ہو گیا ہے۔ یا پھر اس کے پس پردہ کوئی اور شخصیت ہے جس کے کہنے پر وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

نندراج نے مسکرا کر کہا:

"معلوم ہوتا ہے راجہ کرشن اوڈیر کو اب انسانوں کی پہچان ہوتی جا رہی ہے۔ راجہ، واقعی حیدر علی کی خدمات کا بہترین صلہ پیش کر رہے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی"۔

راجہ نے ایک اور انکشاف کیا:

"میسوری فوجوں کی سالاری کے علاوہ ہم ان کی بے پناہ خدمات کے ۔ ۔ ۔ انہیں 'فرزندِ دلبند' کا خطاب بھی دینے کا ارادہ رکھتے ہیں"۔

نندراج نے اپنے بھائی دیوراج کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب تم راجہ کی تعریف کرو۔

دیوراج اشارہ پا کر بولا:

"راجہ کا یہ خطاب بہت مناسب ہے کیونکہ کسی انسان کے لیے اس کے فرزند سے زیادہ اور کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی۔ پھر فرزند اگر دلبند بھی ہو تو اس کا کیا کہنا۔ یہ تو سونے پر سہاگہ کے مصداق ہے"۔

اسی لمحے دو لشکری بھاگتے ہوئے آئے اور انھوں نے حیدر علی کے آنے کی خبر دی۔ یہ تمام لوگ حیدر علی خاں کے استقبال کو دروازے پر آ گئے۔

حیدر علی خاں عام طور پر مشکی گھوڑا استعمال کرتے تھے۔ وہ بڑی شان سے اپنے مشکی گھوڑے پر سوار چلے آ رہے تھے۔ ان سے چند قدم پیچھے ان کا معتمدِ خاص کھانڈے راؤ ایک ابلق (لال کالا) گھوڑے پر سوار تھا۔

حیدر علی کے گھوڑے سے اترنے پر سب سے پہلے نندراج نے اسے سینے سے لگایا۔ پھر دیوراج نے۔ میسور کا راجہ اپنی جگہ کھڑا مسکراتا رہا۔

دونوں بھائیوں سے فارغ ہو کے حیدر علی خاں راجہ کی طرف بڑھے اور قریب پہنچ کر اسے فوجی طرز پر سلام کیا۔ راجہ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور آگے بڑھ کر حیدر علی خاں سے بغلگیر ہو گیا۔

راجہ کرشن اوڈیر نے بغیر کسی تمہید کے اعلان کیا:

"میں اپنے ہیرو حیدر علی خاں کو وطن دوستی اور ان کی اعلیٰ کارکردگی کے صلہ میں ریاست میسور وزیر برادران نندراج اور دیوراج اور میسور کی رعیت کی طرف سے "فرزند دلبند" کا خطاب دیتا ہوں۔ امید ہے کہ ہمارے ہیرو اس خطاب کو قبول کر کے ہم سب کو خوشی کا موقع عطا کریں گے"۔

سب حاضرین نے اس اعلان پر خوشی کا اظہار کیا۔ نندراج نے ایک بار پھر حیدر علی خاں کو سینے سے لگالیا۔

اس کے ساتھ ہی راجہ نے ایک اور اعلان کر کے سب کو چونکا دیا:

"اس کے ساتھ ہی میں یعنی کرشن اوڈیر راجہ میسور، اپنی، اپنے وزرا اور رعیت کی طرف سے حیدر علی خاں کو افواجِ میسور کے سپہ سالار کا عہدہ پیش کرتا ہوں۔

آج سے فرزند دلبند حیدر علی خاں تمام فوجی اور ملکی معاملات کے سربراہِ اعلیٰ مقرر کیے جاتے ہیں۔ انہیں دوسری ریاستوں سے ہر قسم کے معاہدے کرنے یا ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کے پورے اختیارات دیے جاتے ہیں۔ ان کے کسی معاملہ میں کسی کو دخل دینے کا قطعی اختیار نہ ہوگا"۔

راجہ کے اس اعلان پر حاضرین نے اور زیادہ مسرت کا اظہار کیا۔ ان دو اعلانات کے بعد کسی مزید اعلان کی گنجائش نہ تھی مگر اچانک وزیر نندراج نے کہا:

"راجہ میسور کرشن اوڈیر اور معزز حاضرین!

فرزند دلبند حیدر علی خاں کے سیناپتی اور دیگر غیر فوجی معاملات کے ناظمِ اعلیٰ مقرر ہونے کے بعد کسی وزیر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ فرزند دلبند حیدر علی خاں میں فوجی انتظام کے علاوہ سول انتظامیہ کو سلیقے سے چلانے کی پوری اہلیت موجود ہے اس لیے میں اور میرے بھائی دیوراج میسور کی وزارت سے اپنے طور پر سبکدوش ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور فرزند دلبند کے لیے دعا کرتے ہیں کہ وہ جس طرح آج تک ریاست میسور کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں اسی طرح مستقبل میں بھی اپنی اہلیت کا پورا پورا مظاہرہ کرتے رہیں۔

چنانچہ آج سے ریاست میسور میں وزارت کا عہدہ ختم کیا جاتا ہے اور آیندہ اس عہدے پر کسی کا تقرر نہ ہوگا"۔

راجہ کرشن اوڈیر کی تو جیسے جان میں جان آگئی۔ وہ جب سے راجہ بنا تھا اس کی یہی کوشش تھی کہ میسور کو وزیر برادران کے چنگل سے کسی طرح آزاد کرایا جائے مگر اس کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تھی۔

اس جگہ پہلے حیدر علی خاں کے خطاب کے بارے میں کچھ وضاحتیں پیش کی جا رہی ہیں کیونکہ اس معاملہ میں مؤرخین کی مختلف رائیں ہیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں "سلطنتِ خداداد میسور" میں سلطنتِ خداداد کے پہلے مورخ جناب محمود خاں محمود اس طرح رقم طراز ہیں:

"حیدر علی خاں کی اس کارگزاری سے راجہ بہت خوش ہوا اور انہیں سپہ سالار افواج میسور کے عہدے پر ترقی دیتے ہوئے "فتح حیدر بہادر" کا خطاب دیا اور حیدر علی کو کامل اختیارات دیے گئے کہ وہ مرہٹوں سے معاملہ طے کریں"۔

مگر آگے چل کر محمود خاں محمود اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

"یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حیدر علی خاں نے جس صلح و آشتی سے نندراج سے وزارت لی، اس سے نندراج کو حیدر علی خاں سے بجائے رنج کے اور زیادہ محبت ہوگئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

دوسری طرف راجہ اور اس کا خاندان بھی حیدر علی کا بہت احسان مند ہوا اور اس کے صلے میں حیدر علی خاں کو "فرزند ارجمند" کا خطاب عطا کیا گیا"۔

اس طرح محمود خاں محمود بنگلوری کی "تاریخ سلطنتِ خداداد میسور" کے حوالے سے حیدر علی خاں کو ایک خطاب "فتح حیدر بہادر" اور دوسرا خطاب "فرزند ارجمند" راجہ میسور کی طرف سے دیا گیا۔

اس موضوع پر دوسری تحقیقی کتاب "سلطان شہید" میں جناب عطش درانی فرماتے ہیں:

"حیدر علی نے اپنی ذہانت اور فراست سے کام لیتے ہوئے راجہ کی آبرو پر حرف نہ آنے دیا۔ چنانچہ راجہ نے حیدر علی کو "فرزند دلبند" کا خطاب دیا اور اسے مملکت کے درِکُل کا مختار بنا دیا"۔

اب حیدر علی کے تین خطاب سامنے آتے ہیں:

۱۔ فتح حیدر بہادر
۲۔ فرزند ارجمند
۳۔ فرزند دلبند

اس تفصیل سے اس بات کو تقویت پہنچتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سلطان ٹیپو شہید

کے خاندان اور اس کے انمٹ کارناموں میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں پر روشنی پڑے گی اور ان کی بے مثال اہلیت و شجاعت کے کارنامے زیادہ واضح طور پر سامنے آئیں گے۔

ضیافت کے اختتام پر حیدر علی خاں واپس جانے لگا تو راجہ نے سوال کیا:

"سپہ سالار۔ مرہٹہ سردار کو ایک کروڑ روپے کی واپسی کی کیا صورت اختیار کی جائے گی؟"

نند راج اور دیو راج کو تو علم ہو گیا تھا کہ حیدر علی خاں مرہٹوں کو رقم دینے کے بجائے انہیں میسور سے نکالنے کی فکر میں ہے اس لیے وہ دونوں ہی خاموش رہے۔

حیدر علی خاں نے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا اور اشارہ بھی کیا کہ راجہ کو اصل بات سے آگاہ کر دیا جائے مگر نند راج نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔

حیدر علی نے ذرا سوچ کے جواب دیا:

"مہاراجہ میسور کو فکر کی ضرورت نہیں۔ اب یہ ذمے داری میری ہے۔ میں جو مناسب سمجھوں گا وہ قدم اٹھاؤں گا۔

یوں آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میں کل سے میسور کی سرزمین کو مرہٹوں کے ناپاک قدموں سے پاک کرنا شروع کر دوں گا۔"

راجہ کی باچھیں کھل گئیں۔

اور ـــــ وزیر برادران صرف مسکرا کے رہ گئے۔

حیدر علی خاں نے صحیح کہا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے کوچ کا حکم دیا اور اپنی فوجیں لے کر مرہٹہ گوپال راؤ کی طرف بڑھا۔

گوپال راؤ کو کسی ذریعے سے حیدر علی کے ارادوں کی پہلے ہی خبر ہو گئی تھی اس لیے جس دن حیدر علی خاں کا لشکر سرا کی طرف روانہ ہوا، اسی دن گوپال راؤ مرہٹہ فوج لے کر سرا سے نکلا اور حیدر علی کو سزا دینے کے لیے سرنگا پٹم کی طرف بڑھا۔

گوپال راؤ کو یہ تو معلوم تھا کہ سرنگاپٹم کے دو بھائی حیدر علی خاں اور شہباز خاں بلا کے بہادر اور دھر تلے ہیں مگر اسے یہ علم نہ تھا کہ میسور کی ریاست جس کا خزانہ خالی تھا، وہ سال ڈیڑھ سال کے اندر

نہ صرف اس کی رقم ادا کرنے کے قابل ہو جائے گا بلکہ مرہٹوں کے مقابلے پر بھی تیار ہو جائے گا۔

پھر جب گوپال راؤ کو اطلاع ملی کہ ریاست میسور نے اپنے ایک فوجی سردار حیدر علی خاں کے ذریعے سرنگاپٹم کے قرب و جوار کے پالیگاروں سے زبردستی روپیہ حاصل کرنا شروع کر دیا ہے تو اسے تعجب سا ہوا۔ ایک کروڑ کی رقم پالیگاروں سے کسی طرح وصول نہیں کی جا سکتی تھی۔

پھر ایک دوسری اطلاع میں گوپال راؤ کو بتایا گیا کہ میسور کے سردار حیدر علی خاں نے ایک کروڑ کی رقم حاصل کر لی ہے اور وہ آجکل نئی فوج بنا رہا ہے اس لیے اسے سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔

یوں گوپال راؤ دراصل اس بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنے اور مطلوبہ رقم وصول کرنے سرنگاپٹم آ رہا تھا جبکہ حیدر علی خاں اسے سرا کی صوبیداری سے بے دخل کرنے نکلا تھا۔

دونوں فوجیں بڑھتے بڑھتے چن پٹن پہنچیں۔ یہ مقام سرنگاپٹم اور سرا کے درمیان میں واقع تھا۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ سرنگاپٹم اور سرا کی مرہٹہ فوجیں ایک ہی دن شام کے وقت چن پٹن پہنچیں اور آمنے سامنے پڑاؤ ڈالا۔

مشہور ہے کہ حیدر علی خاں کو جنگلی جانوروں میں سب سے زیادہ چیتا پسند تھا۔ چیتے کی پھرتی اور چالاکی سے حیدر علی خاں بہت متاثر تھا۔ چیتے کو چالاک ترین اور چیر درندہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے دشمن کو غافل کر کے یا غافل پا کر اس پر حملہ کرتا ہے اور لمحوں میں اسے تہس نہس کر ڈالتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی عادتیں اور خصوصیات حیدر علی خاں میں بھی تھیں۔ وہ بھی دشمن کو غافل کر کے حملہ کرتا اور اسے تہس نہس کر دیتا تھا۔

آمنے سامنے پڑاؤ کرتے ہی ایک طرف تو کھانا پکنا شروع ہو گیا اور دوسری طرف کل کی متوقع جنگ کی تیاری اور حکمتِ عملی پر گفتگو ہونے لگی۔

حیدر علی خاں کو اس وقت نند راج بہت یاد آ رہا تھا۔ وہ ایک منجھا ہوا ناظم ہونے کے ساتھ ایک بہترین جرنیل بھی تھا اور جنگ کے موقع پر تو ایسی حکمتِ عملی اختیار کرتا تھا کہ پہلے ہی سے فتح کی امید پیدا ہو جاتی تھی۔

مگر ـــــ

نند راج اور نند راج کے بھائی دیو راج دونوں نے حیدر علی خاں اور راجہ سے اجازت لے کر سرنگاپٹم چھوڑ دیا تھا بلکہ انہوں نے وزارت سے ہمیشہ کے لیے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا اور اب اپنی جاگیر

سنی منگل میں سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔

حیدر علی خاں میں یہ خوبی تھی کہ وہ عین میدانِ جنگ میں دشمن کی فوجی طاقت اور اس کی دفاعی پوزیشن کو دیکھ کر اپنی حکمتِ عملی فوری طور پر تیار کرتا اور اس پر فوراً عمل شروع کر دیتا۔

دونوں طرف کے لشکر خیمے لگا کے کھانے پکانے اور جنگی تیاریوں میں مصروف تھے لیکن حیدر علی تن تنہا گھوڑے پر سوار اندھیری رات میں دشمن کی دفاعی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا۔

کھانا تیار ہو چکا تھا مگر حیدر علی خاں ابھی تک دشمن کے اگلے مورچوں کی دیکھ ریکھ سے واپس نہ آیا تھا۔ وہ اپنے نائب کھانڈے راؤ سے کہہ گیا تھا کہ اس کی واپسی کا انتظار نہ کیا جائے اور لشکر کھانے سے فارغ ہو کر آرام کرے۔

کھانڈے راؤ جوں جوں حیدر علی خاں کے قریب ہو رہا تھا اسی قدر اس پر اپنے سپہ سالار کی خوبیاں کھلتی جا رہی تھیں۔

حیدر علی خاں نصف شب گزرنے کے بعد پڑاؤ پر واپس آیا۔ اس وقت لشکر پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور سوائے رات کے گشت کے سواروں یا حیدر علی کے محافظ دستے کے اور سب لشکری اطمینان سے محوِ خواب تھے۔

حیدر علی خاں نے واپس آتے ہی اپنے خاص ملازم کے ذریعے ان سرداروں کو طلب کیا جن کے دستے کسی فوری ضرورت کے وقت استعمال کیے جاتے تھے۔

یہ دستے دراصل شب خون میں استعمال ہوتے تھے اور نصف گھنٹے کے وقفہ میں جنگ کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

حیدر علی خاں نے چیتے جیسی پھرتی سے دشمن کی پوزیشن کا جائزہ لیا۔ اس کے کمزور پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ شب خوں کا راستہ متعین کیا۔ پھر خیمہ گاہ میں آ کر شب خون مارنے والے سرداروں کو بلا کر جلدی جلدی ہدایات [illegible]

یہ سردار دن میں [illegible] نے والے سرداروں سے زیادہ تیز [illegible] آگ کے گولے پھینکنے میں ماہر اور بھاگتے گھوڑے پر [illegible] پھینکنے اور تلوار چلا [illegible] تھے۔

حیدر علی خاں کی خیمہ [illegible] سناٹا [illegible] تھا لیکن [illegible] پانچ سو گھوڑے اور ان کے سوار نکل کے جا چکے تھے۔

حیدر علی خاں اپنے پھرتیلے جانباز سواروں کو لے کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے روانہ ہو کر اسے دشمن کی خیمہ گاہ کے درمیان سے گزرتے ہوئے کھڑیوں میں بندھے اور شعلے اگلتے ہوئے چوبی تیر پھینکنا تھے۔

جنگوں میں عام طور پر بڑے سردار یا بادشاہ قلبِ فوج میں رہ کر لشکر کو لڑاتے تھے یا پھر کسی اونچی جگہ کھڑے ہو کر لڑائی دیکھتے تھے مگر حیدر علی خاں کا اپنے آغاز سے موت تک ہمیشہ یہ طریق کار رہا کہ وہ اپنے لشکر کی نہ صرف راہنمائی کرتا بلکہ حملہ کرتے وقت بھی سب سے آگے رہتا تھا۔

جب حیدر علی کے تمام سوار آگے پیچھے قطاریں بنا کر کھڑے ہو گئے تو حیدر علی خاں نے جو سب سے آگے تھا، آہستہ سے سیٹی بجائی جس کے ساتھ ہی سپاہیوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ایک دم روشن ہو گئیں، جن کے سروں پر کپڑا بندھا ہوا تھا اور انہیں تیل میں ڈبویا گیا تھا۔

حیدر علی خاں کے یہ شعلہ بردار سوار گھوڑے اڑاتے اور بگولوں کے مانند اٹھتے گوپال راؤ کے پڑاؤ میں ایک سرے سے داخل ہوئے اور انہوں نے خیموں پر شعلے پھینک کے آگ لگا دی۔ پھر سامنے آنے والوں اور مزاحمت کرنے والوں پر تلواروں اور نیزوں سے حملہ آور ہو گئے۔

گوپال راؤ کے خیموں میں آگ بھڑک چکی تھی اور اس کے لشکری حواس باختہ ادھر ادھر بھاگ رہے اور مسلسل قتل ہو رہے تھے۔

حیدر علی خاں نے سواروں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ جس قدر تیزی سے ممکن ہو دشمن کی خیمہ گاہ کو پار کریں اور دوسرے سرے سے باہر نکل جائیں۔ پھر نصف دائرہ کاٹ کر دشمن پر پھر اسی مقام سے حملہ کریں جہاں سے وہ پہلی مرتبہ ان کی خیمہ گاہ میں داخل ہوئے تھے۔

اس سے دشمن پر یہ تاثر بٹھانا مقصود تھا کہ حیدر علی کا پورا لشکر ایک ساتھ شب خون مارنے میں شریک ہوا ہے۔

حیدر علی کی اس حکمتِ عملی سے گوپال راؤ کا لشکر واقعی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ حیدر علی کے پاس عظیم لشکر ہے جو ایک گھنٹہ سے مسلسل ایک سمت سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل رہا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹہ فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی اور اندھیرے میں جدھر جس کا منہ اٹھ

وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

حیدر علی خاں نے اپنی ذہانت سے شب خون میں صرف پانچ سو سوار استعمال کیے اور گوپال راؤ کے پورے لشکر کو میدان سے بھگا دیا۔

جب صبح ہوئی تو سامنے کا میدان صاف تھا۔ سوائے لاشوں اور جلے ہوئے خیموں کے وہاں اور کچھ نہ تھا۔

مرہٹے اپنا تمام مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس سامان کا بیشتر حصہ خاک ہو گیا تھا۔ جو سامان بچا وہ حیدر علی نے اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا۔

حیدر علی خاں کی اس کامیابی نے اس کے لشکر کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ مرہٹہ فوج بددل ہو کر بھاگی تھی اور اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کسی جگہ جم کر حیدر علی خاں کا مقابلہ کرے۔

حیدر علی خاں چن پٹن سے اپنی فوجیں لے کر بنگلور کی طرف بڑھے اور شہر کے قریب پہنچ کے خیمہ زن ہوئے۔

چن پٹن سے مرہٹہ شکست خوردہ فوج کسی مقام پر نہ ٹھہری اور اس نے سرا کے قلعہ ہی میں جا کر دم لیا۔

گوپال راؤ نے کھلے میدان میں لڑنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مرہٹوں کے صدر مقام پونا کی طرف یکے بعد دیگرے کئی تیز رفتار سوار دوڑائے کہ اسے پونا سے فوراً فوجی کمک بھیجی جائے تا کہ وہ حیدر علی خاں کا مقابلہ کر سکے۔

ادھر حیدر علی خاں نے سرا جانے کے بجائے میسور کے دوسرے تمام علاقوں کو مرہٹوں سے پاک کرنا شروع کر دیا، جن پر وہ قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

دو ہفتوں کے اندر اندر حیدر علی خاں نے سوائے سرا کے اور تمام علاقے مرہٹوں سے واگزار کرا لیے۔

گوپال راؤ سرا میں بیٹھا کمک کا انتظار کرتا رہا مگر اسے پونا سے کوئی مدد نہ مل سکی اس لیے کہ ۱۷۶۱ء میں شمالی ہند میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے مرہٹوں کی کمر توڑ کے رکھ دی!





جنوری ۱۷۶۱ء میں مرہٹے ایک عذاب عظیم سے دوچار ہوئے۔

چن پٹن کے میدان میں حیدر علی خاں کے شب خون نے مرہٹوں کو ایسا بدحواس کیا کہ وہ تمام ساز و سامان چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مرہٹہ سردار گوپال راؤ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ سرنگاپٹم کا ایک معمولی سردار اتنی جرأت کرے گا کہ مرہٹہ لشکر کے سامنے آئے۔ اس وقت مرہٹوں کا جنوبی ہند اور شمالی ہند دونوں علاقوں میں طوطی بول رہا تھا اور تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور رجواڑے مرہٹوں کی پناہ میں آنے کے خواہش مند اور تمنائی تھے۔

مگر ـــ

جب چن پٹن میں ان کو مار پڑی تو گوپال راؤ کی آنکھیں کھلیں اور حیدر علی خاں سے کھلے میدان میں مقابلہ کے بجائے اس نے قلعہ سرا میں پناہ لینا مناسب خیال کیا۔ یوں وہ بچی کھچی فوج کے ساتھ قلعہ سرا میں پہنچ گیا۔

چن پٹن سے پسپا ہوتے ہی اس نے مرہٹوں کی مرکزی حکومت جو پونا میں قائم تھی اور بالاجی باجی راؤ جس کا پیشوا تھا، اسے اطلاع بھجوا دی تھی کہ میسور میں زبردست بغاوت ہو گئی ہے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اسے فوراً فوجی کمک کی ضرورت ہے جو اسے مہیا کی جائے۔

گوپال راؤ اپنے پیشوا کو اطلاع دے کر اطمینان سے قلعہ سرا میں بیٹھا ہوا تھا کہ جب پونا سے

کمک آئے گی تو وہ قلعہ سے نکلے گا مگر اس کا پیشوا اسے مدد کیسے روانہ کرتا؟

اس وقت شمالی ہند میں شاہِ افغانستان احمد شاہ ابدالی اپنے لشکر کے ساتھ پنجاب میں اترا ہوا تھا اور مرہٹوں کے تمام مقبوضات احمد شاہ ابدالی کی زد پہ تھے اور پونا کے پیشوا کا تخت لرز رہا تھا۔

احمد خاں جو احمد شاہ ابدالی اور احمد خاں درّانی کے نام سے بھی مشہور ہوا، افغانستان کی معزز برادری سدوزئی کا سرگروہ تھا۔ احمد خاں نے نادر شاہ درانی کی غلزئی قبائل کے خلاف رفاقت اور مدد کی تھی جس کے صلہ میں اسے ان علاقوں کی علمداری حاصل ہوگئی تھی۔

پھر جب ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ اندرونی سازشوں کی بھینٹ چڑھا تو ایران کے جنوب مشرق کے صوبے بلا جد وجہد پکے پھلوں کی طرح احمد شاہ کی گود میں آ گرے۔

احمد خاں کو فوراً افغانستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

موجودہ افغانستان کی آزاد مملکت کی بنیاد اسی احمد خاں یعنی احمد شاہ ابدالی نے رکھی تھی۔ اس کی تخت نشینی قندھار میں ہوئی۔

یہ وہی قندھار ہے جس پر قبضہ کے لیے صدیوں تک ایرانی اپنا خون بہاتے رہے ہیں شمال میں بلخ اور مشرق میں پنجاب اور کشمیر تک مقامی حکام نے احمد شاہ ابدالی کا خطبہ پڑھوایا۔

ابدالیوں کو طاقت حاصل ہوئی تو انھوں نے پنجاب پر ہی بس نہیں کیا بلکہ دہلی کے ان تمام علاقوں پر جن پر نادر شاہ نے قبضہ کیا تھا، ان کی تجدید کا قصد کیا۔

اس سلسلہ میں احمد شاہ نے ۱۷۴۸ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان برصغیر پر پانچ حملے کیے۔ ان حملوں کا مختصر احال یہاں درج کیا جاتا ہے۔

پہلا حملہ

احمد شاہ ابدالی کا برصغیر پر پہلا حملہ ۱۷۴۸ء میں ہوا۔

لاہور فتح کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ نے اپنے وزیر قمرالدین کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا۔ شاہ دہلی ان دنوں مرض الموت میں مبتلا تھا۔ پھر بھی اس نے معقول فوج اور توپ خانہ قمرالدین کے حوالے کیا اور ولی عہد شہزادہ احمد کو بھی اس کے ساتھ کر دیا۔

افغان لشکر پانچوں دریا پار کر کے سرہند پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس کا مقابلہ مغل لشکر، جس کا سردار وزیر قمرالدین تھا، سے ہوا۔

قمرالدین اور اس کا بیٹا معین الملک فنونِ جنگ سے واقف اور بادشاہِ دہلی کے دل سے وفادار تھے۔ وہ اس قدر جان توڑ کے لڑے کہ احمد شاہ ابدالی کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا مگر اس جنگ میں قمرالدین شجاعت کے جوہر دکھاتا ہوا کام آیا۔

اپنے وزیر با تدبیر قمرالدین کی موت سے محمد شاہ، بادشاہِ دہلی اس قدر غمزدہ اور نڈھال ہوا کہ کچھ ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

دوسرا حملہ

۱۷۴۹ء میں احمد شاہ ابدالی پھر برصغیر پر حملہ آور ہوا۔

اس وقت قمرالدین کا بیٹا معین الملک پنجاب کا گورنر تھا۔ معین الملک تورانی تھا اور دہلی کا وزیر صفدر جنگ ایرانی تھا۔ چونکہ ایرانیوں اور تورانیوں میں عہدِ قدیم سے اختلاف چلا آ رہا تھا اسلیے وزیر صفدر جنگ نے اپنے تورانی گورنر معین الملک کو کوئی کمک نہ بھیجی اور گورنر کو ابدالیوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔

پنجاب کے چار ضلع سیالکوٹ، امین آباد، پسرور اور اورنگ آباد احمد شاہ ابدالی کے حوالے کر دیے گئے۔

تیسرا حملہ

پنجاب کے چار اضلاع اگرچہ ابدالیوں کے ماتحت ہوگئے تھے لیکن احمد شاہ ابدالی نے ان اضلاع سے مالیہ وصول کرنے کا کام معین الملک ہی کے سپرد کر دیا تھا۔ معین الملک دو سال تک ان اضلاع کا مالیہ وصول کر کے ابدالیوں کو بھیجتا رہا مگر تیسرے سال سے اس نے مالیہ دینا بند کر دیا۔

چنانچہ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے تیسری بار حملہ کر دیا۔

معین الملک نے دہلی کی مرکزی حکومت سے پھر کمک مانگی مگر اس ایرانی تورانی کے اختلاف کی وجہ سے اسے اس بار بھی مدد نہ دی گئی اور اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

احمد شاہ ابدالی، معین الملک کی بہادری سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے معین الملک کو معاف کر کے اسے اپنی طرف سے پنجاب کا گورنر مقرر کیا اور طے پایا کہ معین الملک ۵۰ لاکھ روپے سالانہ احمد شاہ کو ادا کرے گا۔

چوتھا حملہ

اس دوران مرہٹے بڑی تیزی سے شمالی برصغیر کی سیاست پر چھاتے جا رہے تھے۔ احمد شاہ شاہِ دہلی کے وزیر صفدر جنگ نے مرہٹہ پیشوا کا تعاون حاصل کیا اور مرہٹہ فوج دہلی میں بُلالی۔ اس فوج نے دہلی اور اطرافِ دہلی میں خوب اودھم مچایا اور لوٹ مار کی۔ انہی دنوں دوسرے وزیر عماد الملک نے صفدر جنگ کو وزارت سے نکال باہر کیا۔

یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن اس نے بھی مرہٹوں کا تعاون حاصل کیا اور انہیں پنجاب کی فتح پر لگا دیا۔ پنجاب کا گورنر معین الملک تھا جسے احمد شاہ ابدالی نے مقرر کیا تھا اور وہ اسی کے ماتحت تھا۔ عماد الملک نے مرہٹوں کی فوج سے پنجاب پر حملہ کیا۔ معین الملک شکست کھا گیا اور عماد الملک نے اپنی طرف سے ادینہ بیگ کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا۔

پنجاب پر مغلوں کے قبضہ کی خبر جب قندھار پہنچی تو احمد شاہ ابدالی چوتھی مرتبہ برصغیر پر حملہ آور ہوا۔

انہوں نے صرف پنجاب کو فتح نہ کیا بلکہ سیدھا دہلی میں جا کر دم لیا۔ یہ حملہ ۱۷۵۶ء میں ہوا اور احمد شاہ ابدالی ۱۷۵۷ء میں دہلی پہنچا۔

یہ وہی سال ہے جب مکار انگریز قوم نے غدارِ قوم میر جعفر کی مدد سے والیٔ بنگال نواب سراج الدولہ کو شکست دی تھی۔

احمد شاہ ابدالی نے ایک ماہ تک دہلی میں قیام کیا۔ عماد الملک نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر ثانی کو مغل بادشاہ تسلیم کر لیا اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو امیر الامرا کا خطاب دے کر عالمگیر ثانی کا وزیر مقرر کیا۔

اس حملہ میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوؤں کے اہم مقام متھرا کو بھی تباہ کیا تھا۔ پھر وہ اپنے بیٹے تیمور شاہ کو پنجاب کا گورنر مقرر کر کے کابل واپس چلا گیا۔

پانچواں اور آخری حملہ

احمد شاہ ابدالی کے واپس جاتے ہی عماد الملک نے روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو وزارت سے ہٹا دیا اور خود وزیر بن بیٹھا۔

اس نے پھر مرہٹہ فوج طلب کی اور ان کی مدد سے پنجاب پر حملہ کیا۔ وہاں احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور شاہ گورنر تھا۔ عماد الملک نے مرہٹوں کی مدد سے اسے شکست دے کر پنجاب سے بھگا دیا۔ اب پنجاب اور دہلی دونوں جگہ مرہٹوں کا قبضہ تھا۔ ان کی فوج دہلی میں مقیم تھی اور وہ محصول کے بہانے آبادیوں کو لوٹ رہے تھے۔

جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت پہلے ہی بڑھی ہوئی تھی۔ میسور تک ان کا قبضہ ہو چکا تھا اور اب وہ پورے برصغیر پر ایک ہندو حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

۱۷۵۹ء کا زمانہ تھا جب احمد شاہ ابدالی، شاہِ افغانستان کو پنجاب میں اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شکست اور مرہٹوں کے قبضے کی خبر ملی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی کو پانچویں دفعہ برصغیر کا رخ کرنا پڑا۔

لاہور پر مرہٹہ سردار ساباجی سندھیا کا قبضہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے ایک ہی تھپیڑے سے ساباجی سندھیا کا منہ گھوم گیا اور وہ دُم دبا کر پنجاب سے نکل بھاگا۔

لاہور پر قبضے کے بعد احمد شاہ ابدالی آگے بڑھا اور دہلی کے قریب دتاجی سندھیا کو شکست دے کر اس کا سر قلم کر دیا۔

اسی وقت احمد شاہ ابدالی کے ایک سردار جہاں خاں نے سکندرہ کے قریب ملہار راؤ ہلکر کو شکستِ فاش دی۔ اس طرح ایک ہی مہم میں شمالی ہند میں مرہٹہ اقتدار کی جڑیں ہل کے رہ گئیں۔

پنجاب اور دہلی میں مرہٹہ افواج کی شکست کی خبر جب جنوبی ہند میں مرہٹوں کے مرکز پونا میں پہنچی تو مرہٹہ پیشوا چونک پڑا۔

شمال میں مرہٹوں کے تینوں سردار بلکہ سالارِ افواجِ مرہٹہ، ساباجی سندھیا، دتاجی سندھیا اور ملہار راؤ ہلکر پیشوا کی ناک تھے اور اسے اپنے ان سالاروں پر بڑا ناز تھا۔ بالاجی باجی راؤ پورے ۲۴ گھنٹے تک اپنے محل کے سامنے میدان میں زخمی درندے کی طرح تڑپتا اور زخم چاٹتا رہا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہ تھی۔

پھر جب اس غم اور غصہ سے اس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہوا تو اس نے اپنے بھائی سدا شیو راؤ کو اپنے پاس بلایا اور اشکبار آنکھوں سے اس سے کہا:

"اے بھائی! شمالی ہند میں ابدالی لیٹروں نے ہماری عزت لوٹ لی۔ انہوں نے ہماری شجاعت اور عظمت کے چراغ کو بجھا دیا ہے۔ ہزاروں فوجیوں کے علاوہ ہمارے پیارے سردار ساباجی سندھیا، دناجی سندھیا اور ملہار راؤ ہلکر کھیت رہے۔ اب اس ڈوبی ہوئی عزت کو تم ہی جمنا کی سطح پر لا سکتے ہو اور ہمالہ کی چوٹیوں پر پھر سے پہنچا سکتے ہو۔

میں تمہارے ساتھ اپنے لختِ جگر وشواس راؤ کو بھیج رہا ہوں۔ دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ چلوں اور احمد شاہ ابدالی سے مرہٹوں کے خون کا انتقام لوں مگر کیا کروں ایسے حالات میں پونا کو خالی چھوڑنا بھی کسی طرح مناسب نہیں۔

ادھر میسور سے بھی کچھ اچھی خبریں نہیں آ رہی ہیں۔ یہاں بھی حیدر علی نام کا ایک مسلمان بچّہ راجہ کرشن اوڈیر کی مدد پر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ گوپال راؤ اس کی سرکوبی کے لیے قلعہ سرا سے نکل کر سرنگا پٹم گیا ہے۔ میرا دل ادھر سے بھی ڈر رہا ہے۔"

مختصر یہ کہ مرہٹوں کے پیشوا بالاجی باجی راؤ نے تین لاکھ کا ایک لشکر ترتیب دیا جس میں ۷۵ ہزار صرف سوار تھے۔ اس کے علاوہ مشہور توپچی ابراہیم گاردی معہ اپنے توپ خانے کے لشکر کے ساتھ تھا۔

یہ لشکر بڑی شان و شوکت اور آن بان سے احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کو شمال کی طرف بڑھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس سے قبل کبھی اتنی عظیم مرہٹہ فوج میدان میں نہیں نکلی تھی۔

۱۷۶۰ء میں مرہٹہ فوج دہلی میں داخل ہوئی اور اپنی خصلت کے مطابق لوٹ مار مچا دی۔ محلات، مساجد اور مقبرے تک ان کی دست برد سے محفوظ نہ رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ قیامت سے پہلے ایک قیامت مرہٹوں کی شکل میں دہلی والوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔

اس اثنا میں احمد شاہ ابدالی انوپ شہر، جو بلند شہر میں تھا، میں اپنے لشکر کے ساتھ مقیم تھا۔ ان دنوں مشرقی صوبہ اودھ کا صوبیدار شجاع الدولہ کی فوجی طاقت خاص اہمیت رکھتی تھی۔ احمد شاہ ابدالی چاہتا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف اسے شجاع الدولہ کی حمایت حاصل ہو جائے۔

روہیل کھنڈ کا روہیلہ سردار نجیب الدولہ ان دونوں میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ کیونکہ اب یہ مسئلہ مرہٹوں اور ابدالیوں کا نہیں تھا بلکہ اب سوال یہ تھا کہ مغلوں کی طاقت ختم

ہو جانے کے بعد برصغیر پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے کونسی طاقت حکومت کرے گی!

نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اگر مرہٹہ طاقت کا خاتمہ نہ کیا گیا تو مسلمانوں کے ۶۰۰ سالہ دورِ حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا اور برصغیر پر مرہٹہ (ہندو) راج مسلط ہو جائے گا۔

نجیب الدولہ کے یہ بات سمجھانے ہی نے احمد شاہ ابدالی کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ برصغیر پر خواہ کسی کی بھی حکومت قائم ہو جائے مگر مرہٹہ حکومت قائم نہیں ہونی چاہیے۔

آخر روہیلہ سردار نجیب الدولہ کی کوششیں بار آور ہوئیں اور شجاع الدولہ احمد شاہ ابدالی کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔

طے یہ ہوا کہ مرہٹہ طاقت کا سر کچل دیا جائے اور دہلی میں ایک بار پھر مسلمانوں کی طاقتور سلطنت قائم ہو اور مرہٹوں کا ہندو حکومت قائم کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

مرہٹوں کا تین لاکھ کا لشکر معہ توپ خانہ کے پانی پت کے میدان میں پہنچ چکا تھا اور انہوں نے خندقیں کھود کے مورچے قائم کر لیے تھے۔

احمد شاہ ابدالی نے بجائے پانی پت جانے کے دہلی اور پانی پت کے درمیان پڑاؤ ڈال دیا۔ اس طرح مرہٹوں کو دہلی سے حاصل ہونے والی رسد کا راستہ بند ہو گیا اور اب پانی پت کے میدان میں تیسری جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی میں متوقع جنگ کا نام "پانی پت کی تیسری جنگ" کیوں رکھا گیا؟

کیا مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی میں پانی پت کے میدان میں اس سے پہلے بھی دو لڑائیاں ہو چکی تھیں کہ اس ہونے والی جنگ کو "پانی پت کی تیسری جنگ" کا نام دیا گیا؟

اس کے جواب کے لیے برصغیر کی گذشتہ تاریخ کے ورق الٹنا پڑیں گے!

پانی پت کا قصبہ ایک طول طویل لق و دق اور بے آب و گیاہ صحرا کے کنارے پر آباد ہے۔ یہ میدان دہلی سے کچھ دور واقع ہے اور یہاں اس تیسری جنگ سے پہلے دو اور عظیم جنگیں لڑی گئی ہیں جن کا نام پانی پت کی پہلی لڑائی اور پانی پت کی دوسری لڑائی ہے۔

دراصل پانی پت میں لڑی جانے والی لڑائیاں اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ اس میدان کی فتح و شکست نے برصغیر کی قسمت بدل کے رکھ دی تھی۔

اس میدان میں لڑی جانے والی "پانی پت کی پہلی لڑائی" کے نام سے مشہور جنگ، پہلے مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر اور ہند کے لودھی خاندان کے بادشاہ ابراہیم لودھی کے درمیان اپریل ۱۵۲۶ء میں لڑی گئی تھی۔

دراصل دہلی پر قبضہ ہندوستان پر قبضہ سمجھا جاتا تھا اس لیے ہندوستان پر قبضے کے لیے طاقت کا فیصلہ دہلی سے قریب پانی پت کے عظیم الشان میدانِ جنگ میں ہوتا تھا۔

ہند میں مغلوں کا جدِ امجد ظہیرالدین بابر جب پنجاب کو روندتا ہوا دہلی کی طرف چلا تو تاجدارِ دہلی ابراہیم لودھی بھی اپنے لشکر کے ساتھ پانی پت کے میدان کی طرف روانہ ہوا تاکہ ہند پر حملہ آور ہونے والے بابر کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دے۔

بابر کے ہند پر حملے کی وجہ یہ تھی کہ صوبہ پنجاب کا گورنر دولت خاں لودھی اپنے بادشاہ ابراہیم لودھی سے باغی ہوگیا تھا۔ اس نے قندھار کے بادشاہ ظہیرالدین بابر کو ہند پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور بابر اس دعوت پر لشکر لے کر پنجاب پر حملہ آور ہوا۔

یہ حملہ ۱۵۲۴ء میں ہوا۔

بابر نے لاہور پر قبضہ کر کے شہر میں آگ لگوادی۔ اس کا ارادہ تھا کہ پنجاب اور برصغیر پر ایک مستقل حکومت قائم کرے اس لیے اس نے پنجاب کا معقول انتظام کیا اور دولت خاں لودھی کے بیٹے دلاور خاں کو پنجاب کا گورنر مقرر کر کے کابل واپس چلا گیا۔

دوسری طرف دولت خاں لودھی، جس نے بابر کو پنجاب پر حملہ کی دعوت دی تھی، اس خیال میں تھا کہ بابر شاہی افواج کو شکست دے کر واپس چلا جائے گا لیکن جب بابر نے مستقل انتظامات کیے اور اس کے بیٹے کو گورنر بنا کر واپس گیا تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو صوبے داری سے نکال باہر کیا۔ خود پنجاب پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔

اس کی خبر جب کابل پہنچی تو بابر نے پورے ہند پر ایک مستقل حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے تیزی سے تیاریاں شروع کر دیں۔

تیاریاں مکمل ہونے کے بعد بابر بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ پنجاب میں داخل ہوا۔ پہلے اس نے لاہور پر قبضہ کیا۔ پھر انبالہ اور شاہ آباد کے راستے جمنا کے کنارے کنارے آگے بڑھا۔

دوسری طرف سے ابراہیم لودھی اپنے ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ پانی پت پہنچا۔ اس لشکر میں ایک ہزار جنگی ہاتھی بھی تھے۔ بابر بھی پانی پت پہنچ گیا مگر دشمن کے مقابلہ میں اس کے ساتھ صرف

بارہ ہزار کا لشکر تھا۔

ظہیرالدین بابر، بارہ سال کی عمر سے فتح و شکست سے دوچار ہوتا چلا آرہا تھا۔ ابراہیم لودھی کی فوج اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ مزید برآں کہ اس میں ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کا ایک مضبوط دستہ بھی تھا لیکن بابر بالکل ہراساں نہ ہوا اور میدان پر نظر ڈال کر اپنی جنگی حکمتِ عملی فوراً ترتیب دے لی۔

اس نے پانی پت کے قصبے کو اپنے دائیں جانب یعنی میمنہ کی سمت رکھا اور بائیں طرف یعنی میسرہ کی سمت خندق کھود کر اسے محفوظ کیا۔

اب قلبِ فوج کی حکمتِ عملی باقی تھی۔ اس کے لیے بابر نے یہ کیا کہ سامنے کی سمت سات سو گاڑیوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا۔ گاڑیوں کے درمیان مناسب فاصلے پر مورچے قائم کیے اور ان میں توپیں لگا دیں۔

بابر نے یہ پیش بندی اس لیے کی تھی کہ دشمن کا ٹڈی دل اپنی پوری قوت سے اس پر حملہ آور نہ ہو سکے۔

۲۱۔ اپریل ۱۵۲۶ء کی صبح ابراہیم لودھی کے لشکر میں حرکت پیدا ہوئی ــــ اور پورا لشکر ایک ساتھ یلغار کرتا ہوا آگے بڑھا۔ بابر کی فوج نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہ کی۔

ابراہیم لودھی کا لشکر جب گاڑیوں کی قطار کے پاس پہنچا تو اس کے قدم ایک دم رک گئے اور وہ متحیر نظروں سے گاڑیوں کو دیکھنے لگا۔

اسی وقت بابر نے اپنے میمنہ اور میسرہ کے سواروں کو اشارہ کیا اور وہ دائیں بائیں سے نکل کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے ساتھ ہی گاڑیوں کے درمیان بنے ہوئے مورچوں سے توپوں نے آگ اگلنا شروع کر دی۔

واضح رہے کہ بارود کا استعمال سب سے پہلے بابر ہی نے کیا تھا۔ ابراہیم لودھی کے لشکری اور جنگی ہاتھی بارود کی گولوں سے قطعی بے خبر تھے۔ اس ناگہانی آفت سے وہ سخت بدحواس ہوئے اور کسی نہ کسی طرح دوپہر تک لڑتے رہے۔ پھر ان کے قدم اکھڑ گئے۔ ابراہیم لودھی میدانِ جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

پانی پت کی اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر میں افغان لودھیوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور یہاں ظہیرالدین بابر کی مغل حکومت قائم ہوئی۔

پانی پت کی دوسری لڑائی بھی سولھویں صدی عیسوی میں لڑی گئی۔ اس جنگ کا ایک فریق

سلطنتِ مغلیہ کا عظیم بادشاہ اکبر تھا۔

اکبر اس وقت بالکل نوعمر تھا۔ جب اس کے باپ شہنشاہ ہمایوں کا انتقال ہوا تو نوعمر جلال الدین اکبر اس وقت اپنے اتالیق بیرم خاں کے ساتھ پنجاب میں تھا۔ وہیں بیرم خاں نے اکبر کی تاجپوشی کی رسم ادا کرائی۔

اس وقت سلطنتِ مغلیہ کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ سکندر لودھی اگرچہ شکست کھا چکا تھا مگر شمالی پنجاب میں اس کے کئی مضبوط قلعے تھے۔ مشرقی صوبوں پر عادل شاہ کا قبضہ تھا۔ وہ چنار میں تھا لیکن اس کا جرنل ہیموں ایک بڑے لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ ہندو بنیا بہت مغرور تھا۔ کہنے کو وہ عادل شاہ کا جرنل تھا لیکن وہ کسی کی پروا نہ کرتا تھا۔ اس کے دماغ میں ہندوستان میں ایک عظیم ہندو سلطنت کا سودا سمایا ہوا تھا۔

شہنشاہ ہمایوں کی اچانک موت نے اسے ایک سنہری موقع مہیا کر دیا تھا چنانچہ وہ نوعمر شہنشاہ اکبر سے جنگ کرنے کے لیے چل پڑا۔

اس وقت ہند کے دو دارالسلطنت تھے۔ ایک آگرہ اور دوسرا دہلی۔ دہلی میں مغلوں کا گورنر تردی بیگ تھا۔ ہیمو بقال سیدھا دہلی پہنچا۔ اس کے پاس ایک بڑا لشکر تھا جس میں افغانوں کی کثرت تھی۔ اس کے علاوہ راجپوتوں کے بہت سے دستے تھے۔ تردی بیگ ہیمو بقال کا مقابلہ نہ کر سکا اور شکست کھا گیا۔

ہیمو بقال، دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرنے کے بعد مغل بادشاہ نوعمر اکبر سے آخری معرکہ کے لیے پانی پت کی طرف روانہ ہوا۔

بیرم خاں، اکبر کو لے کر پہلے ہی پانی پت پہنچ چکا تھا۔ اور اس تاریخی میدان میں تقدیر کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

ہیمو بقال کا لشکر تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ اس کے ساتھ ڈیڑھ ہزار جنگی ہاتھی بھی تھے۔ آخر ۵۔ نومبر ۱۵۵۶ء کو ہیمو بقال اور اکبر کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور تاریخ کی عظیم جنگ شروع ہوئی جسے پانی پت کی دوسری لڑائی کہا جاتا ہے۔

ہیمو بقال نے پہلے اکبر کے میمنہ اور میسرہ پر حملہ کیا اور پھر انہیں دباتا ہوا آگے بڑھا۔ بیرم خاں ایک انتہائی تجربہ کار جرنیل تھا۔ اس نے دشمن کے دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں کے حملوں کو روک لیا اور ہیمو بقال کے لشکر کی پیش قدمی چند لمحوں کے لیے رک گئی۔

ہیمو بقال قلب میں تھا۔ اس نے فوراً پندرہ سو جنگی ہاتھیوں کو جو قلب فوج میں پہاڑ کی طرح جمے کھڑے تھے، حرکت دی اور یہ کالا پہاڑ چنگھاڑیں مارتا آگے بڑھا۔

کہتے ہیں کہ اس جنگ میں قدرت نے مغلوں کی عجیب انداز سے مدد کی۔

جس وقت ہیمو بقال کے جنگی ہاتھی آگے بڑھ رہے تھے اسی وقت کسی مغل تیر انداز کا ایک تیر ہیمو بقال کی آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ ہیمو اس تکلیف سے چیخ پڑا۔ وہ ہودج میں گر پڑا۔ ہیمو بقال کے نظروں سے غائب ہوتے ہی دشمن کی فوج میں ابتری پیدا ہوئی اور وہ میدان چھوڑ گئی۔

ہیمو بقال گرفتار ہو کے قتل ہوا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی کے نتیجہ میں مغلوں کی ڈگمگاتی حکومت از سر نو جم گئی۔ ہیمو جس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کے بعد راجہ بکرماجیت کا لقب اختیار کر لیا تھا اور سر پہ ہند کی عظیم سلطنت کا تاج رکھنے کی آرزو کر رہا تھا، اس کا خاتمہ ہو گیا۔ افغانوں کا بھی مغلوں کے خلاف یہ آخری معرکہ تھا۔ پانی پت کی شکست نے ان کے خوابوں کو بھی ہمیشہ کے لیے منتشر کر دیا۔

اب یہ پانی پت کی تیسری لڑائی تھی۔

اس میں ایک طرف مرہٹوں کا لشکر جرار تھا جس کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اس میں صرف سواروں کی تعداد ۵۵ ہزار کے قریب تھی۔

اس مرہٹہ لشکر کی کمان، مرہٹوں کے پیشوا بالاجی باجی راؤ کا بھائی سداشیو راؤ جسے عرف عام میں "بھاؤ" کہا جاتا تھا، کر رہا تھا اور باجی راؤ کا لڑکا وشواس راؤ اس کے ساتھ تھا۔

دوسری طرف افغانستان کا بادشاہ احمد شاہ ابدالی تھا جو اپنے لشکر کے ساتھ پانی پت اور دہلی کے درمیان پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اور اس طرح اس نے مرہٹوں کو دہلی سے آنے والی رسد کا راستہ بند کر دیا تھا۔

مرہٹے پانی پت کے میدان میں مورچے جمائے پڑے تھے اور احمد شاہ ابدالی کے پانی پت آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر احمد شاہ ابدالی نے جیسے پانی پت نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔ اس کی حکمت عملی یہی معلوم ہوتی تھی کہ مرہٹوں کی رسد کو روک کر انہیں اتنا پریشان کیا جائے کہ وہ پانی پت کے میدان میں کھودی ہوئی خندقوں اور بنائے ہوئے مورچوں سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں اور کھلے میدان میں آکے مقابلہ کریں۔

آخر احمد شاہ ابدالی کی اس حکمت عملی نے مرہٹوں کو خندقیں اور مورچے چھوڑنے پر مجبور کر دیا

اس لیے کہ ان کے لشکر میں رسد کی کمی ہو گئی تھی اور اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ مورچوں اور خندقوں سے نکل کر ابدالی لشکر پہ حملہ آور ہوں جو اُن کے حملے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

پس ۱۴۔ جنوری ۱۷۶۱ء کی صبح مرہٹوں نے مجبوراً خندقوں کو چھوڑا اور میدان میں آ کر ابدالی لشکر کی طرف بڑھے۔ ابدالی لشکر اس متوقع حملے کا منتظر تھا۔ اس نے بھی آگے بڑھ کر تیروں اور تلواروں سے دشمن کا استقبال کیا۔

اس لڑائی میں کسی قسم کا اتفاق نہیں ہوا۔ تمام دن شدید جنگ ہوتی رہی اور پانی پت کے میدان میں قیامت برپا رہی۔

مرہٹوں کو اپنی طاقت کا بڑا زعم تھا مگر ان کے سوار ابدالیوں کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کے گر رہے تھے۔

شام تک لاشوں کے اس قدر ڈھیر لگ گئے کہ سواروں اور پیادوں کا چلنا مشکل ہو گیا مگر یہ لڑائی دوسرے دن تک بھی نہ جا سکی۔ ابدالی تلواروں نے مرہٹوں کو کاٹ کے رکھ دیا اور وہ میدان میں نہ جم سکے۔

ابدالیوں نے بھاگنے والے مرہٹوں کا تعاقب کیا اور دور تک انہیں مارتے کاٹتے چلے گئے۔ جو ان کے ہاتھوں سے بچ کے نکل گئے انہیں قرب و جوار کے دیہاتی کسانوں نے خوب خوب قتل کیا کیونکہ مرہٹے پورے ہندوستان میں اودھم مچاتے پھرتے تھے۔ ان سے کوئی خوش نہ تھا۔

مرہٹہ سپہ سالار سداشیو راؤ اور پیشوا کا بیٹا وشواس راؤ میدان میں کھیت رہے۔ ایک اندازے کے مطابق پانی پت کی اس تیسری لڑائی میں ایک لاکھ مرہٹے مارے گئے اور ان کی طاقت کا جنازہ اٹھ گیا۔

مرہٹوں کی اس شکستِ فاش کی خبر، اس خبر کے ساتھ پونا پہنچی کہ اس جنگ میں ایک لاکھ مرہٹے کام آئے ہیں جن میں پونا کے پیشوا بالاجی باجی راؤ کا بیٹا وشواس راؤ اور بھائی سداشیو راؤ بھی شامل ہیں۔ بالاجی باجی راؤ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اسی غم میں مر گیا۔



شمالی ہند میں مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی میں ۱۷۵۹ء میں جو آویزش شروع ہوئی تھی اس کا خاتمہ ۱۷۶۱ء میں اس وقت ہوا جب پانی پت کے میدان میں مرہٹے ایک لاکھ لاشیں چھوڑ کر ایسے

بھاگے کہ پھر کبھی پہلے جیسا عروج حاصل نہ ہو سکا۔

لیکن ـــــ

اس دو سال کے عرصے میں جنوبی ہند، خصوصاً میسور کے علاقے سرنگا پٹم میں بھی چھوٹے بڑے کئی انقلاب آئے۔ کچھ بونوں نے اپنے قد بڑھانے کی کوشش کی اور کچھ قد آوروں کے شملے جھک گئے۔

اس زمانے میں حیدر علی خاں کے نائب یا سیکرٹری کھانڈے راؤ کو بڑا عروج حاصل ہوا اور وزیر برادران یعنی نند راج اور دیو راج کا اقتدار گھٹتا گیا۔

نند راج کو اب وزارت سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ راجہ کرشن اوڈیرا اور اس کی رانیوں کی آئے دن کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے وزارت سے خود ہی سبکدوشی حاصل کر لی اور اپنے بھائی دیو راج کے ساتھ ستی منگل چلا گیا جو اس کی جاگیر تھی اور صدیوں پہلے اس کے خاندان کو میسور کے ایک راجہ نے عطا کی تھی۔

مثل مشہور ہے کہ میں کمبل کو چھوڑتا ہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔

نند راج وزارت چھوڑ چکا تھا اور سرنگا پٹم کو خیرباد کہہ کے اپنی جاگیر پہ چلا گیا تھا لیکن اس کے دشمن یعنی راجہ کرشن اوڈیرا اور اس کی رانیاں اس کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ رانیوں میں ایک تو نند راج کی اپنی بیٹی مہارانی نندی تھی اور ایک نئی رانی دیواجی منی تھی جو نند راج کے خلاف بڑھ چڑھ کر کام کر رہی تھیں۔

ان دونوں رانیوں نے راجہ کے کان میں ایک نئی بات ڈالی؛

"مہاراجہ۔ نند راج اگرچہ وزارت سے سبکدوش ہو گیا ہے لیکن وزارت کی سند اور مہریں اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ کسی وقت بھی وزارت کی سند پہ اپنا حق طلب کر سکتا ہے"۔ رانی نندی نے شوشہ چھوڑا۔

راجہ کرشن اوڈیر تو تھا ہی موٹی عقل کا۔ رانیوں کے یہ سجھانے پر وہ بھڑک اٹھا:

"ہاں۔ یہ تو بڑے دھوکے کی بات ہے۔ نند راج نے وزارت چھوڑی ہے تو اسے سند اور مہریں بھی واپس کرنا چاہییں۔ وہ کسی وقت بھی جھگڑا کھڑا کر سکتا ہے"۔

"پھر آپ نے اس کا کیا علاج سوچا مہاراج"۔

یہ سوال اس کی نئی رانی دیواجی منی نے کیا تھا:

"نندراج آسانی سے تو سند اور مہریں واپس کرنے سے رہا!"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے!"

راجہ نے رانی کی ہاں میں ہاں ملائی:

"مگر ہم نندراج پر سختی بھی تو نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے سینا پتی حیدر علی خاں کا دوست ہے انہیں یہ بات ناگوار گزرے گی۔"

اس وقت نندی کو نہ معلوم کیوں باپ پر ترس آ گیا۔ اس نے کہا:

"میرے پتاجی میں چاہے کوئی عیب ہو مگر وہ بات کے بہت پکے ہیں۔ انہوں نے وزارت چھوڑ دی ہے تو وہ اب اس کا کبھی دعوے نہیں کریں گے چاہے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے مہاراجہ کو ان کی طرف سے اطمینان رکھنا چاہیے۔"

رانی دیواجی منی تنک کے بولی:

"مہارانی نندی کو یہ نہیں معلوم کہ اقتدار کا نشہ جس پر ایک بار چڑھ جائے، زندگی بھر نہیں اترتا۔ اگر نندراج ایسے ہی بھلے مانس تھے تو انہیں وزارت کی سند اور مہریں واپس کر کے جانا چاہیے تھا گھی اب سیدھی انگلیوں سے نکلتا دکھائی نہیں دیتا۔"

"رانی! تم میرے باپ پر الزام مت لگاؤ!"

مہارانی نندی نے باپ کی حمایت کی:

"میں ان کی بیٹی ہوں اور ان کی طبیعت کو خوب سمجھتی ہوں۔"

"اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے مہارانی!"

دیواجی منی اکڑ کے بولی:

"تمہارے پتاجی ایسے ہی دیوتا ہیں تو انہیں بلواؤ اور سند اور مہریں لے کر مہاراجہ کے حوالے کر دو۔"

اس نے [illegible] ایسا حملہ کیا تھا کہ وہ پھنس کے رہ گئی اور اسے کہنا پڑا:

"ٹھیک [illegible] پتاجی کو بلوا کے بات کرتی ہوں۔ اس وقت مہاراجہ میرے پتا کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں۔"

مہاراجہ نے یہ بات مان لی۔

مہارانی نندی نے اپنا ایک خاص ملازم باپ کے پاس ستی منگل بھیجا اور اسے پیغام دیا کہ وہ

باپ سے ایک اہم معاملے میں مشورہ کرنا چاہتی ہے اس لیے وہ فوراً سرنگاپٹم چلے آئیں۔

نندراج کے پاس اپنی بیٹی نندی کا قاصد پہنچا تو وہ حیران رہ گیا۔ اس کی بیٹی نے راجہ کے ساتھ شادی کے بعد سے اب تک کسی معاملہ میں اس سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ اب اسے کیا ضرورت پیش آ گئی جو وہ اسے اتنی دور سے مشورے کے لیے بلا رہی ہے۔

نندراج نے دیوراج سے مشورہ کیا۔ دونوں بھائیوں نے وزارت چھوڑ دی تھی۔ پھر بھی انہیں اپنی جان کا خطرہ تو تھا۔

آخر یہ طے ہوا کہ نندراج سرنگاپٹم جائے مگر راج محل جانے سے پہلے دیوراجی پیٹھ میں حیدر علی سے ملاقات کرے اور جیسا وہ مشورہ دیں اس پر عمل کرے۔

نندراج نے بیٹی کے قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ جلد ہی سرنگاپٹم پہنچ رہا ہے۔ قاصد کے جانے کے دوسرے دن نندراج اپنی جاگیر سے سرنگاپٹم روانہ ہوا۔

حیدر علی خاں اپنے قلعہ نما گھر دیوراجی پیٹھ میں تھے۔ انہیں نندراج کے اس طرح اچانک آ جانے سے بہت حیرت ہوئی۔

"وزیر محترم۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ کوئی اہم بات تھی تو مجھے بلوا لیا ہوتا!"

حیدر علی خاں نے جذباتی انداز میں کہا:

"آپ جب وزیر تھے تب بھی میرے لیے محترم تھے اور اب بھی آپ پہلے ہی کی طرح میرے لیے محترم ہیں!"

نندراج نے حیدر علی خاں کو گلے لگاتے ہوئے کہا:

"حیدر علی خاں۔ پہلے میں تمہارے لیے محترم تھا مگر اب تم میرے دوست اور مربی ہو۔ اس وقت میں تم سے ملنے نہیں آیا ہوں بلکہ میری بیٹی مہارانی نندی نے کسی ضروری گفتگو کے لیے مجھے بلایا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے کس قسم کی بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے طے کیا تھا کہ پہلے تم سے ملوں گا۔ اور تم سے رائے لوں گا کہ آیا مجھے نندی سے ملنا چاہیے یا نہیں؟"

"مہارانی نے اگر آپ کو بلایا ہے تو ضرور جائیے!" حیدر علی نے جواب دیا:

"جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر بھی اگر آپ ضروری خیال کریں تو

مجھے ساتھ لیتے چلیں"۔

نندراج، حیدر علی کی اس پیش کش پر خوش تو ہوا مگر سوچ میں پڑ گیا۔

اسے خطرہ پیدا ہوا کہ اگر وہ حیدر علی کو ساتھ لے گیا تو ممکن ہے مہارانی نندی اس سے وہ بات نہ کر سکے جس کے لیے اس نے بلایا ہے۔

نندراج نے بڑے پیار سے کہا:

"تمہاری اس پُرخلوص پیش کش کا بہت بہت شکریہ۔ میرا خیال ہے مجھے مہارانی نندی سے تنہا ہی ملنا چاہیے اس لیے کہ ممکن ہے مہارانی تمہاری موجودگی میں مجھ سے وہ بات نہ کر سکے جس کے لیے اس نے مجھے بلایا ہے"۔

"ٹھیک ہے وزیر محترم"۔

حیدر علی نے مطمئن ہو کے کہا:

"آپ بے فکر ہو کے مہارانی کے پاس جائیے۔ میرے آدمی راج محل کے باہر اور اندر ہر جگہ آپ کی حفاظت کریں گے اور ضرورت کے وقت وہ کسی بھی عملی قدم کے اٹھانے سے گریز نہ کریں گے"۔

اسی شام نند راج نے مہارانی نندی سے راج محل میں ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مہاراجہ کرشن اوڈیر بھی موجود تھا۔

مہارانی نندی نے بالکل سپاٹ اور کھردرے لہجے میں نندراج سے کہا:

"وزیر بابا۔ آپ نے خود ہی وزارت کا عہدہ چھوڑا اور اپنی مرضی سے سرنگا پٹم چھوڑ کر ستی منگل چلے گئے ہیں۔ مہاراجہ چاہتے ہیں کہ جب آپ نے وزارت چھوڑ دی ہے تو پھر سند وزارت اور وزارت کی مہریں بھی شاہی خزانے میں جمع کرا دیجیے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ سندا ور مہرِ وزارت آپ کے لیے بیکار ہو چکی ہیں اس لیے انہیں اپنے پاس رکھنے سے آپ کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا!"

نندراج نے فوراً سوال کیا:

"مہارانی۔ یہ تمہاری خواہش ہے یا مہاراجہ بھی یہی چاہتے ہیں؟"

مہارانی جواب دینا چاہتی تھی کہ راجہ کرشن اوڈیر بول پڑا:

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں وزیر نندراج!"

نندراج کو مہاراجہ کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس نے کہا:

"اے مہاراجہ! یہ اسناد آپ کے آباؤ اجداد سے ہمارے بزرگوں کو حاصل ہوئی ہیں۔ انہیں واپس کرنا اب خارج از بحث ہے۔ آپ اطمینان رکھیے، کیونکہ اب ہم ان اسناد کے ذریعے کسی شخص کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائیں گے۔ ہم نے حکومت کے تمام معاملات سے قطع تعلق کر لیا ہے اس لیے راجہ بہادر اپنے دانش مند مشیروں کے مشورے سے جسے چاہیں عہدہ وزارت پر سرفراز کر دیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا"۔

یہ کہہ کر نند راج غصے میں بھرا ہوا وہاں سے اٹھ کے چلا آیا اور حیدر علی خاں کے پاس پہنچ کر اسے حالات سے آگاہ کیا۔

نندراج اور حیدر علی خاں میں گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ راجہ کرشن اوڈیر کا قاصد آ گیا۔ اس نے سلام کر کے کہا:

"مہاراجہ نے آپ کو سلام دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر حیدر علی خاں کچھ دیر کے لیے راج محل تشریف لائیں تو ان کی مہربانی ہو گی۔ مہاراجہ کو کسی بات میں مشورہ کرنا ہے"۔

حیدر علی خاں نے نندراج کی طرف دیکھا۔ نند راج نے اسے کچھ اشارہ کیا اور خود قاصد سے دریافت کیا:

"تم راج محل میں کب ملازم ہوئے ہو؟"

"جی میں رانی دیواجی منی کا نوکر ہوں اور انہی کے ساتھ راج محل آیا ہوں"۔ قاصد نے ادب سے جواب دیا۔

اب حیدر علی خاں نے قاصد سے پوچھا:

"تمہیں میرے پاس راجہ نے بھیجا ہے یا رانی دیواجی منی نے؟"

"دونوں نے بھیجا ہے جی"۔

قاصد بالکل بدھو معلوم ہوتا تھا۔

"صاف صاف کہو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" حیدر علی نے ذرا تلخی سے کہا۔

"جی میں رانی دیواجی منی کی خواب گاہ کا پہریدار ہوں"۔ قاصد نے وضاحت کی:

"میں پہرے پر تھا کہ مہاراجہ کی کنیز مجھے بلا کے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہاں مہارانی نندی،

اور رانی دیوا جی منی، مہاراجہ سے باتیں کر رہی تھیں۔

میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر رانی دیوا جی منی نے مہاراجہ سے کہا کہ میرا آدمی زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اسے ہی آپ حیدر علی خاں کے پاس بھیجیں۔ راجہ نے کہا ٹھیک ہے۔ پھر میں یہ پیغام لے کر آپ کے پاس آ گیا۔"

حیدر علی خاں نے ایک اور سوال کیا:

"تم یہاں کیسے پہنچے۔ کیا اس سے پہلے یہاں آ چکے ہو؟"

"جی ہاں۔ میں ایک بار پہلے بھی یہاں آیا ہوں۔"

قاصد نے بتایا:

"رانی دیوا جی منی نے مجھے مہاراجہ کے ایک آدمی کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس نے مجھے یہ جگہ اور مہاراجہ کے تمام بڑے بڑے افسروں کے گھر دکھائے تھے۔ رانی دیوا جی منی کہتی تھیں کہ کیا پتہ کب کسی افسر سے کوئی کام پڑ جائے اس لیے تمہیں سب کے پتے معلوم ہونا چاہییں۔"

"اچھا تم چلو۔ ہم آ رہے ہیں۔"

حیدر علی خاں نے اسے رخصت کیا۔ پھر نند راج سے کہا:

"راجہ کی یہ رانی کچھ زیادہ ہی چالاک معلوم ہوتی ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" نند راج نے جواب دیا:

"اب تم جا رہے ہو تو ذرا اسے ٹٹولنے کی کوشش کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔"

حیدر علی خاں جانے کے لیے اٹھا:

"یہ تو ظاہر ہے کہ راجہ کرشن اوڈیر اسی سند اور مہروں کے لیے گفتگو کریں گے اور مجھ سے سفارش کرنے کو کہا جائے گا۔"

"عجیب بے وقوف آدمی ہے۔"

نند راج چڑ گیا:

"سند اور مہریں نہ میرے کام کی ہیں نہ اس کے کام کی۔ معلوم نہیں اسے کون بھڑکا رہا ہے۔ میں نے تو یہ سوچ کے انکار کیا تھا کہ وہ میرے باپ دادا کی نشانیاں ہیں ورنہ مجھے کیا ان چیزوں کا اچار ڈالنا ہے۔"

حیدر علی خاں نے چلتے چلتے کہا:

"آپ ابھی جائیے گا نہیں۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

حیدر علی خاں راج محل پہنچے تو وہی سند اور مہروں کی بات شروع ہوئی۔ راجہ نے کہا:

"دیکھیے نا حیدر علی خاں۔ وزیر نند راج خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ مجھے اب ان سے کوئی کام نہیں لینا۔ پھر انہیں اپنے پاس رکھنے سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"مہاراجہ کرشن اوڈیر۔ آپ نند راج پر کیوں شبہ کر رہے ہیں؟" حیدر علی خاں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا:

"وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ سند اور مہریں ان کے لیے بیکار ہیں۔ وہ ان چیزوں کو محض باپ دادا کی یادگار اور تبرک کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کسی نے غلط مشورہ دیا ہے۔ نند راج میرے کرمفرما ہیں۔ میں ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ بالکل شبہ نہ کریں۔ وہ اس سند اور مہروں سے کوئی غلط کام نہیں لیں گے۔"

راجہ کرشن اوڈیر کے دائیں بائیں اس کی دونوں رانیاں، رانی نندی اور رانی دیوا جی منی بیٹھی تھیں۔ حیدر علی کے سامنے انہیں بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہاں وہ اشاروں ہی اشاروں میں راجہ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

راجہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا:

"حیدر علی خاں۔ ہم نے آپ کو بلوایا تھا کہ اگر آپ نند راج سے کہہ دیں تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ ہمارا اور ہماری رانیوں کا یہی خیال تھا کہ نند راج آپ کی بات بہت مانتے ہیں۔ آپ سے تو وہ انکار کر ہی نہیں سکتے۔"

حیدر علی نے دیکھا کہ راجہ کے دماغ میں کسی نے یہ ٹھونس دیا ہے کہ اگر نند راج نے وزارت کی سند اور مہریں واپس نہ کیں تو کسی وقت دعویٰ کر کے وہ وزارت پر قبضہ کر سکتا ہے۔

حیدر علی نے جزبز ہو کے کہا:

"ٹھیک ہے۔ مہاراجہ کا حکم ہے تو میں نند راج سے کہوں گا کہ وہ سند اور وزارت کی مہریں واپس کر دیں۔"

حکم نہیں۔ یہ تو ہماری درخواست ہے حیدر علی خاں"۔

راجہ کرشن اوڈیر جلدی سے بولا:

"آپ ہمارے فرزند ارجمند ہیں۔ ہم آپ کو حکم کیسے دے سکتے ہیں!"

حیدر علی خاں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے:

"بس یہی بات تھی۔ اور تو کچھ نہیں کہنا ہے؟"

"نہیں۔ بس یہی بات تھی"۔ راجہ بھی حیدر علی کے ساتھ ہی اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی رانیاں بھی کھڑی ہو گئیں۔

راجہ کی بات ختم ہوتے ہی رانی دیوا جی منی نے لقمہ دیا:

"مہاراجہ وہ وزیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

راجہ کو جیسے یاد آ گیا۔ اس نے جلدی سے کہا:

"ہاں حیدر علی خاں۔ ایک بات اور کرنا ہے"۔

"فرمائیے۔ میں حاضر ہوں"۔

حیدر علی خاں پھر بیٹھ گئے۔

"بات یہ کہنا تھی آپ سے"۔ راجہ نے مسند پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"وزیر نند راج اور دیو راج تو اپنے عہدوں سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ ہم، ہماری رانیاں اور محلات کے دوسرے لوگ ان سے اپنی ضرورتیں کہہ دیتے تھے اور وہ پوری کر دیتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں بار بار آپ کو زحمت دینا ہو گی۔ آپ کی فوجی ذمے داریاں پہلے ہی بڑھی ہوئی ہیں۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ہم آپ کو تکلیف دیں۔ ہم چاہتے تھے کہ اس سلسلے میں آپ ہماری رہنمائی کریں۔ ہماری یہ مشکل کس طرح آسان ہو سکتی ہے؟"

حیدر علی خاں نے اس بات کو تو سوچا ہی نہ تھا۔ نند راج کے جانے کے بعد شاہی محلات کی تمام ذمے داری ان پر آ نا تھی اور وہ یہ جھگڑا مول لینے کے لیے قطعی طور پر تیار نہ تھا۔ اس نے اس سلسلے میں راجہ کو کریدا:

"آپ کے خیال میں یہ مشکل کس طرح آسان ہو سکتی ہے؟"

"ہم یہ چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔" راجہ کہتے کہتے اک دم رکا:

"اس سلسلے میں ہماری آپ سے درخواست ہے کہ وزیر نند راج کی جگہ آپ کوئی معقول آدمی مقرر کر دیں جو ہماری ضروریات پوری کرتا رہے"۔

"آپ چاہتے ہیں کہ نند راج کی جگہ نیا وزیر مقرر کیا جائے؟" حیدر علی خاں نے راجہ کو گھور کے دیکھا۔

"جی ہاں"۔ راجہ نے دبے الفاظ میں کہا:

"یہی چاہتے ہیں ہم۔ آپ کو بار بار تکلیف دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا"۔

"مہاراجہ ـــــ"

حیدر علی خاں کا لہجہ اک دم سخت ہو گیا:

"آپ کو اب تک وزیروں سے شکایت تھی اور آپ ان سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ اب دونوں وفادار وزیر استعفیٰ دے گئے ہیں تو آپ پھر ان کی جگہ وزیر مقرر کرنے کی خواہش کر رہے ہیں۔ یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک طرف وزیروں کی مخالفت دوسری طرف نئے وزیر کے تقرر کی خواہش۔ مجھے مہارانی کے رویے پر بھی افسوس ہے کہ وہ اپنے والد کی مخالفت میں اب تک پیش پیش رہی ہیں"۔

مہاراجہ یا مہارانی کے پاس حیدر علی خاں کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔

ذرا دیر بعد حیدر علی نے انہیں ٹٹولا:

"راجہ بہادر۔ فرمائیے کہ آپ نند راج کی جگہ کس نئے وزیر کا تقرر چاہتے ہیں؟"

"نہیں نہیں حیدر علی خاں۔ آپ ہماری نیت پر شک نہ کیجئے"۔ راجہ کرشن اوڈیر نے زور دے کر کہا:

"ہم اپنا کوئی آدمی وزیر نہیں بنانا چاہتے اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ نند راج کی جگہ جو وزیر بنایا جائے اسے نند راج جیسے لامحدود اختیارات دیدیے جائیں۔ آپ اس کی حد ضرور مقرر فرما دیجئے"۔

"پھر بھی کوئی نام ہے آپ کے ذہن میں؟" حیدر علی نے دوبارہ پوچھا۔

دراصل اسے اب تک یہی شبہ تھا کہ راجہ اور رانیوں نے کسی نئے وزیر کا انتخاب کر لیا ہے اور اب وہ حیدر علی سے اس کی اجازت چاہتے ہیں۔

راجہ کرشن اوڈیر دھیمی آواز میں بولا:

"ہم اپنا کوئی آدمی وزیر نہیں بنانا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنا کوئی آدمی وزیر مقرر کر دیں جو ہماری ضرورتوں کا خیال رکھے اور آپ کو بھی اطمینان رہے"۔

حیدر علی خاں کے دل میں جو شبہ تھا وہ جاتا رہا۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ راجہ کی نئی رانی نے دخل دیتے ہوئے کہا:

"میسور کے سپہ سالار حیدر علی خاں مجھے پہلے سے نہیں جانتے مگر میں انہیں یقین دلاتی ہوں کہ راجہ چاہتے ہیں کہ وزارت کے عہدے پر اب جو بھی مقرر ہو وہ سپہ سالار میسور کے اعتماد کا اور اعتبار کا آدمی ہو تاکہ راج محل اور سپہ سالار کے درمیان کبھی کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔

اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک نام ہے۔ اگر سپہ سالار اجازت مرحمت فرمائیں تو میں وہ نام پیش کر سکتی ہوں۔"

حیدر علی خاں کو رانی دیواجی منی کی باتیں بڑی کاٹ دار معلوم ہوئیں اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ راج محل کی سب سے عقلمند یہی نئی رانی دیواجی منی ہے۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ اس کے ذہن میں ایک نام وزارت کے عہدے کے لیے ہے، اس نے حیدر علی کو اور زیادہ حیران کر دیا۔

"رانی دیواجی منی۔ آپ کے پاس وزارت کے لیے کون شخص ہے؟" حیدر علی نے رانی کا ذہن پڑھنے کے لیے سوال کیا۔

"سپہ سالار افواجِ میسور!"

رانی دیواجی منی بڑی متانت سے بولی:

"میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ میرے پاس وزارت کے لیے کوئی موزوں شخص ہے۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک ایسے شخص کا نام ہے جو اس عہدے کا اہل بھی ہے اور سپہ سالار اس پر اعتماد بھی کر سکتے ہیں۔"

"چلیے یونہی سہی۔"

حیدر علی نے بات ختم کرنے کے لیے کہا:

"رانی کے ذہن میں جو نام ہے اسے ارشاد فرمائیں۔"

"میرے ذہن میں وزارت کے لیے موزوں ترین شخص آپ کا نائب اور فوجدار کھانڈے راؤ ہے سپہ سالار محترم۔" رانی نے بڑے اعتماد سے کہا:

"وہ آپ کے آدمی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اس قدر نیک ہیں کہ ہماری ضرورتیں پوری کرنے میں ذرا بھی حیل و حجت نہ کریں گے۔"

حیدر علی نے حیرانی سے رانی کو دیکھا:

"ٹھیک ہے۔ اس نام پر غور ہو سکتا ہے لیکن پہلے سنداور دھرن کا قصہ ختم ہو جائے پھر۔"

حیدر علی خاں نے واپس جا کے نندراج کو بتایا کہ راجہ اور رانیاں سنداور دھرن کے لیے ضد کر رہی ہیں۔ کھانڈے راؤ کے سلسلے میں اس نے نندراج سے کوئی بات نہ کی۔ وہ جانتے تھے کہ وزارت کا ذکر آئے گا تو نندراج کو رنج ہو گا۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ نندراج، کھانڈے راؤ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کا اظہار وہ برملا کر چکا تھا۔

حیدر علی خاں نے نندراج کا عندیہ لینے کے لیے کہا:

"آپ کا کیا خیال ہے وزیر محترم۔ راجہ اور رانیاں سند اور دھرن کے لیے اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"

"یہ سراسر ان کی بے وقوفی ہے۔"

نندراج نے تلخی سے کہا:

"انہیں ڈر ہے شاید میں پھر واپس آ جاؤں گا۔ احمق کہیں کے۔ اگر مجھے واپس آنا ہوتا تو میں بھلا جاتا ہی کیوں!"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

حیدر علی خاں نے جواب دیا:

"وہ تو میرے اس طرح سر ہو گئے جیسے سنداور دھرن واپس ملنے سے انہیں کہیں کی ریاست مل جائے گی۔"

نندراج کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا:

"پھر تم نے انہیں کیا جواب دیا؟"

"میں نے صاف جواب دے دیا کہ یہ ان کی مرضی ہے۔ وہ چاہیں تو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور چاہیں تو واپس کر دیں۔ میں اس سلسلے میں وزیر محترم پر زور نہیں دے سکتا۔" حیدر علی خاں نے نرم لہجے میں رک رک کر کہا۔

نندراج سنجیدگی سے بولا:

"حیدر علی خاں۔ یہ راج ہٹ ہے راج ہٹ۔ جب تک انہیں سنداور دھرن نہیں ملتیں ان کا کھانا پینا حرام رہے گا اور یہ روز تمہاری جان کھاتے اور ناک میں دم کرتے رہیں گے یلیں سنی منگل

جاتے ہی تمہیں سب کاغذات بھیج دوں گا۔ تم جا کے ان کے منہ پر مار دینا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں پریشان کریں۔"

"جیسی آپ کی مرضی وزیر محترم۔ آپ بھیج دیں گے تو میں ان کے حوالے کر دوں گا۔ ختم ہو جائے گی ان کی یہ ضد۔"

حیدر علی خاں دل میں بہت خوش ہوئے۔ ان کے بغیر کچھ کہے بات اپنے ہی آپ بن گئی تھی۔ نند راج اسی دن واپس چلا گیا۔

چار دن بعد اس نے سند وزارت اور وزارت کی تمام مہریں ایک صندوقچی میں رکھ کے حیدر علی کو بھجوا دیں۔

حیدر علی خاں نے سند اور مہریں دیکھنے کے بعد راجہ کرشن اوڈیر کو پہنچا دیں۔ راجہ اور رانیاں سند اور مہریں دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جب تک نند راج سند اور مہریں واپس نہیں کرتا، اس کے واپس آنے کا خطرہ موجود رہے گا۔

○

○

دکن حیدر آباد میں بھائیوں میں آپس میں سازش ہوئی۔

ایک بھائی صلابت جنگ قید ہو گیا۔ باقی دو بھائی یعنی میر نظام علی خاں اور بسالت جنگ ریاست کے حکمران ہوئے۔

دریائے کرشنا کا جنوبی حصہ بسالت جنگ کے قبضہ میں آیا۔ اس نے اپنا مستقر ادھونی میں قائم کر لیا۔

پانی پت کے میدان میں جب مرہٹے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئے تو پورے ہندوستان میں ان کی ساکھ ختم ہو گئی۔ صوبہ سرا دراصل حیدر آباد کا حصہ تھا جس پر اس وقت گوپال راؤ قبضہ کیے بیٹھا تھا۔ یہ صوبہ بھی بسالت جنگ کے حصہ میں آیا تھا۔

مرہٹوں کی شکست کا حال سن کے بسالت جنگ صوبہ سرا کو آزاد کرانے کے لیے فوج لے کر نکلا۔ اس نے صوبہ سرا کے مشہور قلعہ ہوسکوٹہ کا محاصرہ کر لیا۔

بسالت جنگ کے پاس فوج تو تھی لیکن وہ فنونِ جنگ سے واقف نہ تھا اس لیے قلعہ پر قبضہ نہ کر سکا اور محاصرہ طول پکڑتا چلا گیا۔

اس وقت بسالت جنگ نے حیدر علی خاں سے امداد طلب کی۔

حیدر علی خاں کی نظریں پہلے ہی سرا پر تھیں۔ وہ فوراً امداد دینے پر تیار ہو گیا چنانچہ دونوں میں شرائط طے ہوئیں اور معاہدہ ہو گیا۔

معاہدے میں مندرجہ ذیل شرطیں رکھی گئی تھیں:

۱۔ قلعہ ہوسکوٹہ کے فتح ہونے پر قلعہ کا سامان اور آلاتِ جنگ بسالت جنگ کو ملیں گے۔

۲۔ ہوسکوٹہ اور اس کے مضافات حیدر علی خاں کو ملیں گے۔

۳۔ بسالت جنگ دربار دہلی میں سرا کی صوبے داری کے لیے حیدر علی خاں کی سفارش کرے گا۔

۴۔ قلعہ گرم کنڈہ جو اب تک حیدر آباد کے ماتحت تھا اب حیدر علی خاں کی ملکیت تسلیم کیا جائے گا۔

معاہدہ پر دستخط ہونے کے بعد حیدر علی خاں اپنی فوج لے کے بڑھا اور چند دن کے محاصرے کے بعد قلعہ ہوسکوٹہ پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا۔

معاہدہ کے مطابق قلعہ کا سامان اور آلاتِ حرب نواب بسالت جنگ کے حوالے کر دیا گیا اور ہوسکوٹہ اور اس کے مضافات ریاست میسور میں شامل کر لیے گئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ نواب بسالت جنگ نے قلعہ ہوسکوٹہ کا سامان اور آلاتِ حرب حیدر علی کے ہاتھ فروخت کر کے نقد رقم حاصل کی تھی۔ حیدر علی خاں مذاق میں نواب بسالت جنگ کو "تاجر" کہا کرتا تھا۔

پانی پت میں مرہٹوں کو شکست ہوئی تو وہ دہلی چھوڑ کے بھاگ گئے۔ فاتح احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم ثانی کو دہلی کا تاجدار تسلیم کر لیا اور وہ باقاعدہ مغل بادشاہ کی حیثیت سے حاکم ہوا۔

نواب بسالت جنگ نے اس زمانے میں سرا کی صوبے داری کے لیے حیدر علی خاں کا نام تجویز کیا اور بادشاہِ ہند سے سفارش کی کہ حیدر علی خاں کو سرا کا گورنر تسلیم کیا جائے۔

بظاہر جنوبی ہند کے تمام مغل مقبوضہ علاقوں پر گورنر تعینات تھے مگر یہ گورنر خود مختار بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ شاہ عالم ثانی نے بسالت جنگ کی سفارش منظور کر لی اور شہنشاہِ ہند کا سفیر حیدر علی خاں کے پاس سرا کی صوبے داری کا فرمانِ شاہی لے کر حاضر ہوا۔

اس کے ساتھ ہی شہنشاہ نے اپنے گورنر کے لیے شمشیر مرصع، سپر مرصع، پالکی جواہر نگار، نقارہ

اور نشان، نواب بہادر کا خطاب اور ہفت ہزاری کا منصب عطا کیا۔

ادھر تو نواب حیدر علی خاں کو یہ مرتبے اور درجات عطا ہو رہے تھے اور اُدھر ہندو مسلم کا سوال پیدا کر کے اس کے خلاف ایک زبردست سازش تیار ہو رہی تھی۔

نواب بہادر حیدر علی خاں نے مہاراجہ اور رانیوں کی سفارش پر اپنے نائب کھانڈے راؤ کو میسور کا وزیر مقرر کر دیا تھا۔

کھانڈے راؤ بظاہر جتنا وفادار تھا، بباطن وہ اسی قدر بے وفا اور غدار تھا۔ حیدر علی خاں نے شجاعت اور وفاداری کے پیشِ نظر اسے ترقی دیتے دیتے اپنا نائب اور سکہ بند بنایا تھا لیکن اس کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔

یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ مہاراجہ اور مہارانیوں نے یہ جانتے ہوئے کہ کھانڈے راؤ حیدر علی کا بڑے اعتماد کا آدمی ہے، پھر بھی اس کے وزیر مقرر کرنے کی سفارش کیوں کی تھی۔ دراصل یہ کھچڑی بہت دنوں سے پک رہی تھی۔

کھانڈے راؤ نے بڑی محنت سے خود کو حیدر علی خاں کی نظروں میں وفادار ثابت کیا تھا لیکن حقیقت میں وہ ایک کٹر ہندو تھا اور حیدر علی کے بڑھتے ہوئے عروج کو کسی حالت میں برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

کھانڈے راؤ نے حیدر علی خاں کا اعتماد تو حاصل کر لیا تھا اور اب اس فکر میں تھا کہ اس کی رسائی کسی طرح راجہ اور رانیوں تک ہو جائے تاکہ وہ راج محل کا بھی اعتماد حاصل کرے اور اپنے ناپاک منصوبے کو آگے بڑھائے۔

مہاراجہ تک رسائی کے لیے اس نے ایک آسان مگر زبردست نسخہ استعمال کیا۔ کھانڈے راؤ کو معلوم تھا کہ مہاراجہ کرشن اوڈیر شراب و شباب کا رسیا ہے۔ شراب کی تو راج محل میں کمی نہ تھی، شباب بھی راج محل میں بکھرا پڑا تھا۔ رانی نندی اور رانی دیواجی منی حسن کے معاملے میں اپنی مثال آپ تھیں۔ مہاراجہ کی کنیزیں بھی ایک سے ایک بڑھ کے تھیں۔

ان حالات میں بھی کھانڈے راؤ نے ہمت نہیں ہاری اور میسور ہی نہیں بلکہ جنوبی ہند کی حسین ترین عورت کو ڈھونڈ نکالا۔

یہ عورت تھی سیتا منی!

وہی سیتا منی جو گنگا رام فوجدار کی داشتہ رہ چکی تھی۔ معمولی گھرانے کی اس لڑکی کے دماغ میں یہ

بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ راج محل کے قابل ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ریاست میسور کے فوجدار گنگا رام کا سہارا ڈھونڈا تھا جس نے اسے اپنی داشتہ بنا لیا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے راج محل پہنچا دے گا مگر اس کا موقع ہی نہ آیا اور گنگا رام بغاوت کے جرم میں قتل ہو گیا۔

کھانڈے راؤ کو ان حالات کا علم تھا۔

گنگا رام کا انجام بھی اس کے سامنے تھا مگر وہ گنگا رام ہی کے نقشِ قدم پر چل پڑا۔ اس نے سیتامنی کو ڈھونڈا اور پھر ایک شب مہاراجہ کی ایک کنیز کے ذریعے اسے راج محل پہنچا دیا۔

مہاراجہ کی جس کنیز نے کھانڈے راؤ کو یہ موقعہ فراہم کیا تھا' اس سے کھانڈے راؤ نے شادی کا وعدہ کیا تھا۔

مہاراجہ سیتامنی کے حسن کو دیکھ کر پاگل ہو گیا۔

اس نے سیتامنی کو چند غلاموں اور کنیزوں کی مدد سے ایک الگ محل میں رکھا اور پھر وہاں گاہے گاہے جاتا اور دادِ عیش دیتا تھا۔

اس طرح کھانڈے راؤ نے مہاراجہ اور زانیوں کو اپنے اعتماد میں لیا۔ اس نے سب پر یہی ظاہر کیا کہ وہ نند راج کی جگہ وزیرِ مملکت ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ نند راج کو وزارت سے الگ کرانے میں درپردہ کھانڈے راؤ کا ہاتھ تھا۔ نند راج کے وزارت چھوڑتے ہی راجہ کی سفارش سے وہ وزیر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

وزیر ہوتے ہی اس نے ہاتھ پیر نکالے۔ نواب حیدر علی خاں کا نائب ہونے کی وجہ سے میسوری فوج ما اس کا پہلے ہی اثر تھا۔ وزیر ہونے کے بعد اس نے فوج پر اس طرح کی مہربانیاں کیں کہ وہ فوج میں پوری طرح مقبول ہو گیا۔

پھر فوج کو آہستہ آہستہ اس نے حیدر علی کے خلاف کر دیا۔ اس کے لیے اس نے ہندو مسلم کا فتنہ کھڑا کیا اور فوج کے سرداروں کو یہ سبق دیا کہ ایک مسلمان پوری ریاست پر چھاتا چلا جا رہا ہے اور یہی حال رہا تو میسور کی ریاست ایک مسلم ریاست میں تبدیل ہو جائے گی۔

اس کے اس زہر نے فوج میں کام کیا اور پوری فوج حیدر علی خاں سے باغی ہو گئی۔

نواب حیدر علی خاں ان تمام واقعات سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ اپنے گھر دیورانی پیٹھ میں اپنے بال بچوں کے ساتھ اطمینان سے دن گزار رہا تھا۔ ریاست میں بظاہر امن و امان تھا۔

دیورانی پیٹھ کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دیکھنے میں تو یہ ایک بڑی حویلی تھی لیکن حیدر علی نے

اس کے گرد فصیل بنوائی تھی اور فصیل کے برجوں میں توپیں نصب کرا دی تھیں۔

اس حویلی میں تقریباً ۲۰۰ جانبازوں کا ایک دستہ ہر وقت پہرے پر رہتا تھا۔ یہ جوان حیدر علی کے محافظ تھے اور انھوں نے اپنی جانیں اس کے لیے وقف کر دی تھیں۔

حیدر علی خاں حالات سے بے خبر مستقبل کے منصوبوں میں الجھا رہتا تھا۔ اسے سرا کی صوبیداری بھی مل گئی تھی۔ دہلی دربار میں بھی اس کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں اگرچہ مرہٹوں کی کمر ٹوٹ گئی تھی لیکن جنوب میں اب بھی ان کی طاقت موجود تھی اور وہ کسی وقت بھی حیدر علی خاں کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔

حیدر علی خاں کو دراصل مرہٹوں کی فکر تھی اور وہ میسور کا دفاع اس قدر مضبوط کر دینا چاہتا تھا کہ مرہٹوں کی اس طرف نظر نہ اٹھ سکے۔

نواب حیدر علی خاں میسور کے مستقبل کی فکروں میں گھلے جا رہے تھے اور ان کا نائب کھانڈے راؤ مارِ آستین بن کر انہیں ڈسنے کی فکر میں تھا۔

کھانڈے راؤ نے حیدر علی خاں کے راج محل پر متعین جاسوسوں میں سے دو کا خاتمہ کر دیا اور باقی دو کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ راج محل پر حیدر علی خاں کے چار وفادار کام کر رہے تھے۔ دو مسلمان اور دو ہندو۔ کھانڈے راؤ نائب ہونے کی وجہ سے حیدر علی کے بہت سے رازوں سے واقف تھا اور اسے راج محل اور فوجی چھاؤنیوں میں متعین جاسوسوں کے ناموں کا بھی علم تھا۔

کھانڈے راؤ نے سب سے پہلے راج محل کے دونوں مسلمان جاسوسوں کو غائب کرایا۔ پھر دونوں ہندو جاسوسوں کو ہندو مذہب کے نام پر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح حیدر علی خاں کا راج محل سے رابطہ ختم ہو گیا۔

مسلمان جاسوس تو غائب ہو چکے تھے، ہندو جاسوس کبھی کبھی "دیورانی پیٹھ" جاتے اور حیدر علی کو "سب ٹھیک ہے" کی خبر پہنچا آتے تھے۔

یہی حال فوج کے جاسوسوں کا تھا۔ وہاں سے بھی مسلمان جاسوسوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا اور ہندو جاسوس مذہب کے نام پر کھانڈے راؤ کے وفادار ہو گئے تھے اور اب حیدر علی کو راج محل اور فوج کے بارے میں "سب اچھا ہے" کے سوا اور کوئی خبر نہ ملتی تھی۔

حیدر علی خاں کو دو ایک بار یہ خیال آیا بھی کہ وہ مسلمان جاسوسوں کے بارے میں پتہ کرے کہ آخر انہوں نے دیورانی پیٹھ آنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کھانڈے راؤ سے رابطہ قائم کیا تو اسے

بتایا گیا کہ دونوں مسلمان جاسوس کھانڈے راؤ سے لمبی چھٹی لے کر شمالی ہند گئے ہوئے ہیں۔ حیدر علی اس اطلاع سے مطمئن ہو گیا اور پھر اپنے منصوبوں میں لگ گیا۔

اب کھانڈے راؤ کو راج محل پر اور فوج کے اندر مکمل اختیار حاصل ہو گیا۔ اس کے لیے اسے زیادہ تگ و دو اس لیے نہ کرنا پڑی کہ پورا راج محل ہندو تھا اور فوج میں نوے فیصد ہندو لشکری تھے۔ دونوں مقامات پر اس نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ راج محل میں مہاراجہ اور رانیوں کے بغیر مانگے بہترین ساز و سامان، اعلیٰ پارچہ جات، ظروف اور دیگر آرائش کی چیزیں بھجوائیں۔ کنیزوں کی تنخواہوں میں سو فیصد اضافہ کر دیا۔ مستقل لشکریوں کی تنخواہوں میں بھی اس نے سو فیصد اضافہ کر دیا۔ راج محل اور فوج اس سخاوت سے خوش ہو گئے اور کھانڈے راؤ کا دم بھرنے لگے۔

اس کے بعد کھانڈے راؤ نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے قدم اٹھایا۔

ایک شب جب راج محل میں محفلِ رقص و سرود برپا تھی۔ مہاراجہ شراب و شباب میں کھویا ہوا تھا رانیوں اور داشتاؤں کے علاوہ راج محل کی حسین ترین کنیزیں مہاراجہ پر پروانہ وار نثار ہو رہی تھیں ــــ کہ کھانڈے راؤ نے راجہ سے سرگوشی میں تخلیہ کی درخواست کی۔

مہاراجہ اس ارضی جنت کی بہار پہ آئی ہوئی محفل کو اجاڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن کھانڈے راؤ کی درخواست ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔ وہی تو ان راج محفلوں کی جان تھا۔ مہاراجہ اسے ہر محفل میں بلاتا اور اسے اپنے پہلو میں جگہ دیتا تھا۔

راجہ کرشن اوڈیر نے تخلیہ کا حکم دیا تو حسین جبینوں پر شکنیں پڑ گئیں۔ بھلا شباب پہ آئی ہوئی اس رنگ و نور کی محفل کو برخاست کرنے کا حکم کس طرح جائز سمجھا جا سکتا تھا۔

رانیوں نے حکم منسوخ کرنے کی درخواست کی۔

کئی جوانیاں مہاراجہ پر اس قدر جھک گئیں کہ اس کی آنکھیں حسنِ بے حجابا کی اس نمائش سے چکاچوند ہو گئیں۔

مگر ــــ مہاراجہ، کھانڈے راؤ کی درخواست رد نہ کر سکا اور لڑکھڑاتی جوانیوں اور ڈگمگاتے شباب کو محل سے اٹھ کے جانا پڑا۔ صرف مہاراجہ کی جائز رانیوں کو ٹھہرنے کی اجازت دی گئی، وہ بھی کھانڈے راؤ کی اجازت پہ۔

تخلیہ ہونے پر کھانڈے راؤ نے کھڑے ہو کر مہاراجہ کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

"مہاراجہ بہادر۔ میری جان آپ پر صدقے۔ ایسی رنگین محفلوں کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ ایسی ہی

محفلوں کے لیے تو یہ دنیا بنی ہے اور اسی رنگینی کا نام زندگی ہے مگر آپ کا یہ سیوک اور غلام کیا کرے۔ اسے حکم دیا گیا ہے کہ راج محل کی رنگین محفلوں کو فوراً بند کیا جائے ورنہ آپ کے اس غلام کو وزارت سے ہٹا یا جائے گا۔

اب بتائیے میں کیا کروں؟ حکم نہیں مانتا تو ملازمت جاتی ہے یا پھر باغی کہلاتا ہوں اور اگر حکم مانتا ہوں تو ــــ"

کھانڈے راؤ خاموش ہو گیا۔

مہاراجہ نشے میں دھت تھا۔ اس نے سر اٹھا کر کہا:

"کس نے یہ حکم دیا ہے تمہیں؟ میسور کا راجہ، کرشن اوڈیر ہے۔ یہاں صرف ہمارا حکم چلتا ہے۔"

"مہاراجہ بہادر درست فرماتے ہیں۔"

کھانڈے راؤ گڑگڑایا:

"ریاست آپ کی ہے۔ مہاراجہ آپ ہیں مگر سارے اختیارات تو آپ نے اس مسلے کو دے رکھے ہیں جو اپنے آپ کو نواب بہادر حیدر علی خاں کہتا ہے۔ اس کے قلعہ دیوانی پیٹھ پہ نقارہ بجتا ہے اور تاجِ دہلی کا پھریرا لہراتا ہے۔"

حیدر علی خاں کے نام پہ راجہ کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ ایسا خاموش ہو گیا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

کھانڈے راؤ نے مہاراجہ کو خاموش دیکھا تو بات آگے بڑھائی:

"مہاراجہ بہادر اگر اسی طرح خاموش رہے تو مجھے نواب حیدر علی خاں کے حکم کی تعمیل کرنا ہو گی اور اس محل میں رقص و سرود کی کوئی محفل منعقد نہ ہو سکے گی۔"

راجہ نے مخمور نظروں سے کھانڈے راؤ کو دیکھا:

"کھانڈے راؤ۔ ان محفلوں کی وجہ سے تو ہم نے ریاست کا کاروبار دوسروں کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ پھر بھی ہماری محفلوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔"

"مہاراجہ بہادر"۔ کھانڈے راؤ نے ذرا تن کر کہا:

"میں اگر کچھ کہوں گا تو آپ کو ناگوار تو نہ ہو گا۔"

مہاراجہ کو ذرا حوصلہ ہوا:

"کہو کہو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ تم ہمارے آدمی ہو۔ تمہاری بات ہمیں قطعی ناگوار نہ ہو گی۔" راجہ نے

آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

کھانڈے راؤ اور تن گیا اور بولا:

"اس تہی دست نائیک نے، جو خود کو آج نواب حیدر علی خاں کہتا ہے، آپ کی مہربانیوں سے ہی ترقی کے تمام زینے طے کیے ہیں اور ریاست کے خزانے سے ایک بڑا لشکر تیار کر لیا ہے۔ اس کا یہ اعلیٰ رتبہ آپ کے معاملات میں الجھنیں پیدا کر رہا ہے لیکن آگے جا کر اس سے ریاست کے معاملات بھی الجھ سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر قوم کا ایک اجنبی مسلمان، راجہ کی حکومت میں دخل اندازی شروع کر دے اور خواہ مخواہ آپ کے باپ دادا کی بنائی ہوئی ریاست ہاتھ سے نکل جائے۔ ہاں اگر اس خادم کو اجازت ہو تو اس کے اثر اور اختیار کو کم کرنے کی کوشش کی جائے!"

راجہ کرشن اوڈیر سوچ میں پڑ گیا۔

اس نے بڑی مشکل سے نندراج اور دیوراج کو وزارت سے ہٹایا اور کوشش کر کے کھانڈے راؤ کو وزیر بنوایا تھا مگر اب حیدر علی اس کی زندگی کی تمام رنگینیوں کو ختم کرنے کے درپے تھا۔

اس نے سوچا، کھانڈے راؤ وزیر بھی ہے اور فوجدار ہونے اور حیدر علی خاں کا نائب ہونے کی بنا پر اس کا فوج میں بھی کافی اثر ہے۔ ممکن ہے کھانڈے راؤ، حیدر علی خاں کے اقتدار کا خاتمہ کر دے۔ پھر بھی وہ کوئی حکم دینے سے پہلے کھانڈے راؤ کی طرف سے پوری طرح اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

اس نے کھانڈے راؤ سے کہا:

"کھانڈے راؤ، تم گنگا رام کے انجام سے واقف ہو۔ ایسا نہ ہو کوئی غلط قدم اٹھاؤ اور تمہارا انجام بھی گنگا رام جیسا ہی ہو۔"

کھانڈے راؤ نے بڑے جوش سے کہا:

"مہاراجہ بہادر۔ مجھے ہر بات کا علم ہے۔ مجھے حیدر علی خاں کی طاقت کا بھی حال معلوم ہے۔ ریاست کی تمام فوج میرے قبضے میں ہے اور میرے اشارے کی منتظر ہے۔ آپ اجازت دیجیے۔ پھر دیکھیے کہ آپ کا یہ خادم کیا کرتا ہے!"

مہاراجہ کرشن اوڈیر کانوں کا کچا تو تھا ہی۔ وہ کھانڈے راؤ کے فریب میں آ گیا اور اس نے خوش ہو کر کہا:

"کھانڈے راؤ۔ ہمیں تم پر پورا اعتماد ہے۔ تم ریاست کے بھلے کے لیے جو چاہو، قدم اٹھا سکتے ہو۔"

کھانڈے راؤ کو اجازت مل گئی۔

راجہ نے اجازت تو دے دی لیکن یہ گھبراہٹ تھی کہ کہیں کھانڈے راؤ دغا نہ کرے کیونکہ وہ حیدر علی خاں کا نائب تھا۔

ادھر کھانڈے راؤ اپنی جگہ خوش بھی تھا اور گھبرایا ہوا بھی۔ اسے راجہ کی کمزور طبیعت سے یہ خطرہ تھا کہ راجہ کسی وقت بھی رنگ بدل سکتا تھا۔

دوسرے دن کھانڈے راؤ نے راجہ کو مشورہ دیا کہ:

"یہ معاملہ انتہائی اہم ہے اس لیے ہم دونوں کو مندر میں چل کر اس کی رازداری اور وفاداری کی قسم کھانی چاہیے۔"

راجہ بھی شک و شبہ میں مبتلا تھا۔ اس نے فوراً یہ بات تسلیم کر لی۔ راج محل کے احاطے میں رنگ ناتھ سوامی کا مندر تھا۔ راجہ اور کھانڈے راؤ دونوں مندر میں گئے اور بت کے آگے دونوں نے رازداری اور حیدر علی خاں کے خلاف کاروائی کی قسم اٹھائی۔

مہاراجہ اور کھانڈے راؤ قسم کھانے کے بعد مطمئن ہو گئے۔

راجہ کرشن اوڈیر اپنے آپ کو بالکل آزاد اور خود مختار سمجھنے لگا۔ ادھر کھانڈے راؤ نے فوری طور پر مرہٹوں کے مرکز پونا ایک خط تیز رفتار قاصد کے ذریعے بھجوایا۔ اس خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

> "حیدر علی خاں جو ریاست کا ایک ادنیٰ مسلمان نوکر تھا، وہ ترقی کر کے ملک و مال پر قابض ہو گیا ہے اور اس قدر سرکش ہو گیا ہے کہ راجہ صرف نام کا حکمران ہو کر رہ گیا ہے۔
>
> اگر اس وقت اسے نکال باہر کرنے میں تم ہماری مدد کرو تو ہم تمہارے مقرر کردہ سالانہ خراج کے علاوہ لشکر کے اخراجات کے لیے ۵ لاکھ روپے بلا توقف پیش کریں گے۔"

کھانڈے راؤ نے پونا کے پیشوا کو صرف خط نہیں بھیجا بلکہ قاصد کے ہاتھ دو لاکھ روپے بطور نذرانہ بھی بھیجے۔

مرہٹوں کو اگرچہ پانی پت میں شکست ہو چکی تھی اور پونا کا پیشوا بالاجی باجی راؤ اسی صدمے میں مر گیا تھا مگر جب کھانڈے راؤ کا یہ خط اور دو لاکھ روپے کی رقم پیشوا کے بیٹے مادھو لال کو ملی تو اس

نے اسے غیبی مدد سمجھ کے رکھ لیا اور ایک مرہٹہ لشکر ترتیب دے کر ایساجی پنڈت پینی کی سرکردگی میں سرنگاپٹم روانہ کر دیا۔

لشکر کی روانگی سے پہلے اس نے کھانڈے راؤ کو مطلع کر دیا کہ وہ فکر نہ کرے، مرہٹہ لشکر جلد پہنچ رہا ہے۔

نواب حیدر علی خاں اگرچہ بڑا ذہین اور سمجھدار انسان تھا مگر وہ اعتماد سے دھوکہ کھا گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کھانڈے راؤ جسے اس نے مٹی سے سونا بنایا تھا، وہ اس کے ساتھ غداری کرے گا۔

کچھ دنوں سے اسے کسی نامعلوم خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس خطرے کے پیش نظر اس نے ایک سوار کو میسور کی چھاؤنی میں بھیجا تاکہ وہ یہ پتہ لگائے کہ اس کے دونوں جاسوس کہاں ہیں؟

حیدر علی خاں کے ذاتی محافظ دستے کا سوار جب چھاؤنی میں پہنچا تو اسے فوراً ہی محسوس ہو گیا کہ لشکری اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔

اس نے جب مسلمان جاسوسوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو اسے کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ اور کہہ دیا گیا کہ انہیں کچھ نہیں معلوم۔

پھر جب اس نے حیدر علی خاں کے ہندو جاسوسوں کے بارے میں دریافت کیا تو ایک لشکری کے منہ سے نکل گیا کہ ان دونوں کو وزیر کھانڈے راؤ نے اپنی ذاتی ملازمت میں لے لیا ہے اور اب وہ دونوں راج محل میں پہرہ دیتے ہیں۔

حیدر علی کے محافظ دستے کے سوار نے جب واپس آ کر اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس کے محافظ سوار نے حیدر علی سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ چھاؤنی کے لشکر سے کوئی امید نہ رکھیں کیونکہ تمام ہندو لشکران سے باغی ہو چکا ہے۔

حیدر علی خاں کو یقین ہو گیا کہ اس وقت قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ وہ لشکر جو اس پر جان دیتا تھا آج وہ بھی مذہب کے نام پر دھوکہ دے گیا ہے اور اس سے باغی ہو گیا ہے۔

پھر بھی اس نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے ایک غلام کو راج محل بھیجا اور کھانڈے راؤ کو مشورہ

کے لیے اپنے پاس بلوایا۔ بھلا کھانڈے راؤ کیوں آتا۔ وہ تو حیدر علی کو قید کرنے کی فکر میں تھا۔ اس نے قاصد غلام کو ٹال دیا۔

حیدر علی نے دوسری بار پیغام بھیجا کہ بعض انتہائی اہم معاملات میں وہ کھانڈے راؤ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ تھوڑی دیر کے لیے آ جائے۔

کھانڈے راؤ نے اس کے پیغام کے جواب میں حیدر علی کو ان الفاظ سے مطلع کیا:

نواب بہادر حیدر علی خاں!

مجھے راجہ کے پاس سے کہیں جانے کی فرصت نہیں ملتی۔ البتہ اگر جنابِ والا خود تشریف لا کر راجہ کی اجازت سے مجھے لے جائیں تو حاضر ہو سکتا ہوں۔

کھانڈے راؤ کے اس تلخ جواب نے حیدر علی کو حالات کی سنگینی کا پورا احساس دلا دیا۔ ریاستی فوج کی طرف سے وہ پہلے ہی ناامید ہو چکا تھا۔ اب اسے اپنے بچاؤ کی فکر ہو گئی۔

خالی ہاتھوں سے کھانڈے راؤ سے لڑنا خود کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف تھا اور دیوانی بیٹھ میں ٹھہرنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

حیدر علی خاں، کھانڈے راؤ کے تلخ جواب پر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس کے ایک جاسوس نے کمرے میں داخل ہو کر اطلاع دی:

"آقا۔ سرنگاپٹم سے باہر جانے کے تمام راستوں پر کھانڈے راؤ کے فوجیوں کا سخت پہرہ ہے نہ کوئی شہر میں آ سکتا ہے اور نہ باہر نکل سکتا ہے۔ ہر ایک سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔"

اسی وقت حیدر علی کے محافظ دستے کے سردار نے اندر آ کر عرض کیا:

"سپہ سالار محترم۔ شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ دیوانی بیٹھ پر کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے آپ ہمیں ہمارے حالات پر چھوڑیے اور اللہ کا نام لے کر کسی طرف نکل جائیے۔ اللہ کو منظور ہوا تو پھر ملیں گے ورنہ قیامت میں ملاقات ہو گی۔"

حیدر علی بڑے حوصلے کا آدمی تھا مگر حالات نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ محافظ دستے کے سردار کی رائے اسے معقول معلوم ہوئی مگر وہ اپنے محافظ دستوں کو دشمن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

شام کا وقت تھا اور سورج غروب ہونے کو تھا۔ حیدر علی فوراً زنان خانے میں پہنچا۔ اس نے نوعمر شہزادے ٹیپو

کو سینے سے لگایا۔ پھر بیوی سے کہا:

"تمہیں اور شہزادے کو اللہ کی امان میں چھوڑتا ہوں۔ میرا سرنگاپٹم سے جانا ضروری ہے۔ تم لوگ حوصلہ رکھنا اور خدا پر بھروسہ کرنا۔ قسمت نے ملایا تو پھر ملیں گے"۔

اس کے بعد اس نے ٹیپو کو ایک بار پھر سینے سے لگایا اور کہا:

"ٹیپو۔ تم شیر کی اولاد ہو۔ گھبراؤ گے تو نہیں؟"

ٹیپو نے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا:

"بابا۔ ماں کہتی ہیں شیروں کے بچے شیر ہوتے ہیں۔ میں بھی شیر ہوں"۔

"شاباش ٹیپو۔ فی امان اللہ"۔

حیدر علی خاں اہل و عیال سے رخصت ہو کے باہر آیا۔ محافظ دستے کا سردار اب بھی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ حیدر علی نے کہا:

"ہمارے پاس کل کتنے جوان ہیں؟"

"تقریباً تین سو"۔ سردار نے سر اٹھا کر کہا۔

"سب کو تیار ہونے کا حکم دو"۔

"جی۔۔۔؟" سردار نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ ہمارا حکم ہے"۔ حیدر علی نے کہا:

"اب تم جا سکتے ہو"۔

محافظ سردار گومگو کی حالت میں دروازے کی طرف بڑھا۔

اسی وقت سامنے کا دروازہ ایک آواز کے ساتھ کھلا اور ایک عورت جو کپڑے سے اپنے منہ کو چھپائے ہوئے تھی، تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ وہ سیدھی حیدر علی کے پاس آ کر رکی۔

"آپ حیدر علی خاں ہو؟" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"ہاں۔ میں حیدر علی ہوں"۔ حیدر علی خاں نے جواب دیا:
"مگر تم کون ہو؟"

عورت نے جواب دینے کے بجائے کاغذ کی ایک چٹ حیدر علی خاں کی طرف بڑھا دی۔ حیدر علی پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے وہ چٹ محافظ سردار کی طرف بڑھا دی:

"پڑھو۔ اس میں کیا لکھا ہے؟"

اندھیرا پھیل گیا تھا۔ چراغ روشن ہو گئے تھے۔ محافظ سردار نے چراغ کی روشنی میں پڑھا۔ چٹ پر لکھا تھا:

"صبح ہونے سے پہلے اپنا ڈیرا چھوڑ دو"۔

دستخط کی جگہ صرف "ہمدرد" لکھا تھا۔

حیدر علی نے نرمی سے اس عورت سے پوچھا:

"خاتون! خبر لانے کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں مگر یہ تو بتا دو یہ چٹ تمہیں کس ہمدرد نے دی ہے؟"

عورت نے چہرے سے ذرا سا کپڑا ہٹایا جس سے اس کی روشن آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے جواب دیا:

"حیدر علی خاں۔ ہمیں نام بتانے کو روکا گیا ہے آپ فوراً چلے جاؤ"۔

"نام نہیں بتاؤ گی اس کا؟"

"اس کا نام رانی دیواجی منی ہے۔ ہم بھی کہتا ہے اب چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ"۔

اور۔۔۔

وہ عورت جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے دروازے سے نکل گئی۔ حیدر علی اور محافظ سردار کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

کچھ دیر بعد انہیں ہوش آیا تو حیدر علی نے حکم دیا:

"حویلی اور فصیل کی تمام روشنیاں گل کر دی جائیں اور یہ معلوم کیا جائے کہ دروازے پر پہرہ ہونے کے باوجود یہ عورت کس طرح اندر آئی"۔

حیدر علی خاں کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ باہر صدر دروازے کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ حیدر علی زور سے چیخا:

"صدر دروازہ بند کرا دو اور سب کو ہوشیار کر دو"۔

یہ کہہ کر وہ اندر گیا۔ جلدی جلدی جسم پہ اسلحہ سجایا اور باہر مہمان خانے میں آ گیا۔ وہ کوئی اور حکم دینے والا تھا کہ دو آدمی کسی زخمی کو اٹھائے ہوئے داخل ہوئے۔

"آقا۔ یہ مظلوم عورت آپ کے پاس فریاد لے کے آئی تھی۔ اب واپس جا رہی تھی کہ دروازے سے

نکلتے ہی کسی نے باہر سے اس پر گولی چلا دی۔"

یہ بیان دروازے کے پہریدار کا تھا۔

حیدر علی سمجھ گیا کہ مظلوم عورت کا روپ دھار کے اندر داخل ہونے والی یہ عورت وہی تھی جس نے دیواجی رانی کی چٹ اسے پہنچائی تھی مگر واپسی میں دشمنوں نے اسے گولی مار دی۔

"اسے روشنی میں لاؤ۔" حیدر علی نے جلدی سے کہا:

"کیا زندہ ہے؟"

عورت مظلوم تھی یا نہیں مگر حیدر علی کی نظر میں اب وہ مظلوم بھی تھی اور قابلِ احترام بھی۔ وہ دیواجی رانی کی چٹ لے کے آئی تھی جس نے اس کے تمام اندیشوں اور وسوسوں کو یقین میں بدل دیا تھا۔ وہ اس وقت دشمنوں میں بری طرح گھر گیا تھا۔

"آقا افسوس کہ یہ عورت مر چکی ہے۔ گولی سیدھی سینے میں لگی ہے۔" پہرے دار روشنی لیے عورت پر جھکا ہوا تھا۔

حیدر علی خاں کو بھی اس کا صدمہ ہوا۔ وہ زندہ ہوتی تو یہ تو معلوم ہو جاتا کہ اس نے اتنی جرأت کیوں کی اور اس کی اصلیت کیا تھی؟

حیدر علی بھی عورت پر جھکے مگر جب ان کی نظر مرنے والی پر پڑی تو وہ چونک پڑے:

"سیتا منی"۔ انہوں نے جیسے خود سے کہا۔

پھر انہوں نے سیدھے ہو کر کہا:

"یہ یقین کرنے کے بعد کہ یہ عورت واقعی مر چکی ہے، اسے گڑھا کھود کے دفن کر دیا جائے اور تمام لوگ تیار ہو کے یہاں جمع ہو جائیں۔"

حیدر علی سخت پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ سیتا منی جسے کھانڈے راؤ نے مہاراجہ کو رام کرنے کے لیے محل میں پہنچایا تھا، اس نے اتنا اہم کام کیوں کیا؟

سیتا منی کو ان سے ہمدردی کیوں پیدا ہوئی؟

پھر ـــ دیواجی منی بھی اس کے خلاف تھی۔ اس نے کھانڈے راؤ کی سفارش کی تھی اور اب اس کے خلاف (حیدر علی) کو چٹ بھیج کر خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔



وہ بڑی پُر ہول رات تھی۔

سخت تاریکی اور آسمان سے برستا ہوا جھم جھم پانی۔ اس پر بجلی کی چشمک زنی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بادل گرجتے پھر بجلی چمکتی اور دُور تک روشنی کی لہر دوڑ جاتی۔

اشجار دیوؤں کی طرح جھومتے نظر آتے۔ انسان اور جانور سب ہی اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ دریائے کاویری پورے جوش پر تھا۔ پانی اس کے کناروں سے نکل کر طغیانی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

مگر ـــ

شدت کی اس بارش کے باوجود حیدر علی خاں اور اس کے تین سو ساتھی دشمنوں کا محاصرہ توڑ کر قلعہ دیورانی پیٹھ سے نکلے اور جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے دریائے کاویری میں کود پڑے۔

حیدر علی خاں کی دیورانی پیٹھ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کھانڈے راؤ اور مرہٹوں کی فوجوں نے مل کر کیا تھا۔

یہ وہی کھانڈے راؤ تھا جو پہلے حیدر علی خاں کا نائب اور سیکرٹری تھا اور حیدر علی خاں نے جسے اعتماد کا آدمی سمجھتے ہوئے میسور کے راجہ کرشن اوڈیر کا وزیر مقرر کیا تھا۔

حیدر علی کے خلاف یہ سازش بڑی زبردست تھی۔ کھانڈے راؤ نے راجہ اور رانیوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ فوج کو بھی اس نے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ پھر اس نے راجہ سے حیدر علی کے خلاف یہ کارروائی کرنے کی اجازت مانگی۔

راجہ نے یہ سوچتے ہوئے کہ وزیر برادران کا تو خاتمہ ہو ہی گیا ہے۔ اب اگر حیدر علی خاں کا کانٹا بھی درمیان سے نکل جائے تو وہ بالکل آزاد ہو جائے گا، اجازت دے دی۔ تب کھانڈے راؤ نے دو لاکھ کی رقم پیشگی بھیج کر مرہٹہ فوجوں کو سرنگا پٹم بلا لیا۔

مرہٹہ فوجیں سرنگا پٹم میں داخل ہوئیں تو کھانڈے راؤ نے حیدر علی خاں کی رہائش گاہ دیورانی پیٹھ کا محاصرہ شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ حیدر علی نے اپنی رہائش گاہ کو قلعہ میں تبدیل کر رکھا ہے اسی لیے اس نے فصیل اور برجوں پر توپیں چڑھا دی تھیں۔ اس لیے کھانڈے راؤ نے بڑی خاموشی سے محاصرہ شروع کیا تھا۔

مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

حیدر علی خاں کو اپنے جاسوسوں سے محاصرے کی خبر مل گئی تھی مگر باہر جانے کے تمام راستوں پر

کھانڈے راؤ نے سخت پہرہ لگا دیا تھا۔

سب طرف سے مجبور ہو کر اس نے ایک طوفانی رات میں اپنے تین سو جوانوں کے ساتھ دریائے کاویری کا رخ کیا۔

یہ وہی رات تھی جب راج محل سے رانی دیواجی منی نے سیتا منی کے ذریعے حیدر علی خاں کو سرنگا پٹم چھوڑ دینے کی تاکید کی تھی اور غریب سیتا منی واپسی پہ کھانڈے راؤ کے اس گشتی دستے کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی جو حیدر علی خاں کے گرد گھیرا ڈالنے کے انتظامات میں مصروف تھا۔

اسی رات حیدر علی خاں اپنی حویلی کی پشت کے دروازے سے ۲۰۰ جوانوں کے ساتھ نکلا۔ ہر طرف طوفانِ باد و باراں کا راج تھا۔ حیدر علی اور اس کے ساتھی طوفان کے تھپیڑے کھاتے دریائے کاویری کے کنارے پہنچے اور ان سب نے اللہ کا نام لے کر خود کو دریائے کاویری کی طوفانی لہروں کے حوالے کر دیا۔

ہر چند کہ دریا کی منہ زور لہریں حیدر علی اور اس کے ساتھیوں کے منہ پھیرے دیتی تھیں مگر یہ لوگ مردانہ وار لہروں سے لڑتے بھڑتے دریا پار کر گئے۔

حیدر علی خاں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور سرنگا پٹم سے نکلنے کے بعد اپنے جوانوں کے ساتھ سیدھا بنگلور پہنچے۔

حیدر علی خاں نے بنگلور پہنچ کے وہاں کے ماتحت پایگاروں اور قلعہ داروں کو اپنی فوجیں لانے کا حکم دیا۔ بنگلور والوں کو میسور اور سرنگا پٹم کے حالات کا کچھ علم نہ تھا۔ ان کے خیال میں حیدر علی سپہ سالارِ افواجِ میسور تھا اس لیے انہوں نے فوراً اپنی فوجیں اکٹھی کر کے حیدر علی کے حوالے کر دیں۔

حیدر علی خاں بنگلور کے ساہوکاروں سے بھی پچاس لاکھ روپیہ قرض لیا اور اسی وقت فوجی بھرتی شروع کر دی۔ ساتھ ہی میر رضا علی خاں کو بنگلور بلوا لیا۔

سرنگا پٹم میں حیدر علی خاں کے فرار ہونے کی خبر دوسرے دن صبح کو اڑی۔ مرہٹے اور کھانڈے راؤ ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔

کھانڈے راؤ نے راجہ کے حکم سے اپنے سپہ سالار کونیری راؤ کو بنگلور پر حملہ کے لیے بھیجا۔ حیدر علی کے سر کا انعام بھی مشتہر کیا گیا مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ کھانڈے راؤ نے دیورانی پیٹھ پر حملہ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں سخت مقابلہ ہوگا مگر وہاں کی توپیں خاموش رہیں اور کھانڈے راؤ نے دیورانی پیٹھ پر قبضہ کر کے حیدر علی خاں کے اہلِ خانہ، جن میں شہزادہ ٹیپو بھی تھا، قید کر دیا۔

مرہٹے اور کھانڈے راؤ کا سپہ سالار کونیری راؤ اپنی فوج کے ساتھ بنگلور پہنچا۔ حیدر علی خاں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ قلعہ بنگلور سے باہر نکلا۔ صف بندی کی اور مرہٹوں اور کونیری راؤ کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔

مشہور ہے کہ دن بھر جنگ ہوتی رہی۔ حیدر علی اور کونیری راؤ دونوں کو معلوم تھا کہ اس جنگ پر ان کی قسمتوں کا دار و مدار ہے اسی لیے دونوں لشکری چھوڑ کر لڑے ۔۔۔ اور مرنے والوں کے پشتے لگ گئے!

مصنف حیدری نے اس جنگ کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس طرح ہے:

"دونوں مہابھارت دلیں جیسے ساون بھادوں کے گھنگھور [illegible]
طرف سے اٹھتے ہیں، ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ پہلے تو دور سے گولیاں اور گولے، تگرگ اولے کی طرح دونوں طرف سے برسنے لگے۔ گولوں کی گڑگڑاہٹ اور گولیوں کی کڑکڑاہٹ بادل کی گرج اور رعد کی کڑک تھی۔ رنجک کا اڑنا اور مہتابی کا پھکنا، برق کی جھلک اور بجلی کی چمک، دھاں دھاں توپوں کے ہنگامے محشر کا پدیدار (منظر) تھا اور دھمک سے اس کے زلزلت الارض آشکار۔ جب دونوں فوجیں لڑتے لڑتے نزدیک آئیں اور نوبت کوتہ یراق کو پہنچی تو تیغ و تبر، خنجر، جمدھر، پستول، طپنچے، چھڑی، کٹاری، بھالے، برچھی کی بوچھاریں چلتی تھیں اور خون کی پھواریں اڑتی تھیں۔ ایک لمحے میں خون کی ندیاں نالے بہنے لگے۔ ہاتھی گھوڑے، اونٹ، گاؤ، بچھڑے ماہی کے مانند اس میں نظر آتے تھے۔ فیلوں کے سر حباب کے مانند تیرتے پھرتے تھے اور کشتیوں کے مانند لاشیں موجوں کے مارے بہ بہ کے کنارے لگتے تھے۔ آخر کار نواب رستم شوکت اسفندیار صولت نے میسور کے لشکر کو ہزیمت فاش دی۔"

اس شکست کی خبر جب سرنگا پٹم پہنچی تو راج محل میں کہرام مچ گیا۔ مرہٹہ سردار رالیاجی اور کھانڈے راؤ میں کسی نئے منصوبے کے لیے گفت گو شروع ہوئی۔

اس فتح کا حال جب وزیر نندراج کو معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ایک روایت کے مطابق حیدر علی نے نندراج کو اطلاع دی کہ کھانڈے راؤ ریاست کو مرہٹوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی سازش کر رہا ہے اس لیے وہ اس معاملے میں دخل دیں۔

وزیر نندراج نے اسی وقت مرہٹہ سردار ایساجی کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا:

"حیدر علی خاں ریاست میسور کا ایک عہدہ دار ہے اور اس کا ریاست پر بہت حق ہے۔ کھانڈے راؤ، حیدر علی خاں کا ملازم ہے اور اس نے بغاوت اور سرکشی اختیار کی ہے۔ اس کے پیشِ نظر تمہارے لیے یہ مناسب نہیں کہ تم ہماری ریاست کے معاملات میں مداخلت کرو۔ تم صرف اپنی چوتھ (خراج کی رقم) وصول کرنے کی فکر کرو اور واپس چلے جاؤ۔"

مرہٹہ سردار شکست کے بعد اپنی جان چھڑانے کی فکر میں تھا۔ اسے نند راج کا خط ملا تو اس نے صرف رقم کا مطالبہ کیا۔

حیدر علی کے پاس نقد رقم نہیں تھی اس لیے انہوں نے "بارہ محل" کا علاقہ مرہٹوں کے نام لکھ دیا۔ مرہٹہ سردار نے اسی کو غنیمت جانا اور بنگلور اور سرنگاپٹم سے کوچ کر گیا۔

مرہٹوں کو بارہ محل کا علاقہ لکھ دیا گیا تھا مگر یہ تحریر کاغذوں ہی تک محدود رہی اور مرہٹوں کو یہ علاقہ کبھی نہیں مل سکا۔

مرہٹوں سے جان چھڑانے کے بعد حیدر علی خاں نے سرنگاپٹم پر توجہ کی۔ اس نے اس سلسلے میں میر رضا علی خاں سے مشورہ کیا۔ باہم مشورہ میں یہ طے پایا کہ سرنگاپٹم پر حملہ کر کے کھانڈے راؤ کا خاتمہ کیا جائے تاکہ ریاست میں امن و امان بحال ہو۔

حیدر علی خاں نے اس مشورہ پر ابھی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ انہیں سرنگاپٹم کے راج محل سے رانی ویداجی منی کا ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط راج محل کا ایک قاصد لے کر آیا تھا۔

خط میں حیدر علی کو لکھا گیا تھا:

"ملک کی بدانتظامی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ قریب ہے کہ ریاست ہمارے ہاتھ سے چھن کر مرہٹوں کی عملداری میں چلی جائے۔ اس لیے ہمیں اس تباہی سے بچانے کے لیے آپ کا سرنگاپٹم پہنچنا بے حد ضروری ہے۔"

حیدر علی کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بدطینت کھانڈے راؤ کو سزا دینے کے لیے سرنگاپٹم کی طرف بڑھے۔ پس حیدر علی خاں کوڈ لشکر کے ساتھ سرنگاپٹم کی طرف بڑھا۔ راستہ میں نند راج کی جاگیر پڑتی تھی۔ وہاں ٹھہر کر حیدر علی نے نند راج کو تمام احوال سے آگاہ کیا اور اس سے مشورہ کیا۔ اس نے بھی سرنگاپٹم پر چڑھائی کا مشورہ دیا۔

حیدر علی نے سرنگاپٹم پہنچتے ہی راج محل پر گولہ باری کا حکم دے دیا۔ بدطینت کھانڈے راؤ راج محل میں چھپا بیٹھا تھا اور راجہ کی خوشامد کر رہا تھا کہ حیدر علی سے اس کی جاں بخشی کرا دی جائے۔

راج محل پر گولہ باری شروع ہوئی تو سب کی عقل ٹھکانے آ گئی۔ رانیوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ رانی نندی اپنی کنیزوں کو لے کر محل سے نکلی اور حیدر علی کے کیمپ میں پہنچ گئی اور اس سے معافی کی خواستگار ہوئی۔

رانی نندی، حیدر علی کے محسن وزیر نند راج کی بیٹی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر رانی نندی کا استقبال کیا اور اس کی بہت خاطر مدارات کی۔

رانی نندی نے حیدر علی سے راج محل پر گولہ باری بند کرنے کی درخواست کی۔ حیدر علی نے فوراً گولہ باری بند کرا دی مگر راجہ کرشن اوڈیر سے کھانڈے راؤ کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ راجہ اوڈیر حیلے بہانے کرنے لگا۔ حیدر علی خاں نے سختی کی اور محل کو گھیرے میں لے کر تمام دربانوں اور پہریداروں کو ہٹا کر ہر جگہ اپنے لشکری مقرر کر دیے۔

جب راجہ اوڈیر کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تو اس نے حیدر علی سے درخواست کی کہ وہ کھانڈے راؤ کو حوالے کرنے پر تیار ہے۔ بشرطیکہ حیدر علی اسے قتل نہ کرے۔

حیدر علی نے راجہ کو زبان دی اور کھانڈے راؤ کو قتل نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر اس کے آدمیوں نے کھانڈے راؤ کو محل کے دروازے پر گرفتار کر کے حیدر علی کے سامنے پیش کیا۔ کھانڈے راؤ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔

"ہم نے تمہیں قتل نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ کوئی جسمانی تکلیف بھی نہیں دی جائے گی لیکن تم نمک حرامی اور بغاوت کی سزا سے نہ بچ سکو گے۔"

یہ کہنے کے بعد حیدر علی نے ایک قدِ آدم لوہے کا پنجرہ تیار کرنے کا حکم دیا۔

پنجرہ تیار ہوا۔

اور ــــ

نمک حرام کھانڈے راؤ کو اس پنجرے میں بند کر کے مقفل کر دیا گیا۔

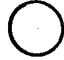
اس کی غذا دودھ اور چاول مقرر ہوئی۔ حیدر علی خاں اسے دیکھ کر اکثر اپنے درباریوں سے کہا کرتے تھے:

"یہ میرا طوطا ہے۔ میں اسے پال رہا ہوں۔"

کھانڈے راؤ دودھ چاول کھا کھا کر بھدا اور بدوضع ہو گیا۔ پنجرے میں رہتے رہتے اس کا جسم بہت موٹا ہو گیا۔ لوگ اسے دور دور سے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ حیدر علی اس کا پنجرہ سفر و حضر میں ساتھ رکھا کرتے تھے۔

کھانڈے راؤ اپنی موت تک اس پنجرے میں قید رہا!





کھانڈے راؤ کو لوہے کے پنجرے میں بند کر کے لٹکا دیا گیا۔

اس کو یہ سزا اس کی نمک حرامی اور غداری کی وجہ سے دی گئی۔ حیدر علی خاں نے اسے ترقی دے کر پہلے اپنا نائب مقرر کیا۔ پھر میسور کے راجہ کرشن اوڈیر کا وزیر بنا دیا۔ فوجدار کا عہدہ پہلے ہی سے اس کے پاس تھا۔ وزارت پلتے ہی کھانڈے راؤ کو شیطان نے گھیرا اور وہ نمک حرامی پر آمادہ ہو گیا۔

کھانڈے راؤ نے پہلے راجہ کرشن اوڈیر کو حیدر علی کے خلاف ورغلایا اور اس کو یہ تاثر دیا کہ ایک مسلمان آہستہ آہستہ ریاست میسور پر قابض ہوتا جا رہا ہے اور اگر اسے روکا نہ گیا تو پھر حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

راجہ اوڈیر سدا کا بدھو اور کم عقل تھا۔ وہ اس کے بہکاوے میں آ گیا اور کھانڈے راؤ کو حیدر علی کے خلاف کارروائی کی اجازت دیدی۔

بدبخت کھانڈے راؤ نے پونا کے مرہٹہ پیشوا کو ایک معقول رقم ارسال کی اور اس سے حیدر علی کے خلاف فوجی مدد طلب کر لی۔

حیدر علی اپنے نائب پر بڑا اعتماد کرتا تھا۔ اسے کھانڈے راؤ سے کسی دغابازی کی امید نہ تھی۔ چنانچہ وہ اعتماد سے مار کھا گیا۔ اسے اصل حالات کا علم اس وقت ہوا جب مرہٹہ فوج سرنگاپٹم پہنچ گئی۔

کھانڈے راؤ نے سرنگاپٹم سے باہر جانے والے تمام راستوں پر اپنی فوج لگا دی تھی اور اپنے

خیال میں حیدر علی کو ہر طرف سے محصور کر لیا۔

لیکن ـــــ

مشہور ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

حیدر علی اپنی قلعہ نما حویلی میں تھا اور اس کے پاس ۲۰۰ آدمی تھے۔ اس کے بیوی بچے بھی گھر ہی میں تھے مگر وہ مردِ میدان اندھیری رات اور باد و باراں کے طوفان میں حویلی سے نکلا اور دریائے کاویری پر پہنچ گیا۔

دریا آنکھیں دکھا رہا تھا اور اس میں سیلابی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ حیدر علی نے خوف و ہراس کو سر جھٹک کر دور کیا اور اپنے ساتھیوں سمیت دریا میں اتر گیا۔ وہ موجوں سے لڑتا بھڑتا دوسرے کنارے پر پہنچا اور صرف ۲۰ گھنٹہ میں بنگلور پہنچ گیا۔

حیدر علی کو اتنا ہی وقفہ کافی تھا۔

اس نے دوڑ دھوپ کے بعد لشکر تیار کیا۔ پھر سرنگا پٹم کی طرف بڑھا۔

ادھر بوکھلایا ہوا کھانڈے راؤ اور مرہٹے بنگلور پر حملہ کے لیے آ رہے تھے۔ حیدر علی نے ان پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ وہ زیادہ دیر میدان میں نہ جم سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

حیدر علی یلغار کرتا ہوا سرنگا پٹم پہنچا اور اس نے راج محل کا محاصرہ کر کے گولہ باری شروع کرا دی۔ کھانڈے راؤ محل ہی میں موجود تھا۔

راج محل پر گولہ باری سے چیخ و پکار اور قیامت مچ گئی۔ رانیوں نے قاصد بھیج کر حیدر علی سے گولہ باری بند کرنے کی درخواست کی۔

حیدر علی کا مقصد محل والوں کو جان سے مارنا نہیں تھا بلکہ یہ احساس دلانا تھا کہ دشمنوں کی سازشیں ناکام ہو چکی ہیں اور فسادیوں کی طاقت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

راج محل پر گولہ باری بند کر دی گئی۔

حیدر علی نے مطالبہ کیا کہ فساد کی جڑ اور سازشی کھانڈے راؤ کو اس کے حوالے کیا جائے۔

کھانڈے راؤ ایک ایک رانی کے سامنے ہاتھ جوڑتا اور اپنی زندگی کی بھیک مانگتا رہا مگر اسے کون بچا سکتا تھا۔ نہ راجہ اوڈیر نہ اس کی کوئی رانی۔

حیدر علی خاں نے کچھ دیر کھانڈے راؤ کی حوالگی کا انتظار کیا پھر راج محل قاصد روانہ کیا کہ اگر فوری طور پر کھانڈے راؤ کو اس کے حوالے نہ کیا گیا تو راج محل کو زمیں بوس کر دیا جائے گا۔

قاصد نے جس وقت راجہ کرشن اوڈیر کو یہ پیغام دیا، کھانڈے راؤ اس وقت راجہ کے پیروں سے لپٹا گڑگڑا رہا تھا:

"مجھے بچا لیجیے مہاراج۔ حیدر علی خاں کے حوالے نہ کیجیے مجھے!"

اس کیفیت میں راجہ کو حیدر علی کا آخری پیغام ملا۔ اسے پہلے ہی پسینے آ رہے تھے۔ حیدر علی سے وہ خود بھی شرمندہ تھا۔ کھانڈے راؤ کے بہکاوے میں آ کر وہ بھی حیدر علی کے خلاف ہو گیا تھا لیکن کھانڈے راؤ کی طاقت ہانڈی کا ابال تھی۔ مرہٹوں سے مدد حاصل کرنے کے باوجود اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور اب اسے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

راجہ کرشن اوڈیر کو اس پر اس قدر غصہ تھا کہ جب اس نے راجہ کے پیر پکڑ کر اس سے جان بخشی کرانے کی درخواست کی تو راجہ نے اسے ٹھوکر مار کر قدموں سے دور کر دیا:

"تو کمینہ ہے۔ تجھے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ تو نے حیدر علی خاں کی نظروں میں مجھے بھی ہمیشہ کے لیے ذلیل کر دیا۔"

راجہ کو اس پر کوئی رحم نہ آیا مگر رانیاں اور محل کی دوسری عورتیں نہ رہ سکیں۔ ان کے دل پسیج گئے اور انھوں نے راجہ کو مجبور کیا کہ وہ حیدر علی سے کھانڈے راؤ کی جاں بخشی کی سفارش کرے۔

آخر راجہ نے حیدر علی کے قاصد سے کہا:

"نواب حیدر علی خاں کو میری طرف سے درخواست کرنا کہ مہاراجہ میسور، خاں صاحب سے بہت شرمندہ ہیں اور انھوں نے درخواست کی ہے کہ کھانڈے راؤ پر رحم فرماتے ہوئے اسے موت کی سزا نہ دی جائے۔"

اس طرح کھانڈے راؤ کی جان تو بچ گئی مگر حیدر علی خاں نے حکم دیا:

"کھانڈے راؤ کو لوہے کے قد آدم پنجرے میں بند کر کے لٹکا دیا جائے۔ اس کی غذا دودھ چاول مقرر کی جاتی ہے۔"

کہتے ہیں کہ اس غدار کو لوگ دور دور سے دیکھنے آتے اور عبرت حاصل کرتے تھے۔

دوسرے دن حیدر علی خاں اپنی فوج کے ایک دستے اور چند افسروں کے ساتھ راج محل پر گئے تمام دروازوں اور راستوں پر فوجی پہرہ لگا دیا گیا۔

کھانڈے راؤ کی گرفتاری کے بعد حیدر علی خاں اپنے بال بچوں سے ملاقات کے لیے راج محل پہنچا تو محل کے چوکیدار سے لے کر راجہ اوڈیر تک اس کے استقبال کو محل کے دروازے پر دست بستہ موجود تھے۔

حیدر علی جب اپنی رہائش گاہ دیوانی پیٹھ سے بے سروسامانی کے عالم میں رات کے اندھیرے اور باد و باراں کے طوفان میں جان بچا کے نکلے تھے تو اپنے اہلِ خانہ یعنی بیوی اور دونوں بچوں ٹیپو سلطان اور عبدالکریم کو اپنی حویلی میں خدا کے حوالے کر گئے تھے۔

کھانڈے راؤ کو جب حیدر علی ہاتھ نہ آئے تو وہ ان کے اہلِ خانہ کو گرفتار کر کے راج محل لے گیا۔ اس وقت سے اب تک وہ راج محل میں کھانڈے راؤ کے قیدیوں کی طرح رہ رہے تھے مگر اس وقت کنیزیں ان کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔

حیدر علی خاں جب راج محل کے دروازے پر گھوڑے سے اترے تو ان کی نظر سب سے پہلے اپنے اہل و عیال پر پڑی۔ ان کی آنکھیں چھلک آئیں۔ حیدر علی نے تیزی سے بڑھ کر پہلے ٹیپو پھر عبدالکریم کو گلے لگایا۔ باپ کو دیکھ کر اگرچہ ان کے چہرے کھل اٹھے تھے مگر گزشتہ دنوں کی پریشانیوں نے انہیں مضمحل کر دیا تھا۔

پھر حیدر علی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس دوران استقبال کرنے والے تمام لوگ دم بخود کھڑے رہے۔ حیدر علی نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

بیوی بچوں سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی نے کسی سے گفتگو نہیں کی۔ راجہ اور اس کی رانیاں سہمی جا رہی تھیں کہ دیکھیے انہیں کیا سزا ملتی ہے!

حیدر علی نے بیوی کو تو کنیزوں کے حوالے کیا کہ انہیں اندر لے جائیں اور خود دونوں بچوں کی انگلیاں پکڑے راج دربار کی طرف چلے۔ محل کے تمام لوگ ان کے ساتھ تھے۔ ان کے پیچھے وہ فوجی افسر تھے جو حیدر علی کے ساتھ معہ ایک دستہ سواروں کے آئے تھے۔

راج محل کے دربار ہال پر پہنچ کے حیدر علی نے راجہ کو مخاطب کیا:

"آپ اندر جائیے۔ مجھے ضرورت ہوگی تو اطلاع دوں گا۔"

راجہ اوڈیر نے، ہچکچاتے ہوئے کہا:

"میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں حیدر علی خاں!"

راجہ کو رانیوں نے سمجھا دیا تھا کہ وہ حیدر علی سے اپنی غلطی پر اظہارِ شرمندگی کرے۔ راجہ کے منہ

سے نکلا ہوا یہ جملہ رانیوں کا رٹایا ہوا تھا۔

مگر۔۔۔

حیدر علی نے راجہ کی معذرت کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ کنیزوں سے کہا:

"سب لوگ جا کے آرام کریں۔ صرف فوجی سردار ہمارے ساتھ رہیں۔"

راجہ، تمام رانیاں اور کنیزیں سر جھکائے واپس ہو گئیں۔

حیدر علی خاں دونوں بیٹوں اور سرداروں کے ساتھ دربار ہال میں جا بیٹھے۔ پھر انہوں نے تحائف کے وہ خوان منگوائے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے خوانوں کو وہاں موجود کنیزوں کے حوالے کیا اور ایک کنیز سے کہا:

"راجہ اوڈیر کو یہ تحائف پہنچا دو اور اسے پیغام دو کہ ہم اسے معزول نہیں کرتے لیکن اب وہ صرف ایک آئینی حکمران رہیں گے۔

ان سے یہ بھی کہو کہ چونکہ راجہ ریاست کے انتظامات سے غافل رہے ہیں اس لیے ریاست کے مفاد میں وہ خود کو ریاستی انتظامات سے سبکدوش سمجھیں۔ ان کے اخراجات کے لیے تین لاکھ کی جاگیر عطا کی جاتی ہے۔"

اس طرح راجہ اوڈیر کی آئینی حیثیت برقرار رکھی گئی اور حیدر علی خاں نے ریاستی انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

یوں بھی حیدر علی خاں کو دربار دہلی سے صوبہ سرا کی گورنری کا پروانہ معہ طبل و نشان اور منصب دیا گیا تھا اور ریاست میسور اسی صوبہ کے ماتحت تھی اس لیے حیدر علی خاں اگر میسور کی عنانِ حکومت راجہ سے نہ بھی حاصل کرتے تو بھی میسور انہی کے ماتحت رہتا۔

چونکہ گورنری کی حیثیت سے صوبہ سرا کا انتظام بھی انہی کے سپرد تھا، چنانچہ حیدر علی نے سرا کے نظم و نسق کی طرف توجہ دی۔ فتنہ پرور حاکموں کو معزول کیا۔ مکار اور بدمعاملہ منشیوں پر جرمانے عائد کر کے انہیں سنبھلنے کا موقع دیا۔ اور عدل و انصاف کی فضا پیدا کی۔

بعض لوگوں نے بغاوت پر کمر باندھی تو انہیں سختی سے کچل دیا گیا۔ ایک سال کے اندر اندر حیدر علی نے صوبہ سرا کا پورا نظام درست کر دیا۔

اس کے بعد ۱۷۶۳ء میں انہوں نے بالاپور خورد اور بندی گڑھ کی طرف توجہ کی۔

بالاپور سے حیدر علی خاں کی بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ یادیں کیا، بلکہ بالاپور خورد میں ان کے

ساتھ وہ المیہ پیش آیا تھا جس سے انہیں دوبارہ زندگی ملی تھی۔

وہ المیہ یوں تھا کہ حیدر علی کے والد فتح علی خاں کے ایک جنگ میں مارے جانے کے بعد ان کے دونوں بیٹوں اور بیوی کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ فتح علی خاں کے بیوی بچے بالاپور میں رہائش پذیر تھے وہاں کا حاکم عباس قلی خاں، فتح علی خاں کے دشمنوں کا حلیف اور ہمدرد تھا۔

جب فتح علی خاں جنگ میں مارے گئے تو حاکم بالاپور عباس قلی خاں نے اس کے دونوں لڑکوں شہباز اور حیدر علی اور ان کی والدہ مجیدہ بیگم کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور الزام لگایا کہ مرحوم فتح علی خاں نے اس سے اٹھارہ ہزار روپے قرض لیے تھے اور جب تک یہ رقم ادا نہ ہو گی اس وقت تک وہ انہیں رہا نہ کرے گا۔

غریب بیوہ مجیدہ بیگم نے عباس قلی خاں سے کہا کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو وہ کہیں سے رقم کا انتظام کر کے اپنے بچوں کو لے جائے گی۔

عباس قلی خاں نے مجیدہ بیگم کو تو آزاد کر دیا مگر اس کے بیٹوں شہباز اور حیدر علی کو نقاروں کے اندر بند کر کے اوپر سے کھال منڈھ دی۔ اندر ہوا جانے کے لیے اس نے نقاروں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کرا دیے۔ پھر اس نے مجیدہ بیگم سے کہا:

"اگر تم رقم لے کر پندرہ دن کے اندر واپس نہ آئیں تو تمہارے بیٹے نقاروں کے اندر مر جائیں گے"۔

ممتا کی ماری ماں کسی نہ کسی طرح سرنگاپٹم پہنچی۔ وہاں راجہ میسور کی ملازمت میں فتح محمد خاں کا بھتیجا حیدر صاحب تھا۔ مجیدہ بیگم نے اس سے جو اپنا حال بتایا تو وہ بہت متاثر ہوا اور اس نے فوراً اٹھارہ ہزار روپے کا انتظام کر کے اپنے دونوں چچا زاد بھائیوں کو نقاروں کی قید سے آزاد کرا کے اپنے پاس منگوا لیا۔

اس وقت سے اب تک حیدر علی خاں جب کبھی بالاپور کا نام کسی سے سنتا تو غم و غصہ سے اس کا بدن کانپ اٹھتا تھا۔

جس وقت حیدر علی نے بالاپور پر حملہ کا ارادہ کیا اس وقت بالاپور پر ہمدردی پر پگنڈہ کا راجہ مراری راؤ آمادہ ہو گیا اور فوراً اپنا لشکر لے کر بالاپور پہنچ گیا۔

ادھر سے حیدر علی خاں اپنے لشکر کے ساتھ چلے۔ ادھر سے بالاپور اور راجہ مراری راؤ کے مشترکہ لشکر بالاپور سے آگے بڑھ کر نندی کے میدان میں خیمہ زن ہوئے۔

حیدر علی خاں نے نندی کے میدان میں پہنچتے ہی بالاپور اور پگنڈہ کے راجہ مراری راؤ کے مشترکہ لشکر پر زبردست حملہ کیا۔ مراری راؤ کو اس اچانک حملہ کی امید نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ حیدر علی کا لشکر تھکا ہوا آیا ہے۔ وہ ایک دو دن آرام کرنے کے بعد جنگ کرے گا مگر حیدر علی خاں کا لشکر اس منہ زور گھوڑے کی طرح تھا جو اپنے سوار کے قابو سے باہر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لشکر نے نندی کے میدان میں دشمن کے لشکر کو فروکش دیکھ کر حیدر علی سے وہاں پہنچتے ہی دشمن پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔

حیدر علی اپنے لشکر کی فطرت سے آگاہ تھا۔ اس فطرت کے بنانے میں خود حیدر علی کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اپنے لشکریوں کو پہلا سبق یہ پڑھاتا تھا کہ دشمن پر اچانک حملہ کرو اور دشمن سامنے موجود ہو تو ایسے وقت میں اس پر حملہ آور ہو کہ وہ بوکھلا کے رہ جائے۔

اسی لیے حیدر علی دن کے بجائے دشمن پر شب خون زیادہ مارتا تھا اور اس کا ہر شب خون کامیاب ہوتا تھا۔ یہ ایک طرح سے حیدر علی اور اس کے لشکر کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔

اس وقت دشمن نندی کے میدان میں پہلے سے موجود تھا اور اس نے اپنے لشکر کو اچھی جگہ خیمہ زن کیا تھا۔ برخلاف اس کے حیدر علی خاں میدان میں بعد میں پہنچے تھے اور وہ وہاں اپنے لشکر کے لیے مراری راؤ سے اچھی جگہ حاصل نہیں کر سکے تھے۔

اب جگہ کی تلاش کے لیے جنگ کو کچھ دن کے لیے موقوف رکھنا نہ تو حیدر علی کے لیے کچھ مفید تھا اور نہ اس کے لشکریوں کے لیے۔ پس جب لشکر نے فوری حملہ کی درخواست کی تو حیدر علی نے اس کی درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی کہ پہلے لشکری میدان میں خیمے لگائیں گے تاکہ دشمن یہ سمجھے کہ آنے والا لشکر آرام کرنے کے لیے دو چار دن جنگ موقوف رکھے گا۔ ادھر دشمن کی اس غلط فہمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلدی جلدی سامان اتار کے خیموں کی آڑ میں صف بندی کریں اور پھر اچانک دشمن پر جا پڑیں۔

لشکری حیدر علی کی شرط کا مطلب فوراً سمجھ گئے۔

وہ خیمے بھی لگاتے گئے اور دوسری طرف صف بندی بھی کرتے گئے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں تمام خیمے نندی کے میدان میں لگ گئے۔

راجہ مراری راؤ اپنے چھوٹے سرداروں کے ساتھ اپنی خیمہ گاہ کے آگے کھڑا حیدر علی کی لشکر گاہ کے خیمے نصب ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ آدمیوں کو بھیج کر معلوم کراؤ کہ حیدر علی کے لشکر کی صحیح تعداد کیا ہے؟" راجہ مراری راؤ نے

اپنے ایک سردار سے کہا۔

سردار جانے لگا تو راجہ نے اسے روک کر مزید تاکید کی:

"اپنے آدمیوں کو سمجھا دینا کہ حیدر علی بہت چالاک ہے۔ اسے بالکل خبر نہ ہونی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ان کو سمجھا دوں گا۔"

یہ کہہ کر سردار آگے بڑھا۔ ابھی دو چار قدم چلا تھا کہ راجہ کی پھر آواز آئی:

"ادھر آؤ۔ ایک بات اور سنتے جاؤ۔"

سردار واپس آ کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا:

"فرمایئے۔ اور کیا حکم ہے؟"

"اپنے آدمیوں سے کہنا کہ یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ حیدر علی جنگ کرے گا یا صلح کی کوشش کرے گا۔"

راجہ مراری راؤ کا یہ ایک احمقانہ سا حکم تھا۔

"جی۔ بہت بہتر۔" سردار نے کہا مگر جانے کے بجائے وہیں کھڑا رہا۔

"تم جاتے کیوں نہیں؟" راجہ نے دریافت کیا۔

"راجہ بہادر۔ میں اس لیے رک گیا ہوں کہ شاید آپ کوئی اور حکم صادر فرمائیں۔" سردار نے جل کر کہا۔

"تم جاؤ۔" راجہ کو اس کے جواب پہ غصہ آ گیا:

"ہم نے جو حکم دینا تھا، دے چکے ہیں۔"

مگر یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ سردار صرف چند ہی قدم چلا تھا کہ راجہ کی آواز پھر سنائی دی:

"ٹھہرو سردار ٹھہرو۔ ادھر واپس آؤ۔"

راجہ کی آواز میں بڑا اضطراب تھا اور ایک طرح کا خوف بھی۔ سردار پلٹ کے اس کے پاس آ چکا تھا۔

راجہ مراری راؤ نے کہا:

"دیکھو۔ ادھر دیکھو۔"

سردار بھی گھبرا گیا تھا۔ اس نے راجہ کے اشارے پہ اس طرف دیکھا اور جو دیکھا اس سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

سامنے کی طرف کافی دور پہ حیدر علی خاں کا لشکر جہاں کچھ دیر پہلے اپنے خیمے نصب کر رہا تھا، اب وہاں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے خیمے پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ خیموں کے بجائے سامنے کے پورے میدان میں گھوڑے بھاگتے نظر آ رہے تھے جن کا رخ مراری راؤ کے لشکر کی طرف تھا۔

"راجہ بہادر بھاگیے۔ بھاگیے، حیدر علی نے حملہ کر دیا ہے۔ اپنی جان بچایئے!" سردار یہ کہتا ہوا اپنے خیموں کی طرف بھاگ پڑا۔

راجہ مراری راؤ کا سر چکرا گیا۔ اسے آنے والے گھوڑے اپنے سر پہ دوڑتے معلوم ہوئے۔ راجہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ چلّایا:

"ہوشیار۔ ہوشیار۔ حملہ ہو گیا۔ ہمیں دھوکا دیا حیدر علی نے!"

راجہ واپس بھاگتا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا۔ لشکر کے پہرے داروں نے بھی آنے والے سواروں کو دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے گھوڑے دوڑا کر پورے لشکر میں "حملہ" کی خبر پہنچا دی اور راجہ کے لشکری جلد جلد تیار ہو کے میدان کی طرف دوڑ پڑے۔

مورچوں میں بیٹھے ہوئے توپچیوں کو ان کے افسروں نے فائر کھولنے کا حکم دے دیا تھا اور انہوں نے اندھا دھند گولہ باری شروع کر دی تھی۔

لیکن ــــ

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

توپچیوں نے پہلی بار ہی گولوں کی باڑ ماری تھی کہ حیدر علی خاں کے تیز رفتار سوار دشمن کی سوار اور پیدل فوج کے سر پہ پہنچ گئے۔ گولہ باری بیکار تھی۔ توپیں خاموش ہو گئیں اور دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔

راجہ مراری راؤ کے لشکر میں نہ تو صف بندی ہو سکی تھی اور نہ کوئی ترتیب تھی۔ بس جو سپاہی اور جو پیادہ جہاں تھا وہیں پہ دفاعی جنگ کر رہا تھا۔

راجہ کے وہ لشکری جو دوسرے کاموں میں لگے تھے وہ ہتھیار بھی نہ اٹھا پائے تھے کہ حیدر علی خاں کے سواروں کے ہاتھوں مارے گئے۔

ندی کا میدان جنگ پیچھے رہ گیا تھا اور راجہ مراری راؤ کے لشکر گاہ کے اندر اب جنگ ہو رہی تھی۔ راجہ کے لشکری بدحواس تھے اور اسی بدحواسی میں لڑ لڑ کر قتل ہو رہے تھے۔

راجہ اور اس کے سردار اپنے لشکریوں کو نہ تو لڑا سکے اور نہ ان میں کوئی ترتیب اور جرأت پیدا کر سکے۔ انہیں اپنی فکر پڑ گئی تھی۔

راجہ کے گرد اس کے سرداروں نے حلقہ سا بنا لیا تھا مگر اس حلقہ پہ حیدر علی خاں کے سواروں کا دباؤ

بڑھ گیا تھا۔

"راجہ بہادر۔ آپ میدان سے نکل جائیے"۔ ایک سردار نے مشورہ دیا۔

راجہ مراری راؤ کو تو اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ اگر سردار اسے مشورہ نہ بھی دیتا تو وہ خود ہی میدان چھوڑ بھاگنے کی فکر میں تھا۔

سردار کی آواز سنتے ہی راجہ نے اپنا گھوڑا موڑا اور ایڑ دے کر پلک جھپکتے میں میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔

راجہ کے جانے کے بعد سرداروں نے بھی پیٹھ دکھائی اور میدان چھوڑ بھاگے پھر لشکری کیوں کھڑے رہتے۔ وہ بھی بھاگ اٹھے۔

حیدر علی خاں خود ان حملہ آوروں کے دستوں میں شامل تھا اس نے اپنی حکمتِ عملی سے راجہ مراری راؤ سے جنگ ہونے سے پہلے ہی جنگ جیت لی تھی۔

راجہ تین توپیں اور دوسرا بہت سا سامانِ جنگ چھوڑ بھاگا تھا۔ اس کے سو سے زیادہ آدمی اس یلغار میں مارے گئے تھے۔

میدان سے سامان اکٹھا کرنے کے بعد حیدر علی خاں نے لشکر کو ایک دن اور ایک رات آرام کرنے کا حکم دیا اور جاسوسوں کو آگے روانہ کیا کہ وہ پتہ لگائیں کہ راجہ مراری راؤ اپنی ریاست پنگنڈہ پہنچ گیا ہے یا نہیں اور اب اس کے کیا ارادے ہیں؟

دوسرے دن صبح کو جاسوسوں نے واپس آ کر اطلاع دی کہ راجہ مراری راؤ اپنے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ گوری بنڈہ میں ٹھہرا ہوا ہے اور اس کے لشکری خود کو حالتِ جنگ میں رکھے ہوئے ہیں۔ راجہ کو اپنے تعاقب کا خطرہ ہے اس لیے اس نے پنگنڈہ سے تازہ دم فوج بھی منگوائی ہے۔

حیدر علی خاں ۳۶ گھنٹے اپنے لشکر کو آرام دینے کے بعد گوری بنڈہ کی طرف روانہ ہوا تاکہ راجہ مراری راؤ پر یہ واضح کر دے کہ حیدر علی کی یلغار کو اگر روکنا ہے تو اس سے میدان میں مقابلہ کے بجائے اپنے اپنے قلعوں میں چھپ کے مدافعتی جنگ کریں اور اپنی سلامتی کی دعا مانگیں۔

نندی کے میدان میں جھڑپ کے چوتھے دن حیدر علی خاں اور راجہ مراری راؤ کا گوری بنڈہ کے مقام پر ایک زبردست معرکہ ہوا۔ نندی کی جھڑپ کے سلسلے میں راجہ کو یہ شکوہ تھا کہ اس کا لشکر دھوکے میں شکست

کھا گیا کیونکہ اسے تیاری کا موقع ہی نہ مل سکا اور نہ وہ صف بندی کر سکا۔

اس چار دن کے وقفے کے دوران راجہ مراری راؤ نے پنگنڈہ سے تازہ دم فوج اور پانچ توپیں بھی منگا لی تھیں۔ اس کا شکست خوردہ لشکر بھی زخمی شیر کی طرح اپنے زخم چاٹ رہا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ گوری بنڈہ میں پچھلی شکست کا پورا پورا انتقام لے گا۔

حیدر علی خاں کو جاسوسوں نے اطلاع دے دی تھی کہ راجہ مراری راؤ نہ صرف پہلے سے زیادہ لشکر میدان میں لایا ہے بلکہ اب وہ ہمہ وقت جنگ کے لیے تیار ہے اس لیے نہ اس پہ اچانک حملہ ہو سکتا ہے اور نہ شب خون مارا جا سکتا ہے۔

شب خون اور اچانک حملہ اگرچہ حیدر علی کی جنگی حکمتِ عملی کے دو بڑے ہتھیار تھے مگر اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ صرف انہی دو طریقوں سے جنگ کر سکتا تھا۔ کھلے میدان میں جھپٹ پلٹ کے حملہ کرنا بھی اس کی ایک زبردست حکمتِ عملی تھی اور اسی حکمتِ عملی پر اس نے گوری بنڈہ کے میدان میں عمل کیا۔

گوری بنڈہ کے میدان میں بالکل روایتی انداز میں جنگ شروع ہوئی۔ دونوں طرف کے لشکر آمنے سامنے تھے۔ حیدر علی کے پاس تین چھوٹی توپیں تھیں جو اسے نندی کے میدان میں حاصل ہوئی تھیں۔ راجہ مراری راؤ کے پاس پانچ توپیں تھیں۔

دونوں طرف کے لشکروں میں صف بندی ہوئی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے دونوں طرف سے آغازِ جنگ کے بگل بجے اور توپوں نے دھاڑنا شروع کر دیا مگر یہ چھوٹی توپیں تھیں اور ان کی مار دُور تک نہیں تھی۔ گولے مخالف لشکر کے سامنے گر گر کر بیکار ہو رہے تھے۔

نصف گھنٹے تک گولے برستے رہے اور میدان میں دھول اٹھتی رہی۔ پھر حیدر علی خاں کے اشارے پر اس کے لشکر کا دایاں اور بایاں بازو متحرک ہوا مگر بجائے آگے بڑھنے کے یہ دونوں بازو اپنے دائیں بائیں چلنے لگے جیسے وہ میدان سے ہٹ رہے ہوں۔

کچھ دُور جانے کے بعد دونوں بازو نیم دائرہ بنا کر دشمن پر لپکے۔ حیدر علی دراصل دشمن کی توپوں سے اپنے لشکر کو بچانا چاہتا تھا۔ جب اس کے دونوں بازو توپوں کی پہنچ سے دور نکل گئے تو انہوں نے چکر کاٹ کر راجہ مراری راؤ کے دائیں اور بائیں بازو پر حملہ کر دیا۔

دونوں طرف کے قلبی لشکر میدان میں بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ توپیں بھی خاموش تھیں مگر راجہ کی فوج کے دائیں بائیں حصوں میں شدید جنگ شروع ہو گئی تھی اور دونوں لشکر ایک دوسرے پہ

غالب آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

حیدر علی قلبِ فوج میں موجود تھا۔ اس نے توپچیوں کو پھر سے گولے برسانے کا حکم دیا۔ جواب میں دوسری طرف سے بھی گولے چلنے لگے اور میدان میں اس قدر گرد اڑی کہ آگے کچھ بھی نہ نظر آتا تھا۔ اس وقت حیدر علی نے گولہ باری رکوا کر قلب کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

حیدر علی اپنے قلبِ لشکر کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھا اور دم کے دم میں دشمن کے سر پہ پہنچ گیا۔ دشمن کو میدان میں اڑتی ہوئی گرد کی وجہ سے حیدر علی کے آنے کی خبر اس وقت ہوئی جب وہ گرد کی چادر چاک کر کے اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اس وقت گولہ باری بیکار تھی اس لیے راجہ کے قلب کے سواروں نے آگے بڑھ کر حیدر علی کو روکنے کی کوشش کی مگر طوفان بھی کہیں کسی کے روکے سے رکا ہے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ مراری راؤ کے لشکر میں ابتری پیدا ہوئی اور فوج گھبرا کر بھاگنے لگی۔ راجہ کو بھی اپنی جان بچانے کے لیے میدان سے بھاگنے ہی میں بہتری دکھائی دی اور اس نے گھوڑا اکھا کر راسیں اٹھا دیں۔

دوسرا میدان بھی حیدر علی خاں کے ہاتھ رہا۔

اس مرتبہ اس نے راجہ کا تعاقب نہیں کیا بلکہ جاسوسوں کو اس کی خبر لانے کے لیے اس کے پیچھے لگا دیا۔

حیدر علی دو دن وہیں پڑاؤ ڈالے پڑا رہا۔ تیسرے دن جاسوسوں نے خبر دی کہ راجہ مراری راؤ پنگنڈہ پہنچ کر قلعہ بند ہو گیا ہے۔

حیدر علی خاں نے سوچا کہ چلو اچھا ہوا۔ وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ وہاں سے تو کہیں اور جا نہیں سکتا۔ یہ سوچ کے اس نے کوچ کا حکم دے دیا اور اس کا لشکر خیمے اکھاڑ کے تیار ہو گیا۔ اب حیدر علی کا رخ پنگنڈہ کی طرف تھا۔

پنگنڈہ میں راجہ مراری راؤ کا گھر بھی تھا اور وہی اس کا صدر مقام بھی تھا۔ حیدر علی نے وہاں پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

ایک ہفتہ تک تو خاموشی رہی۔ پھر قلعہ میں راشن پانی ختم ہونا شروع ہو گیا۔ لوگوں میں دنگا فساد

ہونے لگا۔ چوریاں بڑھ گئیں۔ چوریوں میں مال اسباب کوئی نہ چراتا بلکہ آٹا، دال اور چاول چوری ہوتے۔ بازار میں غلّہ کی دکانوں پر خاک اڑنے لگی۔ راجہ کے محل پہ صبح سے شام تک فریادیوں کا مجمع لگا رہتا۔

راجہ نے سرکاری گوداموں سے لوگوں کو غلّہ دیا مگر کہاں تک؟ آخر کئی گودام خالی ہو گئے مگر لوگ مرتے رہے۔

راجہ کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں لوگ محل پر حملہ کر کے اسے ختم نہ کر دیں۔ آخر ایک ماہ کے سخت محاصرے کے بعد راجہ، قلعہ کا دروازہ کھلوا کر خود حیدر علی کے پاس آ گیا۔ وہ زار زار رو رہا تھا۔ حیدر علی خاں نے اسے تسلی دی۔

"خان صاحب۔ آپ میری فکر نہ کیجیے۔ عوام بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان کے لیے قلعہ کے اندر غلہ بھجوا دیجیے۔"

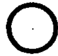
راجہ، حیدر علی خاں کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔

حیدر علی نے محاصرہ اٹھا لیا۔ قلعہ کے تمام دروازے کھول دیئے گئے۔ عوام "حیدر علی زندہ باد" کے نعرے لگاتے قلعہ سے باہر نکلے اور باہر سے سامانِ خورد و نوش حاصل کیا۔

بغیر لڑے بھڑے قلعہ نواب حیدر علی خاں کے حوالے ہو گیا۔ راجہ نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ حیدر علی نے اس کی ریاست بحال رکھی۔

حیدر علی خاں نے ایک مختصر سی فوج علی رضا خاں کی سرکردگی میں نندی کی طرف روانہ کر دی۔ علی رضا نے قلعہ نندی کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ نندی کچھ روز قلعہ بند رہا۔ پھر خود ہی حاضر ہو گیا۔ علی رضا نے راجہ اور چند بڑے سرداروں کو گرفتار کر کے بنگلور بھیج دیا اور حیدر علی خاں کے حکم سے بدر الزماں کو، جو نائطوں کا ایک سردار تھا، نندی کا قلعہ دار مقرر کر دیا۔



حیدر علی خاں لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر بیٹھک میں چلے گئے۔

بالاپور اور پنگنڈہ کی فتح کے بعد سے ان کی بیٹھک ہر وقت آنے جانے والوں سے بھری رہتی تھی۔ جب تک وہ سرنگاپٹم میں راجہ میسور کی ملازمت میں تھے ان کے دماغ پر اتنا بوجھ نہ تھا مگر

اب وہ سرا کے گورنر کی حیثیت سے سرنگاپٹم سے سرا منتقل ہو گئے تھے اور پورے صوبے کا در دِ سر ان کے سپرد تھا۔ روز ایک نیا جھگڑا کھڑا ہوتا اور روز ایک نیا مقدمہ پیش ہوتا تھا۔

ایک دن حیدر علی خاں صبح کے وقت جب سرا کے دربار میں پہنچے تو ناظم دربار نے انہیں بتایا:

"عالی مقام گورنر بہادر۔ ریاست بدنور کا ایک خوبصورت جوان آپ کے پاس فریاد لے کر آیا ہے اور فوراً پیش ہونا چاہتا ہے"

بدنور کے نام پر حیدر علی خاں کے کان کھڑے ہوئے۔

یہ دولت مند ریاست میسور کے شمال میں صوبہ بمبئی کی حدود میں تھی۔ ریاست کی خوبصورتی اور دولت مندی اس علاقہ میں زبان زدِ خاص و عام تھی۔

حیدر علی خاں نے فوراً اس جوان کو طلب کیا۔

چند لمحوں کے بعد ناظم دربار اس جوان کو لیے ہوئے اندر آیا۔ جوان نے سر جھکا کر نہایت ادب سے حیدر علی کو سلام کیا۔ حیدر علی کی نظریں اس پر ٹِک کے رہ گئیں۔

اس نے نرم لہجے میں دریافت کیا:

"جوان۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہارا تعلق ریاست بدنور سے ہے؟"

"جی ہاں سردار۔ میں اسی ریاست بدنور کا ایک بدنصیب انسان ہوں جس کی دولت مندی کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔" خوبصورت جوان نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

حیدر علی نے وضاحت کی:

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم ریاست بدنور کے رہائشی ہو تو پھر تم ہمارے پاس فریاد لے کر کیوں آئے ہو؟ ریاست بدنور ہماری ماتحت نہیں کہ ہم اس پر کوئی زور ڈال سکیں۔ ہاں اگر ہمارے صوبے اور علاقے کے کسی شخص نے تم پر کوئی ظلم کیا ہے تو اسے ہم فوراً سزا دینے پر آمادہ ہیں۔"

"محترم سردار ـــــ"

جوان نے بھی وضاحت کی:

"آپ ایک رحمدل اور انصاف پرور سردار ہیں اور ایک انصاف پسند انسان کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کسی کے ساتھ بے انصافی کی جائے، خواہ اس کا تعلق اس کے علاقے سے ہو یا غیر علاقے سے۔

میں آپ کے پاس یہ امید لے کے آیا ہوں کہ آپ مجھے ریاست بدنور سے انصاف دلائیں۔ میرے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کا بدلہ لیں اور قاتلوں کو سولی پر چڑھائیں۔"

"جوان۔ تمہاری باتیں الجھی الجھی ہیں"۔

حیدر علی خود بھی اس کی باتوں سے الجھن میں پڑ گئے۔ اپنی الجھن دور کرنے کے لیے انہوں نے بات بڑھاتے ہوئے مزید کہا:

"ایک طرف تم ظلم کرنے والے سے بدلہ لینے کے خواہش مند ہو۔ دوسری طرف تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے قاتلوں کو سولی پر چڑھایا جائے جبکہ تم اس وقت زندہ ہو اور تمہیں کسی نے قتل نہیں کیا"۔

"محترم سردار۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ مجھے قتل کر دیا گیا تھا اور یہ محض ایک اتفاق ہے کہ میں اس وقت آپ کے سامنے زندہ موجود ہوں"۔

جوان کی گفتگو میں اب بھی الجھاؤ تھا۔

حیدر علی خاں نے الجھتے ہوئے کہا:

"جوان۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص مصیبت یا صدمے نے تم پر گہرا اثر کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم تسلی اور اطمینان سے اپنے حالات بیان کرو تاکہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں اور ممکن ہو تو تمہاری مدد کر سکوں!"

"سردار بہادر۔ میرا نام عابدی ہے"۔

جوان نے پُرسکون لہجے میں کہنا شروع کیا

"بدنور کی رانی کی شادی کو جب بارہ سال گزر گئے اور ان کے کوئی بچہ نہ ہوا تو راجہ کو بہت فکر ہوئی۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں ریاست ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے انہوں نے مجھے متبنیٰ کیا۔ میری عمر اس وقت آٹھ سال تھی۔

متبنیٰ کے انتخاب کے لیے راجہ نے پوری ریاست میں اعلان کرایا کہ جن لوگوں کے بچے آٹھ اور دس سال کی عمر کے درمیان ہوں وہ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر فلاں تاریخ کو راج محل کے میدان میں جمع ہوں۔

سردارِ محترم۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے کیونکہ اسی دن میں ایک کسان کے بیٹے سے ریاست بدنور کا راجکمار اور ولی عہد بن گیا تھا۔

ریاست کے دوسرے لڑکوں کی طرح میرا باپ بھی مجھے پہنا اڑھا کے میدان میں لایا اور دو رُور تک لگی کتنی قطاروں میں ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ میں اس دن بہت خوش تھا اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں ہی بدنور کا راجکمار بنوں گا۔

کچھ دیر بعد بدنور کے راجہ اور رانی اپنے منتریوں کے ساتھ وہاں آئے اور قطاروں میں گھومتے گھومتے میرے پاس پہنچے۔

بدنور کے راجہ کے سر پر ریشم کی پگڑی بندھی تھی اور آگے کی طرف اس میں ایک بڑا سا ہیرا دمک رہا تھا۔

مجھے راجہ کی پگڑی ایسی اچھی معلوم ہوئی کہ دل چاہا میں راجہ سے وہ پگڑی مانگ لوں مگر ڈر کے مارے میرے منہ سے آواز نہ نکلی اور میں بس ٹکٹکی باندھے راجہ کی پگڑی کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ راجہ میرے سامنے آ کر رک گئے۔

میرے باپ نے مجھے حکم دیا کہ ہاتھ جوڑ کر راجہ کو پرنام کروں مگر میں پگڑی کا ہیرا دیکھنے میں ایسا مگن تھا کہ باپ کی آواز مجھے سنائی نہ دی۔

میرا باپ شاید میری اس حرکت پر ناراض ہوا۔ اس نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا مگر راجہ نے اسے منع کیا اور مجھ سے پوچھا:

"اے لڑکے تو کیا دیکھ رہا ہے؟"

میرے منہ سے فوراً نکلا:

"راجہ بہادر۔ مجھے آپ کی پگڑی بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

انہوں نے کہا:

"کیا پگڑی لینا چاہتے ہو؟"

میرے منہ سے اک دم "ہاں" نکلا۔

میری ہاں پر راجہ مسکرائے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے اعلان کیا کہ میں نے اس بچے کو اپنا متبنیٰ چن لیا ہے۔ میرا باپ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ وہ بار بار میرا منہ چومتا تھا۔

چناؤ کے بعد میں راجہ رانی کے ساتھ راج محل میں آ گیا۔ میرے دن پھر گئے اور میں واقعی راجکمار بنا دیا گیا۔ میرے کہنے پر راجہ نے میرے باپ کو دولت سے مالا مال کر دیا۔ پھر راج محل ہی میں میری پرورش ہوئی۔ میں وہیں جوان ہوا مگر جوانی آتے ہی میری قسمت بدل گئی۔

راجہ بہادر جنہیں میں اپنے باپ سے زیادہ چاہتا تھا، ایک صبح کو اک دم محل میں اعلان ہوا کہ وہ سوتے میں مر گئے ہیں۔ مجھ پر تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں ان کی لاش کے ساتھ لپٹ کر خوب خوب رویا۔

راجہ بہادر کی لاش کو راج محل کے میدان میں لوگوں کے سامنے جلا دیا گیا اور ان کی راکھ دریا میں بہا دی گئی۔

میں دن بھر محل میں اداس اداس گھومتا رہتا تھا۔ اسی دوران محل کی کنیزوں اور غلاموں کی سرگوشیوں سے مجھے معلوم ہوا کہ راجہ بہادر خود نہیں مرے بلکہ انہیں زہر دے کر مارا گیا ہے۔ یہ قتل رانی اور اس کے ایک برہمن وزیر نے مل کر کیا ہے۔

راجہ کے مرتے ہی برہمن منتری کا راج محل میں بے دھڑک آنا جانا شروع ہو گیا اور جلد ہی مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ ان دونوں کے ناجائز تعلقات ہیں۔

مجھے یہ بات بہت بری معلوم ہوئی۔ میں نے رانی ماں کو بند بند الفاظ میں کئی بار اس کام سے منع کیا مگر وہ میری کب سنتیں۔ ان پر تو بدکاری کا بھوت سوار تھا۔

پھر یہ بات راج محل سے نکل کر عام لوگوں تک پہنچ گئی اور لوگوں نے مطالبہ کیا کہ متبنیٰ یعنی مجھے راجہ بنایا جائے۔ رانی اور وزیر اس سے بہت پریشان ہوئے اور ایک رات انہوں نے چند آدمی میرے پاس بھیجے جنہوں نے میرا گلا دبا کر مجھے مار ڈالا"۔

"تمہیں مار ڈالا — ؟" حیدر علی نے حیرت سے پوچھا:

"تو پھر تم زندہ کیسے ہو گئے؟"

عابدی نے جواب دیا:

اے میرے رحمدل سردار۔ میرے زندہ ہونے کی کہانی اس طرح ہے کہ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کوٹھڑی میں پایا۔ کوٹھڑی میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ جوگی مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے محبت کے مارے مجھے سینے سے لگا لیا۔

میں سخت پریشان تھا کہ میں کہاں ہوں اور یہ جوگی کون ہے؟ پھر آہستہ آہستہ مجھے اپنے سابقہ حالات یاد آئے اور میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ میں نے جوگی سے پوچھا:

"بابا۔ مجھے تو کچھ لوگوں نے گلا دبا کر مار ڈالا تھا مگر اب میں زندہ ہو گیا ہوں۔ یہ سب کیسے ہوا؟"

اس نیک اور انسان دوست جوگی نے بتایا :

"رانی اور اس کے آشنا وزیر نے تمہیں گلا گھونٹ کے مروا دیا تھا۔ ان کے آدمی تمہیں مندر کے احاطے میں دفن کر گئے تھے۔ جب وہ واپس گئے تو ہم نے مٹی ہٹا کر گڑھے میں سے تمہیں نکالا۔ تم زندہ تھے اور تمہاری سانس چل رہی تھی۔ میں تمہیں یہاں لے آیا اور تمہارا علاج کیا۔ اب تم اچھے ہو گئے ہو۔"

پھر اس جوگی نے مجھے رائے دی کہ :

"اس ریاست سے فوراً نکل جاؤ اور کسی اور جگہ جا کر اپنی زندگی گزارو۔"

میں آپ کی رحمدلی اور انسان دوستی کا چرچا سن کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ میری داد رسی کیجیے۔ میرا حق مجھے دلوائیے اور ظالموں اور قاتلوں کو مناسب سزا دیجیے۔"

حیدر علی نے عابدی کے حالات سن کر اسے تسلی دی اور کہا :

"میں انسانیت کے نام پر تمہاری مدد کروں گا۔"

پھر انہوں نے عابدی سے بدنور کے قلعہ تک جانے کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ بدنور کا خوبصورت شہر اپنے باغات اور میٹھے پانی کی نہروں سے آراستہ ہے مگر اس میں داخلے کا صرف ایک تنگ راستہ ہے۔ عابدی نے حیدر علی کے لشکر کی رہنمائی کرنے کی پیشکش کی۔

حیدر علی خاں اس خوبصورت جوان کی رہبری میں بدنور روانہ ہوئے۔ راستہ واقعی بہت تنگ اور خطرناک تھا اور بغیر کسی رہبر کے راجہ کے محل تک پہنچنا ناممکن تھا۔

عابدی ہر راستے سے واقف تھا۔ لشکر کو کوئی دقت پیش نہ آئی۔ تنگ راستہ پار کر کے یہ لوگ بدنور کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وہاں کے لوگ عابدی کو پہچانتے تھے۔ جو بھی اُسے دیکھتا یا سنتا اس کے سلام کو دوڑا چلا آتا۔

حیدر علی خاں کو وہاں کے لوگوں کے رویے سے معلوم ہو گیا کہ وہ رانی کے خلاف ہیں اور اس کی بدکاری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اسی لیے انہوں نے حیدر علی کے لشکر کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔

راجہ کے قلعہ تک پہنچنے کے دوران حیدر علی کا لشکر آٹھ چھوٹے بڑے قلعوں کے سامنے سے گزرا جو شاہی قلعے کی حفاظت کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ وہاں ریاست کی فوج بھی موجود تھی لیکن عابدی کو دیکھ کر کسی نے لشکر کو روکنے کی کوشش نہ کی۔

حیدر علی خاں کا لشکر تنگ راستوں سے گزر کر سطح مرتفع پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں خوبصورت باغات اور نہریں تھیں۔ اشجار پھلوں سے لدے ہوئے اور کیاریاں پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔

راجہ کے قلعہ کے سامنے حیدر علی کا لشکر ٹھہرا اور انھوں نے ایک آدمی کے ذریعے رانی کو یہ پیغام بھیجا:

"قلعہ کے سامنے حیدر علی خاں گورنر سرا کا لشکر موجود ہے۔ رانی بدنور کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ قلعہ سے نکل کر گورنر کے خیمے میں آئیں اور ان پر ریاست کے متبنیٰ عابدی نے جو الزامات عاید کیے ہیں۔ ان کی صفائی پیش کریں۔

صرف دو گھنٹے جواب کا انتظار کیا جائے گا اس کے بعد قلعے پر حملہ کر دیا جائے گا۔"

رانی بدنور کا ضمیر گنہ گار اور ذہن مجرم تھا۔ اس نے حیدر علی خاں کے سامنے آنے سے گریز کیا اور قلعہ میں موجود فوج کو حکم دیا کہ باہر سے حملہ کا مقابلہ کیا جائے۔

رانی بذاتِ خود تو یہ چاہتی تھی کہ حیدر علی خاں کے پاس جا کر اپنے کرتوتوں کی معافی مانگ لے لیکن اس کے آشنا برہمن وزیر نے اس پر مقابلہ کرنے کے لیے زور دیا۔

حیدر علی کو دو گھنٹے تک جواب موصول نہ ہوا تو انھوں نے حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ قلعہ کے اندر اندازے سے کہیں زیادہ فوج موجود تھی۔ حیدر علی کے لشکر نے یلغار کی تو قلعہ کی فصیل سے پتھر لڑھکائے گئے۔ باہر ڈھلوان ہونے کی وجہ سے لڑھکتے پتھروں نے حملہ آور فوج کے قدم چند لمحوں کے لیے روک دیے مگر ذرا دیر بعد پھر کوشش کی گئی لیکن پتھروں کی بارش کی وجہ سے فصیل تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔

کچھ لشکری فصیل تک پہنچ گئے مگر ان پر اوپر سے توڑے دار بندوقوں سے گولیاں برسائی گئیں۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے تمام دن جنگ ہوتی رہی۔ جب شام کا دھندلکا ہوا تو عابدی، حیدر علی

کو ایک ایسے راستے سے قلعہ کی طرف لے گیا جو گھوم کر فصیل تک جاتا تھا۔ وہاں فصیل کی اونچائی بھی خاصی کم تھی۔

حیدر علی خاں نے وہاں سے واپس آ کر ڈیڑھ سو جوانوں کو منتخب کیا اور انہیں ساتھ لے کر عابدی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے۔

لشکریوں نے فوراً فصیل پر کمندیں پھینکیں اور اوپر چڑھ گئے۔ حیدر علی خاں ایک ہاتھ میں ننگی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں سلطنتِ مغلیہ کا پرچم لیے آگے آگے تھے۔

قلعہ والوں نے فصیل پر چراغ جلا رکھے تھے۔ چراغوں کی روشنی میں جب انھوں نے سلطنتِ مغلیہ کا پرچم دیکھا تو اُن کے ہوش اڑ گئے۔ ریاست بدنور کے ایک سپاہی نے حیدر علی کو پہچان لیا۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہوا کہ:

"حیدر علی آ گیا۔ حیدر علی آ گیا"

کہتا ہوا بھاگ پڑا۔

اس کی دیکھا دیکھی فصیل کے دوسرے محافظوں نے بھی بھاگنا شروع کر دیا۔ حیدر علی خاں اپنے شمشیر برداروں کے ساتھ فصیل سے اترے اور قلعہ کے صدر دروازے کے محافظوں پر حملہ کر دیا اور انہیں مار بھگایا۔ قلعہ کا صدر دروازہ کھول دیا گیا اور حیدر علی خاں کا لشکر فاتحانہ اندر داخل ہوا۔

حیدر علی خاں نے وہیں کچہری لگا دی اور حکم دیا کہ ریاست کی رانی اور اس کے برہمن وزیر کو حاضر کیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد قلعہ کے لشکری خود ہی رانی اور وزیر کو پکڑ کے لے آئے۔ اس وقت عابدی حیدر علی کے پاس بیٹھا تھا۔ رانی اور وزیر نے اسے دیکھا تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔

"عابدی بھوت ہو گیا ہے"۔ رانی چیخنے لگی۔

"عابدی نرک (جہنم) سے واپس آ گیا ہے"۔ وزیر چلّایا۔

حیدر علی نے غصے سے کہا:

"عابدی نہ بھوت بنا ہے اور نہ جہنم سے لوٹا ہے۔ تم دونوں نے اسے قتل کیا تھا مگر یہ بھول گئے تھے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ عابدی ریاست بدنور کا متبنّیٰ اور اصل راجہ ہے۔ یہ حق اسے دیا جاتا ہے"۔

اس کے بعد حیدر علی وزیر سے مخاطب ہوئے:

"او شیطان۔ درندے! تجھے ریاست کے وارث کو قتل کرتے ذرا بھی رحم نہ آیا"۔

وزیر "رحم۔ رحم" چلّانے لگا۔

"تجھ پر رحم کرنا، رحم کی توہین ہے"۔

حیدر علی خاں گرجے:

"خون کا بدلہ خون ہے۔ اسے لے جاؤ اور قتل کر دو"۔

حیدر علی خاں کے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر وزیر کی گردن پکڑی اور گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے گیا۔

ریاست کی رانی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ حیدر علی نے اسے مڑ کر دیکھا تو رانی ان کے پیروں پر گر پڑی:

"مجھ سے غلطی ہو گئی حیدر علی خاں۔ مجھے شما (معاف) کر دو"۔ رانی نے بھرائی ہوئی آواز میں ان سے التجا کی۔

حیدر علی خاں نے عابدی کی طرف دیکھا:

"تم کیا کہتے ہو عابدی؟"

عابدی کو رانی پر رحم آ گیا۔ اس نے کہا:

"گورنر بہادر۔ میں نے رانی کو ہمیشہ رانی ماں کہا ہے۔ اگر آپ انہیں معاف فرمائیں تو یہ مجھ پر احسان ہو گا"۔

"تم کیا کہتی ہو رانی؟"

"یہ میرا بیٹا ہے گورنر بہادر"۔ رانی جلدی سے بولی:

"اگر آپ مجھے معاف فرما دیں تو میں اسے سینے سے لگاؤں گی اور اس کے سر پر ریاست بدنور کا تاج سجاؤں گی"۔

"رانی۔ تم عابدی کی مجرم ہو۔ اس نے تمہیں معاف کر دیا تو میں بھی معاف کرتا ہوں"۔ حیدر علی نے فراخدلی کا ثبوت دیا:

"مگر اسے اس کا حق ملنا چاہیے"۔

"میں آپ کی شکر گزار ہوں حیدر علی خاں"۔ رانی نے کہا اور احساسِ ندامت سے اپنی گردن جھکا دی۔

اگلی صبح عابدی کی تاجپوشی ہوئی۔

رانی نے بڑے پیار سے اسے دلہا بنایا۔ تاجپوشی کے بعد معززین اور عوام نے راجہ عابدی کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ نقد رقم اور بیش قیمت تحائف۔

حیدر علی خاں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کئی لاکھ کی نقد رقم تھی اور لاکھوں کے نذرانے۔ انہوں نے سوچا کہ لوگوں نے بدنور کی دولت مندی کے بارے میں سچ ہی کہا ہے۔ اتنی دولت تو بڑے بڑے رجواڑوں میں نہ ہوگی۔

راجہ عابدی نے کھڑے ہو کر اعلان کیا:

"حیدر علی خاں نے ہمیں بدکردار اور نمک حرام وزیر سے مجھے اور بدنور کے باسیوں کو نجات دلائی ہے۔ وہ گورنر سرا ہونے کے باوجود ہمارے مفاد کے لیے لشکر لے کر سرا سے یہاں آنے کی تکلیف اٹھائی۔ اس کے صلے میں میں حیدر علی خاں کی خدمت میں منگلور کی بندرگاہ مع اس کے متعلقہ مضافات کے پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ وہ میری اس ناچیز پیش کش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائیں گے۔"

حیدر علی خاں نے وہاں مزید ایک روز اور قیام کیا۔ پھر منگلور کا قبضہ لینے کے لیے آگے بڑھے۔ چونکہ واپسی کا راستہ بدنور ہی سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے انہوں نے عابدی سے کہا:

"راجہ عابدی۔ اس وقت تو میں منگلور جا رہا ہوں اس لیے تمہاری خوبصورت ریاست کی سیر نہیں کر سکتا لیکن واپسی پر دو چار دن تمہارے پاس ٹھہروں گا۔ پھر ریاست کی سیر ہوگی۔"

راجہ عابدی خوش ہو گیا۔ حیدر علی خاں نے اسے خدمت کا موقع دیا تھا۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ جب حیدر علی منگلور سے واپس آئیں تو ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔

اعلان ہوتے ہی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بدنور کے عوام بھی حیدر علی کے احسان مند تھے۔ برہمن وزیر نے پوری ریاست کو الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ اگر حیدر علی، عابدی کو واپس لا کر راجہ نہ بناتے تو پتہ نہیں وزیر اور کیا گل کھلاتا۔ اچھا ہوا کہ وزیر، حیدر علی کے حکم سے مارا گیا۔

حیدر علی خاں کے بدنور سے نکلتے ہی رانی ماں نے پھر سازش کا جال بچھایا۔ اس مرتبہ اس نے کسی اور کے بجائے بدنور کے نئے راجہ عابدی کو اپنے جال میں پھانسا۔ وہ راجہ کے پاس گئی

اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا:

"پیارے بیٹے راجہ عابدی۔ مجھ سے ایسی غلطی ہوئی تھی جسے تم شاید عمر بھر معاف نہ کر سکو۔"

"نہیں نہیں راج ماتا۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

راجہ عابدی نے جلدی سے کہا:

"جو ہو چکا ہے اس پر خاک ڈالیے۔ میں نے آپ کو دل سے معاف کر دیا ہے۔ آپ میری طرف سے بالکل اطمینان رکھیے۔"

"راجہ بیٹے۔ تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔"

راج ماتا نے سرد آہ کھینچی:

"مجھے اس کمینے دیوان (وزیر) نے ایسا بھڑکایا کہ میں اپنے بیٹے کے خلاف ہو گئی۔ ہائے میری آنکھوں پر بالکل پردہ پڑ گیا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ حیدر علی کب واپس آ رہے ہیں؟"

"یہ تو انہوں نے نہیں بتایا تھا۔" راجہ عابدی نے کہا:

"مگر جب بھی آئیں گے۔ ادھر ہی سے گزریں گے۔ منگلور سے سرا جانے کا راستہ ہماری ریاست ہی سے گزرتا ہے۔"

"ہوں ـــ" رانی نے لمبی سی "ہوں" کہہ کر سانس لی اور خاموش ہو گئی۔ عابدی کچھ دیر اس کا منہ تکتا رہا۔ پھر پوچھا:

"راج ماتا۔ آپ کچھ پریشان معلوم ہوتی ہیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو۔ مجھے بتائیے۔"

"میرے بیٹے!" رانی نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری:

"تمہارے سوا میرا اور کون ہے۔ نہ مرد نہ بیٹا بیٹی۔"

پھر چند لمحے ٹھہر کر بولی:

"تم نے دیوان سے تو ریاست بچالی لیکن ـــ"

وہ پھر خاموش ہو گئی۔

راجہ عابدی گھبرا گیا:

"آپ کہتے کہتے رک کیوں گئیں۔ بتائیے نا کیا بات ہے؟"

"راجہ بیٹے! تم نے منگلور حیدر علی خاں کو دے دیا۔ یہ تو اچھا کیا۔ اسے بدنور سے دور دور ہی رکھنا اچھا ہے۔" رانی سانسوں کی سرسراہٹ میں کہہ رہی تھی ـــ "وہ اگر بدنور کی طرف سے واپس نہ

نہ جائے تو بہت اچھا ہو"۔

"کیوں کیوں راج ماتا۔ بات کیا ہے۔ آپ مجھے بتائیے نا!" حابدی کو اور زیادہ فکر ہو گئی۔

"راجہ بیٹے۔ چاہے تم یقین کرو یا نہ کرو مگر میں یہی چاہتی ہوں کہ ایک بار تمہارے ہاتھ میں ریاست کی باگ ڈور آگئی ہے اور اب نہ نکلنا چاہیے"۔

راج ماتا چبا چبا اور الفاظ کو دبا دبا کر بول رہی تھی:

"کیا کروں۔ میری زبان رکتی ہی نہیں۔ میرے آدمیوں نے بتایا ہے کہ حیدر علی خاں کے ارادے کچھ اچھے نظر نہیں آتے"۔

حابدی چونک پڑا:

"سچ سچ بتائیے راج ماتا۔ کیا ارادے ہیں حیدر علی خاں کے۔ آپ کے آدمیوں نے آپ کو کیا بتایا ہے؟"

"ہاں۔ میں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے"۔ راج ماتا نے بڑے عزم سے کہا:

"میرے آدمیوں نے حیدر علی خاں کو اپنے ساتھیوں سے کہتے سنا ہے کہ وہ واپسی پر بدنور پر قبضہ کر کے تمہیں معزول کر دے گا"۔

"نہیں نہیں راج ماتا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ انہوں نے خود مجھے راج گدی دلوائی ہے۔ وہ ایسا کیوں کریں گے"۔

حابدی بے چین سا ہو گیا۔

"تم بہت بھولے ہو راجہ بیٹے۔" رانی گھل کے بولنے لگی:

"کیا تم نہیں جانتے کہ یہ وہی حیدر علی ہے جس نے راجہ میسور کو معزول کر کے سرنگا پٹم پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس نے سرا کی صوبیداری بھی چالبازی سے حاصل کی ہے۔ نندی پر اس نے قبضہ کیا۔ بالاپور کو اس نے مٹایا۔ چگندہ کے راجہ مراری راؤ کو گرفتار کر کے قید کیا اور وہاں اپنا مسلمان گورنر مقرر کر دیا پھر بھلا وہ بدنور جیسی ریاست کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

تم یہ بھی جانتے ہو کہ منگلور کو راستہ بدنور سے ہو کر جاتا ہے۔ وہ اپنے راستے میں کسی ہندو کی ریاست کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اس نے تو میسور کے وزیر برادران کو بھی سرنگا پٹم سے نکال باہر کیا۔ حالانکہ وزیر نند راج کے اس پر ہزاروں احسان تھے۔ اسی کی کوششوں سے حیدر علی، نواب حیدر علی خاں بنا تھا"۔

راج ماتا نے ایسا زہر گھولا کہ حابدی کے کان اور آنکھیں بالکل بند ہو گئیں اور وہ پوری طرح اس کے قبضے میں آگیا۔

"راج ماتا۔ پھر تم ہی کچھ اس کا علاج کرو۔ مجھے اس زہریلے ناگ سے بچاؤ"۔

رانی آنکھوں میں آنسو بھر لائی — پھر رندھے گلے سے بولی:

"میرے راج بیٹے۔ کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔ میرے پاس تو بس ایک جان رہ گئی ہے۔ وہ میں تم پر نچھاور کر سکتی ہوں"۔

"پھر تم مجھے بتاؤ راج ماتا۔ میں کیا کروں۔ اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا پاؤں"۔ حابدی کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔

"بیٹے۔ میں تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ ریاست کے عقلمندوں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں سے مشورہ کرو۔ وہی کوئی راستہ بتا سکتے ہیں"۔ راج ماتا نے آخر اسے بہکا کے دم لیا اور راستہ بھی خود ہی بتایا۔

"مگر راج ماتا۔ میں افسروں سے حیدر علی کے خلاف کیسے کہہ سکتا ہوں"۔

حابدی گھبرا گیا:

"وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے خود ہی حیدر علی کو بلایا ہے۔ راج ماتا! میری ماں! تم ہی ان لوگوں سے بات کرو نا!"

یہی تو راج ماتا چاہتی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی:

"اچھا راج بیٹے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے!"

مذہب کے نام پر بڑے بڑے فتنے ابھارے گئے۔ سازشوں کے جال بُنے گئے اور خوب قتل و غارت ہوئی۔ خاص طور پر ہندو مسلم قوموں کے اختلاف نے تو تخت و تاج تک الٹ کے رکھ دیے ہیں۔

حیدر علی خاں کے معاملہ کو دیکھیے۔

ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور برصغیر میں اکثریت ہندو قوم کی تھی اس لیے

وہ مسلم اقلیت کی حکمرانی کسی طور برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھی۔

میسور میں پہلے گنگا رام نے بغاوت کی تو اس نے سب سے پہلے حیدر علی خاں پر یہ تہمت دھری کہ وہ متعصب ہیں اور ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میسور میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لیے وہاں کا سپہ سالار مسلمان کے بجائے ہندو ہونا چاہیے۔

اس بغاوت کا خاتمہ ہوا تو کھانڈے راؤ کھڑا ہو گیا۔

کھانڈے راؤ، حیدر علی خاں کا نائب تھا۔ حیدر علی نے خود اسے میسور کا وزیر بنایا تھا مگر اس نے نمک حرامی کی اور بغاوت پر اتر آیا۔ مگر حیدر علی حق پر تھے۔ فتح ان کی ہوئی اور کھانڈے راؤ اپنے انجام کو پہنچا۔

اب بدنور کا معاملہ درپیش تھا۔

بدنور کا متبنیٰ عابدی خود فوجی مدد حاصل کرنے حیدر علی خاں کے پاس آیا۔ حیدر علی خاں نے اس کی مدد کی اور اسے بدنور کا راجہ بنوا دیا — مگر جب بدکار رانی نے اس کے سامنے "مسلمان" کا لفظ رکھا تو وہ بہک گیا۔

اس نے یہ نہ سوچا کہ اگر حیدر علی خاں کو بدنور پر قبضہ کرنا ہی تھا تو اس نے عابدی کو راج گدی پر کیوں بٹھایا۔ بدنور اس نے بزورِ شمشیر حاصل کیا تھا۔ وہ بدنور پر قبضہ کر کے وہاں کی تمام دولت اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا!

حیدر علی کے اس سلوک، نیکی اور احسان کا بدلہ یہ دیا گیا کہ احسان فراموش عابدی ریاست کی بدکار رانی کی سازش میں شریک ہو گیا اور سازش بھی اس قدر خطرناک کہ حیدر علی خاں کی گورنری تو الگ رہی، خود اس کی زندگی کا تختہ ہی الٹ دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔

رانی نے مندروں کے بڑے بڑے پنڈتوں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے ایک زہر آلود تقریر کی۔ اس نے کہا:

"حیدر علی خاں نہ صرف ایک غیر ملک کا ہے بلکہ اس کا مذہب بھی ہم سے الگ ہے۔ وہ مسلمان ہے اور مسلمان جس ملک میں گھس جاتا ہے پھر وہاں سے نہیں نکلتا۔

حیدر علی کی پوری زندگی ہمارے سامنے ہے۔ سرنگاپٹم پر اس نے قبضہ کیا۔ ہزار سال کے حکمراں راجہ خاندان کو بے دخل کر کے ریاست میسور کا

پورا انتظام خود سنبھال لیا۔ پھر سرا کا صوبیدار بن بیٹھا۔ نندی، بالاپور اور پنگنڈہ کے راجاؤں کو قید کر کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ بدنور پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر اس نے ایک بار قبضہ کر لیا تو پھر وہ یہاں سے نہیں نکلے گا۔

اگر آپ سب لوگ ساتھ دیں تو اس بلا کو ٹالا جا سکتا ہے ورنہ پھر اس ہندو ریاست پر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔"

ہندو قومیت کے نام پر پنڈت بھڑک اٹھے۔ حیدر علی خاں کے بارے میں اگرچہ انہیں کچھ بھی خبر نہ تھی۔ برخلاف اس کے وہ رانی کے گھناؤنے کردار سے اچھی طرح واقف تھے۔ رانی اور اس کے دیوان کی عیاشیوں اور عشرت پسندیوں کے نظارے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے مگر وہ اوّل و آخر ہندو تھے۔ حیدر علی خاں نے انہیں ایک بدکار رانی اور زانی دیوان سے نجات دلائی تھی مگر اس وقت وہ اسی بدکار رانی کو ریاست کا سب سے بڑا بہی خواہ سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے نہ صرف رانی کی ہاں میں ہاں ملائی بلکہ اسے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

رانی کے بعد ریاست کے نئے راجہ عابدی نے تقریر کی۔ اس نے رانی کی باتوں کو سراہا اور لوگوں کو بتایا کہ وہ راج ماتا کے ساتھ ہے اور اس سلسلے میں وہ جو بھی قدم اٹھائیں گی وہ ان کے ساتھ ہوگا۔

پنڈتوں نے جب راجہ عابدی کو بھی رانی کے ساتھ دیکھا تو ان کے دلوں میں اگر کچھ شک و شبہ تھا تو وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب رانی نے پنڈتوں کی مدد سے سازش کی کڑیاں جوڑنا شروع کر دیں۔

سازش کا تانا بانا بنا گیا۔

ہر پہلو پر غور کیا گیا کیونکہ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ سازش کامیاب ہوتی تو راج ماتا کے پوبارہ اور اگر سازش پکڑی گئی تو کئی گردنیں تن سے جدا ہو جائیں گی۔

پھر جب سازش مکمل ہوئی تو اس میں ناکامی کا ایک فیصد بھی امکان نہ تھا۔ اس سلسلے میں بڑی راز داری برتی گئی تھی۔

سازشیوں کا ہر اجلاس کسی مندر میں ہوتا تھا جس میں راجہ بدنور، راج ماتا اور چھ پنڈت شریک ہوتے۔ کہا یہ جاتا کہ راجہ اور راج ماتا مندر میں پرارتھنا کرنے آتے ہیں جبکہ اس پرارتھنا کی آڑ میں اس منصوبے کی عملی صورتوں پر غور ہوتا تھا۔

آخر ایک دن سازشیوں کی محفل میں اعلان ہوا کہ تمام کام مکمل ہو گیا۔ بس اب حیدر علی خاں کے آنے کی دیر ہے۔ اس کے آتے ہی وہ کچھ حاصل ہو جائے گا جس کے لیے وہ لوگ اتنے دنوں سے جدوجہد کر رہے تھے۔ بس حیدر علی خاں کے منگلور سے واپس آنے کا شدت سے انتظار ہونے لگا۔

حیدر علی خاں ایک صاف دل سپاہی تھے۔ ان کے دل میں چھل کپٹ نہ تھی۔ راجہ چہابدی نے اسے منگلور کا بندرگاہ کا علاقہ اور اس کے متعلقہ مضافات اس کی گراں بہا خدمات کے صلہ میں دیے تھے۔ اس نئے علاقہ کے انتظام و انصرام کے لیے حیدر علی خاں معہ اپنے لشکر کے منگلور گئے۔ راجہ چہابدی کا فرمان ان کے پاس تھا اس لیے انہیں بندرگاہ کی طرف سے کسی مزاحمت کا خیال نہ تھا۔

ناظم بندرگاہ ایک لشکر کے بندرگاہ کی طرف آنے کی اطلاع سے بہت پریشان تھا۔ اس نے اپنے جاسوسوں سے معلومات حاصل کیں۔ اسے صرف یہ بتایا گیا کہ یہ لشکر سرا کے گورنر حیدر علی خان کا ہے۔ ان کے آنے کا مقصد بالکل معلوم نہ ہو سکا۔

بندرگاہ کا ناظم پریشان تھا کہ آخر حیدر علی خاں کو منگلور آنے کی کیا ضرورت پڑی۔ منگلور ریاست بدنور کے ماتحت تھا۔ ریاست چونکہ امیر تھی اس لیے منگلور میں ایک مختصر سی بحری فوج موجود تھی جو منگلور کی سول آبادی کی انتظامیہ کی بھی ذمے دار تھی مگر اس مختصر فوج اور حیدر علی خاں کے لشکر کا کیا مقابلہ تھا!

ناظم اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس کے ملازم نے اطلاع دی:

"نواب حیدر علی خاں گورنر صوبہ سرا کا ہرکارہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

ناظم خوش ہو گیا:

"اسے عزت سے اندر لے آؤ۔"

اس کی مشکل آسان ہو گئی تھی۔ حیدر علی خاں نے خود اپنا آدمی اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ اب اس کی تمام الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

ناظم کا ملازم دوبارہ اندر آیا تو اس کے ساتھ ایک فوجی سپاہی تھا جس کی کمر میں ایک طرف خنجر اور دوسری طرف تلوار لگی ہوئی تھی۔

ناظم نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ فوجی نے اسے فوجی انداز میں سلام کیا اور بغیر کچھ کہے ایک بند لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

ناظم نے لاپرواہی سے لفافہ لیا اور اسے چاک کر کے خط پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ خط پڑھتا جاتا تھا اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد وہ گھبرایا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ناظم کا ملازم اور حیدر علی کا سپاہی اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اسی وقت بندرگاہ کا گھنٹہ زور زور سے بجنے لگا۔ یہ گھنٹہ انتہائی ضرورت کے وقت بجایا جاتا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی ہر بری اور بحری افسر کا فرض ہوتا تھا کہ وہ جلد سے جلد ناظم بندرگاہ کے دفتر پر پہنچ جائے۔

گھنٹے کی آواز سن کے ملازم اور سپاہی بھی باہر آ گئے۔ ناظم اس وقت بھی سر جھکائے خط پڑھ رہا تھا اور بندرگاہ کے افسران ایک ایک دو دو کر کے تیز تیز قدموں سے دفتر کی طرف آ رہے تھے۔

ناظم نے خط پڑھنا بند کر دیا۔ تمام افسر آ چکے تھے اور ان کی نظریں ناظم پر جمی ہوئی تھیں۔ آخر اس نے سکوت توڑا:

"اے منگلور کے بری اور بحری افسران! آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہو گی کہ آپ کی بندرگاہ منگلور اور اس سے ملحقہ تمام مضافات اب ریاست بدنور سے نکل کر صوبہ سرا کے گورنر نواب حیدر علی خاں کے قبضۂ اقتدار میں آ گئے ہیں۔ ریاست بدنور کے نئے راجہ چہابدی نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے اس امر کی اطلاع ہمیں بھجوائی ہے۔

اس کے علاوہ آپ اور ہم سب کے لیے ایک اور خوشی کی بات یہ ہے کہ منگلور کے نئے حکمران یعنی نواب حیدر علی خان بہادر اپنے نئے علاقے کا دورہ کرنے آ چکے ہیں اور کوئی دم میں یہاں پہنچنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کے استقبال کے لیے تیار ہو جائیے میں انہیں لینے جا رہا ہوں۔"

ایک افسر نے چلا کر کہا:

"ہم اپنے نئے حکمران کو لینے کے لیے آپ کے ساتھ چلیں گے۔"

ناظم نے ایک لمحہ سوچا پھر بولا:

"ٹھیک ہے آپ بھی چلیے مگر راستے والوں کو خبر کرتے چلیے تاکہ وہ اپنے حاکم کے استقبال کے لیے تیار رہیں۔"

ذرا دیر میں منگلور کے نئے حاکم کے آنے کی خبر بندرگاہ والوں کو ہوگئی اور پھر یہ خبر مضافات تک پہنچ گئی۔

پھر کیا تھا! ناظم بندرگاہ کے دفتر کی طرف لوگوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ ایک تو لوگوں کو اس بات کی خوشی تھی کہ انہیں ریاست بدنور کی بدکارانی اور عیاش دیوان سے چھٹکارا ملا۔ دوسری خوشی یہ کہ ان کا نیا حاکم ایک مشہور و معروف سردار تھا جس نے مرہٹوں جیسے مضبوط لشکر کو شکست دی تھی۔

ناظم بندرگاہ نے حیدر علی خاں کے پڑاؤ پر پہنچ کر اپنے آنے اور حاضر ہونے کی درخواست کی۔ ناظم بندرگاہ ہی اس علاقے کا حاکم تھا۔ حیدر علی خاں نے اسے بلایا اور عزت سے بٹھایا۔

ناظم نے منگلور اور آس پاس کے علاقوں کے حالات سے بھی حیدر علی کو آگاہ کیا۔ خاص طور پر ناظم نے پرتگیزیوں کا ذکر کیا جو بدنور کے علاقوں پر اکثر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی منگلور تک بھی پہنچ جاتے تھے۔

ناظم کے اصرار پر حیدر علی معہ اپنے لشکر کے بندرگاہ کے دفتر کی طرف چلے۔ ان کی منظم اور تجربہ کار فوج نے جب باجوں کے ساتھ کوچ کیا تو سماں بندھ گیا۔

دو رویہ منگلور کے عوام کھڑے تالیاں بجا رہے تھے اور نئے حاکم کی جے کار کر رہے تھے۔ بعض لوگ فوج پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔

حیدر علی خاں گھوڑے پر سوار فوج کے آگے آگے تھے۔ ان کے برابر منگلور کا ناظم تھا جو بلدی میں گھبرا کر پیدل ہی حیدر علی کے پڑاؤ پر بھاگا چلا آیا تھا۔ حیدر علی نے اسے گھوڑا دیا تھا اور وہ ان کے ساتھ ہی آگے آگے چل رہا تھا۔

یہ جلوس اسی شان سے چلتا ہوا سمندر کے کنارے ناظم کے دفتر پہ پہنچا۔ ناظم نے دفتر والوں کا حیدر علی سے تعارف کرایا۔

حیدر علی نے تمام ملازمین کو ایک ایک ماہ کی تنخواہ مفت تقسیم کرائی، اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حیدر علی صرف بہادر ہی نہیں، دریا دل بھی ہیں۔

حیدر علی خاں منگلور میں دو تین دن سے زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے لیکن منگلور والے اس قدر

پُرخلوص تھے کہ انہیں وہاں ایک ہفتہ قیام کرنا پڑا۔

اس دوران انہوں نے ناظم کے مشورے سے منگلور اور مضافات میں نئے لوگ مقرر کیے۔ اس کے بعد بدنور واپس ہوئے۔

انہوں نے راجہ مہابدی کو اپنی واپسی کی اطلاع دے دی تھی۔ وہاں ان کے لیے جال بچھایا جا چکا تھا بس ان کے پہنچنے کی دیر تھی۔

جس روز حیدر علی واپس جانے والے تھے، اس سے پہلے کی رات ان کے پاس سرا سے ایک قاصد آیا۔ اس نے فوراً حیدر علی سے ملنے کی التجا کی۔

سرا سے قاصد کے آنے سے حیدر علی کچھ پریشان ہو گئے۔ پھر جب انہوں نے قاصد کو اپنے سامنے بلوایا تو اسے دیکھ کر انہیں تعجب سا ہوا۔

"تم سرا سے آئے ہو؟" حیدر علی خاں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"جی صوبیدار بہادر۔" قاصد نے مختصر سا جواب دیا۔

"تمہیں کس نے بھیجا ہے اور کیا پیغام لائے ہو؟" حیدر علی خاں کے لہجے میں ہلکی سی تلخی پیدا ہو گئی تھی۔

"صوبیدار بہادر۔ میں سب کچھ تنہائی میں عرض کروں گا۔" قاصد نے جرأت سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

حیدر علی خاں نے پاس بیٹھے لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب اٹھ کر باہر چلے گئے۔

"ہاں۔ اب بتاؤ تم کس کا اور کیا پیغام لائے ہو؟" حیدر علی خاں کی آواز میں پوری گھن گرج پیدا ہو گئی تھی۔

"صوبیدار بہادر۔ آپ مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے میں کوئی مشکوک آدمی ہوں۔" قاصد نے اور زیادہ حوصلے سے کہا۔

حیدر علی نے جواب میں کہا:

"تمہارا چہرہ اور حرکتیں کچھ ایسا ہی ظاہر کر رہی ہیں مگر یاد رکھو اگر تم نے مجھے فریب دینے کی کوشش کی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

"صوبیدار بہادر۔ میں نے جیسا سنا تھا آپ کو ویسا ہی پایا۔" قاصد نے کہا اور سر سے اپنی پگڑی اتار دی۔

اس کا سر مُنڈا ہوا تھا اور بیچ یا پر بالوں کا ایک گچھا اور چوٹی تھی۔ ہندو عام طور پر سر پہ چوٹی رکھتے ہیں۔

حیدر علی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا:

"اس کا مطلب ہے تم ہندو ہو؟"

"جی صوبیدار بہادر۔ میں ہندو ہوں اور سرا سے نہیں بلکہ بدنور سے آیا ہوں"۔

قاصد نے پُرسکون لہجے میں کہنا شروع کیا:

"میں نے اپنے آپ کو اس لیے چھپایا تھا کہ کہیں آپ کے فوجی مجھے گرفتار نہ کر لیں اور میں آپ کو اس بات سے آگاہ نہ کر سکوں جس کے لیے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آیا ہوں"۔

"قاصد۔ تمہاری باتیں اب تک بہت پراسرار ہیں۔ اپنی سچائی ثابت کرو ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی"۔

حیدر علی خاں کا استعجاب اب تک ختم نہ ہوا تھا۔

پھر جب ہندو قاصد نے راز پر سے پردہ ہٹایا تو حیدر علی پر ایک ساتھ کئی جذبے طاری ہوئے

اس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

آنکھوں میں غضب کی ایک لہر دوڑی۔

پھر کمالِ غصہ سے اس کا جسم کانپنے لگا۔

ہندو قاصد کی نظریں حیدر علی پر تھیں جو خلا کو خالی خالی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کی یہ کیفیت، جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، کافی دیر تک قائم رہی۔

جب حیدر علی کو خود پر قابو حاصل ہوا تو انہوں نے اس ہندو بھگت سے پوچھا:

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"کشن داس"۔

"شادی ہوئی ہے؟"

"جی نہیں!"

"ماں باپ، بہن بھائی، آگے پیچھے کوئی ہے؟"

"ایشور کی کرپا سے ماں باپ، دو بہنیں اور دو بھائی ہیں"۔

حیدر علی نے ایک ٹھنڈی سانس لی:

"کشن داس۔ خیال رہے اگر تمہاری بات غلط ثابت ہوئی تو تم اور تمہارا پورا خاندان قتل کر دیا جائے گا"۔

"صوبیدار بہادر ــــ"

کشن داس بالکل پُرسکون تھا:

"جھوٹ کی یہ سزا بھی کم ہے ــــ لیکن میں سچا ثابت ہوا تو صوبے دار بہادر کس حد تک سخاوت کا اظہار فرمائیں گے"۔

"کشن داس۔ اگر تو سچا ثابت ہوا تو حیدر علی کو قسم ہے وحدہٗ لاشریک کی کہ وہ اپنے محسن کا گھر دولت سے بھر دے گا۔ تو جو مانگے گا میں دوں گا"۔ حیدر علی نے بڑے جوش سے کہا۔

حیدر علی خاں نے تالی بجا کر اپنے ساتھیوں کو بلایا اور ان کو بتایا:

"اس شخص کا نام کشن داس پنڈت ہے۔ یہ بدنور سے ایک ایسی خبر لایا ہے کہ جس سے بے خبری مجھے اس جہانِ فانی سے اٹھا سکتی تھی۔ احسان فراموش مہابدی اور بدنور کی آوارہ رانی نے ہمارے احسانوں کا بدلہ ہماری موت کی صورت میں دینے کے لیے ایک زبردست جال بچھایا اور یہ شخص جس کی بات تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، اگر ہمیں اس خوفناک منصوبے سے آگاہ نہ کرتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ بدنور پہنچنے پر ہمارا کیا حشر ہوتا!"

حیدر علی خاں کے سرداروں پر سناٹا چھا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک جوشیلے سردار نے کہا:

"خدا آپ کو سلامت و زندہ تاقیامت رکھے لیکن ان نمک حراموں کو عبرت ناک سزا ملنی چاہیے اور کشن داس کو اتنا بڑا انعام ملنا چاہیے جس کا یہ تصور بھی نہیں کر سکتا"۔

"ایسا ہی ہوگا۔ انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا"۔ حیدر علی خاں نے کہا۔ پھر اسی سردار کو حکم دیا:

"یہ محترم پنڈت تمہارے حوالے ہیں۔ ان کی حفاظت کی جائے اور پوری طرح احترام برتا جائے بدنور میں زندہ و سلامت ہمارے سامنے انہیں پیش کرنا"۔

صبح کو لشکر بدنور کی طرف روانہ ہوا۔

حیدر علی خاں نے روانگی سے پہلے ایک سردار کو حکم دیا کہ وہ بدنور پہنچتے ہی راجہ مہابدی اور راج ماتا

کو حراست میں لے لے۔

دوسرے کو حکم ہوا کہ وہ ان پانچ پنڈتوں کو گرفتار کر لے جن کے نام کشن داس نے بتائے تھے۔

تیسرے سردار کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ اس مندر کو گھیرے میں لے لے جس کی نشان دہی کشن داس نے کی تھی۔

ان سرداروں کے کام کی ترتیب یہ رکھی گئی کہ سب سے پہلے مندر کو گھیرے میں لیا جائے۔ پھر پنڈت گرفتار ہوں اور آخر میں راجہ اور راج ماتا کو حراست میں لیا جائے۔

ان احکامات کے بعد لشکر بڑی تیزی سے ریاست بدنور کی طرف چلا۔ لشکریوں کو ان اقدامات سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ ان کے سردار کے خلاف کوئی زبردست سازش کی گئی ہے جس میں راجہ، راج ماتا اور بدنور کے یہ پانچ پنڈت بھی شریک ہیں مگر سازش کی تفصیل انہیں معلوم نہ ہو سکی۔

حیدر علی خاں اپنے لشکر کے ساتھ شام کے وقت بدنور پہنچے۔

ان کے استقبال کی روایتی انداز میں تیاریاں کی گئی تھیں۔ استقبال کرنے والوں میں راجہ مہابدی، راج ماتا، تمام سرکاری عہدیدار اور معززین شہر موجود تھے۔

حیدر علی خاں اپنے لشکر کے ساتھ اسی مکان پر پہنچے جہاں انہوں نے منگلور جانے سے پہلے قیام کیا تھا۔ اب اس مکان کو اندر باہر سے خوب آراستہ کیا گیا تھا مگر حیدر علی نے مکان سے کچھ دور پر اپنا خیمہ لگوایا اور اس میں دربار لگایا۔

جب حیدر علی مکان کے اندر جانے کے بجائے خیمہ کی طرف چلے تو راجہ مہابدی نے کہا:

"گورنر بہادر۔ مکان میں آرام اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ پھر خیمہ میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

حیدر علی نے لاپرواہی سے کہا:

"مہابدی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم نے مکان میں ہمارے آرام کی ہر چیز مہیا کر رکھی ہے۔ اطمینان رکھو مکان کہیں بھاگا نہیں جاتا۔ رات کو ہم وہیں قیام کریں گے"۔

مہابدی کے دل میں کھوٹ تھا۔ حیدر علی خاں کا ہر لفظ اسے چبھتا ہوا محسوس ہوا مگر وہ انہیں مکان میں ٹھہرنے پر زور بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے راج ماتا کی طرف دیکھا جو اس سے زیادہ پریشان تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

حیدر علی کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے مگر راجہ مہابدی اور راج ماتا کے دلوں میں پنکھے لگے

ہوئے تھے۔ وہ ہوں ہاں کرتے رہے۔

اتنے میں باہر ہلکا سا شور ہوا اور ایک محافظ نے خیمے میں داخل ہو کر عرض کیا:

"صوبے دار محترم۔ آپ کے حکم کے مطابق پانچوں پنڈتوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور انہوں نے اقبالِ جرم بھی کر لیا ہے۔ مجرموں کو پیش کرنے کی اجازت دی جائے"۔

راجہ مہابدی اور راج ماتا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ شاید وہ بھاگنا چاہتے تھے۔ اسی وقت ایک سردار جو ان دونوں کی پشت پر کھڑا تھا، بولا:

"صوبیدار بہادر۔ مجھے راجہ اور راج ماتا کو گرفتار کرنے کی اجازت دی جائے"۔

"ہم ان کی گرفتاری کا حکم پہلے ہی دے چکے ہیں۔ دوبارہ حکم دینے کی ضرورت نہیں"۔ پھر حیدر علی نے اطلاع دینے والے محافظ سے کہا:

"مجرموں کو اندر لانے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود باہر آ رہے ہیں۔ ان سب کی قسمت کا فیصلہ میدان میں عوام کے سامنے کیا جائے گا"۔

حیدر علی خاں اپنے سرداروں کے ساتھ باہر آ گئے۔ راجہ اور راج ماتا نے بھی باہر جانے کا ارادہ کیا مگر وہاں کھڑے سردار نے حکم دیا:

"تم دونوں ملزم ہو۔ اپنے آپ کو حراست میں سمجھو"۔

اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بڑھ کر راجہ اور راج ماتا کی مشکیں کس دیں۔ سردار ان کو گرفتار کر کے باہر لایا۔

باہر ایک اور ہی تماشہ نظر آیا۔

وہ مکان جس میں حیدر علی خاں کو رات میں قیام کرنا تھا اس مکان کے صحن اور تمام کمروں کے فرش کھودے جا رہے تھے۔ درجن بھر سے زیادہ مزدور لگے تھے اور بڑے زور و شور کے ساتھ کھدائی ہو رہی تھی۔

حیدر علی خاں کو یہ تو بتلا دیا گیا تھا کہ سازش میں شریک پانچوں پنڈت گرفتار ہو گئے ہیں اور انہوں نے اقبالِ جرم بھی کر لیا ہے۔ نیز اس مندر کو بھی گھیرے میں لے لیا گیا ہے جہاں سے سرنگ کھود کے اس مکان تک لائی گئی تھی۔ پھر بھی وہ سرنگ اور مکان کے نیچے بچھائے گئے بارود کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔

حیدر علی خاں کے یہ لمحات بڑی بے چینی سے گزر رہے تھے کہ اچانک کسی طرف سے

آواز آئی:

"بارود — بارود — بارود۔"

حیدر علی خان تیزی سے کھڑے ہوئے اور آواز کی طرف بڑھے۔

مکان کے کمرے، آنگن، برآمدے غرضیکہ مکان زمین کے جتنے رقبے پر تعمیر کیا گیا تھا اُسے جس جگہ سے بھی کھودا گیا، اس کے نیچے بارود بھرا ہوا تھا۔

اس وقت حیدر علی خان کے لشکر کے علاوہ بدنور کے عمائدین اور سرکاری افسر بھی وہاں موجود تھے۔ حیدر علی نے ان سب کو حکم دیا کہ وہ بارود کو ہاتھ سے چھو کے دیکھیں کہ وہ اصلی ہے یا نقلی۔

اور پھر اپنے راجہ اور راج ماتا کی غداری و نمک حرامی پر آنسو بہائیں۔

حیدر علی خان نے کشن داس کو بلا کر اپنے پاس کھڑا کر لیا تھا۔ پھر وہ شہر کے معززین کے ساتھ اس مندر تک گئے جہاں سے سرنگ کھود کر اس مکان کے نیچے تک لائی گئی تھی۔

کشن داس نے سرنگ میں اتر کر حیدر علی خان کو وہ فلیتہ بھی لا کر دکھایا کہ جس میں آگ لگا کر پورے مکان کو اڑایا جانا تھا۔

حیدر علی خان کے حکم پر کشن داس نے سازش کی تفصیل اس طرح بیان کی:

"صوبے دار بہادر کے منگلور جانے کے بعد راج ماتا نے راجہ عابدی کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ حیدر علی خان منگلور سے واپس آ کر بدنور پر قبضہ کر لیں گے اور راجہ کو نکال باہر کریں گے۔

راج ماتا نے راجہ سے یہ بھی کہا کہ حیدر علی خان مسلمان ہیں اور تم ہندو ہو۔ اس لیے حیدر علی تمہیں راجہ نہیں رہنے دیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ حیدر علی کو بدنور واپس آتے ہی بارود سے اڑا دیا جائے۔

راج ماتا نے سازش کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری خود اٹھائی۔ راجہ جب خود بھی اس سازش میں شریک ہو گیا تو پانچ بڑے مندروں سے ایک ایک پنڈت بلایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ (رانی) بدنور پر کسی مسلمان کی حکمرانی قبول نہیں کرے گی اور حیدر علی کو بدنور آتے ہی قتل کر دیا جائے گا۔

تمام پنڈتوں نے رانی کو اپنے تعاون کا یقین دلایا اور دیوتاؤں کی

قسمیں کھائیں۔

میں اس مندر کا چھوٹا پنڈت ہوں۔ میرے بڑے پنڈت کو سازش میں شریک کیا گیا۔ راجہ، راج ماتا اور پنڈتوں کی میٹنگ اسی مندر میں ہوتی تھی۔

طے یہ پایا کہ اس مندر سے اندر ہی اندر اس مکان تک سرنگ کھودی جائے جہاں حیدر علی خان کو قیام کرنا ہے۔ پھر اس سرنگ سے بارود کے تھیلے مکان کے نیچے پہنچا دیے جائیں۔ جب یہ کام ہو جائے تو بارود کے ڈھیر سے اس مندر تک ایک فلیتہ لگا دیا جائے اور ایک مقررہ وقت پر اس میں آگ لگا دی جائے۔ فلیتہ جلتا ہوا جب بارود تک پہنچے گا تو مکان کے نیچے بچھا ہوا بارود ایک دھماکے کے ساتھ پھٹے گا اور پورا مکان اڑ جائے گا۔

اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو بدنور کے رہنے والوں کے منہ پر ہمیشہ کے لیے کالک لگ جاتی۔ بدنور کا اگر کوئی باسی کسی اور ملک میں جاتا تو لوگ اس کے منہ پر تھوکتے اور کہتے کہ یہ اس ملک کا باسی ہے جس نے اپنے مہمان کو گھر بلا کر قتل کر دیا۔

مجھے جب پورے حالات کا علم ہو گیا اور مکان کے نیچے بارود بچھایا جا چکا تو میرے ضمیر نے ملامت کی اور میں فوراً منگلور پہنچا اور میں نے صوبے دار بہادر کو سازش سے آگاہ کر دیا۔"

یہ اتنی بڑی اور مکمل سازش تھی کہ اگر کشن داس پنڈت منگلور پہنچ کر حیدر علی خان کو آگاہ نہ کرتا تو وہ گھناؤنی سازش کا شکار ہو جاتے۔

عمائدین شہر اور معززین نے جب یہ باتیں سنیں اور مکان کے نیچے بارود کے تھیلوں کو بچھا ہوا دیکھا تو انہوں نے راجہ اور راج ماتا پر لعنتیں بھیجیں اور ان کے قتل کا مطالبہ کیا۔

حیدر علی خان تمام لوگوں کے ساتھ پھر اس جگہ واپس آ گئے جہاں تمام مجرم موجود تھے۔ کشن داس نے ایک بار پھر سازش کی تفصیل ان لوگوں کے سامنے بیان کی۔

حیدر علی خان نے سازش کی سرغنہ راج ماتا کو قتل کرنے کا حکم دیا اور راجہ عابدی کو قید کی سزا

دی گئی۔

اس سازش میں جو پانچ پنڈت شامل تھے ان کے لیے حیدر علی نے کہا:

"بدنور کے یہ پانچوں پنڈت اگرچہ کسی رحم کے مستحق نہیں کیونکہ یہ پوری طرح سازش میں شریک تھے لیکن میں مسلمان ہوں اور میرے مذہب اسلام کا حکم ہے کہ نہ تو کسی غیر مذہب کی عبادت گاہ کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی مذہب کے پیشوا کو تکلیف دی جائے بلکہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے۔ اس لیے میں ان پنڈتوں کو صرف ملک بدر کرتا ہوں۔ وہ صبح ہونے سے پہلے بدنور کی حدود سے نکل جائیں۔

پنڈت کشن داس جس نے اپنی کوشش سے اس سازش کو ناکام بنایا ہے، میں اور میرے لشکری اس کے احسانمند ہیں۔ میں پنڈت کشن داس کو بدنور کے تمام مندروں کا ناظم اعلیٰ مقرر کرتا ہوں دوسری طرف میں بدنور کو ایک بادشاہت میں تبدیل کرتا ہوں جس کا دارالسلطنت بدنور رہے گا اور اس کے ماتحت سرنگا پٹم، سرا اور میرے تمام مفتوحہ و مقبوضہ علاقے ہوں گے۔ کشن داس کو اس نئی سلطنت میں تمام غیر مسلم اقوام کا وزیر مقرر کیا جاتا ہے۔

غیر مسلم اقوام کے مذاہب میں کسی قسم کا دخل نہ دیا جائے گا اور ان کی ترقی اور بہبود کے لیے کشن داس، جسے میں راجہ کا لقب دیتا ہوں، کی ہر سفارش قبول کی جائے گی"۔

حیدر علی خاں کو بدنور سے تقریباً بارہ کروڑ روپیہ کا خزانہ حاصل ہوا۔ بورنگ "تاریخ حیدری" میں لکھتا ہے:

"اس فتح کی خوشی میں نواب حیدر علی خاں اپنی تمام سپاہ کو اور قلعہ داروں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سال کی تنخواہ بطور انعام تقسیم کی اور تخت بدنور پر بحیثیت بادشاہ کنار جلوہ افروز ہوا"۔

ایک دوسرا انگریز مؤرخ لکھتا ہے:

"حیدر علی خاں کو یہ خداداد فتح ایسی حاصل ہوئی کہ اس نے حیدر علی کو دفعۃً کرسی سے تخت پر بٹھا دیا۔ تخت نشیں ہو کر نواب حیدر علی خاں نے بدنور کا نام اپنے نام پر "حیدر نگر" رکھا اور اس کو پایہ تخت بنانے کے خیال سے وہاں جدید تعمیرات کی بنیاد رکھی"۔

نواب حیدر علی خاں نے حیدر نگر میں ایک ٹکسال قائم کی اور اپنے نام کے سکے ڈھلوائے۔ ایک

بادشاہ کی حیثیت سے یہ ان کا پہلا قدم تھا، اگرچہ انہوں نے شاہ یا سلطان کا لقب اختیار نہیں کیا۔

حیدر علی خاں جس وقت منگلور میں تھے تو وہاں کے ناظم نے پرتگیزیوں کی شکایت کی تھی کہ وہ گاہے گاہے منگلور پر حملہ کر کے لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔ پھر بدنور (حیدر نگر) میں انہیں بتایا گیا کہ پرتگیزیوں نے بدنور کے بعض علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ نواب حیدر علی یہ بات کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے فوراً ایک لشکر تیار کیا اور پرتگیزیوں کے مرکز جزیرہ گوا پر حملہ کر دیا۔

گوا والے یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کوئی ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ وہ علاقے کے چودھری بنے ہوئے تھے اور آئے دن ادھر ادھر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ گوا جزیرہ تھا اس لیے وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھتے تھے۔ آج تک اس جزیرے کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

جب گوا پر حیدر علی خاں نے حملہ کیا تو وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہے تھے کہ وہ کونسی مخلوق ہے جس نے چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر سوار ہو کر پرتگیزی مرکز پر حملے کی جرأت کی ہے۔

پرتگیزی چونکہ ہمیشہ دوسروں پر حملے کرتے تھے اس لیے انہوں نے جزیرے کی حفاظت کا کوئی مستقل اور معقول انتظام نہ کر رکھا تھا۔ حیدر علی کے لشکری کشتیوں سے اتر کر جزیرے میں داخل ہو گئے اور انھوں نے پرتگیزیوں کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔

ظالم صرف ظلم کرنا جانتا ہے۔ اسے یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ اس پر بھی کبھی وار ہو سکتا ہے اور وہ بھی مکافاتِ عمل کی زد میں آ سکتا ہے۔

حیدر علی خاں کے حملے کو پرتگیزیوں نے پہلے تو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ یہ سمجھے کہ یہ ساحلی مچھیرے اور لٹیرے ہیں جو مچھلی کا شکار کرتے کرتے جزیرے پر چڑھ آئے ہیں۔ پس وہ انہیں ڈرانے اور بھگانے کے لیے تلواریں اور بندوقیں لے کر دوڑ پڑے۔

مگر—

پندرہ منٹ کے بعد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ مچھیرے یا لٹیرے نہیں بلکہ خدا کا قہر ہے جو ان پر نازل ہوا ہے اور ان کے مظالم کا بدلہ لے رہا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ پرتگیزی پورے جزیرے میں بھاگتے اور چھپتے پھرے اور حیدر علی خاں کے لشکری انہیں قتل کرتے رہے۔

اس بھاگ دوڑ اور مار کٹائی میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس وقت گوا کے پرتگیزی قلعہ دار کو معلوم ہوا کہ ان کے جزیرے پر حملہ ہوگیا ہے اور منظم فوجی دستے پرتگیزیوں کا صفایا کرتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ پرتگیزی فوجی جلدی جلدی تیار ہو کر قلعہ سے باہر نکلے اور فوراً مورچہ بند ہو گئے۔

حیدر علی خاں اپنے دستوں کے ساتھ مارتے کاٹتے اور یلغار کرتے قلعہ دار کے سامنے پہنچے۔ قلعہ کے باہر انہوں نے پرتگیزیوں کو مورچہ بند پایا۔

ایسے مورچوں کی وہ کب پرواہ کرتے تھے۔ انہوں نے ذرا ٹلنے کا حکم دیا۔ حیدر علی خاں کے لشکری بھوکے شیروں کی طرح پرتگیزی مورچوں پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کی تمام مورچہ بندی دھری کی دھری رہ گئی پرتگیزیوں کو ایسے جنگجو فوجیوں سے اب تک سابقہ نہ پڑا تھا۔ وہ مدافعت میں قطعی ناکام ہو گئے اور مورچے چھوڑ کر قلعہ کی طرف بھاگے۔

حیدر علی خاں نے بھاگنے والوں کا قلعہ کی دیواروں تک تعاقب کیا۔ اس پسپائی پر پرتگیزیوں کے بہت سے سپاہی مارے گئے اور بچے کھچے سپاہی قلعہ میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔

حیدر علی اپنے ساتھ قلعہ شکن سامان نہیں لائے تھے اس لیے انہوں نے حکم دیا کہ قلعہ کی فصیل کے نیچے سرنگ کھود کر اس میں بارود کی لکڑیاں بھری جائیں اور لکڑیوں میں آگ لگا کر فصیل کو اڑا دیا جائے۔

حیدر علی کے حکم پر بیک وقت دو سرنگیں کھودنا شروع کی گئیں۔ ایک دن اور ایک رات کی محنت سے دونوں سرنگیں فصیل تک پہنچ گئیں۔ پرتگیزی یہ سب کچھ فصیل پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ وہ بے بس تھے۔ نہ قلعہ سے باہر آ کر لڑ سکتے تھے اور نہ سرنگ کھودنے والوں کو روک سکتے تھے کیونکہ سرنگیں زمین کے اندر ہی اندر کھودی جا رہی تھیں اور مٹی نکال نکال کر باہر جمع کی جا رہی تھی جس سے ایک ٹیلہ سا بن گیا تھا۔

پرتگیزیوں نے مٹی کے ٹیلے سے اندازہ لگا لیا کہ سرنگیں تقریباً مکمل ہو گئی ہیں۔ پھر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ حیدر علی خاں کے لشکری پہاڑیوں پر سے سوکھے درخت کاٹ کاٹ کر لا رہے ہیں اور ان کے ٹکڑے کر کے ایک جگہ ڈھیر کر رہے ہیں تو انہیں پورا یقین ہو گیا کہ اب لکڑیاں سرنگوں میں بھری جائیں گی اور ان میں آگ لگا کر فصیل کو اڑا دیا جائے گا۔

اس صورت حال نے ان میں کھلبلی مچا دی اور پرتگیزیوں کے بڑے بڑے سردار سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔

آخر پرتگیزیوں نے صلح کی بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا۔ دو رکنی ایک مصالحتی سفارت تیار ہوئی اسے گفتگو کے لیے جھولے میں بٹھا کر قلعہ کے باہر اتارا گیا۔

وہاں سے یہ سفارت حیدر علی خاں کے لشکر کی طرف چلی۔ ان کے ہاتھ میں سفید جھنڈے تھے۔ اس لیے ان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔

سفارت حیدر علی خاں کے لشکر میں پہنچی اور اسے باعزت طریقے سے حیدر علی کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

حیدر علی کو پرتگیزیوں پر سخت غصہ تھا۔ انہوں نے سخت لہجے میں کہا:

"او بدیسی بدبختو! تم خود کو تاجر بتاتے ہو مگر ہندوستانیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت بنانے کے خواب دیکھنے لگتے ہو؟"

"اے بدنور کے بادشاہ!" وفد کا ایک رکن گڑگڑایا:

"ہمیں معاف کیا جائے۔ ہم غلطی پر تھے۔ ہم اپنی خطا مانتے ہیں۔ آپ جو حکم دیں گے ہم اس پر عمل کریں گے"۔

دشمن پیروں پر گر پڑا تھا۔ حیدر علی خاں نرم ہو گئے:

"تمہیں ضمانت دینا ہوگی کہ تم گوا کے علاوہ ساحل پر کسی اور جگہ قابض ہونے کی کوشش نہ کرو گے!"

"ہم ہر طرح سے ضمانت دینے کو تیار ہیں شاہ بہادر"۔ سفیر نے کہا:

"آپ جس طرح فرمائیں گے۔ ہم ضمانت دیں گے"۔

"اچھا۔ پہلے پچاس بندوقیں پیش کی جائیں"۔ حیدر علی نے حکم دیا۔

انہوں نے جواب میں کہا:

"بندوقیں ہم قلعہ سے جا کر لا دیں گے۔ اور کوئی شرط ہو تو فرمایئے!"

"تم لوگوں نے گوا کے ساحل پر کاردار کے علاقہ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ ریاست بدنور کا حصہ ہے جسے ہم نے حیدر نگر کا نام دیا ہے۔ اس ساحلی علاقے کو فوراً خالی کر دیا جائے!" حیدر علی خاں نے دوسری شرط پیش کی۔

سفارت نے یہ شرط بھی مان لی اور کہا:

"کاردار کا علاقہ ہم خالی کر دیں گے مگر اس کے لیے ہمیں دو دن کا وقفہ دیا جائے!"

"وقفہ دیا جا سکتا ہے مگر وہاں سے سوائے اسلحہ کے اور کوئی سامان لانے کی اجازت نہ ہوگی سارا سامان وہیں چھوڑنا ہوگا۔"

حیدر علی خاں کی یہ شرط بہت سخت تھی مگر پرتگیزیوں کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑا۔ یہ ان کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اگر وہ ایک شرط بھی قبول نہ کرتے تو قلعہ راما کی فصیل کو سرنگوں میں آگ بھر کر اڑا دیا جاتا اور قلعہ جو پرتگیزیوں کی آخری پناہ گاہ تھی، تباہ ہو جاتا۔

چنانچہ ——

پرتگیزیوں نے حیدر علی خاں کی تمام شرائط کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔

پرتگیزی سفارت واپس گئی اور دو گھنٹے کے اندر مطالبہ ۵۰ بندوقیں حیدر علی خاں کو بھجوا دی گئیں۔

حیدر علی خاں کا لشکر قلعہ کے سامنے میدان میں خیمے لگائے ٹھہرا ہوا تھا۔ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ جب تک کاروار کا علاقہ خالی نہ کر دیا جائے، اس وقت تک لشکر جزیرے سے ہرگز واپس نہ جائے گا۔

حیدر علی خاں نے اپنا ایک سردار اور کچھ لشکری کاروار بھیج دیے تھے جو پرتگیزیوں کے انخلاء کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے علاقہ سے سوائے اسلحہ کے لوٹا یا کٹورا تک نہ اٹھانے دیا۔

پرتگیزیوں کا انخلاء ایک ہی روز میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد کاروار کا علاقہ مقامی لوگوں کے سپرد کر دیا گیا اور انہیں خوشخبری سنائی گئی کہ وہ اب نواب حیدر علی خاں، جو حیدر نگر کے تخت کے مالک ہیں، کی رعیت ہیں۔

نواب حیدر علی خاں نے گوا سے واپسی پر چند گھنٹے کاروار کے علاقے میں بھی گزارے۔ علاقہ کے لوگوں سے ان کی ضروریات پوچھیں اور انہیں ضروری امداد دی۔ جو کام اور ضرورتیں فی الفور پوری نہ ہو سکیں، ان کے لیے حیدر علی نے احکامات صادر کیے اور وہاں ایک ذیلدار مقرر کر کے اسے تاکید کی کہ وہ حیدر علی خاں کو علاقہ کے حالات سے گاہے گاہے آگاہ کرتا رہے۔

ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر حیدر علی خاں اپنی نئی مملکت حیدر نگر واپس آئے۔

○

○

موسم بہت حسین تھا۔

پھر سمندر کا کنارہ۔ تیز اور خنک ہوا کے چلتے ہوئے جھونکے۔ گہرے بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی چہرہ دکھاتا ہوا چاند اور دور دور تک پھیلا ہوا سناٹا۔

ایسے موسم میں اور ایسے ماحول میں تو عشق کے ماروں کی عید ہو جاتی ہے۔ کمزور دل اس موسم میں گھر سے قدم نہیں نکالتے مگر عشق پیشہ جوان اور الھڑ جوانیاں تو موسم کا مزہ لوٹنے ساحلِ سمندر پہ سیر کرنے پہنچ جاتے ہیں۔

کہیں دور بجلی چمکی۔

بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے ساحلِ مالابار کی پہاڑیاں گونج اٹھیں تو نوجوان نے قریب بیٹھی دوشیزہ کو مخاطب کیا:

"اب واپس جاؤ راجکماری۔ بارش شروع ہونے والی ہے!"

"بارش ——"

اور راجکماری کھلکھلا کے ہنس پڑی:

"علی! تم بارش سے ڈرتے ہو کیا؟"

"میں تمہاری وجہ سے کہہ رہا ہوں راجکماری۔" علی نے جواب دیا:

"میں گھوڑے پر دم کے دم میں پہاڑیاں پار کر جاؤں گا مگر تم بارش میں گھر جاؤ گی۔ تمہارا

راج محل جانا مشکل ہو جائے گا۔"

"ضروری تو نہیں کہ میں راج محل واپس جاؤں۔"

راجکماری شوخی سے بولی:

"کیا تمہارا گھوڑا، تمہارے ساتھ میرا وزن نہیں اٹھا سکتا۔ ایک دن تو تمہارے ساتھ جانا ہی ہے پھر آج ہی کیوں نہ چلی جاؤں!"

"نہیں راجکماری!"

علی نے نرمی سے سمجھایا:

"حالات ہمارے قابو میں ہیں۔ ہم انہیں بے قابو کیوں ہونے دیں۔ تم جلد سے جلد راج بابا سے بات کرو۔"

"علی۔ میں کیسے بات کروں؟"

راجکماری بے بسی سے بولی:

"وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ اتنی محبت کرتے ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو میں جان دیدوں گی۔"

"واہ۔ یہ کیا بات ہوئی!"

علی نے منہ بنایا:

"ایک طرف تم کہتی ہو وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ ڈر بھی ہے کہ وہ انکار نہ کر دیں۔ یہ بات ایک دن تو کھلنا ہی ہے۔ پھر دیر کیوں کرتی ہو؟"

"میری زبان نہیں کھلتی ان کے سامنے۔ ہاں اگر تم میرے ساتھ چلو تو ــــ" راجکماری نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں چلوں ــــ اور تمہارے ساتھ؟"

علی نے راجکماری کو حیران نظروں سے دیکھا:

"کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا!"

"بس ڈر گئے!" راجکماری نے مذاق کہا:

"محبت کا سارا نشہ اتر گیا؟"

"میں ڈرتا نہیں راجکماری ــــ لیکن کتے کی موت مرنا نہیں چاہتا!" علی نے بڑے عزم کے

ساتھ جواب دیا:

"تمہارے باپ کنانور کے راجہ ہیں راجہ ــــ میں ان کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات کر بیٹھا تو مجھے گرفتار کرا کے جوتے لگوائیں گے۔ سمجھی کہ نہیں؟"

"مگر تم الٹی بات کرو گے کیوں؟"

راجکماری نے اسے اور بنایا:

"سیدھی طرح کہہ دینا کہ میں آپ کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنے کی آپ مجھے اجازت دے دیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ بڑا اچھا راستہ دکھا رہی ہو۔"

علی نے جل کے کہا:

"ان کے پاس جانے سے تو یہ زیادہ آسان ہے کہ میں سمندر میں کود کے جان دیدوں۔"

اس کے ساتھ ہی ایسی کڑاکے کی بجلی چمکی اور بادل گرجے کہ خدا کی پناہ۔ پھر جو چھما چھم بارش ہوئی ہے تو بس اللہ دے اور بندہ لے۔ چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔ ندی نالے بہ نکلے۔

علی نے کہا:

"اتنی دیر سے کہہ رہا تھا کہ چلی جاؤ۔ بارش آنے والی ہے مگر تم کب سنتی ہو کسی کی؟"

کنانور کے راجہ کی بیٹی کے جسم پر اعلیٰ درجے کے ریشمی کپڑے تھے۔ بارش کی وجہ سے لباس اس کے جسم سے چپک گیا تھا اور علی اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بڑے بے شرم ہو۔ دوسری طرف دیکھو۔" راجکماری شرماتے جا رہی تھی۔

علی کے جسم پر ایک لمبا فوجی کوٹ تھا۔ اس نے کوٹ اتار کر راجکماری کی طرف بڑھایا اور شرارت سے بولا:

"لو۔ اسے پہن لو۔ شرم نہیں آئے گی۔"

راجکماری نے جلدی سے کوٹ لے کر پہن لیا۔ اسی وقت دو عورتیں اور دو مرد چھتریاں اور بڑے چھاتے لیے آتے دکھائی دیے۔

علی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"لیجئے راجکماری صاحبہ۔ آپ کے درباری آگئے۔ اب میری ضرورت نہیں رہی۔ اجازت ہو تو چلا جاؤں؟"

"ہرگز نہیں۔" راجکماری نے جیسے حکم دیا:
"تم کہیں نہیں جا سکتے علی!"
"اچھا جناب۔ کہیں نہیں جائیں گے"۔ علی نے بڑی سعادت مندی سے ہتھیار ڈال دیے۔

کنانور کی ہندو ریاست جنوبی ہند کے مغربی حصے میں ساحل کے ساتھ ساتھ واقع تھی۔ اس علاقے کو کیرالا یا چیرالا کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آمد آغازِ اسلام ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ عرب کے تاجر اور ملاح اس علاقے میں آتے اور آباد ہوتے رہتے تھے علاقہ زرخیز تھا اس لیے مسلمان یہیں آباد ہو گئے تھے۔

ان مسلمانوں نے ہندو آبادی پر بھی اثر ڈالا اور بہت سے خاندان مسلمان ہو گئے تھے۔ ان مسلم اور نومسلم خاندانوں کو ماپلہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

جب ماپلاؤں کی طاقت بڑھی تو انہوں نے اس علاقے میں کئی چھوٹی چھوٹی زمینداریاں اور ریاستیں بنالیں لیکن مقامی ہندو آبادی اور ریاستیں انہیں پریشان کرتی رہتی تھیں۔ مشہور مسلم سیاح ابنِ بطوطہ نے ان کے مفصل حالات لکھے ہیں۔

راجکماری مالابار کی سب سے طاقتور ہندو ریاست کنانور کے راجہ کی پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی۔ لاڈ پیار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ راجہ کے صرف یہی ایک اولاد تھی۔ راجکماری صرف پانچ سال کی تھی کہ اس کی ماں مر گئی تھی۔ راجہ بالکل اکیلا تھا۔ لے دے کے یہی ایک لڑکی تھی۔ ننھی سی جان۔ راجہ پریشان کہ کرے تو کیا کرے۔

وہ چاہتا تو دوسری شادی کر سکتا تھا۔ مشکل سے ۴۰ سال کی عمر تھی مگر ننھی سی بچی کا چہرہ دیکھتا تو اٹھتے ہوئے جذبات سینے ہی میں گھٹ کر دم توڑ دیتے۔

پھر راجہ نے ایک فیصلہ کیا۔ یہ کہ وہ دوسری شادی نہ کرے گا۔ اس فیصلہ کے ساتھ ہی ننھی راجکماری اس کی تمام آرزوؤں، امیدوں اور محبتوں کا مرکز بن گئی۔

اس طرح راجکماری کنیزوں سے زیادہ خود راجہ کی گود میں پل کے جوان ہوئی۔ اس نے راجکماری کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑنے دیا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی۔ اس لاڈ پیار نے راجکماری کو شوخ و شنگ تو بنایا مگر بدتمیزی یا بے ہودگی کا اس میں شائبہ بھی پیدا نہ ہوا۔ راجکماری محل کے اندر باہر بھاگتی

دوڑتی پھرتی۔ جس طرف جاتی ہاتھوں ہاتھ لی جاتی۔

ایک سال پہلے بھی ایسا ہی بھیگا موسم تھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ راجکماری گھوڑے پر سوار جنگلی ہرنی کی طرح اڑتی پھر رہی تھی کہ اچانک اس کے سامنے علی آ گیا۔

خوبصورت، سجیلا جوان، سرخ و سفید رنگ، چوڑا سینہ، نکلتا ہوا قد، مشکی گھوڑے پر سوار، ایک طرف لٹکتی تلوار، دوسری جانب اڑسا ہوا خنجر۔ ہاتھ میں کمان اور کمان میں جڑا ہوا تیر۔ وہ شکار کا پیچھا کرتا ہوا راجکماری کے سامنے آ گیا۔

دونوں کی امڈتی جوانی، مچلتے جذبات، نظروں میں حجاب اور بے حجابی کی بل کھاتی لہریں۔ جوان نظریں ٹکرائیں اور دل میں اترتی چلی گئیں۔

"محبت بیک نظر" اسی کو کہا جاتا ہے۔

دو گھوڑے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ راجکماری کا اسپ تازی سفید تھا اور علی کا شہوار شبِ دیجور کی طرح سیاہ!

"آپ شاید کنانور کی راجکماری ہیں؟" یہ ایک جوانی کا دوسری جوانی سے سوال تھا۔
"ہوں ـــ" راجکماری جیسے نیند میں بولی:
"مگر تم کس دیس کے راجکمار ہو؟"
"میں ماپلہ یا لیگار[1] کا بیٹا ہوں"۔
"ماپلہ ـــ" راجکماری نے اسے پریشان نظروں سے دیکھا:
"تو تم ہمارے مذہب کے نہیں ہو"۔
"جی ہاں راجکماری۔ میں ہندو نہیں ہوں"۔
"تو تمہارا نام بھی ہمارے جیسا نہیں ہوگا؟" راجکماری نے دلچسپی سے پوچھا۔
"نام تو ایک شناخت ہوتا ہے۔ آپ مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتی ہیں"۔
"پھر بھی تمہاری ماں نے کوئی نام تو رکھا ہوگا؟"
"میری ماں زندہ نہیں ہیں راجکماری۔ وہ میرے بچپن میں مر گئی تھیں"۔
"میری بھی ماں نہیں ہیں۔ وہ بھی بچپن میں مر گئی تھیں"۔

۱۔ مسلمان زمیندار

"کیا آپ یہاں روزانہ آتی ہیں؟"

"نہیں۔ کبھی کبھی آتی ہوں"۔ راجکماری کی دلچسپی بڑھی:

"کیا تم روز آتے ہو یہاں؟"

"جی نہیں راجکماری۔ یہ آپ کی ریاست کا علاقہ ہے۔ میں شکار کے پیچھے ادھر آگیا اور ڈر رہا تھا کہ کوئی مصیبت نہ آجائے"۔ ماپلہ نوجوان نے جواب دیا۔

"کیا تم روز آسکتے ہو یہاں؟" راجکماری نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے ماپلہ نوجوان کی پوری بات سنی ہی نہیں۔

"روز ــــ؟" جوان نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" راجکماری کا یہ سوال بالکل ہی بے ربط تھا۔

"اوہ۔ میں نام بتانا تو بھول ہی گیا۔" ماپلہ نوجوان مسکرایا:

"میرا نام علی ہے۔ آپ مجھے ماپلہ بھی کہہ سکتی ہیں"۔

راجکماری بھی مسکرائی:

"علی بھی بڑا پیارا نام ہے"۔

اس دوران راجکماری کی سکھیاں، سہیلیاں اور کنیزیں اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آگئیں مگر راجکماری کو ایک نوجوان سے باتیں کرتے دیکھ کر دور ہی رک گئیں۔

"یہ سب بلائیں آگئیں میرے پیچھے"۔ راجکماری نے منہ بنایا۔

"بلائیں نہیں۔ آپ کی سہیلیاں ہیں شاید"۔ علی نے خیال ظاہر کیا۔

"اچھا تم یہ بتاؤ۔ کل آؤ گے یہاں؟" راجکماری نے اچانک سوال کیا۔

"آپ حکم دے رہی ہیں تو ضرور آؤں گا۔ بشرطیکہ کوئی روک ٹوک نہ ہو"۔ علی بولا۔

"کوئی روکے تو کہہ دینا راجکماری نے بلایا ہے"۔

اس کے ساتھ ہی راجکماری گھوڑا گھما کر اپنی سہیلیوں کی طرف بڑھ گئی۔

جب سے ــــ

یہ ڈرامہ روز اسی جگہ کھیلا جاتا تھا۔

جاڑا، گرمی، برسات، یہ محبت کے مارے ہر موسم میں یہاں اکٹھا ہوتے اور اس طرح گھل مل کر بات کرتے جیسے انہیں آج ہی پیار ہوا ہو۔

علی کی زمینداری کوئی بڑی نہ تھی۔ راجہ کنانور کے مقابلے میں تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ پھر علی مسلمان اور راجہ مالابار ذات کا نائر ہندو۔ نہ ایک مذہب اور نہ برابر کی حیثیت مگر دونوں اس طرح ملتے جیسے ایک ہی خاندان کے ہوں۔ ایک ساتھ گھومنا پھرنا۔ کھانا پینا۔ اٹھنا بیٹھنا۔

یہ خبر شدہ شدہ علی کے باپ تک پہنچی تو انہوں نے بیٹے کو سمجھایا:

"بیٹے! میں سمجھا تھا کہ تم سنِ شعور کو پہنچ چکے ہو مگر ــــ"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ علی بھی باپ کو بہت پیارا تھا۔ اکیلا بیٹا تھا۔ انہوں نے آج تک اسے ٹیڑھی نظر سے نہ دیکھا تھا مگر آج ان کے الفاظ میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

"بابا۔ میں سمجھا نہیں۔ کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے؟" علی نے نرمی سے پوچھا۔

"غلطی کوئی نہیں بیٹے مگر یہ ضرور خیال رکھو کہ آگ اور پانی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے"۔

باپ نرم پڑ گئے:

"راجہ کنانور بہر حال راجہ ہے۔ ہم اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ پھر وہ نائر اور ہم مسلمان۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم راجکماری سے نہ ملو مگر یہ خیال رکھو کہ ہوا کا دامن کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ راجکماری ایک خوبصورت کھلونے کی طرح دیکھی تو جا سکتی ہے مگر ایک مسلمان پالیگار، ایک نائر راجکماری کو اپنا نہیں سکتا۔ وہ تمہاری پہنچ سے دور ہے بیٹے!"

"بابا۔ آپ اگر مجھے حکم دیں کہ راجکماری سے ملنا چھوڑ دو تو یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے لیکن میں آپ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ راجکماری میری پہنچ سے باہر ہے"۔

"علی۔ میں تمہیں منع تو نہیں کرتا مگر احتیاط کی تاکید ضرور کروں گا"۔

علی اور اس کے باپ میں اس سلسلے میں اکثر گفتگو ہوتی اور علی ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ پرعزم اور مستقل مزاج دکھائی دیتا۔

ادھر علی اور راجکماری کی محبت میں پختگی پیدا ہو رہی تھی اور دوسری جانب علی کی زمینداری اور کنانور کی ریاست میں اس محبت کے چرچے بڑھتے جا رہے تھے۔

پورے مالابار میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہر دم ٹھنی رہتی تھی۔ پھر بھلا کنانور والے یہ کیسے برداشت کرتے کہ ان کی راجکماری ایک مسلمان رئیس زادے سے محبت کی پینگیں بڑھائے۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ کنانور والوں نے علی کا داخلہ اپنی ریاست میں بند کر دیا۔ راجکماری روز کی طرح ملاقات کی مخصوص جگہ پر پہنچی تو علی غائب تھا۔

یہ پہلا دن تھا کہ علی غیر حاضر ہوا تھا ورنہ اس کا گھوڑا راجکماری کے آنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتا تھا۔

راجکماری کے ساتھ آنے والے محافظ اور سہیلیاں حسبِ معمول اس سے کچھ دور ٹھہر گئی تھیں۔

جب کافی انتظار کے باوجود علی نہ پہنچا تو راجکماری اپنی سہیلیوں میں واپس پہنچی۔

"پتہ نہیں آج علی کیوں نہیں آیا؟" راجکماری کی آواز پژمردہ تھی۔

"بیمار نہ ہو گئے ہوں کہیں؟" ایک سہیلی نے جواب میں کہا۔

"مرد کی ذات بے مروت ہوتی ہے۔ اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیے"۔ یہ رائے دوسری سہیلی کی تھی۔

پہلی نے تردید کی:

"صرف مرد بے وفا نہیں ہوتا، عورت بھی بے وفا ہو سکتی ہے"۔

"عورت تو وفا کی پتلی ہے۔ اس سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا"۔

راجکماری کی دو سہیلیوں میں بحث شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے دلیلوں کے انبار لگا دیے گئے مگر کوئی ہار ماننے پر تیار نہ تھی۔ آخر راجکماری کو انہیں ڈانٹنا پڑا:

"تم لوگوں کو اپنی راجکماری کی کوئی فکر نہیں۔ صرف بحث کرنا جانتی ہو؟"

دونوں خاموش ہو گئیں۔ پھر تیسری سہیلی بولی:

"راجکماری۔ اجازت ہو تو کسی کو علی کے گھر بھیجا جائے"۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ وہ نہیں آیا تو ہم اس کی کیوں فکر کریں!"

راجکماری کہنے کو تو کہہ گئی مگر اس کی بے چینی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ سہیلیاں چپ چاپ کھڑی اس کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

"واپس چلو۔ اب وہ نہیں آئے گا"۔

راجکماری بہت مضمحل ہو گئی تھی!

دو دن کے کربناک انتظار کے بعد راجکماری کنا نور نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلّی دینا شروع کی کہ علی بے وفا تھا۔ مرد بے وفا ہوتے ہیں۔ اس کا علاج صرف صبر ہے۔ صبر کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔

راجکماری نے اس جگہ جانا چھوڑ دیا تھا جہاں اسے پہلی اور آخری محبت ہوئی تھی۔ دن بھر ایک کمرے میں پڑی رہتی۔ سہیلیاں آتیں تو بیماری کا بہانہ کر کے ان سے ملنے سے انکار کر دیتی۔

محبت کا مارا راجہ کنا نور بھی اپنی بیٹی کے بارے میں پہلے ہی سمجھتا رہا کہ راجکماری کچھ بیمار ہے۔ اس نے پوری ریاست کے وید اور حکیم اکٹھا کر دیے۔ ہر ایک نے اسے الگ دیکھا اور راجہ کنا نور کو اپنی رائے سے آگاہ کر دیا۔

عجیب بات یہ تھی کہ تمام ویدوں اور حکیموں نے راجہ کو بتایا کہ راجکماری کو کوئی بیماری نہیں، پھر اس کا علاج کیا کیا جائے۔ راجہ نے خود تو اس رائے سے اتفاق کر لیا مگر رعایا کو یہی ظاہر کیا کہ راجکماری بیمار ہے۔

راجہ کو یہ ڈر تھا کہ اگر اس نے لوگوں کو بتایا کہ راجکماری کو کوئی بیماری نہیں تو لوگ پتہ نہیں کیا کیا باتیں بنائیں اور کیسے کیسے افسانے تراشیں۔ اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

مگر ــــ

کہا جاتا ہے کہ عشق اور مشک چھپا نہیں کرتے۔

راجہ کو اگرچہ راجکماری کی بیماری کا علم نہ ہو سکا مگر بہت سے لوگ جانتے تھے کہ راجکماری کی بیماری اس کا ایک مسلمان امیر زادے سے عشق ہے۔ وہ جانتے کیوں نہ! راجکماری علی الاعلان علی سے ملتی تھی اور دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ آنے جانے والوں کی نظر ان پر پڑتی تھی اور وہ سب کچھ جان گئے تھے۔

راجہ کنا نور، راجکماری کی طرف سے پریشان رہنے لگا تھا مگر رعایا میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ راجکماری کا راز کھولے۔ اس قسم کا راز کھل جانے سے بڑا فتنہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ ماپلاؤں اور کنا نور کے نائروں کے درمیان جنگ ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ راجہ اسے راجکماری پر تہمت سمجھ کر راز کھولنے والے کو قتل کرا دے۔

بہرحال رازِ عشق کھل کے رہا۔

ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا تھا اور راجکماری نے اپنے کمرے سے قدم باہر نہ نکالا تھا۔ اس کی سہیلیاں روز آتیں اور بے نیل و مرام واپس چلی جاتی تھیں۔

راجکماری دراصل اپنی سہیلیوں سے شرمندہ تھی۔ انہوں نے اسے سمجھایا تھا کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں مگر راجکماری نے ان کا مذاق اڑایا تھا۔ اگر اب وہ سہیلیوں کا سامنا کرتی تو ممکن تھا کوئی سہیلی

اسے طعنہ دیتی اور اسے اور زیادہ شرمندہ ہونا پڑتا۔

آج چار سہیلیاں ایک ساتھ آئی تھیں اور یہ قصد کر کے آئی تھیں کہ راجکماری سے ملے بغیر نہیں جائیں گی۔

راجکماری نے کمرے کے دروازے پر ایک کنیز کو مقرر کر دیا تھا کہ وہ ملاقات کے لیے آنے والوں سے کہہ دے کہ راجکماری کی طبیعت خراب ہے اور وہ کسی سے ملاقات نہیں کر سکتیں حسب معمول پہرے پر موجود کنیز نے آنے والی سہیلیوں کو مطلع کیا:

"راجکماری کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ کسی سے نہیں مل سکتیں!"

چاروں میں سے ایک سہیلی نے کنیز سے کہا:

"ہم جانتے ہیں کہ راجکماری کسی سے نہیں مل سکتیں مگر ہم چاروں کو تو راجکماری نے اپنے ملازم کے ہاتھ بلوایا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ راجکماری نے سختی سے منع کیا ہے کہ کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے۔"

کنیز نے فوراً انکار کر دیا۔

"تم ہمیں نہیں روک سکتیں۔ راجکماری نے ہمیں خود بلایا ہے۔"

لڑکی نے زور دے کر کہا:

"اگر ہم ملے بغیر واپس گئیں تو تمہاری خیر نہیں۔ ہم ان سے صاف کہہ دیں گی کہ پہرے پر موجود کنیز نے ہمیں اندر جانے نہیں دیا تھا۔"

"تم کچھ بھی کہو" کنیز ٹس سے مس نہ ہوئی:

"مگر میں تمہیں اندر نہ جانے دوں گی۔"

اسی وقت راجہ کنا نور وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے کنیز کو سہیلیوں سے جھگڑتے دیکھا تو قریب آ کر بولا:

"کیا بات ہے۔ تم سب کیوں جھگڑ رہی ہو؟"

کنیز نے راجہ کو جواب دیا:

"ان داتا۔ یہ کہہ رہی ہیں کہ راجکماری نے انہیں ملازم بھیج کے بلوایا ہے مگر میرے لیے حکم یہ ہے کہ کسی کو بھی اندر نہ جانے دوں۔"

"ہاں بھئی، تم کیا کہتی ہو؟" راجہ نے چاروں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔

"جی ان داتا۔ ہم سب راجکماری سے ملنے آئی ہیں"۔ ایک سہیلی نے کہا:

"اتنے دن ہو گئے راجکماری اپنے کمرے سے نہیں نکلیں۔ وہ بیمار ہو جائیں گی ان داتا۔"

"ہو گیا جائیں گی۔ وہ بیمار ہے۔"

راجہ نے جواب میں کہا:

"سب وید حکیم اسے دیکھ چکے ہیں۔ کوئی اس کی بیماری جان ہی نہیں سکا۔"

"راجکماری کا علاج ویدوں کے پاس نہیں ہے ان داتا۔" دوسری سہیلی بولی۔ یہ کچھ زیادہ ہی تیز طرار تھی۔

"ہائیں۔ یہ کیا کہا تم نے؟"

راجہ نے چونک کر اسے دیکھا:

"پھر کون کرے گا اس کا علاج؟"

"میں بتاؤں ــــ ان داتا!" اس نے اپنی ساتھی لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں بتا دو"۔ ایک اور سہیلی بولی۔

"راجہ ناراض ہو گئے تو ــ؟" وہ بتانے سے گھبرا رہی تھی۔

راجہ کنا نور ان کی باتوں کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے اعلان کیا:

"جو لڑکی راجکماری کا علاج بتائے گی اسے ہم منہ مانگا انعام دیں گے!"

دوسری لڑکی بڑھ کے راجہ کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی:

"راجہ جی۔ علی کو بلوایئے۔ راجکماری اچھی ہو جائے گی"۔

راجہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"تم لڑکیاں میرے ساتھ آؤ"۔ اس نے کہا۔

راجکماری کی سہیلیاں راجہ کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچیں اور انہوں نے راجہ کو راجکماری اور علی بابا کے امیرزادے کی محبت کی پوری داستان سنا دی اور راجہ سے یہ سفارش کی کہ راجکماری کو ان میں سے کسی کا نام نہ بتایا جائے۔

راجہ نے انہیں تسلی دی اور انعام کا وعدہ کر کے رخصت کر دیا اور خود راجکماری کے کمرے میں پہنچ گیا۔

راجکماری بستر پہ چت لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ راجہ کو اندر آتے دیکھ کر وہ بستر سے اٹھ کر

بیٹھ گئی۔

"کیسی طبیعت ہے راجکماری؟" راجہ نے پوچھا۔

"اچھی ہوں راجہ پتا!" راجکماری نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔

راجہ نے بڑے دکھ سے کہا:

"راجکماری۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے باپ کی محبت پر اعتبار نہیں کیا!"

"جی ـــ" راجکماری نے حیران نظروں سے باپ کو دیکھا۔

"علی ایک زندہ دل جوان ہے۔ وہ ہماری ریاست کے قریب ہی ایک جاگیردار کا بیٹا ہے مگر تم نے ہمیں اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔

راجکماری۔ ہم نے آج تک تمہاری کون سی خواہش پوری نہیں کی۔ تم نے ہم سے کہہ کے تو دیکھا ہوتا ـــ"

راجہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

راجکماری بھی رو پڑی اور باپ کے گلے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ جب رونے سے اس کا دل کچھ ہلکا ہوا تو باپ بیٹی میں گفتگو شروع ہوئی۔

دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر راجہ چلا گیا اور راجکماری کی سہیلیوں کو ملاقات کی اجازت مل گئی۔

سہیلیوں نے بہت گلے شکوے کیے۔ راجکماری کی طبیعت اس وقت بحال تھی۔ وہ سہیلیوں سے ہنس ہنس کے باتیں کرتی رہی۔

سہیلیاں بھی اپنی راجکماری کو پا کے بہت خوش تھیں۔ اتنے دنوں سے ان کا کھانا پینا حرام تھا۔ وہ بہت دیر تک راجکماری سے باتیں کرتی رہیں۔

سہیلیاں جانے لگیں تو راجکماری نے کہا:

"کل صبح ذرا جلدی آنا۔"

"کیوں۔ خیریت تو ہے؟" ایک سہیلی نے پوچھا۔

"ہاں۔ خیریت ہے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔ تم سب میرے ساتھ چلو گی۔" یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

"کہیں علی کے پاس جانے کا ارادہ تو نہیں؟" ایک سہیلی راز پا گئی۔

راجکماری ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی نے سہیلی کے خیال کی تصدیق کر دی۔

دوسرے دن صبح کو دو گاڑیاں راج محل کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ ایک گاڑی کھلی تھی اور دوسری پہ پردے پڑے ہوئے تھے۔

ایک گاڑی پہ راجکماری سوار ہوئی اور اس کے ساتھ چار مسلح عورتیں بیٹھ گئیں۔ دوسری گاڑی میں راجکماری کی سہیلیاں تھیں۔

گاڑیوں کے ساتھ چار مسلح سوار تھے جن کی پگڑیوں پہ ریاست کنانور کے ریاستی نشان لگے تھے۔

راجہ کنانور راجکماری کو رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔

دو گاڑیوں اور چار سواروں پر مشتمل یہ مختصر قافلہ کنانور سے صبح کے وقت روانہ ہوا اور شام کے وقت کنانور کی سرحد پار کر کے علی کی زمینداری میں داخل ہوا۔

دوسری سرحد میں داخل ہوتے ہی دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ چار سواروں میں سے ایک سوار آگے بڑھا۔ اس نے ایک شخص سے علی کا پتہ پوچھا اور گھوڑا بھگاتا ہوا نصف گھنٹے میں علی کی حویلی پہ پہنچ گیا۔

علی گھر پہ موجود نہ تھا۔

سوار اس کے والد کے سامنے پیش ہوا اور بڑے ادب سے کہا:

"ریاست کنانور کی راجکماری آپ کی زمینداری میں تشریف لائی ہیں۔ وہ اس وقت آپ کی حدود میں داخل ہو چکی ہیں اور یہاں آنے کے لیے آپ کی اجازت چاہتی ہیں!"

علی کے والد کنانور کا نام سنتے ہی معاملہ کی تہ کو پہنچ گئے تھے۔ علی نے انہیں بتا دیا تھا کہ کنانور کے محافظوں نے اسے کنانور میں داخلے سے روک دیا ہے۔

انہوں نے بڑے اخلاق سے سوار کو جواب دیا:

"زہے نصیب۔ راجکماری کی آمد ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

یہ کہہ کے علی کے والد نے اپنا گھوڑا منگایا اور پانچ سواروں کے ساتھ راجکماری کے استقبال کو جانے کے لیے تیار ہوئے۔

اسی وقت علی بھی آ گیا۔ اس نے باپ کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا مگر باپ نے اسے محبت سے

سمجھا کے روک دیا۔ چنانچہ علی کے والد راجکماری کے استقبال کے لیے کنانور کے سوار کے ساتھ سرحد کی طرف چلے۔

راجکماری بڑی بے چینی سے علی کے آنے کا انتظار کر رہی تھی مگر جب علی کے بجائے استقبال کے لیے اس کے والد آئے تو وہ بہت مایوس ہوئی۔ پھر بھی اس نے گاڑی سے اتر کر علی کے والد کو ادب سے سلام کیا۔

علی کے والد نے راجکماری کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی۔ راجکماری نے پوچھا:

"علی کیسے ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ نہیں آئے؟"

"علی بالکل اچھا ہے۔ جہاں تک اس کا میرے ساتھ آنے کا تعلق ہے تو وہ آنے کا خواہش مند تھا مگر میں نے خود ہی روک دیا"۔

علی کے والد نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا:

"میرے روکنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے سرحدی محافظوں نے اسے کنانور میں داخلے سے روک دیا ہے۔ اس لیے میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ آپ سے اس سلسلے میں گفتگو سے پہلے اسے یہاں لاؤں"۔

"میرے محافظوں نے علی کو روکا تھا؟"

راجکماری نے کمالِ حیرت سے کہا:

"مجھے اس واقعہ کا کوئی علم نہیں"۔

"میں درست کہہ رہا ہوں راجکماری"۔ علی کے باپ نے کہا:

"وہ روزانہ کنانور جایا کرتا تھا مگر ایک دن کنانور کے محافظ سواروں نے اسے روک کے کہا کہ اسے کنانور میں داخلے کی اجازت نہیں۔ نیز اسے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ کنانور میں بغیر اجازت کے داخل ہوا تو اسے نقصان پہنچ سکتا ہے"۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں"۔ راجکماری نے ان کی بات کی تائید کی:

"لیکن علی کے کنانور میں داخلے کو روکنے کا حکم میرے راج بابا نے ہرگز نہیں دیا۔ اگر انھوں نے یہ حکم دیا ہوتا تو آج وہ مجھے خود آپ کے پاس نہ بھیجتے"۔

"ممکن ہے یہ حرکت کنانور کے کسی اور بااثر آدمی نے کی ہو جو علی کا آپ سے ملنا پسند نہ کرتا ہو"۔

علی کے والد نے اپنا خیال ظاہر کیا:

"میں امید کرتا ہوں کہ یہاں گفتگو کرنے سے یہ بات زیادہ بہتر ہوگی کہ آپ غریب خانہ کو

رونق بخش کے مجھے مہمان نوازی کا شرف عطا فرمائیں۔ اس عزت افزائی کے لیے میں اور میرا بیٹا آپ کے شکر گزار رہیں گے"۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میرے لیے یہاں تک آنے کی تکلیف گوارا کی"۔

راجکماری نے جو اس زمانے کے مروّجہ علوم سے آراستہ تھی، متبسم انداز میں کہا۔

"بیٹیاں باپ کے گھر آنے پر شکریہ ادا نہیں کرتیں راجکماری"۔ یہ کہہ کر علی کے والد نے اسے بند گاڑی میں سوار کرایا۔

خوبصورت مہمان کے اس قافلہ کو منزل پر پہنچتے پہنچتے کافی رات گزر چکی تھی مگر وہاں علی نے راجکماری کے استقبال کے لیے جشن کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ہر طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور پوری آبادی جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔

راجکماری کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ علی، اس کے دوستوں اور معززین نے اسے خوش آمدید کہا اور اسے ایک آراستہ و پیراستہ حویلی میں اتارا گیا۔

قارئین کرام!

آپ شاید ان باتوں اور تفاصیل کو شاعرانہ خیال آرائی یا کوئی افسانوی بیان سمجھ رہے ہوں مگر ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے اور سلطنتِ خداداد میسور کی تمام تاریخیں اس بات کی شاہد ہیں کہ مالپلہ پالیگار کے ایک امیرزادے علی اور راجہ کنانور کی بیٹی کے درمیان بالکل یہی واقعات پیش آئے تھے جن کا ذکر اس باب میں کیا جا رہا ہے۔

قارئین اس بات کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ اب تک جو واقعات اس داستانِ عشق میں بیان کیے گئے ہیں وہ اس قدر حیرت انگیز نہیں جتنے آئندہ پیش آنے والے ہیں۔ مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ امیرزادے علی اور راجکماری کنانور کی داستانِ محبت، دنیا کی چند معروف سچی عشقیہ داستانوں میں سے ایک ہے۔

امید ہے آپ مجھے اس جملہ معترضہ کے لیے معاف فرمائیں گے اور آئیے اب آگے کے حالات ملاحظہ کیجیے۔

⁂

راجکماری کنانور کو جس حویلی میں ٹھہرایا گیا تھا اس حویلی کا ایک طویل و عریض باغیچہ تھا جسے محلات کے پائیں باغ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ یہ پائیں باغ بھی روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

پہلے راجکماری کو کھانا دیا گیا۔ یہ رات کا کھانا نہیں تھا بلکہ نصف شب گزرنے کے بعد کھانا لگایا گیا تھا۔ راجکماری کنانور صرف تعلیم یافتہ ہی نہ تھی بلکہ مجلسی قواعد و قوانین سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھی جسے ہم آج کی زبان میں مہذب یا کلچرڈ کہتے ہیں۔

کھانے یا دعوت میں علی، اس کا باپ اور آبادی کے تمام معتبرین اور معززین شامل تھے اور راجکماری انتہائی بے تکلفی سے دعوت میں شامل تھی۔ امیرزادہ علی اس کے بالکل مقابل بیٹھا تھا اور علی کے والد راجکماری کے برابر بیٹھے تھے۔

یہ شاندار دعوت مسکراہٹوں اور قہقہوں کے درمیان ختم ہوئی۔ کھانے کے بعد تمام لوگ پائیں باغ میں جا بیٹھے۔ علی اور راجکماری بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔

وہاں بھی دیر تک دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ راجکماری کی ذہانت اور علمیت بھری گفتگو نے حاضرین کو بہت متاثر کیا۔

رات کافی جا چکی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ صرف راجکماری اور علی باقی رہ گئے۔ ان کے دل زور زور سے اچھل رہے تھے۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور راہداریوں میں مسلح خواتین پہرہ دے رہی تھیں۔ گفتگو کا آغاز راجکماری نے کیا۔

"علی!"

راجکماری نے اس قدر محبت سے کہا کہ علی کا دل تڑپ اٹھا:

"میں تو یہ سمجھی تھی کہ تم نے مجھ سے بے وفائی کی اور اپنے آدمیوں کے منع کرنے پر تم نے کنانور آنا چھوڑ دیا مگر تمہارے والد نے تو اس کی کچھ اور ہی وجہ بیان کی۔"

علی جو اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، بولا:

"تو تمہیں ابا جان کی بات کا یقین آیا کہ نہیں؟"

"یقین تو آ گیا"۔ راجکماری نے جواب دیا:

"جب میں سوچتی تھی کہ علی نے بے وفائی کی تو ایک دم میرے دل سے آواز اٹھتی کہ نہیں نہیں

علی ایسا نہیں ہے۔ اس لیے مجھے یقین نہ آتا تھا مگر جب ہفتہ بھر سے زیادہ گزر گیا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی"۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ تم اک دم کیسے آ گئیں؟" علی نے دریافت کیا۔

"تمہارے ابا جان نے بتایا نہیں تمہیں"۔

راجکماری نے جواب دیا:

"تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے پتا راجہ کنانور کی اجازت سے آئی ہوں"۔

"یہ تو بتایا تھا مجھے ابا جان نے"۔ علی نے کہا:

"مگر تمہارے پتا نے تمہیں اجازت کیسے دے دی۔ نائروں اور مسلمانوں میں تو ہمیشہ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے"۔

"یہ سب ٹھیک ہے علی مگر راجہ کنانور بڑے فراخدل ہیں"۔

راجکماری نے بتایا:

"تمہارے نہ آنے سے میں بیمار ہو گئی تھی"۔

"واقعی بیمار ہو گئی تھیں یا راجہ کو دکھانے کے لیے مکر کیا تھا"۔ علی نے مسکرا کر بات کاٹی۔

"ٹھیک ہے اڑا لو میرا مذاق"۔

راجکماری نے منہ بنایا:

"بس اب اس معاملہ پر کوئی گفتگو نہیں ہو گی"۔

راجکماری ناراض ہو گئی۔

"ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔ اچھا معاف کر دو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں"۔ علی نے ایسی محبت سے کہا کہ راجکماری مسکرا دی اور اس کی ساری ناراضگی دور ہو گئی۔

"ہاں اب بتاؤ۔ تم بیمار ہو گئیں . . . . . پھر کیا ہوا؟" علی نے پوچھا۔

"میں بیمار ہوئی تو جیسے پورا محل اور کنانور کی پوری آبادی بیمار ہو گئی"۔

راجکماری نے بتانا شروع کیا:

"پتا جی نے راج محل سے نکلنا چھوڑ دیا۔ تمام تقریبات، محفلیں، مجلسیں بند۔ رعیت نے شادیوں کی تاریخیں آگے بڑھا دیں۔

مجھے دو حکیموں نے گھیر لیا۔ کوئی نبض دیکھتا تو کوئی آنکھوں میں جھانکتا مگر میرا مرض کسی کے

پلے نہ پڑا۔"

"مگر تمہیں مرض کیا تھا؟" علی نے پھر اس کی بات کاٹی اور ساتھ ہی مسکرایا بھی۔

"پھر چھیڑا تم نے۔" راجکماری پھر ناراض ہوئی:

"جاؤ۔ میں کچھ نہیں بتاتی۔"

"اچھا اچھا۔ اس بار اور معاف کر دو۔ اب بات نہیں کاٹوں گا۔" عاشقِ صادق نے حسن کے حضور معافی نامہ پیش کیا جو فوراً قبول ہوا۔

راجکماری ہنس دی اور بات پھر وہیں سے شروع کی:

"وید اور حکیم مرض جاننے میں ناکام ہو گئے تو راجہ کنانور پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دوسری طرف میری سہیلیوں کا میرے بغیر برا حال تھا۔ میں نے ان سے ملنا جلنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا۔ دن رات اپنے کمرے میں گھسی رہتی اور تم کو کوسنے اور گالیاں دیتی رہتی تھی۔"

"ہائے ہائے۔ کیسی پُر درد داستان ہے راجکماری کنانور کی۔" علی نے بیچ میں لقمہ دیا۔

"تم تو بے فکر تھے نا۔" راجکماری چڑ گئی:

"دوستوں کے ساتھ خوب گھومتے پھرتے ہو گے۔"

"قسم لے لو راجکماری جو ایک دن بھی کسی دوست کے ساتھ گیا ہوں۔"

علی سنجیدہ ہو گیا:

"جس دن مجھے کنانور کی سرحد پر روکا گیا تھا میرا دل چاہتا تھا ان سے لڑ بھڑ کر اپنی جان ختم کر دوں مگر فوراً خیال آیا کہ میری اس حرکت سے تم بدنام نہ ہو جاؤ۔ اس لیے دل مسوس کر رہ گیا اور چپ چاپ واپس آ گیا۔"

"ارے ہاں۔" راجکماری کو جیسے کچھ یاد آ گیا:

"یہ تو بتاؤ۔ تمہیں روکا کس نے تھا۔ کتنے آدمی تھے وہ؟"

"چار سواروں نے مجھے گھیرا تھا۔ کچھ سوار دور پر کھڑے تھے۔" علی نے بتایا:

"انہوں نے کہا کہ تمہیں کنانور میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"سواروں کی پگڑیوں پر ریاستی نشان تھا؟"

"میں کنانور کے ریاستی نشان کو پہچانتا ہوں۔ وہ سرکاری سوار نہیں تھے۔ نہ ان کی پگڑیوں پر

ریاستی نشان تھے۔"

علی نے راجکماری کو مزید بتایا:

"مجھے بھی شبہ ہوا تھا کہ یہ کوئی اور لوگ ہیں مگر میں نے تمہاری سرحد میں جھگڑا کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس آ گیا۔"

راجکماری سوچتے ہوئے بولی:

"یہ تو طے ہے کہ وہ ریاستی لشکر کے سوار نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو پتاجی مجھے ضرور بتاتے۔ بہرحال علی! تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ پتاجی تمہیں بالکل اسی طرح پسند کرتے ہیں جیسے میں۔"

"کیا سچ؟" علی نے حیرانی سے پوچھا۔

"سچ نہیں تو اور کیا جھوٹ۔"

راجکماری مسکرائی:

"انہوں نے ہی تو مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔" علی بڑی مسرت سے بولا:

"ابا جان تمہارے آنے سے جس قدر خوش ہیں اسی قدر پریشان بھی ہیں۔ میں یہ بات انہیں بتاؤں گا تو وہ خوش ہو جائیں گے۔"

اسی وقت چار کنیزیں ان کی طرف آئیں۔ ایک علی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دوسری کنیزیں راجکماری کے پاس پہنچ کے رک گئیں۔

علی نے متجسس نظروں سے کنیز کو دیکھا۔

کنیز نے ادب سے کہا:

"آقا آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ فرمایا ہے کہ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ آ کے آرام کریں۔"

علی نے "اچھا" کہہ کر راجکماری کی طرف دیکھا۔

راجکماری کے پاس کھڑی کنیزوں میں سے ایک نے کہا:

"راجکماری صاحبہ۔ آپ کو زنانخانے میں بلایا جا رہا ہے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ بھی چل کے آرام فرمائیے۔"

راجکماری نے پلٹ کر علی کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی اس کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور سنجیدہ ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ ان دونوں کے سونے کا الگ الگ انتظام

کیا گیا ہے۔
رات راجکماری زنان خانے میں خواتین کے ساتھ سوئی اور علی مردانے میں باپ کے ساتھ سو۔
صبح ہوئی تو راجکماری کی واپسی کی تیاری شروع ہو گئی۔

علی صبح ہی سے گھبرایا ہوا پھر رہا تھا کہ کسی طرح راجکماری سے دو منٹ گفتگو کا موقع مل جائے
مگر خواتین راجکماری کو گھیرے ہوئے تھیں۔
وقت گزرتا جا رہا تھا اور علی کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔ پھر اطلاع آئی کہ راجکماری کی سواری تیار ہے۔
علی نے ایک جاتی ہوئی کنیز کو روک لیا:
"تم میرا ایک کام کرو گی؟" اس کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔
"کام کیوں نہیں کروں گی امیر زادے۔ آپ کی کنیز ہوں"۔ کنیز نے ادب سے جواب دیا۔
"راجکماری کو جانتی ہو۔ وہی جو سامنے کھڑی ہیں"۔ علی نے اشارے سے بتایا۔
"انہیں کون نہیں جانتا۔ وہ تو ہماری مہمان ہیں اور ـــ" کنیز گھبرا کے چپ ہو گئی۔
"ان سے جا کے کہو کہ میں بلا رہا ہوں"۔ علی نے جلدی سے کہا۔
"ابھی کہتی ہوں ـــ" کنیز نے قدم بڑھائے۔
"سنو تو ـــ" علی نے اسے پھر روک لیا۔
"فرمائیے سرکار"۔
"آہستہ سے کہنا۔ کوئی اور نہ سننے پائے"۔
"مگر سرکار ـــ"
"مگر اگر نہیں۔ جیسا میں نے کہا ہے وہ کرو"۔
کنیز ہوشیار تھی۔ وہ راجکماری کے پاس پہنچی اور موقع پا کر سرگوشیوں میں علی کا پیغام پہنچا دیا۔
راجکماری نے کنکھیوں سے علی کی طرف دیکھا۔
"میں ابھی آئی" راجکماری نے کہا اور تیزی سے چلتی ہوئی علی کے پاس پہنچ گئی۔

علی راجکماری کو لے کر ایک طرف ہٹ بیٹھ ہو گیا۔
"تم مجھے تو بالکل ہی بھول گئیں"۔ اس نے شکایت کی۔
"کیا کروں میں۔ عورتیں چھوڑتی ہی نہیں"۔
"یہ بتاؤ۔ اب کب ملاقات ہو گی"۔ علی بہت پریشان تھا۔
"پتاجی نے تمہارے ابا جان کو بلایا ہے۔ میں نے انہیں کنانور آنے کی دعوت دے دی ہے"۔ راجکماری نے بتایا۔
"کیا مجھے بھی بلایا گیا ہے؟"
"نہیں۔ ابھی نہیں"۔
پھر چاروں طرف سے راجکماری، راجکماری کی آوازیں آنے لگیں اور وہ تیز تیز قدموں سے اُدھر چلی گئی۔
راجکماری ایک ایک سے گلے مل کے رخصت ہوئی۔ علی کے والد نے راجکماری کے سر پہ ہاتھ پھیر کر اسے بہت سی دعائیں دیں۔ علی دور ہی کھڑا رہا۔
راجکماری بند گاڑی میں سوار ہوئی۔ پھر دونوں گاڑیاں کنانور کے محافظ سرداروں کے پہرے میں روانہ ہوئیں۔
راجکماری پردہ ہٹا کر تاحدِ نظر ہاتھ ہلاتی رہی۔ اس طرح ایک رات کا مہمان رخصت ہو گیا اور علی کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔
"میں پرسوں کنانور جا رہا ہوں"۔ اس کے والد کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔
"جی ـــ" گھبراہٹ میں علی کے منہ سے نکل گیا:
"جی ہاں آپ کنانور جا رہے ہیں"۔
اس کے والد نے اسے گھورا:
"تمہیں کس سے معلوم ہوا"۔
علی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بات بنانے کے لیے بولا:
"جی وہ۔ آپ ہی نے تو بتایا ہے ابھی ـــ"
پھر رک کے کہا:
"کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا"۔

"ابھی نہیں۔ راجہ کنانور نے صرف مجھے دعوت دی ہے۔" والد نے صاف کہہ دیا۔

تیسرے دن علی کے والد بھی صرف چار سواروں کو لے کر کنانور روانہ ہو گئے۔ انہیں رخصت کرنے کے لیے علی کے علاوہ علاقہ کے تمام بڑے بڑے رئیس موجود تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ماپلہ یا لیگار کسی نائر راجہ کے بلاوے پر صرف چار سواروں کے ساتھ اس کے پاس جا رہا تھا مگر کسی بھی شخص نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ اس لیے کہ نائر راجکماری بھی تنہا ایک ماپلہ امیرزادے کے گھر بے خوف و خطر آ گئی تھی۔

راجہ کنانور کو علی کے والد کی آمد کی اطلاع ایک قاصد کے ذریعے ایک دن پہلے مل گئی تھی۔ اس نے مہمان کے استقبال کا انتظام کیا اور جب علی کے والد کنانور کے محل پر پہنچے تو راجہ کنانور اور اس کے تمام معزز درباریوں نے مسلمان ماپلہ رئیس کا بڑی خوشدلی سے استقبال کیا۔ راجہ کے درباریوں نے ماپلہ رئیس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور اس پر زر و جواہر نچھاور کیے۔

علی کے والد کنانور والوں کے رویہ سے بہت خوش ہوئے۔ راجہ نے انہیں اپنے محل میں اتارا۔ پھر رات کے کھانے سے پہلے راجکماری نے علی کے والد سے ملاقات کی اور انہیں خوش و خرم دیکھ کے وہ بہت خوش ہوئی۔

پھر چلتے وقت اس نے علی کے والد سے کہا:

"آپ علی کے ابا جان ہیں۔ میں بھی آپ کو اپنے پتا جی کے مانند سمجھتی ہوں اس لیے آپ سے ایک درخواست ہے۔ امید ہے آپ اسے قبول فرمائیں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو راجکماری۔ تمہاری درخواست سننے سے پہلے ہی میں قبول کرتا ہوں۔" علی کے والد جذباتی ہو گئے:

"یہ بات میرے تصور میں بھی نہ تھی کہ نائر راجہ اور ان کے درباری مجھے اس قدر عزت بخشیں گے۔"

"ابا جان!" راجکماری بھی جذباتی ہو گئی:

"جو لوگ عزت کے قابل ہوتے ہیں وہ کوئی بھی ہوں اور کہیں کے بھی ہوں ان کی عزت ضرور کی جاتی ہے۔ میری آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ پتا جی آپ سے جس بات کے لیے کہیں آپ اسے

فوراً مان لیں۔ کسی بات میں بحث نہ کریں۔

میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے پتا جی آپ کے سامنے کوئی ایسی شرط نہیں رکھیں گے جس سے آپ کو نقصان پہنچنے کا امکان ہو۔"

"ٹھیک ہے بیٹی!" علی کے والد نے کہا:

"میں ایسا ہی کروں گا۔"

کھانے پر صرف راجہ کنانور اور علی کے والد تھے۔ انہیں تعجب تھا کہ راجہ کنانور نے کسی اور کو کھانے پر کیوں نہیں بلایا۔ پھر وہ یہ سوچ کے مطمئن ہو گئے کہ شاید راجہ ان سے راجکماری اور علی کے متعلق کچھ بات کرنا چاہتا ہو۔

کھانا شروع ہوا۔ راجہ کنانور اور علی کے والد آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ علی کے والد انتظار میں تھے کہ راجہ اب بات شروع کرے گا مگر راجہ دیر تک کچھ نہ بولا اور علی کے والد نے گفتگو میں پہل کرنا مناسب نہ سمجھا۔

کھانے کے بعد راجہ اور علی کے والد مہمان خانہ میں جا بیٹھے۔ راجہ نے اپنے غلام خاص کو حکم دیا کہ وہ کسی کو اندر نہ آنے دے۔ غلام سلام کر کے باہر چلا گیا۔

راجہ کنانور نے علی کے والد کی طرف دیکھا۔ چند منٹ دیکھتے رہنے کے بعد وہ ایک دم بولا:

"علی آپ کا بیٹا ہے؟" انداز سوالیہ تھا۔

علی کے والد نے جواب دیا:

"بے شک۔ علی میرا ہی بیٹا ہے۔"

"راجکماری کنانور میری بیٹی ہے؟" اس بار بھی انداز سوالیہ تھا۔

علی کے والد نے پہلے ہی کی طرح جواب دیا:

"بے شک راجکماری راجہ کنانور کی بیٹی ہے۔"

"علی خوبصورت اور ایک عالی ظرف جوان ہے۔"

"میں راجہ کنانور کے خیال کی تائید کرتا ہوں۔"

"اور راجکماری کنانور ---؟"

"وہ میرے لیے دنیا کی تمام دوشیزاؤں سے زیادہ خوبصورت اور پیاری ہے۔" علی کے والد نے فوراً جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک" راجہ مسرت سے بولا:

"اب میں آپ سے علی کو مانگتا ہوں"۔

"مجھے کوئی عذر نہیں۔ علی آپ ہی کا ہے"۔

"اب آپ راجکماری کو مجھ سے مانگیے"۔ راجہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اے کنانور کے عظیم راجہ۔ میں راجکماری کو اپنی بیٹی بنانا چاہتا ہوں"۔ علی کے والد نے بھی بیٹے کا پیغام دیا۔

راجہ کھڑا ہو گیا۔ علی کے والد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

راجہ نے کہا:

"اے میرے دوست۔ ماپلہ پالیگار امیر۔ میں نے یہ رشتہ قبول کیا"۔

علی کے والد نے کہا:

"اے راجہ کنانور آپ نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ میں خوش ہوں مگر آپ افسردہ نہ ہوں — راجکماری ہمیشہ آپ کے پاس رہے گی۔ میں اسے آپ سے جدا نہیں ہونے دوں گا"۔

"اے پالیگار امیر!"

راجہ کنانور کی آواز بھرا گئی:

"راجکماری میرے پاس رہے گی نہ علی تمہارے پاس۔ وہ دونوں اپنی ریاست کنانور میں رہیں گے۔ میں راجکماری کے جہیز میں کنانور کی ریاست اس کو دے کر تیرتھ یاترا (زیارتوں) پر چلا جاؤں گا۔ علی راجہ کنانور اور راجکماری، رانی کنانور کی حیثیت سے یہاں رہیں گے"۔

علی کے والد یہ سن کر سناٹے میں آ گئے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ راجہ کنانور اپنے خیالوں میں ڈوبا رہا۔

علی کے والد اس انتظار میں تھے کہ راجہ بتلائے کہ وہ علی اور راجکماری کی شادی کو پایۂ تکمیل تک کس طرح پہنچائے گا۔ نائروں اور ماپلہ پالیگاروں میں آئے دن جھگڑے فساد ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ پھر اس صورت حال میں بظاہر تو یہ ملاپ ممکن نظر نہ آتا تھا۔

آخر راجہ کنانور اپنے خیالوں سے چونکا اور اس نے بڑی سنجیدگی سے علی کے والد کو مخاطب کیا:

"آپ کے خیال میں علی اور راجکماری کی شادی کی رسومات کس طرح ادا ہونی چاہییں؟"

"میں ہر طرح آمادہ ہوں۔ جس طرح آپ مناسب سمجھیں وہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے"۔

راجہ کنانور نے کہا:

"مشرقی ممالک میں عام طور سے دولہا کے گھر سے بارات چڑھتی اور دلہن کے گھر جاتی ہے اور وہیں شادی کی رسومات ادا ہوتی ہیں"۔

"جی ہاں۔ ہونا تو ایسا ہی ہے"۔ علی کے والد نے تائید کی۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ بارات لے کر آئیے۔ ہم رسومات ادا کر کے راجکماری کو علی کے ساتھ رخصت کر دیں گے مگر علی کو دوسرے دن راجکماری کے ساتھ کنانور واپس آنا ہوگا"۔ راجہ کنانور نے مختصر تفصیل بتائی۔

"ہوتا تو ایسا ہی ہے لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ہی دن واپس آنے میں راجکماری کو تکلیف ہوگی۔ سفر کی تکان بھی نہ اترے گی کہ پھر سفر درپیش ہوگا۔ کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ راجکماری اور علی ہفتہ دو ہفتہ کے بعد کنانور واپس آئیں"۔

علی کے والد کی تجویز معقول تھی۔ اتنے طویل سفر سے دلہا دلہن کی صحت پر خراب اثر پڑنے کا بہت امکان تھا۔

مگر —

راجہ کنانور نے اس کی سخت مخالفت کی۔

"نہ میرے دوست۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا"۔ اس نے کہا:

"شادی کی صبح یعنی دوسرے دن مجھے علی کی بحیثیت راجہ کنانور تاجپوشی کرنا ہے۔ یہ پروگرام تو کسی صورت منسوخ نہیں کیا جا سکتا"۔

علی کے والد کے ذہن سے تاجپوشی والی بات تو بالکل ہی نکل گئی تھی۔ اس مسئلہ پر انہیں راجہ سے تفصیلی گفتگو کرنا تھی۔

علی کے والد نے کہا:

"اے کنانور کے عظیم راجہ۔ کیا آپ کو امید ہے کہ آپ کی نائر رعایا راجکماری کی ایک ماپلہ امیر زادے کے ساتھ شادی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی؟"

راجہ کنانور ہنس پڑا۔ اس نے اپنی لانبی مونچھوں کو تاؤ دیا:

"ماپلہ امیر! میں پالیگار نہیں بلکہ کنانور کا راجہ ہوں۔ یہاں کا دھرماتما ہوں۔ جو حکم ہو

وہی ہوگا۔ میری مخالفت کرنے والا کنانور کی سرزمین پر سانس نہ لے سکے گا"۔

علی کے والد کو مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ راجہ کنانور کے عزم و حوصلہ سے مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے دوسری بات چھیڑی:

"بارات میں کتنے آدمی ہونے چاہییں؟"

راجہ کنانور دوبارہ ہنسا:

"اے امیر! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بارات کسی کے گھر نہیں بلکہ ریاست کنانور آ رہی ہے۔ اس ریاست میں جتنی زمین ہے اور اس پر جتنے آدمی سما سکتے ہیں آپ لے آیئے، ہم سر آنکھوں پر بٹھائیں گے"۔

علی کے والد پھر راجہ کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ پھر کچھ سوچ کے بولے:

"بارات کس دن یہاں پہنچنا چاہیے؟"

"جس قدر جلد ممکن ہو سکے بارات لے آیئے تاکہ میں اس فرض کو ادا کر کے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں"۔

راجہ نے یہ بات بھی علی کے والد پر چھوڑ دی:

"آج پیر وار ہے۔ مناسب ہو تو اگلے پیر وار کو بارات لے آیئے۔ ہم ہمہ وقت آپ کی آمد کے منتظر ہیں"۔

تمام معاملات بغیر حیل و حجت کے طے پا گئے۔

سچ ہے اگر دونوں فریق کسی فیصلے پر پہنچنے کے آرزومند ہوں تو ان کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر دلوں میں کھوٹ ہو تو ہر بات میں کوئی نہ کوئی پیچ نکل آتا ہے۔

علی کے والد کا خیال تھا کہ انہیں اس اہم معاملے کو طے کرنے میں نہ معلوم کتنے دن لگ جائیں۔ مگر سارے معاملات ایک ہی دن میں طے پا گئے اور دوسری صبح وہ اپنی بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔



ماپلہ پالیگار امیرزادے سے علی کی بارات بڑی دھوم دھام سے چڑھی۔

اتوار کے دن علی کی سہرا بندی ہوئی۔ پھر کم و بیش بارہ سو آدمیوں کی بارات کنانور کی طرف روانہ ہوئی۔

بارات کیا تھی ایک چلتی پھرتی بستی معلوم ہوتی تھی۔ لوگ چھوٹی بڑی گاڑیوں پر سوار تھے۔ زیادہ آدمی گھوڑوں پر تھے اور ایک کے بجائے دو دو بیٹھے تھے۔

فاصلہ طویل تھا اس لیے خواتین کو بارات میں جانے سے روک دیا گیا تھا۔ راجہ کنانور کی طرف سے عورتوں کے لیے کوئی پابندی نہ تھی۔ اس نے تو خواتین کے آنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور ان کی حفاظت کے لیے ریاستی فوج کو علی کی بستی تک بھیجنے کی پیش کش کی تھی مگر علی کے والد نے احتیاط کے طور پر خواتین کو بارات میں جانے سے منع کر دیا تھا۔

دولہا علی کو آٹھ گھوڑوں والی گاڑی میں سوار کیا گیا جس میں اس کے تمام دوست سوار تھے۔ اس گھوڑا گاڑی کو جھنڈیوں، کاغذی اور اصلی پھولوں سے سجایا گیا تھا۔

بارات کے ساتھ بہت سے خوانچہ فروش بھی ہو لیے تھے جن کے پاس ایسے مواقع کی تمام ضروری چیزیں موجود تھیں۔ وہ بارات کے ساتھ آوازیں لگاتے چل رہے تھے۔

ایک عجب شان تھی اس بارات کی!

بارات عجب اس لیے تھی کہ یہ دو مخالف قوموں کی تہذیب و تمدن کے درمیان کا ایک پشتہ تھا ایک راستہ تھا۔ ایک پُل تھا۔ یہ شادی دو قوموں کے ملاپ کا سبب بن سکتی تھی اور اختلاف کی صورت میں ایک مہیب جنگ کا پیش خیمہ بھی بن سکتی تھی۔

اس دور میں تیراندازی اور شمشیرزنی کا عام رواج تھا۔ توڑے دار بندوقیں بھی تھیں مگر ان کا رواج کم تھا۔ ہر باراتی شمشیر اور تیر کمان سے آراستہ تھا۔ علی کے والد کے دل میں جو وسوسے تھے وہ راجہ کنانور کی گفتگو سے تقریباً ختم ہو چکے تھے مگر پھر بھی ان کے کسی کونے سے ایک نامعلوم خوف جھانکتا تھا۔

راجہ کنانور اپنے عمائدین اور معززین کے ساتھ بارات کے استقبال کے لیے شہر سے ۵ میل آگے بڑھ آیا تھا۔ اس کے ساتھ تقریباً ۲۰۰ امرا، رؤسا اور عمائدین ریاست آئے تھے۔ ان سب کے لیے چھولداریاں اور خیمے لگا دیے گئے اور وہاں بھی خیموں کی ایک بستی آباد ہو گئی تھی۔

یہ کوئی افسانوی شادی نہیں بلکہ حقیقی اور تاریخی شادی تھی۔ دونوں طرف کے باراتیوں کے دل اگرچہ کبھی کبھی دھڑک اٹھتے تھے مگر وہ اس بات سے خوش تھے کہ اس شادی کے نتیجے میں نائر اور ماپلہ قوموں کی روزانہ کی چھیڑ چھاڑ اور لوٹ مار میں یقینی کمی واقع ہو جائے گی۔

پھر جب دو مختلف تہذیبوں اور قوموں کا ایک مقام پر ملاپ ہوا تو وہ تاریخی منظر بھی دیکھنے

کے قابل تھا۔

یہ رات کا کوئی پہر تھا مگر دونوں طرف سے روشنی کا اس قدر معقول انتظام کیا گیا تھا کہ رات پہ دن کا شبہ ہوتا تھا۔

استقبال کرنے والے اپنے خیموں سے نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے تھے۔ دوسری طرف بارات گاڑیوں اور گھوڑوں سے اتری۔

جب یہ دونوں تو ملیں، دو تہذیبیں مقابل ہوئیں تو سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ بارات کے ساتھ آنے والے تقریباً تمام ماپلہ تھے، جن کا لباس کنانور کے استقبال کرنے والوں سے بالکل مختلف تھا۔

مگر —

جب استقبال کرنے والے، باراتیوں کے گلے میں ہار ڈال کے ان سے گلے ملے تو ملاپ، محبت اور دوستی کا جیسے سمندر ابل پڑا۔

وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو چوما اور بعض نے تو ایک دوسرے کے منہ تک چوم لیے۔

علی کے والد اور راجہ کنانور تو ایسی چھپٹی مار کے گلے ملے کہ جب تک لوگوں نے انہیں الگ نہ کیا وہ ایک دوسرے سے چمٹے ہی رہے

بارات کو یہاں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرایا گیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی کا وافر انتظام تھا اور تھکن دور کرنے کے لیے دور دور تک فرش بچھا دیے گئے تھے۔ پھلوں اور میووں کا بھی انتظام تھا۔ باراتی منہ ہاتھ دھو کر کمر ٹکا کے فرش پر لیٹ گئے۔ اس وقت پھلوں اور میوہ جات کے خوان ان کے سامنے رکھے گئے۔ یہ رات کا ناشتہ تھا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بارات دوبارہ روانہ ہوئی۔

اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ بارات کے ساتھ آنے والے تمام لوگوں، جن میں خوانچہ فروش بھی تھے، سب کی یکساں طور پر خاطر مدارات کی گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ علی کے والد، علی اور راجہ کنانور باراتیوں کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھے اور ان کے ساتھ پھل اور میووں سے لطف اٹھایا۔

کنانور شہر میں استقبال کرنے والوں کا ایک اژدہام تھا۔ علی کے والد کے تمام وسوسے اور شبہات غلط ثابت ہوئے۔ ان کا یوں استقبال کیا گیا جیسے ماپلہ اور نائر ایک ہی قوم کے باشندے

ہوں۔

راجکماری اور علی کی شادی کی تشہیر پورے کنانور میں ڈھول اور تاشوں کے ذریعے کی گئی تھی تین روز تک پورے کنانور میں چولہا جلانے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جس گھر سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا اس گھر کے رہنے والوں پر جرمانہ کیا جائے گا۔

راجہ کی طرف سے کنانور کی پوری آبادی کی دعوت تھی۔ سب کو دعوت میں صبح و شام شریک ہونا تھا۔ بچوں، عورتوں اور گھر آنے والے مہمانوں کے لیے گھروں پہ کھانا پہنچانے کا انتظام تھا۔

بارات پہنچی تو منڈپ تیار تھا۔

دور دور تک فرش بچھا تھا۔ شامیانے لگے تھے۔ درمیان میں ایک الاؤ جل رہا تھا جس میں خوشبوئیں ڈالی گئی تھیں اور فضا مہک رہی تھی۔

الاؤ کے ایک طرف لمبے موٹے تازے پنڈت صرف دھوتی باندھے اور جنیو گلے میں کر تک ڈالے بیٹھے تھے۔ دوسری جانب دلہا دلہن کو بیٹھنا تھا۔ پورا پنڈال دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں سے بھر گیا۔ دلہا جن کپڑوں میں آیا تھا، اسی لباس میں منڈپ میں لایا گیا۔ پھر راجکماری دلہن بنی ہوئی آئی اور دلہا علی کے برابر بیٹھ گئی۔

محل سے گانے بجانے والی عورتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھیل تماشے والے پنڈال کے چاروں طرف مجمع لگائے لوگوں کو محظوظ کر رہے تھے۔

پنڈتوں نے راجہ سے اجازت مانگی اور ہندو رواج کے مطابق جنتر منتر پڑھنا شروع کیے۔ وہ پڑھتے جاتے اور پڑھ پڑھ کے دلہا دلہن پہ پھونکتے جاتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد پھیرے ہوئے دلہا کے پیچھے دلہن کا پلو دامن سے باندھا گیا۔ اس طرح آگے دلہا اور پیچھے دلہن آگے پیچھے منڈپ کے گرد گھومنے لگے۔

ہندو مذہب میں نکاح کی یہ آخری رسم ہوتی ہے۔ سات پھیرے جسے پھیر دی گھومنا بھی کہتے ہیں، لگانے کے بعد نکاح پکا ہو جاتا ہے۔

پھیرے پورے ہوتے ہی مبارک، مبارک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ علی کے والد اور راجہ کنانور ایک بار پھر پر جوش طریقے سے بغل گیر ہوئے۔

اس وقت ماحول بالکل ہندوانہ تھا۔ دیکھنے والا یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ اس میں نائروں کے علاوہ کثیر تعداد میں مسلمان بھی موجود ہیں۔ نائر اور ماپلہ بڑی محبت سے ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔

ہندوانہ نکاح ہونے کے بعد راجہ کے محل کے ایک بڑے حصہ میں مسلمان باراتیوں کو پہنچایا گیا۔ پھر دلہا دلہن محفل میں لائے گئے۔ یہاں صرف مسلمان تھے اور کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ دلہا دلہن کو ایک دوسرے سے الگ بٹھایا گیا۔

دلہن کو اس کی سہیلیوں اور دلہا کو اس کے دوستوں نے گھیر رکھا تھا۔ جب سب لوگ بیٹھ گئے تو سب سے آخر میں راجہ کنانور اور علی کے والد مسکراتے ہوئے آئے اور آ کر برابر برابر بیٹھ گئے۔

اس وقت علی کے والد اٹھ کر ایک بزرگ شخص کے پاس گئے۔ انہیں علی کے والد اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ ان سے چند باتیں کرنے کے بعد دونوں اٹھ کر دلہن کے پاس گئے۔ راجکماری کی سہیلیاں ایک طرف ہو گئیں۔

یہ بزرگ مالاباروں کے بڑے عالمِ دین تھے۔ وہ دلہن کے سامنے بیٹھ گئے۔

"بیٹی راجکماری۔ آپ اپنی مرضی سے دینِ اسلام قبول کر رہی ہیں؟" عالمِ دین نے راجکماری سے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔" راجکماری نے جواب دیا۔

"میں جو الفاظ کہتا ہوں وہ آپ دہراتی جائیے۔"

"بہتر ہے۔"

عالمِ دین نے راجکماری کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا اور اس کا نام سلمہ رکھا۔ پھر علی کے والد سے مخاطب ہو کر کہا:

"آپ وکیل اور دونوں گواہوں کو ساتھ لے آئیے۔"

راجکماری کا مسلمان ہونا اور وکیلوں اور گواہوں کے نام پہلے سے طے شدہ تھے۔ علی کے والد نے وہیں سے ان کو اشارہ کیا۔ وہ آئے اور ان میں سے ایک نے دلہن راجکماری سلمہ سے ایجاب و قبول کا سوال کیا۔

راجکماری نے "ہاں" کہہ کر علی کو اپنا شوہر قبول کیا۔ یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے گئے۔ چونکہ عالمِ دین نے خود اپنے کانوں سے راجکماری کے منہ سے "ہاں" کا لفظ سنا تھا اس لیے وہ اور وکیل و گواہ دلہن کے پاس سے اٹھ کے محفل میں آئے۔

پھر دلہا سے ایجاب و قبول کے بعد عالمِ دین نے بلند آواز سے خطبۂ عقد پڑھا۔ خطبہ کے بعد

عالمِ دین نے ہاتھ بلند کیے اور سب نے دلہا دلہن کے لیے دعائے خیر کی۔

اس کے ساتھ ہی مبارکباد کی آوازیں بلند ہوئیں۔ دلہا علی اور اس کے والد برابر کھڑے ہو گئے ایک ایک آدمی اپنی جگہ سے اٹھتا اور علی اور اس کے والد سے گلے مل کر مبارک باد کہتا۔ راجہ کنانور یہ سب بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

لوگوں کی مبارک باد کا سلسلہ ختم ہوا تو علی اور اس کے والد راجہ کے پاس گئے اور دونوں اس سے بغل گیر ہوئے۔

اس طرح نکاح کی محفل اختتام پذیر ہوئی۔ شروع سے آخر تک کسی موقعہ پر بدمزگی نہیں ہوئی اور ہر کام بخیر و خوبی انجام پایا۔



شادی کے بعد دلہن کی طرف سے شریک ہونے والے افراد اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور دلہا کے ساتھ آنے والوں کو وہاں پہنچا دیا گیا جہاں ان کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔

دلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں پہنچا دی گئی۔ محل کے ایک بڑے کمرے کو اس مقصد کے لیے حجلۂ عروسی میں تبدیل کیا گیا تھا۔

دوسرے کمروں میں دلہا علی، اس کے والد اور ساتھ آنے والے معززین کے قیام کا انتظام تھا۔ چونکہ باراتی زیادہ تھے اس لیے ان کے لیے میدان میں بڑے بڑے خیمے نصب تھے۔

کنانور والوں کو یہی معلوم تھا کہ راجکماری کی شادی ایک مالابار مسلمان امیرزادے علی کے ساتھ ہو گئی ہے اور بارات ایک دو دن کنانور میں گزار کر واپس چلی جائے گی۔ انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ راجکماری مسلمان ہو گئی ہے اور اس کا اسلامی طریقے سے علی کے ساتھ نکاح پڑھایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں راجہ نے اپنے سیناپتی (سپہ سالار) کو اعتماد میں لے لیا تھا اور اس نے راجہ کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا تھا۔

طے یہ ہوا تھا کہ شادی کے فوراً بعد سپہ سالار کنانور کے علاوہ چند اور اہم ہستیوں کو اعتماد میں لے کر یہ اعلان کرا دیا جائے گا کہ دوسرے دن صبح کو کنانور کے نئے راجہ کی تاجپوشی ہو گی اور یہ راجہ کوئی اور نہیں، کنانور کی راجکماری کا شوہر علی ہو گا۔

راجہ نے اس سلسلے میں دوپہر کی دعوت کے فوری بعد ان لوگوں کو محل میں روک لیا تھا۔

اعتماد میں لیا جاتا تھا۔

یہ کام راجہ نے سپہ سالار کے سپرد کیا تھا اور اس نے فرداً فرداً مخصوص آدمیوں کو سرگوشیوں میں دربارِ خاص کے لیے رکنے کو کہہ دیا تھا۔

دعوت ختم ہوئی تو محل کے دربار ہال میں دربارِ خاص منعقد ہوا۔ سپہ سالار نے دربار ہال کے دروازے اور محل کے گرد سخت فوجی پہرہ لگا دیا تھا اور فوجیوں کو حکم دیا تھا کہ دربار ہال سے کسی کو باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

راجہ کنانور اور سپہ سالار کو دربار میں سخت مخالفت کا خطرہ تھا کیونکہ یہ معاملہ ایک ناٹر ریاست کو ایک ماپلہ امیر زادے کے سپرد کرنے کا تھا۔ راجہ کنانور نے اپنے سپہ سالار کو یہ کہہ کر اعتماد میں لیا تھا کہ ریاست میسور کا حکمران اور صوبہ دار سرا نواب حیدر علی خان کا لشکر کنانور پر حملے کے لیے تیار کھڑا ہے راجہ نے اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ مسلمانوں کو مقامی ہندوؤں نے اس قدر تنگ کیا ہے کہ انہوں نے حیدر علی خان سے درخواست کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو غیر مسلم آبادیوں سے نجات دلانے کے لیے آئے اور اس درخواست کے جواب میں اس نے غیر مسلم ریاستوں پر حملے شروع کر دیے ہیں۔ نواب حیدر علی نے پہلے بدنور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کیا ہے اور اب کنانور کی طرف حملے کے لیے بڑھ رہا ہے۔

راجہ نے اپنے سپہ سالار کو یہ بھی بتایا کہ راجکماری کا دولہا علی ' دراصل حیدر علی خان کا ایک رشتہ داری عزیز ہے اور علی اور راجکماری میں ایک عرصے سے دوستی ہے اس لیے میں نے علی سے راجکماری کو بیاہ کر دراصل ریاست کنانور کو حیدر علی خان سے بچایا ہے۔

یہ بات قابلِ یقین تھی۔ بدنور پر حیدر علی کا لشکر قابض ہو چکا تھا۔ پھر کنانور اس سے کب بچ سکتا تھا۔ جب کنانور نہ ہوتا تو پھر سپہ سالار کہاں رہتا۔ اس کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔

دربارِ خاص میں راجہ کنانور خاموش بیٹھا رہا اور اس کے سپہ سالار نے عمائدینِ ریاست کو وہی باتیں بتائیں جو راجہ نے اس سے کہی تھیں۔

نواب حیدر علی خان کے حملے کی بات سن کے کنانور والوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ سپہ سالار نے آخر میں کہا:

"جس طرح راجکماری نے ماپلہ امیر زادے کے ساتھ شادی کرنے کی رضامندی دے کر ریاست کنانور کو نواب حیدر علی خان کے ہاتھوں میں جانے سے روکا ہے اسی طرح راجہ کنانور بھی ایک زبردست قربانی دے رہے ہیں۔"

سپہ سالار نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"اگرچہ راجکماری اور علی کی شادی سے فی الحال ریاست کنانور بچ گئی ہے مگر نواب حیدر علی خان کی بڑھتی ہوئی طاقت نے مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک تمام علاقے اپنے قبضے میں لے لیے ہیں اس لیے صرف ایک غیر مسلم ریاست کنانور اس کی آنکھوں میں ضرور کھٹکتی رہے گی۔ اگر وہ اس ریاست پر قبضہ نہ بھی کرے تو ریاست میں اپنا گورنر مقرر کرنے سے اسے کون روک سکتا ہے؟ اس وقت ہماری پوزیشن کیا ہوگی! کیا ہم اپنے عہدوں سے معزول نہ کر دیے جائیں گے!"

شہر کوتوال نے کھڑے ہو کر سوال کیا:

"سیناپتی جی۔ پھر آپ نے ہماری اور اپنی ملازمتوں کو بچانے کا کیا اپائے (حل) سوچا ہے؟"

سپہ سالار نے فوراً جواب دیا:

"اس کا حل آپ کے اور میرے راجہ کنانور نے بے مثال قربانی دے کر نکالا ہے۔ ہمارے پیارے راجہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ راج سنگھاسن (راج گدی) چھوڑ کے راجکماری کے شوہر علی کو کنانور کی راج گدی پر بٹھا دیں گے اور اس کا نام "راجہ علی" ہوگا۔ یہ راجہ چونکہ اپنی راجکماری کا پتی ہوگا اس لیے وہ حکومت کے کارکنوں میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا۔"

شہر کوتوال خوش ہو گیا:

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ راجکماری اور راجہ کنانور دونوں نے ہمارے لیے قربانی دی ہے ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔

لیکن سیناپتی جی۔ یہ کام جلدی ہو جانا چاہیے۔ کہیں نواب حیدر علی خان کی نیت نہ بدل جائے ورنہ اور مشکل ہو جائے گی"۔

"آپ لوگ تیار ہوں تو ہم کل ہی علی کو راج گدی پر بٹھا دیں؟" سیناپتی نے کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے"۔

شہر کوتوال نے کہا:

"اس طرح خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل جائے گا"۔

اسی دن شام کو شہر کے بڑے چوک میں ڈگڈگی بجتی جا رہی تھی:

"سنو سنو۔ ریاست کنانور کے باسیو سنو!

ہمارے پیارے راجہ کنانور دو دن بعد تبرکاً ریاست سے

باہر جا رہے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کی غیر حاضری میں راجکماری
کے پتی یعنی راجہ کنانور کے جوائی (داماد) علی راجہ کی گدی سنبھالیں
گے اس لیے کل صبح راجہ علی کی "راجپوشی" ہوگی۔
اس مبارک رسم میں شریک ہونے کے لیے سب لوگ راج محل کے
سامنے والے میدان میں جمع ہو جائیں۔"

اس اعلان پر کسی نے بھی کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ جب راجہ اور اس کے تمام درباریوں نے راجکماری اور علی کی شادی کر دی ہے تو پھر علی کو راجہ بنانے پر کیوں اعتراض کیا جائے؟

ایک دو آدمیوں نے اس اعلان پر ناک بھوں چڑھائی۔ اس اطلاع پر شہر کوتوال نے ایک درجن سے زیادہ آدمیوں کو بازاروں میں سراؤں اور قہوہ خانوں پر بھیج دیا جنھوں نے عوام کو یہ بتانا شروع کیا کہ راجکماری کی علی کے ساتھ شادی اور علی کا راج سنگھاسن پر بیٹھنا، یہ سب کچھ ریاست کنانور کو نواب حیدر علی خان سے بچانے کے لیے کیا گیا ہے اس لیے کہ علی، حیدر علی خان کا قریبی عزیز ہے اور اس نے نواب کو کنانور پر حملہ کرنے سے روک دیا ہے۔

جب یہ باتیں لوگوں میں عام ہوئیں تو راجکماری اور راجہ کنانور کی قربانیوں سے وہ بہت متاثر ہوئے۔

دوسرے دن راج محل کے سامنے والا میدان تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تختوں کے ایک اونچے سٹیج پر کنانور کے راجہ، علی کے والد، علی اور دوسرے عمائدینِ ریاست بیٹھے تھے۔ دعائیں اور منتر جنتر پڑھنے کے لیے سٹیج کے دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے سٹیج اور بنائے گئے تھے۔ ایک پر بڑا دھاری پنڈت اور دوسرے پر بارات کے ساتھ آنے والے عالم دین براجمان تھے۔

شام کے اعلان کے بعد ہی میدان کے کنارے کنارے دکانیں لگ گئی تھیں۔ کھیل تماشے والے اپنی منڈلیاں لے کے آ پہنچے تھے۔ باجے گاجے والے الگ شور مچا رہے تھے۔ یہ میلہ اور جشن، سورج نکلنے ہی شروع ہو گیا تھا اور اس وقت تک زور شور سے جاری رہا جب تک "راجپوشی" نہ ہو گئی

تاجپوشی کی رسم سادگی سے ادا کی گئی۔
راجہ کنانور نے کھڑے ہو کر اپنی زرنگار پگڑی (تاج) علی کے سر پر رکھا۔ پھر پنڈت اور عالم دین کے ساتھ ہی عوام نے بھی راجہ علی کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں اور اسے مبارک باد دی گئی۔

اس کے بعد نئے راجہ کو نذرانے پیش کیے گئے۔ ان میں خوانوں میں سجے ہوئے سونے چاندی کے ظروف اور جڑاؤ ہار تھے۔ ہیرے جواہرات اور زیورات تھے۔ یہ رسم کوئی دو گھنٹے میں ختم ہو گئی۔ لوگوں کا میلہ شام تک میدان میں جما رہا۔



راجہ کنانور دعوت ولیمہ کے اگلے دن بستی چھوڑنے پر آمادہ ہوا۔ علی کے والد نے اسے روکا:
"راجہ بہادر۔ تیز تر پر جانے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو یہاں بارات بھی رخصت نہیں ہوئی ہے!"
راجہ نے ہنس کر کہا:
"اے امیر۔ آپ نے وہ مثل نہیں سنی کہ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔"
"مگر یہ بادشاہت تو آپ نے خود ہی علی کو دی ہے!"
علی کے والد بھی مسکرائے:
"کل بارات واپس جائے گی۔ آپ دلہا دلہن کو رخصت کرنے کے بعد چلے جائیے گا۔"
"یہ کیا فرمایا آپ نے؟" راجہ نے گھبرا کر کہا:
"کیا دلہا دلہن آپ کے ساتھ جائیں گے؟"
"کیا آپ راجکماری سلمہ کو رخصت نہیں کریں گے؟" علی کے والد بھی گھبر گئے۔
"امیر۔ آپ تو عقلمند آدمی ہیں۔" راجہ نے کہا:
"علی ابھی راج گدی پر بیٹھے ہیں۔ ریاست کے بڑے بڑے سردار اور امیر تو انہیں پسند کرتے ہیں لیکن رعایا کا دل آہستہ آہستہ ہی ہاتھ میں لیا جائے گا۔ راجہ علی کو بھی آپ کم از کم دو مہینے کنانور میں رہنے دیجیے۔ جب یہ اچھی طرح جم جائیں تو پھر یہ چاہے یہاں رہیں، کوئی فرق نہیں پڑے گا"
"یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"
علی کے والد بھی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ذرا رک کے بولے:
"مگر جب ہم بغیر دلہا دلہن کے بارات لے کے واپس گھر پہنچیں گے تو وہاں کیا جواب دیں گے؟"
"آپ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"
راجہ بھی فکرمند ہو گیا:
"مگر یہ بھی تو ایک مجبوری ہے۔ علی کا فوراً واپس جانا کسی طرح مناسب نہیں۔"
علی کے والد کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔
"مسئلہ حل ہو گیا۔"
"وہ کیسے؟"
"میں نے ترکیب سوچ لی۔" ان کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔
"کیا ترکیب نکالی آپ نے؟" راجہ نے انہیں دلچسپی سے دیکھا۔
علی کے والد مسکراتے ہوئے بولے:
"ہم علی کو لے کر آئے تھے۔ اب علی کو یہاں چھوڑ دیں گے اور راجکماری کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اس طرح گھر والوں کو کوئی شکوہ نہ ہوگا۔"
"ٹھیک ہے"۔ راجہ نے اس دن اپنی روانگی منسوخ کر دی اور کہا:
"میں راجکماری کی رخصتی کے بعد جاؤں گا۔"
علی کے والد کو اچانک یاد آیا۔ وہ بولے:
"میرے باراتیوں میں دو سو کے قریب ملاح ہیں۔ یہ اگرچہ کشتی رانی کرتے ہیں مگر جنگ کے وقت سپاہی بن جاتے ہیں۔ میں انہیں احتیاطاً ساتھ لایا تھا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں ان ملاحوں کو یہاں چھوڑ جاؤں اور انہیں ریاست کی فوج میں بھرتی کر لیا جائے۔"
"آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا۔"
راجہ نے سر ہلایا:
"مگر اب یہ کام آپ کا یا راجہ علی کا ہے۔ آپ لوگ جیسا مناسب سمجھیے کیجیے۔"
راجہ علی اور رانی سلمہ کے دل کے ابھی ارمان بھی نہ نکلے تھے کہ وقتِ رخصت آ گیا۔ علی کے والد نے

اسے سمجھا دیا تھا کہ علی کو کنانور میں چھوڑنے اور راجکماری کو اپنے ساتھ لے جانے میں کیا مصلحت تھی۔ علی کو بھی حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور تھا۔ اس لیے اس نے بھی اس تدبیر کو پسند کیا۔

بارانیوں میں سے دو سو بحری (ملاح) فوجی علی کے پاس چھوڑ دیے گئے۔ باقی ایک ہزار رانی اور رانی سلمیٰ علی کے والد کے ساتھ واپس ہو لیے۔

علی کے گھر والے اور بستی کے لوگ بے چینی سے بارات کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ علی کو کنانور کی راج گدی عطا ہوئی ہے اور وہ ریاست کے انتظامات میں مشغول ہے تو سب کے دل کو اطمینان ہوا۔

دلہن کو حویلی میں اتارا گیا۔

بستی کی ساری عورتیں اسے دیکھنے کو ٹوٹ پڑیں۔ سلمہ رانی کچھ دن پہلے راجکماری کی حیثیت سے بستی میں آچکی تھی مگر اس وقت اسے کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا تھا۔ اب وہ بستی کی بہو بن کے آئی تھی تو سب ہی نے اسے دیکھا۔

رانی سلمہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ جس نے دیکھا اس نے پسند کیا۔ علی کے والد نے بستی والوں کو بھی ولیمہ دیا اور علی کے نہ آنے کی مجبوری بیان کی۔

بستی والوں نے انہیں مبارک باد دی اور کہا کہ یہ تو بستی والوں کی عزت افزائی ہے کہ ایک یادگار امیر کا بیٹا ایک ریاست کا راجہ بنا ہے۔

اس خوشی میں بستی والوں نے علی کے راجہ ہونے کے جشن کو اپنے طور پر منایا جس میں رانی سلمہ اور علی کے تمام عزیزوں کو دعوت دی گئی۔ رانی سلمہ اس محفل کی مہمانِ خصوصی تھی۔

دو چار دن بعد ہی رانی سلمہ کی اجنبیت ختم ہو گئی اور وہ بستی کی عورتوں اور لڑکیوں میں گھل مل گئی۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ اسی بستی کی رہنے والی ہے۔

اب آیئے اس ناول کے ہیرو، یعنی نواب حیدر علی خاں کی طرف چلتے ہیں۔

مغربی ساحل پر ان کی آخری فتح "ریاست بدنور" کی تھی۔ اس فتح نے حیدر علی کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ انہیں بدنور سے اس قدر دولت حاصل ہوئی کہ ایک انگریز مؤرخ کی زبان میں:

"بدنور کی فتح نے حیدر علی خاں کو کرسی سے تخت پر بٹھا دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد نواب حیدر علی خاں نے بدنور کا نام بدل کر اپنے نام پر "حیدر نگر" رکھا اور اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔

حیدر نگر میں نواب نے سکے ڈھالنے کی ٹکسال تعمیر کرائی اور اپنے نام کے سکے ڈھلوائے۔

پھر حیدر علی خاں نے خشکی سے نکل کر پرتگالی جزیرے گوا پر شدید حملہ کیا اور ان کے قلعہ کاررار تک ان کو مار بھگایا۔ انہوں نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی اور بدنور کے جن ساحلی علاقوں پر انہوں نے قبضہ کیا تھا وہ علاقے خالی کر کے نواب حیدر علی خاں کے نہ صرف حوالے کیے بلکہ ان سے معافی مانگی اور انہیں یقین دلایا کہ اب وہ کسی ساحلی علاقے پر قبضہ نہیں کریں گے"۔

نواب حیدر علی خاں کی اس فتح نے ایک طرف انہیں دولت، شہرت اور بادشاہت دی تو دوسری طرف مالابار کے علاقے میں صدیوں کے کچلے ہوئے پا بستہ مسلمانوں نے سر اٹھا کر چلنا شروع کیا۔ یہ مسلمان طلوعِ اسلام کے ساتھ ہی تاجروں اور ملاحوں کی صورت میں مالابار آئے اور یہاں بس گئے تو پھر انہوں نے یہاں اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں نابیں مگر مقامی آبادیاں انہیں پریشان کرتی اور ان کے علاقوں میں تاخت و تاراج کرتی رہتی تھیں۔

بدنور میں نواب حیدر علی کی بادشاہت قائم ہوتے ہی مالابار کی ان مسلم ریاستوں نے دھڑا دھڑ اپنے وفد نواب کے دربار میں بھیجنے شروع کر دیے۔ انہوں نے مقامی غیر مسلم حکمرانوں کے ظلم و ستم سے محفوظ کیے جانے کی درخواست کی تھی۔

نواب نے ہر سفارت کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا اور صاف طور پر کہا تھا کہ جیسے ہی کسی مسلم ریاست پر کوئی غیر مسلم حملہ کرے یا انہیں پریشان کرے تو اس کی اطلاع حیدر نگر بھیجی جائے تاکہ حملہ آور کی سرکوبی کے لیے حیدری لشکر بھیجا جائے۔

راجہ علی کی ریاست کنانور بھی ایک نامور ریاست تھی۔ کنانور کے پرانے راجہ نے اپنی رعایا کو خبردار کر دیا تھا کہ راجہ علی کو قطعاً پریشان نہ کیا جائے ورنہ نواب حیدر علی کا حیدری لشکر کنانور پہنچ کر پوری ریاست کو تہ و بالا کر دے گا۔

کنانور کے لشکر اور بڑے بڑے سرداروں نے تو راجہ کی بات کو تسلیم کر لیا تھا مگر رابعہ کے ریاست

سے رخصت ہوتے ہی ریاست کے کچھ بدخواہوں نے رعایا کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ اس طرح راجہ علی کو راج گدی سے بے دخل کرنے کا مطالبہ شروع ہوا۔

رانی کچھ دن سسرال میں رہ کر کنانور واپس آئی تو اسے راجہ علی نے حالات سے آگاہ کیا۔

وہ تو پہلے ہی علی پر عاشق تھی۔ اب تو وہ اس کا شوہر تھا۔ اس نے راجہ علی کو حوصلہ دیا کہ گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اگر رعایا نے بغاوت کی تو وہ بھی تلوار اور بندوق کے ساتھ راجہ علی کے شانہ بشانہ باغیوں کا مقابلہ کرے گی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ کنانور کے تمام مندروں کا پیشوا جسے گرو پنڈت کہا جاتا تھا ایک سو آدمیوں کا وفد لے کر سیناپتی کے پاس پہنچا۔

سیناپتی ان لوگوں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس کے جاسوس کئی روز سے اطلاع دے رہے تھے کہ عوام میں بے چینی بڑھ رہی ہے اور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

یہ گرو پنڈت، جاہل اور متعصب نائروں کا گرو گھنشال تھا اور راجہ علی کی حکمرانی کو غیر قوم کی حکومت سمجھتا تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے اس تاک میں تھا کہ اسے ذرا سا موقع ملے اور وہ مایلہ راجہ علی کو کنانور سے نکال باہر کرے۔

کنانور کا سیناپتی ایک عقلمند اور سمجھدار انسان تھا۔ اس نے وفد کا خوش دلی سے استقبال کیا اور گرو پنڈت سے دریافت کیا:

"پنڈت مہاراج۔ بخیریت تو ہے آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے یا ریاست کے کسی رکن نے کنانور کے مذہبی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ پھر آپ کو کیوں زحمت کرنا پڑی؟"

گرو گھنشال لیڈر بن کے آیا تھا۔ اس نے سخت لہجہ میں کہا:

"ہم جس کام کے لیے آئے ہیں وہ مذہبی بھی ہے اور ریاستی بھی۔ آپ کو ہماری باتیں کان کھول کر سننا ہوں گی۔"

اس وقت سیناپتی کے پاس پندرہ بیس لشکری اکٹھا ہو گئے اور اس مجمع کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

گرو پنڈت کی سخت کلامی پر سیناپتی نے بھی اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے کہا:

"پنڈت مہاراج۔ اگر کوئی مذہبی معاملہ ہے تو میں آپ کی بات سننے پر تیار ہوں اور اگر اس کا تعلق کسی انتظامی معاملہ سے ہے تو میں آپ کی بات سننے کو تیار نہیں اور نہ آپ کو یہ حق دے سکتا ہوں کہ آپ ریاست کے سپہ سالار کو دھمکانے کے لیے آدمی لے کر آئیں۔"

گرو پنڈت نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں لشکریوں کی تعداد چالیس پچاس تک پہنچ چکی تھی۔ اسے خوف پیدا ہوا کہ کہیں جھگڑے کی صورت میں وہ خود ہی نہ مارا جائے۔ اس پر وہ ٹھنڈا ہو گیا اور مؤدبانہ انداز میں بولا:

"سیناپتی جی۔ ہم کسی انتظامی معاملے کی نہیں بلکہ مذہبی بات کرنے آئے ہیں۔ آپ ہماری بات تو سنیے۔"

"ٹھیک ہے۔ مذہبی معاملے پر میں ضرور بات کروں گا۔"

سیناپتی بھی نرم پڑ گیا:

"آپ دو چار آدمیوں کو ساتھ لے کر اندر آ جائیے اور اس مجمع سے کہیے کہ وہ یا تو خاموشی سے آپ کی واپسی کا انتظار کرے یا واپس چلا جائے۔"

گرو پنڈت نے مجمع کو مخاطب کیا:

"بھائیو! میں سیناپتی سے گفتگو کرنے جا رہا ہوں۔ آپ لوگ خاموشی سے میری واپسی کا انتظار کیجیے۔"

گرو پنڈت کے ساتھ آنے والوں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ لشکریوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر انہوں نے کوئی حرکت کی تو انہیں نقصان پہنچے گا۔ وہ تو خاموش ہو گئے اور بعض چالاک لوگ جو محض تماشہ دیکھنے کے لیے ساتھ چلے آئے تھے وہ آہستہ آہستہ کھسکنا شروع ہو گئے۔

گرو پنڈت اپنے ساتھ پانچ مندروں کے پانچ پنڈتوں کو لے گیا۔

جب یہ سب ایک کمرے میں بیٹھ گئے تو سیناپتی نے پوچھا:

"فرمائیے گرو مہاراج۔ موجودہ راجہ نے آپ پر اور آپ کے مذہب پر کیا غضب ڈھا دیا ہے کہ آپ جلوس لے کر ریاست کے سیناپتی کو دھمکانے آئے ہیں۔"

"سیناپتی جی!" گرو نے جواب دیا:

"ہم آپ سے صرف ایک مطالبہ کرنے آئے ہیں۔ آپ اسے پورا کر دیں، ہم خاموش ہو جائیں گے۔"

"تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں۔" سیناپتی کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔ "کھل کر کہو کیا

کہنا چاہتے ہو؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ کنانور کی راج گدی پہ کوئی نائر راجہ بیٹھے۔" گرو نے اکڑ کر کہا اور باقی پنڈتوں کی طرف دیکھا۔

"تم ریاست کنانور کے بابا ہو، چاچا ہو، کیا ہو؟ کون ہوتے ہو تم راجہ کو بدلنے والے! پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ مطالبہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

سیناپتی کو طیش آ گیا:

"تم ریاست کے ملازم ہو۔ ریاست نے مندروں کے لیے زمین وقف کی ہے جس سے مندروں کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ تمہیں تنخواہیں ملتی ہیں۔ تم لوگ مندروں میں بیٹھ کر سوائے لوگوں پہ رعب ڈالنے کے اور کیا کرتے ہو؟"

گرو پنڈت نے سیناپتی کے بگڑتے تیور دیکھے تو اس کی جان نکل گئی۔ وہ گھگیا کے بولا:

"سیناپتی جی۔ آپ ناراض نہ ہوئیے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ کنانور کی راج گدی پر ہماری ذات اور ہماری ریاست کا کوئی راجہ ہونا چاہیے۔ آپ راجہ بن جائیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"تم مجھے لالچ دے رہے ہو۔ بغاوت پہ آمادہ کر رہے ہو۔ لعنت ہے تم لوگوں پر۔" سیناپتی بپھر پڑا!

"تم تو کنوئیں کے مینڈک ہو۔ تمہیں کیا خبر کہ زمانے میں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں سے سو پچاس میل باہر جا کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مالا بار کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور پالیگار زمیندار یاں ختم ہو گئی ہیں۔ ان ریاستوں کو ختم کرنے والا وہ شخص ہے جس نے مرہٹوں کو شکست دی ہے۔ نظام دکن اور ارکاٹ کے نوابوں کا منہ پھیر دیا ہے۔ انگریز اور فرانسیسی جس کے نام سے گھبراتے ہیں۔ اس نے پرتگالیوں کے جزیرہ گوا پر حملہ کر کے ان کا کچومر نکال دیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کون ہے؟"

گرو پنڈت نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

انہیں بھلا کیا معلوم تھا کہ جنوبی ہند میں کیسی کیسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ وہ تو مندروں میں گھنٹا بجانا اور دان (خیرات) وصول کرنا ہی جانتے تھے۔

"ہمیں نہیں معلوم سیناپتی جی"

گرو پنڈت نے ہتھیار ڈال دیے:

"ہمارے مندروں میں سوائے دیوی دیوتاؤں کے اور کسی کی بات نہیں ہوتی۔ آپ ہی بتائیے۔"

"اچھا تو سنو۔"

سیناپتی نے گرج کر کہا:

"اس عظیم ہستی اور فاتح کا نام ہے نواب حیدر علی خاں۔ جو اس وقت سرنگاپٹم، ریاست میسور ریاست بدنور اور تمام جنوبی وسطی علاقوں کا بادشاہ ہے اور ہمارا راجہ علی، حیدر علی خاں کا عزیز دار ہے۔

جب نواب حیدر علی خاں نے بدنور کے بعد کنانور پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو ہمارے راجہ علی اور ان کے باپ نے نواب کو روک دیا اور یہ طے پایا کہ راجکماری کنانور اور امیرزادے علی کی شادی کر دی جائے اور علی کو کنانور کا راجہ بنا دیا جائے۔ اس طرح کنانور تباہی سے بچ گیا ورنہ کنانور کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔

تمہیں تو راجہ علی کا احسانمند ہونا چاہیے لیکن تم تو الٹا انہیں راج گدی سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"یہ بات تو ہمیں معلوم نہیں تھی سیناپتی جی۔" گرو پنڈت مردہ آواز میں بولا۔

"اب تو سب کچھ معلوم ہو گیا تمہیں۔" سیناپتی نے کہا:

"اب جاؤ اور خاموش ہو کے بیٹھو۔ خبردار جو راجہ علی کے خلاف ایک لفظ بھی تم لوگوں نے منہ سے نکالا تو ——"

راجہ علی کے خلاف کنانور کے پنڈتوں نے جو شورش برپا کرنا چاہی تھی وہ بظاہر ختم ہو گئی مگر کنانور کے چاروں طرف کے علاقوں میں نواب حیدر علی خاں کے خلاف ایک نیا محاذ قائم کرنے کی کوشش جاری رہی جس میں عام طور سے وہ راجے مہاراجے اور پالیگار شامل تھے جن کے علاقوں اور ریاستوں پہ نواب نے قبضہ کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے راجہ علی کا کنانور کی گدی پہ بیٹھنا، ان کی تحریک کے خلاف تھا۔

حیدر علی خاں اور راجہ علی میں کوئی خاندانی رشتہ نہ تھا بلکہ علی کے والد نے کنانور کی راجکماری اور علی کی شادی کے سلسلے میں یہ نکتہ پیش کیا تھا اور راجہ نے کسی متوقع ہنگامے سے بچنے کے لیے علی کے والد سے مفاہمت کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ راجہ کو اپنی اکلوتی اولاد راجکماری کنانور سے بے انتہا محبت تھی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ علی اور راجکماری میں محبت اس قدر بڑھ چکی ہے جسے ختم کرنا اب ناممکن ہے۔ اس لیے

اس نے علی کے والد کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اپنے داماد علی کو راجہ کنانور بنایا اور خود راج گدی سے کنارہ کش ہو گیا۔

یہ منصوبہ اس قدر مکمل تھا کہ سیناپتی کو بھی اسی میں بہتری معلوم ہوئی کہ علی کو راجہ تسلیم کر لیا جائے اور کسی قسم کا خطرہ نہ مول لیا جائے۔ اسی لیے اس نے پنڈتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا دیا تھا پھر بھی راجہ علی کے خلاف دوسرے علاقوں میں تحریک شروع ہوئی تو کنانور کا سیناپتی گھبرا گیا۔

ایک دن اس نے راجہ علی سے کہا:

"اے کنانور کے مہربان راجہ! آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں کنانور کے تمام پنڈتوں نے آپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی کوشش کی تھی اور میں نے انہیں ڈرا دھمکا کر خاموش کرا دیا تھا مگر اب۔۔۔"

"ذرا ٹھہریے سیناپتی جی"۔ علی نے اسے روکا:

"میں اس سلسلے میں آپ سے خود بات کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں جو کچھ ہوا اس کا مجھے علم ہے اور آپ کی کوششوں کا میں اور ریاست کنانور کے تمام باشندے شکر گزار ہیں۔ مگر وہ فتنہ جو اب کنانور کے خلاف دوسرے علاقوں میں سر اٹھا رہا ہے میں اس سے بھی پوری طرح باخبر ہوں۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ آپ نے خود اس کی پہل کر دی۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کنانور کے لشکر کا سپہ سالار نہ صرف اپنی ریاست کی ذمہ داریوں پر پوری نظر رکھتا ہے بلکہ اس کی نگاہ قرب و جوار میں سر اٹھاتے فتنوں پر بھی رہتی ہے۔"

"میرے مہربان راجہ"۔ سیناپتی نے کہا:

"اگر آپ کو باہر کے حالات کا علم ہے تو پھر آپ نے اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھایا ہو گا۔"

"سیناپتی نے صحیح اندازہ لگایا"۔ راجہ علی کھل کے بولا:

"مجھے معلوم ہے کنانور اور قرب و جوار کے نائر میرے جانی دشمن بن گئے ہیں۔ انہوں نے ماپلاؤں کا جینا حرام کر دیا ہے جو میری شادی کے بعد کنانور میں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ ان کی شکایات متواتر میرے پاس پہنچ رہی ہیں۔ میں اب تک یوں طرح دیتا رہا کہ میری شادی نائروں میں ہوئی ہے

اور نائر میرے رشتے دار بن گئے ہیں مگر اس کے باوجود ان لوگوں نے مجھے دل سے اپنا راجہ تسلیم نہیں کیا ہے"

سیناپتی راجہ علی کے خاموش ہونے پر بولا:

"انہی حالات سے آگاہ کرنے کے لیے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں میرے محبوب راجہ۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ ملکی اور غیر ملکی حالات سے خود کو پوری طرح باخبر رکھتے ہیں۔

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب راجہ علی تمام حالات سے پوری طرح واقف ہیں تو انہوں نے اس کی درستی اور اصلاح کے لیے بھی کوئی تدبیر ضرور سوچی ہو گی۔"

"کیوں نہیں۔ میں آخر نائر کا جائز راجہ اور منتخب حکمران ہوں"۔ راجہ علی نے بڑے عزم اور استقلال سے کہا:

"میں نے اس سلسلے میں جو فیصلہ کیا ہے اس میں تمہارا مشورہ ضروری ہے۔ اچھا ہوا کہ تم نے آج خود ہی یہ بات چھیڑ دی۔"

راجہ علی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر چند لمحے غور کے بعد بولا:

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کنانور کے راجہ ہونے کے سلسلے میں نواب حیدر علی خاں فرمانروائے ریاست میسور، گورنر صوبہ سرا اور حاکم سلطنت خداداد کی پوری پوری حمایت حاصل ہے۔ پورے مالابار اور خاص کر کنانور میں ماپلاؤں پر جو ستم ڈھائے جا رہے ہیں ان کی اطلاعات سلطنت خداداد کے مرکز حیدر نگر پہنچ چکی ہیں اور حضرت نواب بہادر نے مجھے حالات کی تصدیق کے لیے بلوایا ہے۔"

"یہ تو آپ نے بڑی اچھی خبر سنائی راجہ بہادر"۔

سیناپتی خوش ہو گیا:

"اب کس بات کی فکر۔ آپ تشریف لے جائیے اور نواب بہادر کو تمام حالات سے نہ صرف آگاہ کیجیے بلکہ فوج کے ہراول دستے اپنے ساتھ لے آئیے تاکہ شرپسندوں کے سرغناؤں کا دماغ صحیح کیا جائے۔"

"میرا بھی کچھ ایسا ہی ارادہ ہے"۔ علی نے جواب دیا:

"اب سوال یہ ہے کہ میں خود حیدر نگر جاؤں یا نواب بہادر کی خدمت میں سفارت روانہ کروں تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

"میرے راجہ علی!" سیناپتی مسرت سے بولا:

"نواب بہادر نے آپ کو طلب کیا ہے اس لیے آپ کا جانا ہی زیادہ مفید ہو گا تاکہ شرپسندوں کے خلاف کوئی فوری قدم اٹھایا جا سکے"۔

"اس کا مطلب ہے مجھے خود جانا چاہیے"۔

راجہ علی نے سیناپتی کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا تھا:

"دوسرا سوال یہ ہے کہ میں حیدر نگر کی طرف کب روانہ ہوں؟"

"فوراً راجہ بہادر۔" سیناپتی نے کہا:

"نیک کاموں میں جلدی کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے آپ کل روانہ ہو جائیں"۔

"اچھا۔ اب میں امید کر سکتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں آپ کسی فتنہ کو سر نہ اٹھانے دیں گے؟"

علی نے سیناپتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

دراصل یہی وہ بات تھی جس کے لیے راجہ علی نے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اپنے طور پر حیدر علی خان کو مالابار کے حالات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ یہ کام کسی سفارت کے ذریعے بھی کر سکتا تھا لیکن سفارت کے آنے جانے میں کافی وقت لگ سکتا تھا اور اس دوران کنانور میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

راجہ علی نے اسی وجہ سے سفارت کے ساتھ خود جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ جانے سے پہلے کنانور کے سپہ سالار کو پوری طرح اپنی گرفت اور اعتماد میں لینا چاہتا تھا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں بغاوت نہ ہو سکے۔

سیناپتی نے سینہ تان کے جواب دیا:

"اے ریاست کنانور کے محبوب راجہ علی! آپ اطمینان سے حیدر نگر تشریف لے جائیے۔ کنانور کا میں ذمے دار ہوں۔ یہاں جو ہاتھ آپ کے خلاف اٹھے گا تراش دیا جائے گا۔ جو سر بلند ہو گا، کاٹ دیا جائے گا"۔

"شاباش سیناپتی۔ مجھے اسی جواب کی امید تھی"۔

راجہ علی نے واقعی اطمینان کا سانس لیا:

"میں کل ہی حیدر نگر روانہ ہو جاؤں گا اور پھر انشاءاللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔

پھر جیسے اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا:

"اور ہاں سیناپتی۔ ایک بات کا خیال رکھنا"۔

"حکم راجہ علی؟"

"میں رانی سلمہ سے یہ کہہ کے جاؤں گا کہ میں اپنے گھر والوں سے ملنے جاؤں گا۔ یہی بات آپ بھی کہیے گا"۔

"بہتر ہے راجہ بہادر"۔ سیناپتی نے جواب دیا:

"میں خیال رکھوں گا کہ آپ کے حیدر نگر جانے کی اطلاع کسی کو نہ ہو سکے"۔

راجہ علی دوسرے دن کنانور سے حیدر نگر کی طرف روانہ ہوا لیکن اس نے راستہ ایسا اختیار کیا جو اس کی بستی سے ہو کر گزرتا تھا۔

اس کے ساتھ صرف دس سوار تھے۔ یہ سب کے سب ماپلہ ملاح تھے جنہیں راجہ علی نے فوج میں سپاہی بھرتی کر لیا تھا۔

راجہ علی صرف چند گھنٹوں کے لیے اپنی بستی میں ٹھہرا۔ باپ کو کنانور کے حالات سے آگاہ کیا اور حیدر نگر جانے کا سبب بتایا۔

راجہ علی کو اس کے باپ نے اپنی دعاؤں اور مشوروں کے ساتھ حیدر نگر روانہ کیا۔

نواب حیدر علی خاں ان دنوں حیدر نگر ہی میں تھے۔ مالابار کی اس بڑی اور امیر ریاست بدنور کو فتح کرنے کے بعد انہوں نے اسے حیدر نگر کے نام سے موسوم کر دیا تھا۔

اس شہر کو نواب نے اپنا یعنی سلطنت خداداد کا دارالسلطنت بنا دیا اور وہاں جدید قسم کی عمارتوں کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ ٹکسال کی تعمیر مکمل ہو گئی تھی اور حیدر علی خاں کے نام سے سکے ڈھلنا بھی شروع ہو گئے تھے۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ راجہ علی اور حیدر علی خاں میں کوئی رشتے داری نہ تھی بلکہ علی کے والد کے راجہ کنانور پر رعب ڈالنے کے لیے نواب حیدر علی خاں کو اپنا قریبی عزیز ظاہر کیا تھا مگر اس بات سے واقعات کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ راجہ علی جب نواب حیدر علی خاں کے محل پر پہنچا اور اس نے حاجب دربار سے درخواست کی کہ نواب بہادر کو اطلاع دی جائے کہ کنانور کا راجہ علی سلام کے لیے حاضر ہوا ہے تو اسے فوراً ہی طلب کر لیا گیا۔

اس سلسلے میں حاجبِ دربار اور راجہ علی میں جو گفتگو ہوئی، وہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اس لیے درج کی جا رہی ہے۔

نواب حیدر علی خان نے حیدر نگر بدنور میں یوں تو بہت سی تعمیرات کرائی تھیں۔ ٹکسال کے علاوہ کئی شفا خانے اور دینی مدارس تعمیر کرائے تھے۔ سرکاری دفاتر کے لیے بھی حویلیاں اور باغات بنوائے تھے۔ مگر وہ خود راجہ بدنور کے قلعہ ہی میں رہتے تھے۔ اپنے لیے انہوں نے کوئی الگ محل نہیں بنوایا تھا۔

ریاست بدنور کے بارے میں پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ ایک بلند پہاڑی پہ آباد تھی اور وہاں جانے کے لیے صرف ایک تنگ راستہ تھا۔ حیدر علی خان نے اسے بیدنگر میں تبدیل کرتے ہی وہاں تک پہنچنے کے لیے کئی راستے بنوا دیے تھے اور اب لوگ وہاں آسانی سے آ جا سکتے تھے۔

نواب حیدر علی خان اگرچہ بادشاہ نہ تھے مگر ان سے ملاقات کے لیے ایک مختصر سا دفتر بنایا گیا تھا۔ باہر سے آنے والے ملاقاتی اس دفتر پر رپورٹ کرتے تھے اور ناظم دفتر "حاجب" ہوا کرتا تھا[1]۔

راجہ علی جب حاجب کے سامنے پیش ہوا تو حاجب نے حسبِ معمول سوال کیا:

"تمہارا نام؟"

علی نے جواب دیا:

"راجہ علی!"

"راجہ تمہارے نام کا حصہ ہے یا تم واقعی راجہ ہو؟"

"نام میرا صرف علی ہے مگر نائروں کی ریاست کنانور کا حکمران ہوں اس لیے مجھے راجہ کہا جاتا ہے"۔ علی نے وضاحت کی۔

"اس کا مطلب ہے تم کنانور کے فرمانروا اور بادشاہ ہو"۔ حاجب نہ معلوم کیوں بات کو اس قدر طول دے رہا تھا۔

"نہیں۔ نہ میں بادشاہ ہوں نہ حکمراں"۔ علی نے تردید کی:

"کنانور ایک ریاست ہے۔ ریاست کا مالک راجہ کہلاتا ہے۔ جب وہاں کے راجہ نے مجھے اپنی راج گدی پر بٹھایا تو میں بھی راجہ ہوا اور اب تک راجہ کہلاتا ہوں"۔

---

[1] حاجب کے معنی سنتری، نگہبان، پاسبان اور ڈیوڑھی پر کھڑا ہونے والا یا دربان کے ہیں۔ خلافت فاطمہ مصر میں وزیر سلطنت جو خلیفہ کے بعد سب سے بڑا عہدہ تھا اسے بھی حاجب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

"بات تو ایک ہی ہوئی نا!" حاجب اڑ گیا:

"حکمران یا بادشاہ ہی تو راجہ ہوتا ہے"۔

علی کو اس کج بحثی پر غصہ آ گیا۔ اس نے سخت لہجے میں سوال کیا:

"کیا نواب حیدر علی خاں بہادر سلطنتِ خداداد کے بادشاہ یا سلطان نہیں ہیں؟"

حاجب مسکرایا:

"ہمارے نواب بہادر کا مرتبہ تو سلطان سے بھی بڑا ہے"۔

"تو پھر آپ انہیں سلطان کیوں نہیں کہتے؟" علی نے دوسرا سوال کیا۔

حاجب گھبرا گیا:

"وہ... وہ... وہ... نواب بہادر خود کو سلطان کہلوانا پسند نہیں کرتے"۔

علی نے بڑے رعب سے کہا:

"اسی طرح میں بھی فرمانروا یا بادشاہ کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ براہِ کرم آپ نواب حیدر علی خاں کو راجہ علی کے آنے کی اطلاع دیں"۔

حاجب بڑا مغرور معلوم ہوتا تھا مگر راجہ علی کا رعب کھا گیا اور اسی وقت اندر جا کر نواب بہادر کو کنانور کے راجہ علی کے آنے کی اطلاع دی ۔۔۔ پھر حاجب کا منہ اس وقت کھلے کا کھلا رہ گیا جب نواب بہادر نے حاجب کو حکم دیا:

"کنانور کے جوان عمر راجہ علی کو عزت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرو"۔



حیدر علی خاں نے اگرچہ بدنور کا نام تبدیل کر کے حیدر نگر رکھ دیا تھا۔ حیدر نگر کو انھوں نے دار السلطنت خداداد میسور کا نام بھی دیا تھا۔ وہاں دفاتر اور ٹکسال قائم ہوئی تھی اور حیدر علی کے نام کے سکے بھی ڈھالے جا رہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق حیدر علی خاں حیدر نگر کے بطور بادشاہ تخت نشیں ہوئے تھے مگر انھوں نے اپنی بادشاہت کا اب تک کوئی باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔

بدنور کی حالت حیدر نگر ہوتے ہی بدل گئی تھی۔ بڑے دفاتر اور ٹکسال کے علاوہ کتنے ہی اسکول اور شفا خانے بھی قائم کیے گئے تھے۔ حیدر علی خاں نے اپنے لیے نیا محل نہیں بنوایا تھا۔ ان کا قیام پرانے ہی محل میں تھا مگر اس محل کی صورت بھی تبدیل ہو گئی تھی۔

حیدر علی خاں نے محل کے ایک حصے میں عدالت قائم کی تھی جہاں قاضی القضاۃ بیٹھتے تھے اور دن بھر مقدمات سنتے تھے۔ یہ عدالت شرعی قوانین کی پابندی کرتی تھی۔

کنانور کا راجہ علی دار السلطنت حیدر نگر پہنچا تو شاہی ٹھاٹ باٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے خیال گزرا کہ شاید حیدر علی تک اس کی رسائی مشکل ہی سے ہو گی مگر اس کے باپ نے اسے بتایا تھا کہ حیدر علی خاں ایک بیدار مغز حکمران ہے اور وہ اپنی سلطنت کے تمام حالات سے خود کو باخبر رکھتا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ کنانور میں ابھرتی ہوئی بغاوت کا حال اس کے گوش گزار ہو چکا ہو۔

راجہ علی کو حیدر علی خاں کی بیدار مغزی کا ثبوت اس وقت مل گیا جب نواب حیدر علی خاں کے حاجب کے ساتھ بک بک جھک جھک کے بعد اس کا نام اندر بھیجا گیا اور فوراً ہی اسے اندر طلب کر لیا گیا۔

حیدر علی خاں بجائے تخت پر بیٹھنے کے فرش پر ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے تھے — جواں عمر راجہ علی نے دربار میں داخل ہو کر نواب بہادر کو جھک کر سلام پیش کیا۔

نواب بہادر مسکرائے اور بولے:

"آؤ راجہ علی ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ اگر اس ہفتے تم خود نہ آتے تو ہم تمہیں گرفتاری کا پروانہ بھیج دیتے۔"

راجہ علی چپ چاپ نظریں نیچی کیے کھڑا تھا۔

یہ ایک بڑا ہال تھا جو پرانے طرز پر آراستہ تھا۔ نواب نے اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہ کی تھی۔ یہ دراصل راجہ بدنور (حیدر نگر کا پرانا نام) کا دربار ہال تھا۔ نواب نے وہاں سے دیوی دیوتاؤں کی مورتیں اور دیگر ہندوانہ نشانیاں ہٹا دی تھیں۔ باقی سامان ویسے ہی رہنے دیا تھا۔ راجہ کا سنگھاسن ایک چاندی کا تخت تھا جس کے چاروں پایوں پر سونے کی مورتیاں لگی تھیں۔ نواب نے اس تخت کو ٹکسال میں بھیج کر چاندی سونے کے سکے ڈھلوا دیے تھے۔

نواب نے تخت ہٹوا کر پورے ہال میں چاندنی کا فرش بچھوا دیا تھا اور شمال کی جانب درمیان میں ایک قالین پر گاؤ تکیے کے ساتھ اس کی نشست تھی۔

نواب نے راجہ علی کو گم سم کھڑے دیکھا تو مسکرائے:

"ارے راجہ علی تم اب تک کھڑے ہو۔ آخر تم کنانور کے راجہ ہو۔ رانی سلمہ تمہاری بیگم ہے۔ کیا ہوا اس وقت تمہاری ریاست کے حالات بگڑے ہوئے ہیں۔ تم نے اور تمہارے باپ نے ہم سے اپنا تعلق ظاہر کیا ہے۔ یوں بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے تم ہمارے بھائی ہو۔ ادھر آؤ اس جگہ ہمارے قریب بیٹھو۔"

راجہ علی فوراً جوتے اتار کر آگے بڑھا اور اس جگہ جا کر بیٹھ گیا جہاں نواب حیدر علی خاں نے اشارہ کیا تھا۔

مگر —

اس کی حیرانی کا یہ عالم تھا کہ وہ حیرت کی دبیز تہہ میں دبتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے نواب حیدر علی خاں

کا صرف نام سنا تھا، ان کے عادات و اطوار سے بالکل ناواقف تھا مگر نواب نہ صرف اس کے نام و نسب بلکہ اس کی ریاست کے ابتر حالات سے بھی واقف تھے۔ یہی نہیں انہیں علی کی بیوی کا وہ نام بھی معلوم تھا جو مسلمان ہونے کے بعد اسے دیا گیا تھا۔

"راجہ علی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم پہلے تمہاری خبر نہ لے سکے۔ دراصل ہمارے جاسوسوں نے بہت دیر کر دی"۔

نواب نے علی کو خود مخاطب کیا:

"کنانور کے بارے ہمارے فوجی دستے تیار ہیں۔ ہم ایک دو دن بعد خود ہی تمہیں فوجی کمک بھیجنے والے تھے مگر ہمیں تعجب تھا کہ تمہاری طرف سے ہمیں بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ کیا ہم اس کی وجہ دریافت کر سکتے ہیں؟

کنانور میں نائروں کی بغاوت بظاہر تمہارا اپنا معاملہ ہے اور ہمیں اس میں دخل نہ دینا چاہیے تھا مگر ہمیں کنانور کے معاملات سے محض اس وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی کہ تمہاری طرف سے ہمارا نام استعمال کیا گیا تھا اور جس مقام پر "حیدر علی" کا نام لیا جائے وہاں کی پوری ذمہ داری ہم اٹھا لیتے ہیں۔ مگر تم نے کیوں خاموشی اختیار کی راجہ علی؟"

"نواب بہادر حیدر علی خاں!" علی نے ادب سے عرض کیا:

"یہ دراصل میری کوتاہی نہیں بلکہ شرم اور ندامت تھی کہ میں نے کنانور کا راجہ ہوتے ہی آپ کی سلامی کو کیوں حاضری نہیں دی۔ میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ اس مشکل وقت میں آپ کے پاس قاصد بھیج کر مدد کی درخواست کروں، اس لیے خود حاضرِ خدمت ہوا ہوں تاکہ کمک کی درخواست کے ساتھ ساتھ اپنی ندامت اور لاپروائی کی معافی مانگوں"۔

نواب حیدر علی خاں بڑے غور سے راجہ علی کی باتیں سن رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہوا تو نواب نے کہا:

"راجہ علی۔ تمہاری وضاحت ہم نے قبول ہی نہیں کی بلکہ ہمیں پسند بھی آئی۔ تمہاری باتوں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ تم ایک ذہین جوان ہو"۔

اس کے ساتھ ہی نواب حیدر علی خاں ایک ٹھنڈی سانس لے کر کسی سوچ میں گم ہو گئے۔ جب اس عالم میں انہیں زیادہ دیر گزری تو وہاں بیٹھنے والے دوسرے لوگوں کو فکر ہوئی۔ راجہ علی اپنی جگہ پریشان تھا کہ شاید اس کی کسی بات سے نواب بہادر کو صدمہ پہنچا ہے جو اُن پر خاموشی

طاری ہو گئی ہے۔

دراصل نواب حیدر علی خاں کو نوجوان راجہ علی کو دیکھ کر اور اس کی ذہانت بھری گفتگو سن کر اچانک اپنے بیٹے شہزادہ ٹیپو کا خیال آ گیا تھا۔

شہزادہ اس وقت گیارہ بارہ سال کا تھا مگر اس کی اٹھان اچھی تھی اور قد پانچ فٹ سے اونچا ہو گیا تھا۔

حیدر علی خاں کو راجہ علی کی آنکھوں میں وہی جوش و جذبہ دکھائی دے رہا تھا جو اس نے اپنے بیٹے شہزادہ ٹیپو کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

آخر نواب بہادر نے سر اٹھایا۔

"راجہ علی!" انہوں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

راجہ علی، نواب بہادر کو جواب دینے کے بعد اب تک اسی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ وہ نواب کی آواز پر چونک کر بولا:

"غلام حکم کا منتظر ہے نواب بہادر"۔

"ہم نے سنا ہے کہ ماپلا قوم کے افراد ساحل و سمندر سے شناسائی رکھتے ہیں!" نواب نے متجسس نظروں سے علی کو دیکھا۔

"نواب بہادر کی اطلاعات درست ہیں"۔

راجہ علی نے سر کو ذرا سا خم کیا:

"ماپلہ قوم کا بچہ بچہ پیدائشی ملاح ہوتا ہے۔ میری قوم ہنرمند ملاحوں کی قوم ہے مگر بحیرہ عرب کے جزیروں پر ہندو راجہ کا قبضہ ہے اور وہ آئے دن ساحلوں پر حملہ کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کرتا رہتا ہے"۔

"ان حالات میں کس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے؟" نواب حیدر علی خاں نے جیسے چونک کر سوال کیا۔

راجہ علی نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا:

"ضرورت ہی نہیں بلکہ بڑی سخت ضرورت ہے نواب بہادر"۔

"آخر کس بات کی؟" نواب نے اپنا سوال دہرایا۔

"نواب بہادر کے ایک اسلامی بحری بیڑے کی۔ جو بحیرہ عرب کے جزیروں کے راجہ کو اس کے

جزیروں ہی میں غرق کر کے رکھ دے"۔

"شاباش راجہ علی" نواب بہادر چیخ اٹھے :

"تم نے ہمارے دل کی ترجمانی کی۔ تم ہمارے خواب کی تعبیر بن کے آئے ہو۔ ہم تمہیں ضائع نہیں کریں گے بلکہ تمہیں تمہارا اصل مقام دیں گے"۔

راجہ علی، حیران نظروں سے نواب بہادر کو دیکھ رہا تھا اور اس کا منہ حیرت کے عالم میں آدھے سے زیادہ کھلا ہوا تھا۔

نواب بہادر نے اسے حیران دیکھا تو کہا :

"تم اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہو راجہ علی۔ کیا تمہیں ہمارے کہنے کا یقین نہیں ؟"

"نہیں نہیں نواب بہادر۔ میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔ راجہ علی نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا :

"میں تو یہ سوچ کے حیران ہو رہا ہوں کہ کیا میں واقعی اس قابل ہوں کہ والیِ میسور نواب حیدر علی خاں مجھ پر اس قدر نوازش فرمائیں۔ میں تو آپ کا ایک حقیر خادم ہوں نواب بہادر"۔

نواب بہادر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا :

"اب تم غور سے سنو کہ ہم تمہیں کیا بنانا چاہتے ہیں"۔

"میں گوش برآواز ہوں اے والیِ میسور"۔

راجہ علی اظہارِ اطاعت میں ذرا اور نرم ہو گیا :

"مگر میری نواب بہادر سے ایک درخواست ہے"۔

"کہو۔ بے خوف ہو کے کہو۔ ہم تمہارے تمام شکوک و شبہات دور کر دینا چاہتے ہیں"۔ نواب نے اسے حوصلہ دیا۔

"اے والیِ میسور"۔ راجہ علی نے رک رک کے کہنا شروع کیا :

"میں اپنے حوصلے اور جرأت پر فخر کر سکتا ہوں مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اسی جگہ لگانے کی کوشش کریں جس کی ذمہ داریاں میں پوری طرح ادا کر سکوں"۔

"تمہاری درخواست نامنظور کی جاتی ہے راجہ علی"۔

نواب بہادر کا چہرہ شکن آلود ہو گیا :

"تم نے اپنی بزدلی کا اظہار کر کے ہماری طبیعت مکدر کر دی ہے۔ حوصلہ مند جوانوں کی طرح

ہمیشہ پہاڑ کی بلندیوں پر رہتی ہیں۔ شجاع وہ ہوتا ہے جو خطروں کو دعوت دیتا ہے اور موت کو سامنے دیکھ کر قہقہے لگاتا ہے"۔

"بجا فرمایا نواب بہادر نے"۔

راجہ علی کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو چھلک آئے :

"میں اپنے خیالات اور الفاظ پر شرمندہ ہوں"۔

"تمہاری شرمندگی سے ہم خوش ہوئے"۔ نواب بہادر نے کہا :

"خوش ہو جاؤ کہ ہم تمہیں سلطنتِ میسور کے بحری بیڑے کا امیرالبحر بناتے ہیں"۔

"جی نواب بہادر"۔ راجہ علی بدحواس ہو گیا۔

"ہوش میں آؤ راجہ علی۔ تم ہمارے سامنے ہو۔ خود کو سنبھالو اور ہماری نوازشات کو اپنے مضبوط دامن میں سمیٹ لو"۔

نواب بہادر نے متانت سے کہا :

"ہم اپنے الفاظ واپس نہیں لیا کرتے۔ تم ریاست میسور کے امیرالبحر ہو۔ جاؤ اور ایک مضبوط بحری بیڑا تیار کراؤ۔ جنگی جہازوں اور کشتیوں کے لیے جس قدر رقم کی ضرورت ہو حیدر نگر کے خزانے سے حاصل کر سکتے ہو لیکن خیال رہے کہ بحری بیڑا ایک ماہ میں تیار ہو جانا چاہیے تاکہ اگلے ماہ تم اپنے اوپر حملہ کرنے والوں پر خود حملہ آور ہو کر ان کی کشتیاں ڈبو دو یا جلا ڈالو"۔

پھر ـــ

نواب حیدر علی خاں نے خزانچی کو بلا کر حکم دیا کہ راجہ علی کو جب اور جتنی رقم کی ضرورت ہو اسے بغیر کسی حساب کے فوراً مہیا کی جائے۔

راجہ علی کے پاس اب کہنے سننے کو کیا رہ گیا تھا۔ اس نے نواب بہادر کو رخصتی سلام کیا :

"غلام، نواب بہادر کے احکامات کی پوری پوری تعمیل کرے گا۔ اب خادم اجازت کا طلب گار ہے"۔

"تم جا سکتے ہو راجہ علی"۔ نواب بہادر حیدر علی خاں نے راجہ علی کو واپس جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا :

"ہمیں توقع ہے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گے"۔

راجہ علی تعظیم پیش کر کے دربار سے نکلنے لگا کہ اچانک اسے کچھ خیال آیا اور اس

واپس آ کر عرض کیا:

"نواب بہادر میں اپنے اعزازات اور آپ کی کرم نوازیوں کی خوشی میں بالکل بھول گیا کہ اس دربار میں میں اپنی ریاست کنانور کے لیے فوجی کمک کی درخواست کرنے آیا تھا۔ اس کے لیے بھی احکامات جاری فرمائے جائیں۔"

"تم کمک مانگنا بھول گئے راجہ علی مگر ہم نہیں بھولے۔"

نواب بہادر نے جواب دیا:

"ہم نے اپنے حاجب کو حکم دے دیا ہے کہ راجہ علی کے امیر البحر سلطنت میسور بنائے جانے کا اعلان پوری سلطنت میں ایلچیوں اور ڈھنڈورچیوں کے ذریعے فوری طور پر کرا دیا جائے۔ تمہاری ریاست میں یہ اعلان تمہارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہو چکا ہوگا۔

اس کے علاوہ ہمارے محافظ دستوں میں سے ایک سو سوار تمہارے ساتھ جا رہے ہیں جو کنانور میں ہماری نمائندگی کریں گے۔

یہ سو سوار چار ہزار نائروں کے لیے کافی ہوں گے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم مزید لشکر وہاں بھیج دیں گے۔"

راجہ علی کنانور سے چلا تھا تو اس کے ہاتھ خالی تھے اور واپس ہوا تو "امیر البحر سلطنت میسور" کا فرمان اس کے پاس تھا اور شاہی دستے کے سو سوار اس کے ہمرکاب تھے۔

راجہ علی کا کنانور میں بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ نائروں کے بڑے بڑے راجہ علی کی قدمبوسی کے لیے حاضر تھے۔ وہ جس علاقے سے بھی گزرا، اسے بتایا گیا کہ شاہی ایلچی اس کے امیر البحر بنائے جانے کا اعلان کر چکے ہیں۔

کنانور میں راجہ علی کے پہنچنے سے دو دن پیشتر ہی اس کے بحیثیت امیر البحر سلطنت میسور کے تقرر کا اعلان ہو چکا تھا۔

اس اعلان کا باغی نائروں پر ایسا اثر پڑا کہ وہ بھیگی بلی بن گئے اور اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کے راجہ علی کے استقبال کو کنانور آ گئے۔

راجہ علی کے تمام بہی خواہوں کو اس کے امیر البحر ہونے کی بہت خوشی ہوئی۔ اس کی رانی سلمہ اور

ریاست کے سیناپتی کی خوشی کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔

ریاست کے سیناپتی نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے راجہ علی کی عدم موجودگی میں نائروں کو سختی سے دبائے رکھا تھا۔ باغیوں نے اس کو اپنے ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

راجہ علی کی آمد کے چوتھے دن اس کے والد اور دیگر عزیز و اقارب اس کے گاؤں سے اسے مبارک باد دینے پہنچ گئے۔ راجہ علی ان لوگوں سے بڑی خوش دلی سے ملا اور مستحق عزیزوں کے ساتھ دامے، درمے، سخنے حسنِ سلوک بھی کیا لیکن وہ انہیں زیادہ وقت نہ دے سکا۔ اس کا لمحہ لمحہ بے حد قیمتی تھا۔ نواب بہادر حیدر علی خاں نے ایک ماہ کے اندر اسے بحری بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ اس سلسلے میں دن رات لگا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی محبوب بیوی سلمہ کے ساتھ بھی سکون سے بیٹھ کے بات نہ کر پاتا تھا۔

سلمہ ایک سمجھدار اور ذمے دار عورت تھی۔ اسے راجہ علی کے نئے عہدے اور اس کی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ راجہ علی کو اپنے ارادوں کی تکمیل اور ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت ملے۔ اسی لیے مہمانداروں کو اس نے سنبھال رکھا تھا اور انہیں راجہ علی کا وقت ضائع نہ کرنے دیتی تھی۔

راجہ علی کے ساتھ ریاست کنانور کا سیناپتی بھی دن رات کام کر رہا تھا۔ راجہ علی نے اسے اپنا نائب مقرر کر لیا تھا۔

راجہ علی اور سیناپتی کی کوششوں سے ایک ہفتے کے اندر اندر چھوٹی بڑی کشتیوں کی تیاری کے لیے اعلیٰ قسم کی لکڑی کا انتظام ہو گیا تھا اور کافی تعداد میں لکڑی اور دیگر ضروری سامان ساحلِ سمندر پر پہنچا دیا گیا۔

رقم کی کمی تھی نہ کام کرنے والوں کی۔ دسویں دن کشتیاں بننا شروع ہو گئیں۔ راجہ علی نے صرف دس کاریگروں سے کام شروع نہیں کرایا بلکہ اس نے کنانور کے اردگرد سو میل تک جتنے بھی کاریگر مل سکے سب منگوا لیے اور بڑی تیز رفتاری سے کام شروع ہو گیا۔

کشتی سازی اور چھوٹے جہاز بنانے کا کام ایک ساتھ ہی شروع کیا گیا۔ کام رات دن ہوتا تھا آٹھ آٹھ گھنٹوں کی تین شفٹیں لگتی تھیں۔

راجہ علی اور سیناپتی نے اپنے خیمے ساحل پر لگوا لیے تھے اور وہ ہر وقت کاریگروں اور مزدوروں

کے ساتھ رہتے تھے۔

ان کاریگروں میں اکثریت مسلمان ماپلاؤں کی تھی۔ پھر جب انہیں بتایا گیا کہ یہ مسلمان بیڑا ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے بنایا جا رہا ہے جن کا قبضہ بحیرہ عرب پر ہے اور جو روز ساحلوں پر حملے کرتے رہتے ہیں تو کاریگروں نے مزید دل لگا کر کام کرنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف بحری فوجی عملہ بھرتی کیا گیا۔ ان کی تربیت کے لیے فرانسیسی اور پرتگیزی تجربہ کار عملہ ملازم رکھا گیا۔

ماپلے پیدائشی ملاح ہوتے تھے۔ انہیں تربیت ملی تو ان کے جوہر کھلے۔ بحری فوج اور کشتی سازی کا کام ایک ساتھ ہو رہا تھا۔

آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پہلے ماہ کے اختتام پر تقریباً دو سو جنگی کشتیاں پورے جنگی اسلحہ اور بحری فوجیوں سے لیس، سمندر میں اتاری گئیں۔

اس دن ایک مختصر سا جشن منایا گیا جس میں نواب بہادر حیدر علی خان کو مدعو کیا گیا۔ نواب بہادر خود تو اس جشن میں شریک نہ ہو سکے البتہ ان کی نیابت ایک نائب نے کی۔

بظاہر یہ ایک عام سا جشن تھا مگر مالابار کے ناظر یہ سوچ رہے تھے کہ حیدری لشکر کا رخ خشکی سے سمندر کی طرف ہو رہا ہے۔ یہ سمندر، بحیرۂ عرب تھا جو آج بھی پاکستان کا سمندر ہے۔ ۹۲ھ اور ۹۴ھ میں جزائر بحیرۂ عرب پر مسلمان تاجروں کا قبضہ تھا۔ پھر بحری قزاقوں نے سندھ کے راجہ داہر کی شہ پا کر مسلمانوں کے سامان سے بھرے ہوئے جہازوں (بڑی کشتیوں) پر قبضہ کر لیا۔ ان کشتیوں پر مسلمان مرد، خواتین، بچے اور بوڑھے بھی سوار تھے۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ جب ملاحوں اور ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر کے اندرون سندھ پہنچایا گیا اور ایک مسلم خاتون پر کچھ زیادہ ہی ظلم و ستم توڑے گئے تو اس مجبور خاتون نے بے ساختہ نعرہ بلند کیا:

"حجاج بن یوسف المدد"

مشہور ہے کہ مجبوروں، یتیموں اور مظلوموں کی آہیں آسمانوں کا سینہ چاک کرتی ہوئی عرشِ الٰہی سے جا ٹکراتی ہیں۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

ترجمہ:

اے لوگو! مظلوموں کی آہوں سے خوف کھاؤ۔ اس لیے کہ جب مظلوم دعا کرتا ہے تو عرش کے دروازے کھل جاتے ہیں اور مظلوم کی دعا کا قبولیت آگے بڑھ کر استقبال کرتی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ مظلوم کی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔

پس اس خاتون کے "المدد" کے نعرے سے عرش و فرش تھرا اٹھے۔ اس وقت بنی امیہ کا خلیفہ ولید بن عبدالملک تھا اور حجاج بن یوسف خراسان کا گورنر تھا۔ سندھ کا علاقہ اس کے علاقہ سے متصل تھا۔ چنانچہ جب

"المدد یا حجاج بن یوسف"

کی صدا حجاج کے کانوں تک پہنچی تو وہ تلوار بلند کر کے کھڑا ہو گیا اور سراپردہ تک برہنہ پا بھاگتا چلا گیا۔

درباریوں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا اور جوش کو ٹھنڈا کیا۔ پھر حجاج، جس کا تعلق عرب قبیلہ ثقفی سے تھا، نے اس وقت سندھ پر فوج کشی کا حکم دیا اور اتمامِ حجت کے لیے ایک سفیر راجہ کے دربار میں بھیجا۔

سفیر نے راجہ داہر سے بحری قزاقوں کی گرفتاری اور بے گناہ مسلمانوں کی قید سے رہائی کا مطالبہ کیا۔

مغرور راجہ داہر نے بجائے کوئی معقول جواب دینے کے صاف جواب دے دیا:

"تجارتی سامان کی کشتیوں اور مسلمان خواتین اور مردوں کو بحری قزاقوں نے لوٹا اور قید کیا ہے ہمارا بحری قزاقوں پر کوئی اختیار نہیں۔ اس معاملہ میں ہم کچھ نہیں کر سکتے"۔

یہ متکبرانہ جواب سن کر حجاج بن یوسف کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جنگی تیاریاں تو مکمل ہو ہی چکی تھیں۔ حجاج نے اپنے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم، جو ابھی ایک نوعمر جوان تھا، کو سردار لشکر بنا کر خشکی اور سمندر دونوں طرف سے سندھ پر حملہ کا حکم دیا۔

ایک تاریخی حوالہ کے مطابق بحری اور بری افواج دیبل کے مقام پر آملیں۔ پھر سندھ پر ایسا زبردست حملہ ہوا کہ ملتان تک اس نوجوان سپہ سالار کو کوئی نہ روک سکا۔

مسلمانوں کا بھارت میں یہ پہلا قدم تھا۔ اسی وجہ سے کراچی (سندھ) کو "باب الاسلام"

کہا جاتا ہے۔

تعجب ہے کہ بعض لوگ آج بھی "جوشِ قومیت اور ثقافت" میں راجہ داہر کو، جس نے مسلمانوں پر ظلم کیا، ان کا راستہ روکا اور مارا گیا، قومی ہیرو کا درجہ دیتے ہیں۔

یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ موہن جو داڑو اور ہڑپہ وغیرہ پاکستان کے قدیم علاقائی حصوں کی ثقافت کے آئینہ دار ہیں مگر ان تہذیبوں کو پاکستانی ثقافت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

یہاں حجاج بن یوسف ثقفی کا ذکر آ گیا تو اس کی تھوڑی سی تفصیل بیان کر دی جائے۔ اگرچہ حجاج کا اس ناول اور واقعات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں لیکن اس کی شخصیت تاریخِ عالم میں متنازعہ ہے اس لیے قارئین اس کی تھوڑی سی تفصیل دلچسپی سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

تاریخِ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کی تین اور خلافتیں اپنی وسعت، طاقت اور شان و شوکت کی وجہ سے بہت مشہور ہوئیں۔

خلافتِ راشدہ میں چار خلفاؓ شامل تھے:

۱۔ سیدنا ابو بکر صدیقؓ
۲۔ سیدنا عمر فاروقؓ
۳۔ سیدنا عثمانِ غنیؓ
۴۔ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ

ان میں پہلے دو خلیفہ جناب سیدنا ابو بکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ "شیخین" کہلاتے ہیں۔ ان دونوں کا تعلق قبائلِ قریش سے تھا۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ قریش میں سے نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد سیدنا علی مرتضیٰؓ خلیفہ ہوئے مگر شام کے اموی امیر معاویہ بن ابو سفیانؓ نے جناب علی مرتضیٰؓ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور "جنگِ صفین" ہوئی جس میں دونوں طرف سے ہزاروں مسلمان کام آئے۔

پھر جناب علی مرتضیٰؓ کی شہادت کے بعد خلافت خاندان بنو امیہ یعنی شام کے امیر معاویہؓ کو منتقل ہو گئی اور یہ اموی خلافت کہلائی۔

۱۔ خلیفہ اول جناب سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی مدتِ خلافت ۲ سال ۳ ماہ ۱۰ دن ہے۔
۲۔ خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروقؓ نے ۱۰ سال ۶ ماہ ۴ دن خلافت کی۔
۱۔ تیسرے خلیفہ جناب عثمانِ غنیؓ کی مدتِ خلافت ۲۳ھ سے ۳۵ھ تک بیان کی گئی جو ۱۲ سال ہوتی ہے۔
۴۔ چوتھے خلیفہ سیدنا علی مرتضیٰؓ ۳۵ھ میں برسرِ خلافت آئے۔ خلافتِ راشدہ کی کل مدت ایک اندازے کے مطابق ۲۵ سال ہوتا ہے۔ یوں جناب علیؓ کی مدتِ خلافت تقریباً ۶ سال ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد خلافت بنو امیہ اور پھر خلافتِ عباسیہ قائم ہوئی۔ یہ دونوں خلافتیں اہلِ سنت کی تھی۔

اسی دوران مصر اور افریقہ میں اہلِ تشیع ایک زبردست خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جسے فاطمی خلافت کہا جاتا ہے۔

خلافت بنو امیہ اگرچہ مدتِ خلافت میں بنو عباس سے کم رہی مگر بنو امیہ نے اسلامی سلطنت کو اس قدر وسعت دی جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً بنو امیہ کے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں یہ خلافت بامِ عروج پر تھی۔

مختصر یہ کہ، یہ وہی ولید بن عبدالملک ہے جس کے عہد میں عراق اور خراسان کا گورنر حجاج بن یوسف تھا۔

حجاج بن یوسف کی طبیعت عجب طرفہ تماشہ تھی۔ ایک طرف تو اسے تاریخِ اسلام کے ظالم ترین اشخاص میں شمار کیا جاتا ہے جس نے کئی ہزار علما بلکہ بڑی بڑی جید ہستیوں کو بے دریغ تہ تیغ کرا دیا اور دوسری طرف اس عظیم جرنل اور گورنر نے چار ایسے سپہ سالار مقرر کیے جو تاریخ کے عظیم ترین فاتحین میں شمار ہوتے ہیں۔

تاریخ کے یہ عظیم سپہ سالار اور بے نظیر فاتح مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ محمد بن قاسم:
اس جواں عمر جرنل نے برصغیر پر حملہ کیا اور سندھ کی فتح کے بعد ملتان تک پہنچ گیا۔

۲۔ موسیٰ بن نصیر:
اس جرنل نے شمالی افریقہ میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اسلام کی سرحدیں شمالی افریقہ کے مغربی کنارے تک پہنچ گئیں۔

۳۔ طارق بن زیاد:

حجاج بن یوسف کے اس سالار نے بحیرہ روم کو عبور کیا اور کشتیاں جلا کر ہسپانیہ (اندلس، سپین) میں فاتحانہ داخل ہوا اور وہاں مسلمانوں کی اتنی زبردست سلطنت قائم کی جو صدیوں تک باقی رہی۔

۴۔ قتیبہ بن مسلم:

اس جرنیل نے اپنی فتوحات سے اسلامی سلطنت کی سرحدیں چین تک وسیع کر دیں۔

قارئین کرام مجھے معاف فرمائیں گے کہ میں جملہ معترضہ میں تاریخ اسلام کا پورا باب جستہ جستہ بیان کر گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہندوستان کے جنوب مغربی علاقہ مالابار میں آغازِ اسلام ہی سے مسلمان تاجر آ کر آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان مسلمانوں کو ماپلہ کہا جاتا تھا۔

بحیرہ عرب کے بہت سے جزائر ہندوؤں اور دوسری غیر قوموں کے قبضے میں تھے اور مسلمان صرف ساحل ہند تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

بحری بیڑے کی تیاری اور فوجی بھرتی کے سلسلے میں راجہ علی ساحلِ سمندر پر موجود رہا تھا۔ اسے ایک دن بھی ایسا نہ ملا تھا کہ وہ دو گھڑی کے لیے کنانور جا کر اپنی پیاری بیوی سے بات کرتا۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا بلکہ اس کی بڑھتی ہوئی مصروفیات ہی اس کے راستے میں حائل تھیں۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ وہ اپنی بیوی سے غفلت اور بے اعتنائی برت رہا ہے مگر پھر اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا کہ سلمہ تعلیم یافتہ (وہ اپنی خاندانی تعلیم سے بہرہ ور) اور سمجھدار خاتون ہے وہ حالات کو ضرور سمجھتی ہو گی۔

بحری بیڑے کی تیاری کے بعد ایک شب وہ ساحلِ سمندر پر لگے اپنے خیمے میں قدرے سکون سے بیٹھا تھا۔ مالابار ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی فوجی بیرکیں اس نے تعمیر کرا دی تھیں اور بحری سپاہیوں اور ملاحوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ وہاں منتقل ہو جائیں مگر وہ خود اب تک خیمہ ہی میں رہتا تھا۔

آج شام ہی سے اس کا دل گھبرا رہا تھا اور ایک نامعلوم سی الجھن اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟

اسی گھڑی ایک محافظ نے خیمہ میں داخل ہو کر عرض کیا:

"امیر البحر راجہ بہادر۔ راج محل سے ایک تیز رفتار قاصد آیا ہے اور راجہ بہادر سے فوراً ملنا چاہتا ہے"۔

"رانی سلمہ!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

محافظ کی موجودگی سے ایک لمحہ کے لیے وہ خجل سا ہو گیا۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا:

"اسے فوراً اندر بھیجو"۔

محافظ باہر گیا اور فوراً ہی قاصد کو ساتھ لیے اندر آ گیا۔ امیر البحر راجہ علی نے محافظ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

جب محافظ باہر چلا گیا تو راجہ علی نے بے چینی سے دریافت کیا:

"رانی خیریت سے تو ہیں؟"

اس کی پریشانی الفاظ کے الجھاؤ سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"مہارانی بالکل کشل (بخیریت) ہیں امیر البحر راجہ بہادر"۔ قاصد نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

راجہ علی نے اطمینان کا سانس لیا:

"پھر کیا خبر لائے ہو تم؟"

"میرے پاس زبانی تو کوئی خبر نہیں ہے راجہ بہادر"۔ قاصد نے کہا:

"ہاں مہارانی نے ایک بند لفافہ آپ کے لیے بھیجا ہے اور مجھے تاکید کی تھی کہ آپ جہاں بھی ہوں، آپ کو یہ لفافہ فی الفور وہاں پہنچا دوں"۔

یہ کہتے ہوئے قاصد نے لفافہ راجہ علی کی طرف بڑھا دیا۔

راجہ علی نے لفافہ لے کر بے تابی سے کھولا مگر اس میں خط کے بجائے ایک چھوٹا سا رومال تھا۔

اس نے احتیاط کے طور پر لفافے کو جھاڑ کر دیکھا مگر اس میں کوئی اور چیز موجود نہیں تھی۔

راجہ علی نے سر اٹھا کر قاصد کو دیکھا۔

قاصد نظریں جمائے بڑے غور سے راجہ کو دیکھ رہا تھا۔ راجہ نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا وہ باہر گیا تو راجہ نے رومال کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔

رومال نم تھا۔

معاً پورا مسئلہ اس کی ذہن میں آ گیا۔ رانی سلمہ نے اسے خط کے بجائے آنسوؤں سے بھیگا ہوا

رومال بھیجا تھا۔

راجہ علی کے دل پر چوٹ لگی۔ اس کی آنکھیں بھی نمناک ہوگئیں۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہوگیا اور دربان کو بلا کر گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ دربان جانے لگا تو اس نے اسے روک کے کہا:

"قاصد سے کہو کہ ہم اس کے ساتھ کنانور چل رہے ہیں۔"

گھوڑا تیار کر کے خیمہ پر پہنچا یا گیا۔ راجہ علی جن کپڑوں میں تھا انہی میں سوار ہوا:

"ہم صرف ایک دن کے لیے کنانور جا رہے ہیں۔"

راجہ علی نے لگامیں کھینچ کے ڈھیلی چھوڑ دیں اور گھوڑا کنانور کی طرف اڑنے لگا۔ رانی سلمہ کا قاصد اس کے عقب میں آ رہا تھا۔

رانی سلمہ خیالوں میں گم اداس بیٹھی تھی کہ راج محل کی کنیز نے دوڑ کر اسے اطلاع دی:

"راجہ بہادر تشریف لا رہے ہیں۔"

رانی کا کملایا ہوا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا اور وہ بے تابانہ محل کے صدر دروازے کی طرف دوڑ پڑی۔

راجہ علی منہ سے جھاگ اڑاتے گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ رانی سلمہ کا دل چاہا کہ وہ باہر نکل کے اپنے محبوب سے لپٹ جائے مگر بلہرا ارکینِ ریاست نے راجہ کو گھیر لیا تھا۔

راجہ علی اہالیانِ ریاست سے جلدی جلدی فارغ ہو کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کی طرف چلا۔ زنانخانے کے دروازے پر پہلے کنیزوں اور غلاموں نے اس کا استقبال کیا۔ پھر وہ کنیزوں کے جلو میں اندر داخل ہوا۔

رانی سلمہ دروازے کے پٹ سے لپٹی کھڑی تھی۔ کنیزیں رانی کو دیکھ کے پیچھے ہٹ گئیں۔

راجہ علی اندر داخل ہوا اور رانی سلمہ ہاتھ پھیلا کر اس کی مضبوط باہوں میں جھول گئی۔

"سلمہ۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔" راجہ علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سرتاج۔ میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتی ہوں مگر کیا کرتی۔" رانی نے گلوگیر آواز میں جواب دیا:

"دل تو دل ہے، یہ کسی طور مانتا ہی نہیں تھا۔"

راجہ علی خوش ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے تم نے مجھے معاف کر دیا؟"

"آپ سے مجھے شکوہ تھا۔" رانی اس سے الگ ہٹتے ہوئے بولی:

"مگر آپ کے اس قدر جلد آنے سے سارے گلے شکوے ختم ہو گئے ہیں۔"

"میں تو اڑ کر تمہارے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔" راجہ بولا:

"بھلا تمہارے آنسوؤں سے بھیگا ہوا رومال میں کیسے دیر کر سکتا تھا۔"

"پیارے علی!"

رانی سلمہ نے پیار میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا:

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہارے نئے اعزاز نے تمہیں مجھ سے چھین لیا ہے۔"

"ایسا کبھی نہ سوچنا رانی سلمہ!"

راجہ علی بھی جذباتی ہو گیا:

"میں علی سے راجہ علی ہوا تو تمہارے طفیل ـــ اور اب امیر البحر ہوں تو یہ بھی تمہاری قسمت سے ہے۔ اتنا بڑا اعزاز تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔"

"ارے حیدر نگر کی کوئی بات سناؤ۔"

سلمہ نے بات ٹالنا چاہی:

"جب سے تم امیر البحر ہوئے ہو مجھ سے تو بات ہی نہیں ہوئی۔ آخر نواب بہادر نے تم میں کیا خوبی دیکھی جو حیدر نگر جاتے ہی تمہیں امیر البحر بنا دیا؟"

"کہا نا میں نے۔ یہ سب تمہارے ستاروں کا فیض ہے۔"

راجہ علی ہنس کے بولا:

"گیا تھا فوجی کمک مانگنے اور نواب بہادر نے مجھے امیر البحر بنا دیا۔ میں جب بھی سوچتا ہوں تو تعجب سا ہوتا ہے۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ نواب بہادر نے کیا سوچ کے مجھے اتنا بڑا عہدہ دے دیا!"

"پیارے علی! میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تمہیں یہ عہدہ کیوں اور کیسے ملا۔ حالانکہ میں اور صرف میں شاید اس کا جواب جانتی ہوں۔"

رانی سلمہ بھی مسکرا دی:

"جس وقت ڈھول تاشہ پر تمہارے امیر البحر بنائے جانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں اسی
سمجھ گئی تھی کہ نواب بہادر نے تمہارا انتخاب کیوں کیا ہے!"

راجہ علی نے حیران نظروں سے رانی کو دیکھا:

"پیاری رانی۔ اگر تم جانتی ہو تو پھر تم نے مجھ سے کیوں پوچھا؟"

"پوچھا اس لیے تھا کہ شاید اس کی کوئی دوسری وجہ ہو۔" رانی سلمہ نے راجہ علی کے جواب میں کہا:

"مگر جب تم نے بتایا کہ تم خود بھی اس بات کو نہیں سمجھ سکے تو مجھے یقین ہو گیا کہ میرا خیال درست ہے۔"

"اب مجھے زیادہ نہ ستاؤ میری عقلمند رانی۔"

راجہ علی کھسک کر راجہ علی کے کچھ اور قریب ہو گیا:

"تمہاری ذہانت کا تو میں پہلے ہی سے قائل تھا۔ اب اگر تمہارا یہ اندازہ بھی درست ہوا تو تمہاری شاگردی کر لوں گا۔ ہاں تو کیا وجہ ہو سکتی ہے میرے امیر البحر بنائے جانے کی؟" راجہ علی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میرا اندازہ ہے اور یہ اندازہ درست بھی ہے کہ نواب بہادر ایک زبردست بحری بیڑا تیار کرنا چاہتے تھے۔۔۔"

راجہ علی نے اس کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی:

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟"

"پیارے علی۔ اگر تم ذرا سا بھی دماغ پر زور دیتے تو تم کو بھی اندازہ ہو جاتا۔"

رانی سلمہ سنجیدہ ہو گئی:

"تم دیکھتے نہیں کہ نواب بہادر کے اردگرد جو طاقتیں ہیں ان سب کے پاس بحری طاقت ہے۔ فرانسیسیوں کے پاس بحری فوج ہے۔ پرتگالیوں نے جزیروں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک قوم انگریز بھی ہے جو سات سمندر پار سے بھارت آئی ہے اور فرانسیسیوں اور انگریزوں میں کئی بار بحری لڑائیاں ہو چکی ہیں۔

اس طرح نواب بہادر کو جو طاقتیں آنکھیں دکھا رہی ہیں ان سب کے پاس سمندری فوج موجود ہے۔ نواب بہادر نے کشتیوں ہی کی مدد سے پرتگیزیوں کے جزیرے پر چڑھائی کی تھی۔ ان جیسے

سمجھدار جنرل نے یہ بات ضرور سوچی ہو گی کہ ان کے پاس بھی بحری طاقت ہونی چاہیے تاکہ وقت پڑنے پر وہ اسے کام میں لا سکیں۔"

راجہ علی منہ کھولے رانی سلمہ کا منہ تک رہا تھا۔

وہ خاموش ہوئی تو راجہ علی نے [illegible] لمبی سانس لے کے کہا:

"اب کی دفعہ میں جب نواب بہادر سے ملوں گا تو انہیں مشورہ دوں گا کہ سلطنتِ میسور کا امیر البحر میری بجائے میری رانی سلمہ کو بنا دیا جائے!"

یہ کہہ کے وہ خاموش ہوا اور مسکرا کے رانی سلمہ کو دیکھنے لگا۔ سلمہ بھی [illegible] مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

آخر راجہ علی نے خود ہی کہا:

"رانی سلمہ! تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نواب بہادر کو ایسا مشورہ کیوں دوں گا؟"

رانی سلمہ ہنس پڑی:

"علی۔ میں جانتی ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کہا لیکن میں خود بتانے سے پہلے تم سے ہی پوچھوں گی کہ تم نواب بہادر کو یہ مشورہ کیوں دینا چاہتے ہو؟"

"اچھا۔ میں بتاتا ہوں۔" راجہ علی نے کہا:

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اپنی ریاست کے علاوہ مالابار کی دوسری تمام ریاستوں اور خاص کر نواب بہادر کی ریاست میسور کے بارے میں اس قدر معلومات رکھتی ہو کہ خود نواب بہادر کو بھی اس قدر معلومات حاصل نہ ہوں گی۔

اس صورت میں اگر میری جگہ تمہیں امیر البحر مقرر کر دیا جائے تو نواب بہادر کو ایک بہتر افسر مل جائے گا۔"

"تمہارا خیال صحیح ہے لیکن اس میں میری ذہانت اور عقلمندی کا زیادہ دخل نہیں ہے۔" رانی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہنا شروع کیا:

"میرے پتا جی مجھے بہت چاہتے تھے مگر یہ غم انہیں ہر وقت ستاتا رہتا تھا کہ ان کے بعد ان کی ریاست کنانور اور پیاری راجکماری کا کیا بنے گا۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ان کے کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے ان کے بعد مجھے راج گدی پر بٹھایا جائے گا اس لیے مجھے ریاست کے کام کاج میں بھرپور حصہ لینا چاہیے

میری سمجھ میں ان کی باتیں نہ آتی تھیں مگر میں ان کی ہاں میں ہاں ضرور ملاتی تھی۔ اس دوران انہوں نے مجھے مالابار، کالی کٹ، میسور وغیرہ کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا تھا۔ انہوں نے نواب حیدر علی خاں کے بارے میں واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ میسور کا یہ جنرل ایک دن پورے جنوبی بھارت کا بادشاہ ہوگا اور اس کی بری اور بحری طاقت کا کوئی بھی مقابلہ نہ کر سکے گا۔

پتاجی کی باتوں سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ نواب بہادر نے امیر البحر کے طور پر تمہارا انتخاب کر کے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ تم ماپلاؤں کے خاندان کے ایک بہادر فرد ہو۔ سمندروں سے آنکھ مچولی کھیلنا تمہارے خاندان کا پیشہ بھی ہے اور مشغلہ بھی۔"

"کمال ہے رانی سلمہ!"

راجہ علی نے سانس کھینچ کے کہا:

"باتیں تو میں نے بھی بہت سنی ہیں مگر اصل ذہانت تو اس سے صحیح نتیجہ نکالنا ہوتا ہے اور تمہیں اس میں کمال حاصل ہے۔"

"ایک بات میں تمہیں اور بتاؤں میرے راجہ۔"

رانی سلمہ نے شوخی سے کہا:

"نواب بہادر نے تمہیں امیر البحر مقرر کر کے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔"

راجہ علی چونکا:

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ ایک طرف تو ان کا بحری بیڑا تیار ہو گیا اور دوسری طرف تمہارے نئے اعزاز کی ڈگی پٹتے ہی کنانور کے باغیوں کے ارادوں پر اوس پڑ گئی ہے۔ کل تک جو پانڈے (پنڈت) ہمارے سپاہی کو آنکھیں دکھاتے تھے اب وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں اور لاکھ لاکھ قسمیں کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک کہا رانی سلمہ!"

راجہ علی کھڑا ہو گیا:

"مگر تم نے میرا خیال کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ میں اتنی دور سے آ رہا ہوں۔ آئے ہوئے بھی اتنی دیر ہو گئی ہے اور تم نے مجھے کھانے پینے کو نہیں پوچھا۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگی تھی مگر تمہاری صورت دیکھ کر میں سب کچھ بھول گئی —" اور رانی سلمہ نے

ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

راجہ علی پھر بیٹھ گیا:

"اچھا بھئی۔ تمہیں دیکھ کے میری بھوک بھی اڑ گئی ہے۔ آج ہم دونوں ہی بھوکے رہیں گے۔"

اس طرح دونوں میاں بیوی ہنستے بولتے اور ہجر و فراق کے دنوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے وصل کے لمحات سے شادکام ہوتے رہے۔

رانی سلمہ اپنے شوہر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ راجہ علی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ایک شب سے زیادہ کنانور میں نہیں ٹھہر سکتا مگر اس کی مصروفیت کنانور میں آ کر پھر بڑھ گئی تھی۔

اسی دن شام کو اس کے والدین اس سے ملنے آ گئے۔ علی نے انہیں کنانور چلنے وقت اطلاع کرا دی تھی۔ بے چارے ماں باپ بھی بیٹے کو دیکھنے کو ترس رہے تھے۔ علی نے انہیں اطلاع دی تھی کہ وہ صرف ایک دن کے لیے کنانور آ رہا ہے اور واپسی میں ان سے ملاقات کی کوشش کرے گا مگر وہ لوگ یہ سوچ کر کہ کہیں راجہ علی کنانور سے سیدھا اپنے مستقر پر نہ چلا جائے، خود ہی بھاگم بھاگ کنانور آ گئے تھے۔

رانی سلمہ اپنے شوہر کو ملاقاتوں کے ساتھ مصروف دیکھتی تو دل مسوس کے رہ جاتی۔ اب تو اس کے والدین بھی آ گئے تھے مگر سلمہ نے خود کو سنبھالا اور راجہ علی کو دوسرے دن خوشی خوشی رخصت کر دیا۔ اور راجہ علی اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن اپنے بحری بیڑے میں واپس پہنچ گیا۔

اسلامی بحری بیڑے کی تیاری کے سلسلے میں جو جشن منایا گیا اس میں قریب اور دور کے بہت سے مسلمانوں نے شرکت کی اور بحری فوج کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

خشکی کی غیر مسلم آبادی جو زیادہ تر ناڑوں پر مشتمل تھی، اسے تو یہ یقین ہو گیا تھا کہ حیدری بحری بیڑا نہ صرف پورے ساحل پر اسلامی پرچم لہرائے گا بلکہ ان مفتوحہ جزائر پر بھی حملہ آور ہوگا جو آئے دن ساحلی مسلمانوں پر ظلم توڑتے رہتے تھے اور جن کے ساتھ ساحلی علاقوں کے ناڑ بھی شامل ہو جاتے تھے۔

نائر ہندو قوم کے برہمنوں کی ایک ذات ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں شیعہ اور سنّی دو مشہور فرقے ہیں اسی طرح ہندو چار بڑی بڑی ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

مسلمان فرقوں میں صرف خیالات کا اختلاف ہے ورنہ سب مسلمان برابر کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ہندو قوم کی ذاتیں درجات میں تقسیم ہیں۔ یہ درجے اور ذاتیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ وہ بالکل الگ نظر آتی ہیں۔

یہ درجاتی اور طبقاتی تقسیم اس طرح ہے:

۱۔ برہمن:

یہ ہندوؤں کی سب سے اونچی ذات ہے۔ برہمنوں کا ہندو مذہب پر پورا قبضہ ہے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ بھگوان (خدا) کا حکم ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ صرف برہمن ہی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے مجاز ہیں۔ ان کی عزت باقی ذاتوں پر فرض ہے مگر یہ کسی کی عزت کرنے پر مجبور نہیں۔ مالابار کے نائر اسی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔

۲۔ راجپوت (کھتری)

یہ ہندوؤں کی لڑنے والی ذات ہے۔ راجہ، مہاراجہ اور لشکر اسی ذات سے ہوتا تھا۔ سوائے برہمنوں کے یہ سب سے مفید ذات ہے۔

۳۔ ویش (بنیے)

یہ تاجر پیشہ ہندوؤں کی ذات ہے۔ ملکی تجارت اور حکومت کے خزانوں کا سارا حساب کتاب انہی کے سپرد تھا۔

۴۔ شودر (نیچ ذات)

یہ قوم ہمیشہ سے پسماندہ اور ذلیل ہے۔ کہنے کو تو یہ ہندو ہیں مگر یہ نہ تو تعلیم حاصل کرسکتے ہیں اور نہ مندروں میں داخل ہوسکتے ہیں۔ بھنگی، دھوبی چوہڑے اور تمام ذلیل قسم کے لوگ اسی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اوپر کی ذاتوں کی خدمت ہی ان کی عبادت ہے۔

یہ دوسری ذاتوں کے سامنے اونچی جگہ یا چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ دوسروں کی عزت کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے مگر ان کی اپنی کوئی عزت نہیں۔

معاف کیجیے قارئین! میں پھر بہک گیا۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا نائر قوم کا۔ ساحل مالابار پر ان کی اکثریت تھی اور بحیرہ عرب کے جزائر پر بھی انہی کا قبضہ تھا۔

ساحل والوں کو تو احساس ہو گیا تھا کہ حیدری بیڑہ قیامت برپا کرنے والا ہے مگر جزائر کے نائروں کو یا تو اس کی خبر نہ تھی یا پھر وہ مسلمانوں کو اہمیت نہ دیتے تھے اور ان کے خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ مالابار کی ماپلہ قوم جو صدیوں کی کچلی ہوئی ایک کمزور قوم تھی، وہ کوئی بحری بیڑہ بھی تیار کرسکتی ہے۔

پھر جب ـــ

حیدری بحری بیڑہ سمندر میں اترا اور جنگی کشتیاں اور چند چھوٹے جہاز سطح سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھے تو موجوں نے مست ہو کر کشتیوں کے قدم چومے۔ جزائر کے ہندوؤں نے جب اجنبی کشتیوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو پہلے وہ حیران ہوئے۔ پھر جب ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو ساحلوں سے آبادی کی طرف چیختے چلاتے بھاگے۔ لمحوں میں جزیرے والوں کو معلوم ہو گیا کہ نامعلوم حملہ آور ان کی طرف آرہے ہیں۔

جزیرے کے ہندو صدیوں سے ساحلوں پر حملے کرتے چلے آرہے تھے۔ انہیں تعجب تھا کہ الٹی گنگا کیسے بہنے لگی اور ان کے مقابلہ پر آنے کی جرأت کس نے کی؟

پھر جب دونوں طرف کی کشتیاں قریب آئیں تو ہندوؤں کو معلوم ہوا کہ کشتیوں میں وہی ماپلہ (مسلمان) سوار ہیں جن کی بستیوں کو وہ غارت کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ماپلہ ملاحوں اور بحری فوجیوں کا مذاق اڑایا اور زور شور سے ان پر حملہ آور ہو گئے۔

پہلے دونوں طرف سے تیروں کی بارش ہوئی۔

پھر کشتیاں مل گئیں اور بحری فوجی ایک دوسرے کی کشتیوں پر کود پڑے۔ تلواروں، بھالوں اور خنجروں کا استعمال شروع ہو گیا۔

مسلمان ملاحوں کو شمشیر زنی کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ پہلے بھی اس فن سے واقف تھے۔ ایک ماہ کی تربیت نے ان کے فن کو اور نکھار دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جزیرے کے نائر فوجیوں کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سمندر خون سے رنگین ہو گیا۔

ساحل مالابار کے قریب وہ جزیرے تھے جہاں اب تک مسلمانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے اور

وہاں کے باسی اللہ اکبر کی صدا سے نا آشنا تھے مگر ایک ہی شدید حملہ نے ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیے اور ماپلاؤں نے انہیں بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔

دراصل ماپلاؤں کا یہ بے رحمانہ سلوک اس ظلم و ستم کا ردِعمل تھا جو صدیوں سے ان پہ توڑا جا رہا تھا۔

ایک جزیرے پر قبضہ ہونے کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ اللہ اکبر کی صدا نائروں کے لیے موت کا پیغام بن گئی۔ راجہ علی جس جزیرے پر حملہ کرتا وہاں مقتولین کے انبار لگ جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند جزائر میں معمولی مدافعت کے بعد باقی جزیروں نے بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیے۔

اس طرح تمام جزائر پر نواب بہادر حیدر علی خاں کا پرچم لہرا دیا گیا۔ یہ سب جزائر ایک ہندو راجہ کے قبضہ و اقتدار میں تھے۔ راجہ نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور اپنے آپ کو حیدری فوج کے حوالے کر دیا۔

راجہ کے ساتھ ہی اس کی رانی اور بچوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

ماپلہ فوجیوں کا مطالبہ تھا کہ ہندوؤں کے صدیوں کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی پاداش میں راجہ اور اس کے اہل و عیال کو سولی پر چڑھا دیا جائے مگر راجہ علی نے فوجیوں کی اس بات سے تو اتفاق کیا کہ جزائر کے ہندوؤں نے ماپلاؤں پہ لاتعداد ستم توڑے ہیں۔ ان کی آبادیوں کو تہ و بالا کیا اور بستیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے مگر اس ظلم و ستم میں راجہ کے اہل و عیال کا کوئی قصور نہیں اس لیے رانی اور اس کے بچوں کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔

راجہ علی کی دلیل معقول تھی۔

یوں بھی اسلام سلامتی کا مذہب ہے اور اعلان کرتا ہے کہ انتقام اور بدلہ لے سکتے ہو لیکن درگزر کرو تو اللہ کی نظر میں اس کا بڑا مقام ہے۔

مگر —

ایک زمانے کے ستم رسیدہ ماپلہ فوجی انتقام کی آگ میں جل رہے تھے اور ان کی تسلی صرف اس طرح ہو سکتی تھی کہ راجہ اور اس کے بال بچوں کو سرِعام قتل کر دیا جائے۔

راجہ علی نے فوجیوں کے جذبات ٹھنڈے کرنے کی بہت کوشش کی لیکن فوجی اپنی بات پر اڑ گئے

اس وقت راجہ علی نے ایک حکمران کی حیثیت سے اعلان کیا:

"اسلام نے جنگ میں بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانے سے منع کیا ہے۔ ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر غزوہ اور سریہ میں اپنے سرداروں کو اور لشکریوں کو یہی حکم دیا تھا کہ ہتھیار ڈالنے والوں پر رحم کرنا۔ ضعیفوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ اس لیے میں رانی اور اس کے بچوں کو رہا کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ وہ بالکل آزاد ہیں۔ وہ جس جگہ جانا چاہیں۔ سرکاری خرچ پر انہیں اس مقام تک بحفاظت پہنچایا جائے۔ رہا راجہ، تو اس کی قسمت کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔"

ماپلہ فوجی، رانی اور اس کے بچوں کے معاملہ میں تو خاموش ہو گئے لیکن راجہ کے قتل کے لیے اڑ گئے۔

راجہ علی نے رانی اور اس کے بچوں کو اپنے پاس بلوایا۔ رانی اپنے بچوں کے ساتھ راجہ علی کے سامنے آئی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

راجہ علی نے حکم دیا:

"رانی اور اس کے بچوں کے لیے نشست کا انتظام کیا جائے۔"

اسی وقت خیمے کے سامنے آرام دہ کرسیاں لا کر رکھی گئیں۔ رانی، علی کا شکریہ ادا کر کے اپنے بچوں کو لے کر کرسیوں پر بیٹھ گئی۔

راجہ علی نے نرم لہجے میں کہا:

"کیا رانی کو معلوم ہے کہ میں نے انہیں اور ان کے بچوں کو آزاد کر دیا ہے؟"

رانی نے عرض کیا:

"اے امیر البحر علی! آپ نے مجھے اور میرے بچوں کو آزاد کیا اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں لیکن میں کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟ میرا مالک اور میرا سہارا تو میرا راجہ ہی ہے آپ نے انہیں قید کر رکھا ہے اور نہ جانے انہیں کیا سزا دیں گے؟"

"معزز رانی! یہ راج نیتی کی باتیں ہیں۔ اس بارے میں تمہیں کچھ نہ کہنا چاہیے۔" راجہ علی تحمل سے بولا:

"فوج راجہ کے حکم سے لڑتی ہے، جنگ کا ذمے دار ملک کا راجہ ہی ہوتا ہے۔ اسے ہم جو چاہیں سزا دے سکتے ہیں۔"

"مگر آپ انہیں کیا سزا دیں گے؟" رانی بے چین ہو گئی۔

"تم یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتیں رانی۔"

راجہ علی تھوڑا سا چڑ گیا:

"پھر ابھی ہم نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

"راجہ بہادر۔" رانی نے افسردگی سے کہا:

"مجھے بتایا گیا ہے کہ میں جہاں جانے کی خواہش کروں گی وہاں مجھے بھیج دیا جائے گا۔"

"نہیں درست بتایا گیا ہے معزز رانی۔" علی نے کمالِ ہمدردی سے کہا:

"میں نے بھی اعلان کیا تھا کہ رانی جہاں جانا چاہیں گی انہیں بحفاظت پہنچایا جائے گا۔"

"آپ مجھے حیدر نگر بھجوا دیجیے۔" رانی نے فیصلہ کن انداز میں کہا:

"میں آپ کی شکر گزار رہوں گی۔"

راجہ علی چونک پڑا۔

حیدر نگر نواب بہادر حیدر علی خاں کا دار السلطنت تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ رانی وہاں کیوں جانا چاہتی ہے مگر اب وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ رانی کو اس کی مرضی کے مطابق اس مقام تک پہنچانے کا اعلان کر چکا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے اسے دھڑکا پیدا ہوا کہ ممکن ہے رانی حیدر نگر جا کے نواب بہادر سے اس کی شکایت کرے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ نواب بہادر نے اسے امیر البحر بناتے وقت وہ تمام اختیارات دے دیے تھے جو ایک جنگی جنرل کو حاصل ہوتے ہیں۔

آخر اس نے رانی کو حیدر نگر جانے کی اجازت دے دی:

"معزز رانی۔ تمہیں عزت اور احترام کے ساتھ دار السلطنت پہنچا دیا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے نائب کو حکم دیا:

"رانی اور اس کے بچوں کو فوجی پہرے میں فوراً حیدر نگر روانہ کیا جائے۔"

اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور رانی کو دار السلطنت روانہ کر دیا گیا۔

رانی اور اس کے بچوں کو حیدر نگر بھیجتے ہی بحری فوج میں ایک افواہ پھیل گئی۔ افواہ کچھ اس طرح تھی کہ:

"راجہ علی نے ظالم ہندو راجہ کی رانی اور اس کے بچوں کو نہ صرف آزاد کیا ہے بلکہ انہیں نواب بہادر کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ وہ نواب بہادر

سے راجہ کی رہائی کی درخواست کرے تاکہ راجہ قتل ہونے سے بچ جائے۔"

یہ افواہ اور اسی قسم کی کچھ اور باتیں تمام ماپلہ ملاحوں اور فوجیوں میں بڑی تیزی سے پھیلیں اور ان میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہو گئی۔

اس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں بحری فوج بغاوت نہ کر دے۔ ماپلاؤں کو دراصل راجہ سے شدید نفرت تھی اور اس نفرت کو وہ راجہ کے خون سے دھونا چاہتے تھے۔

راجہ علی نے فوراً اپنے والد اور کنانور کے سیناپتی کو، جسے اس نے اپنا نائب بنایا تھا اور جو اس وقت چھٹی پر کنانور گیا ہوا تھا، فوراً بلوا لیا تاکہ دونوں سے مشورہ کر کے اس سر اٹھاتی بغاوت کو کچل دیا جائے۔

راجہ علی کے والد اور سیناپتی آ گئے۔ صلاح مشورے شروع ہوئے۔ مشوروں کے دوران ماپلہ ملاحوں کا تین آدمیوں پر مشتمل ایک وفد راجہ علی سے گفتگو کے لیے آ گیا۔

راجہ نے وفد کو بلوا لیا اور اس کی بات سنی۔

وفد نے مطالبہ کیا کہ چرّاکل کے ہندو راجہ کو ان ہزاروں مسلمانوں کے قصاص میں ماپلاؤں کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اسے قتل کر کے اپنے بزرگوں کا انتقام لیں۔

راجہ علی نے اس مطالبے کو یکسر مسترد کر دیا مگر اس کے والد نے مصلحتِ وقت کے تحت نرم رویہ اختیار کیا اور کہا:

"دیکھو۔ تم لوگ بحری فوج کے ملاح ہی نہیں بلکہ مسلمان ماپلہ قوم کے افراد بھی ہو اور اسی قوم سے میرا اور تمہارے راجہ کا تعلق ہے۔ ماپلہ ہونے کے ناطے ہم اور تم دونوں کو راجہ سے یکساں طور پر نفرت ہے اور ہم اس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں لیکن ریاست کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اگر فیصلہ تمہارے ہاتھ میں دے دیا جائے تو پھر امیر البحر کس مرض کی دوا رہ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تمہارے مطالبے سے بغاوت کی بو آتی ہے۔ یاد رکھو اگر تم نے راجہ علی کے خلاف غاوت کی تو میسور کا مردِ آہن نواب بہادر حیدر علی خاں تمہاری آبادیوں کو تہس نہس کر دے گا اور تمہاری م کو خاک میں ملا دے گا۔"

ماپلہ وفد راجہ کے والد کی یہ تقریر سن کر گھبرا گیا۔ اس میں سے ایک جو ذرا تحمل مزاج نظر آتا تھا، اب میں بولا:

"ہم لوگ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ راجہ کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اگر اسے رہا کر دیا گیا تو وہ پھر

طاقت حاصل کرے گا اور ہمارا پہلے جیسا حشر کرے گا۔"

اس موقع پر راجہ نے دخل دیا :

"میرے ساتھیو ! تمہاری طرح میں بھی ماپلّہ ہوں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ راجہ کو اس قابل نہ رہنے دیا جائے کہ وہ دوبارہ سر اٹھا سکے۔"

سیناپتی نے مشورہ دیا :

"راجہ کی دونوں آنکھیں نکلوا دی جائیں تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائے۔"

ماپلّہ وفد اس بات سے خوش ہو گیا۔ اس نے کہا :

"راجہ بہادر۔ تمام ماپلّہ آپ کے اپنے بھائی بند اور غلام ہیں۔ وہ آپ سے بغاوت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ آپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ ہم سیناپتی کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور آپ سے درخواست ہے کہ راجہ کو اندھا کر دیا جائے۔"

راجہ علی نے باپ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی سیناپتی کی رائے کی تائید کی۔ راجہ نے اسی وقت ہندو راجہ کی آنکھیں نکال دینے کا حکم دے دیا۔

اس حکم کے دو گھنٹے بعد راجہ کی دونوں آنکھیں نکال کر اسے اندھا کر دیا گیا۔



راجہ کے اندھا کیے جانے سے ماپلّاؤں میں بڑھتی ہوئی بے چینی ختم ہو گئی اور پورے بحری بیڑے پر سکوت طاری ہو گیا لیکن اس سکوت نے ایسا طوفان برپا کیا جس میں راجہ علی کو امیر البحری تنکے کی طرح بہہ گئی۔

یہ طوفان حیدر نگر میں اٹھا اور امیر البحر علی کو اپنے ساتھ اڑا لے گیا۔

نابینا ہندو راجہ کی بینا رانی نے حیدر نگر میں فریاد کی :

"اے مالابار کے مشرق و مغرب کے تاجدار۔ اے سلطنتِ میسور کے بادشاہ ! کیا آپ نے اپنے امیر البحر راجہ علی کو حکم دیا تھا کہ وہ جزیروں میں رہنے والی ہندو آبادی کو تہ تیغ کرے اور جو لوگ زندہ بچ جائیں انہیں اندھا کر دے۔"

رانی کی پژمردہ مگر کڑکتی ہوئی آواز نے حیدر نگر کے ایوانوں کی دیواریں ہلا دیں۔

نواب بہادر حیدر علی خان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور ان کی آنکھیں غصہ سے خونِ کبوتر ہو گئیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ حیدر نگر میں امیر البحر راجہ علی کی فتوحات کا "جشنِ نصرت" منایا جا رہا تھا۔ نواب بہادر نے دربار لگایا تھا اور تمام عمائدینِ سلطنت مدعو تھے۔

نواب بہادر کے پاس امیر البحر کا قاصد ایک ہفتہ پہلے "نویدِ فتح" لایا تھا مگر نواب نے دربار آج اس لیے لگایا تھا کہ قاصد ہندو جزائر کی فتح اور ان پر حیدری پرچم لہرائے جانے کی تفصیلات تمام درباریوں کے سامنے بیان کرے۔

صبح ہی سے لوگوں نے دربار میں آنا شروع کر دیا تھا اور دن چڑھے تمام مدعوئین دربار میں اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ نواب بہادر بھی اپنی نشست سنبھال چکے تھے۔

نواب کا قد چھ فیٹ سے بھی زیادہ بلند تھا۔ اس پر ان کا طرّہ دار صافہ عجب بہار دکھا رہا تھا ان کا چہرہ بڑا پُر رعب تھا۔ آج "جشنِ فتح" تھا اور مسرت سے ان کا گندمی چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔

واضح رہے کہ شکست خوردہ ہندو راجہ کی رانی اپنے بچوں کے ساتھ حیدر نگر پہنچ چکی تھی اور نواب بہادر نے ایک آراستہ حویلی اسے عطا کر کے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔

اس طرح حیدر نگر والوں کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ امیر البحر راجہ علی کو فتح حاصل ہوئی ہے مگر انہیں ابھی اس کی اطلاع نہیں ہوئی تھی کہ راجہ علی نے ہندو راجہ کو اندھا کر دیا ہے جبکہ رانی کو یہ خبر اس کے آدمیوں نے پہنچا دی تھی۔

چنانچہ رانی اپنی فریاد لے کر اسی وقت دربار میں پہنچی جہاں اس وقت جشنِ فتح منانے کے لیے سب عمائدین جمع تھے۔

دربار کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ نواب بہادر کو زیادہ خوشی اس لیے تھی کہ ان کے جواں عمر امیر البحر نے ان جزائر کے ہندو راجہ کو شکست دے کر گرفتار کر لیا ہے جس کے ہندو ساحل مالابار کے ماپلاؤں کی آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔

جشن کی تقریب ابھی شروع نہ ہوئی تھی کہ ایک دربان نے داخل ہو کر نواب بہادر سے سرگوشی کی۔ جواب میں نواب بہادر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ دراصل ہندو راجہ کی اس رانی کے آنے کی اطلاع تھی جو حیدر نگر ہی میں نواب کی عطا کردہ حویلی میں مقیم تھی۔

نواب بہادر کی اجازت پا کر رانی دربار میں آئی اور سلام کر کے چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ جب کچھ دیر تک رانی نے کلام نہ کیا تو نواب بہادر نے خود اسے مخاطب کیا۔

"رانی کو اجازت ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں بے خوف کہیں۔"
اذنِ گویائی پا کر رانی نے فریاد کی:
"اے مالابار کے مشرق و مغرب کے تاجدار۔ اے سلطنتِ میسور کے بادشاہ! کیا آپ نے اپنے امیر البحر کو یہ حکم دیا تھا کہ ساحلِ مالابار کے جزائر میں رہنے والی ہندو آبادیوں کو تہ تیغ کرے اور جو لوگ زندہ بچ جائیں انہیں اندھا کر دے۔"
رانی کا نواب بہادر سے یہ سوال نہ تھا بلکہ ایک نشتر تھا جو نواب کے آہنی سینے میں اترتا چلا گیا۔ نواب، رانی کے تلخ و ترش الفاظ برداشت نہ کر سکے اور غصے سے تڑپ کر اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے۔
"ہم نے تم پر رحم کھایا۔ تمہاری اور تمہارے بچوں کی رہائش کا انتظام کیا، ضروری مصارف کے لیے تمہارا وظیفہ مقرر کیا۔ کیا تم ہماری ان نوازشوں سے انکار کر سکتی ہو؟"
نواب حیدر علی خاں کے لہجے میں حاکمانہ جاہ و جلال تھا۔ درباری پہلے ہی رانی کے سخت لہجے سے حیران ہو رہے تھے اور اب نواب بہادر کا تحکمانہ انداز۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟
رانی بالکل پرسکون تھی۔ اس پر نواب بہادر کی گرج نے کوئی اثر نہ کیا۔ وہ پہلے ہی کی طرح کڑکتی آواز میں بولی:
"اے مسلمانوں کے عظیم بادشاہ! کیا آپ اپنی نوازشوں کا ذکر کر کے میرے لبوں پر آئی ہوئی فریاد کو روک دینا چاہتے ہیں؟"
"فریاد؟" نواب بہادر نے اس لفظ کو دہرایا۔
رانی کا انداز اگرچہ پہلے سے زیادہ تلخ تھا مگر نواب بہادر 'فریاد' کا لفظ سن کر موم ہو گئے اور مسند پر بیٹھتے ہوئے بولے:
"اے معزز رانی! ہمیں تمہارے پہلے فقرے پر یہ شبہ ہوا تھا کہ شاید تم ہمارے امیر البحر راجہ علی کی شکایت لے کر آئی ہو جس نے تمہارے راجہ بینی کو شکست دے کر گرفتار کیا ہے مگر تم نے اپنے دوسرے سوال میں "فریاد" کا نام لیا ہے۔ یقین کرو رانی۔ فریاد کے معاملے میں تو ہم خود اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتے۔ پھر ہمارے امیر البحر کی کیا حقیقت ہے۔
ہمیں افسوس ہے کہ اگر تمہیں ہمارے امیر البحر سے شکایت تھی یا تم اس کے ظلم پر فریاد

کرنا چاہتی تھیں تو تم نے اس قدر تاخیر کیوں کی۔ ہمارے کان ہر وقت "فریادی" کی آواز پر لگے رہتے ہیں۔"
"اے عادل بادشاہ!"
رانی نے سنبھل کر کہنا شروع کیا:
"جس وقت میں دارالسلطنت حیدر نگر میں آئی تھی اس وقت میں آپ کے امیر البحر راجہ علی کے احسانات سے دبی ہوئی تھی۔ راجہ علی نے مجھے نہ صرف فوجیوں کی قید سے رہائی دلائی تھی بلکہ مجھے دارالسلطنت تک عزت و احترام سے بھیجنے کا انتظام بھی کیا تھا۔
میں خوش تھی کہ ایک فاتح جرنل نے مفتوح راجہ کی دھرم پتنی کو اتنی عزت دی۔ دارالسلطنت میں آنے کے بعد آپ نے میرے حسبِ مرتبہ حویلی اور دیگر مراعات عطا فرمائیں اور میں آپ کے احسانوں تلے دب کر رہ گئی ــــ"
یہ کہہ کے رانی پھر خاموش ہو گئی۔ یہاں تک کہ نواب بہادر کو خود بولنا پڑا:
"رانی، تم نے ہمارے امیر البحر کی تعریف کی۔ اس سے ہم خوش ہوئے۔ پھر تم نے ہماری نوازشات کا ذکر کیا جو اگرچہ احسان سے زیادہ ہمارے فرائض میں داخل ہیں۔ پھر بھی تمہاری باتوں سے ہمیں خوشی حاصل ہوئی مگر ان باتوں کے باوجود تم ہمارے امیر البحر کے خلاف خود کو فریادی کہہ رہی ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"
"اے کرم نواز حکمران!"
رانی کی آواز میں تلخی اور سختی پیدا ہو گئی:
"میں اب تک آپ اور آپ کے امیر البحر کی احسان مند تھی مگر اب صورت حال بدل گئی ہے اور میں آپ کے پاس فریادی بن کر آئی ہوں ــــ آپ کے امیر البحر نے میرے شوہر کے ساتھ اس قدر گھناؤنا اور ظالمانہ سلوک کیا ہے جو کسی جرنل، حکمران یا بادشاہ کو قطعی زیب نہیں دیتا۔"
رانی نے پھر خاموشی اختیار کی۔ نواب بہادر کو پھر پوچھنا پڑا:
"رانی! تم بے خوف ہو کے بتاؤ کہ راجہ علی نے تمہارے شوہر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"
رانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر اس کی چیخ نکل گئی:
"اے حکمران! تیرے ظالم امیر البحر نے میرے راجہ بینی کی دونوں آنکھیں نکلوا کے انہیں ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیا ہے۔" اور رانی اپنے بال نوچ کے رونے لگی۔

پورا دربار تھرا گیا۔

نواب بہادر کو ایک بار پھر کھڑا ہونا پڑا:

"اے مظلوم و مغموم رانی۔ تیرے دکھ، درد اور غم میں خدا کا یہ بندہ حیدر علی برابر کا شریک ہے۔ میرے خیال میں یہ سراسر ظلم ہے اور امیر البحر راجہ علی نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے لیکن قبل اس کے کہ میں اس سلسلے میں کوئی حکم دوں، مجھے کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے کی ضرورت ہے۔ تم ذرا صبر کرو۔ ہم اپنے قاضی القضاۃ کو طلب کر کے دینی احکام حاصل کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنے دینی احکامات کے تحت تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔"

حیدر علی خاں نے اسی وقت ہرکارہ بھیج کر قاضیِ شہر کو جو قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے، بلوا لیا۔

قاضی کے آنے پر حیدر علی خاں انہیں ساتھ لے کر دربار کے برابر ایک کمرے میں چلے گئے۔ اس تخلیہ میں انہوں نے اپنے امیر البحر کے تقرر سے لے کر ہندو راجہ کے اندھا کیے جانے تک کے تمام حالات سے قاضیِ شہر کو آگاہ کیا۔

"اے قاضیِ شہر۔ اب فرمائیے کہ دینی نقطۂ نظر سے راجہ علی کا یہ فعل ظلم اور سنگین ظلم کے ذیل میں نہیں آتا۔ اگر دین کی نظر میں بھی یہ ایک سنگین ظلم ہے تو پھر اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟"

قاضیِ شہر کو نواب بہادر سے ایسے ہی سوال کی توقع تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کے حاکمِ وقت کو دیکھا اور کہا:

"اے سلطنتِ میسور کے حکمران! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی طاقت اور اختیارات دیے ہیں کہ آپ اپنے امیر البحر کے خلاف کسی بھی تادیب کا حکم دے سکتے ہیں لیکن اگر آپ دینی نقطۂ نظر معلوم کرنے کے خواہاں ہیں تو آپ کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا پڑے گی کہ اسلام سلامتی کا دین ہے اور وہ کسی قسم کے ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔"

"قاضیِ شہر نے بالکل درست فرمایا۔" نواب بہادر نے بڑے ادب سے کہا:

"میں اس خدائے ذوالجلال کا حقیر سا بندہ ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری اور تمام عالم کی جانیں ہیں مجھے تسلیم ہے کہ دین اللہ یعنی دینِ اسلام، سلامتی اور محبت کا مذہب ہے اور میں اسی بنا پہ آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ اسلام کی رُو سے راجہ علی کے ظلم کی سزا کیا ہے؟"

"نواب بہادر۔ خیال رہے کہ عدل آپ کے ہاتھ میں ہے اور ایک عادل حکمران کو جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی میں آپ کو تنبیہ کرتا ہوں کہ اپنی زبان کو گناہ سے آلودہ نہ کیجیے۔"

قاضی صاحب کا لہجہ تھوڑا سا تلخ ہو گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں نواب بہادر کی باتیں ناگوار گزری ہیں۔

حیدر علی خاں، قاضیِ شہر کے لہجے سے گھبرا گئے۔ انہیں گمان ہوا کہ شاید ان کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل گیا ہے جو گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے فوراً نرم لہجے میں کہا:

"بزرگِ محترم۔ اگر میری زبان گنہ گار ہوئی ہے تو مجھے معاف فرمائیے اور میرے گناہ اور غلطی کی نشاندہی کر کے میری اصلاح کیجیے۔"

"اے حاکم۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کی غلطی سے درگزر فرماتا ہے جو اپنی غلطی تسلیم کر کے آیندہ کے لیے توبہ کرتا ہے۔"

قاضیِ شہر نے بڑی متانت سے کہا:

"جہاں تک آپ کی غلطی اور گناہ کا تعلق ہے تو اس کے لیے میں آپ کی توجہ لفظ "ظلم" کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ کا اپنے امیر البحر راجہ علی کو "ظالم" کہنا اپنی زبان کو گناہ سے آلودہ کرنا اور حدودِ عدل سے تجاوز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔ آپ گفتگو میں احتیاط سے کام لیجیے۔"

نواب بہادر حیدر علی خاں نے حیرت ناک نظروں سے قاضیِ شہر کو دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ راجہ علی کو ظالم کہنے سے اس کی زبان گناہ سے آلودہ کیسے ہو گئی۔ آخر جب اس سے نہ رہا گیا تو وہ پوچھ بیٹھا:

"اے عالمِ دین۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ میری زبان گناہ سے کس طرح آلودہ ہو گئی؟"

قاضیِ شہر نے نواب کو تیز نظروں سے دیکھا:

"نواب بہادر۔ کیا آپ نے مجھ سے یہ دریافت نہیں کیا کہ راجہ علی کے ظلم کی سزا کیا ہے؟"

"جی ہاں۔" نواب بہادر نے تسلیم کیا:

"میں نے یہ پوچھا تھا آپ سے!"

قاضیِ شہر نے نواب سے جرح کی :

"اس کا مطلب ہے آپ راجہ علی کو ظالم سمجھتے ہیں ؟"

"بالکل ۔ اس میں کیا شبہ ہے "۔

نواب بہادر نے جواب دیا :

"راجہ علی کو ہندو راجہ کی آنکھیں نکلوانے کا حکم میں نے نہیں دیا تھا "۔

"اے حکمران ۔ یہ باتیں تو بعد کی ہیں کہ راجہ علی نے کیا کیا "۔ قاضیِ شہر کا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا :

"دین اس بات کی اجازت کسی بادشاہ کو نہیں دیتا کہ وہ کسی شخص کو بغیر تحقیق اور پوچھ گچھ کے "ظالم" کہے ۔

راجہ علی کو اس وقت تک ظالم کہنا گناہ ہے جب تک اس کا ظلم ثابت نہ ہو جائے ۔ امیر البحر پر ظلم کا الزام رانی نے لگایا ہے اور یہ اس وقت تک الزام ہی رہے گا جب تک ملزم کو صفائی کا موقع نہیں دیا جاتا ۔ آپ یا میں راجہ علی کو اس کا بیان سننے سے پہلے کس طرح مجرم گردان سکتے ہیں ۔ ہمیں اس وقت تک یہ حق حاصل نہیں کہ راجہ علی کو ظالم کہیں "۔

نواب بہادر اگرچہ اَن پڑھ تھے لیکن قاضیِ شہر نے انہیں ملزم اور مجرم کا فرق اس وضاحت سے سمجھایا کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ۔

نواب بہادر نے برملا کہا :

"خدا مجھے معاف فرمائے !"

اس کے بعد نواب بہادر نے حکم دیا کہ آگے پیچھے دو تیز رفتار قاصد ساحلِ مالابار روانہ کیے جائیں ، اس تاکید کے ساتھ کہ کنانور کا راجہ علی جس حال میں بیٹھا ہو اسی طرح اسے لے کر حیدر نگر واپس آئیں ۔

نواب بہادر نے قاضیِ شہر سے درخواست کی :

"آپ اس مقدمہ کے دوران مشورے کے لیے ضرور تشریف لائیے گا "۔



عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت نواب بہادر کا پہلا ہرکارہ راجہ علی کے ساحلی خیمہ پر پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ امیر البحر ایک عارضی غسل خانے میں ، جو قریب ہی دوسرے خیمے میں بنایا گیا تھا غسل کے لیے تشریف لے گئے ہیں ۔

ہرکارے نے راجہ علی کے خیمے کے محافظ سے کہا :

"تم مجھے فوراً اس جگہ لے چلو جہاں راجہ علی غسل کر رہے ہیں "۔

محافظ نے تیز نظروں سے اسے دیکھا مگر نرم آواز میں بولا :

"شاہی قاصد آپ پسینے میں شرابور ہو رہے ہیں ۔ آپ گھوڑے سے اتریے ۔ تشریف رکھیے ۔ میں امیر البحر کو ابھی بلائے لاتا ہوں "۔

"تم مجھے فوراً راجہ علی کے پاس لے چلو "۔ ہرکارے کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا ۔

محافظ نے پھر بھی سنجیدگی اختیار نہ کی :

"میں شاہی قاصد سے پورے احترام کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ وہ گھوڑے سے نیچے تشریف لے "

"تم شاہی احکامات کی بجاآوری میں دخل اندازی کر رہے ہو "۔ ہرکارہ گھوڑے سے کود پڑا اور تلوار کھینچ لی :

"اگر تم نے اب ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں تمہیں نواب بہادر حیدر علی خاں والیِ میسور کے احکامات کی توہین کی پاداش میں فوراً قتل کر دوں گا "۔

محافظ گھبرا گیا اور تیز تیز ایک طرف چلنے لگا ۔ ہرکارہ اسی طرح شمشیر بکف اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا ۔ عارضی غسلخانہ قریب ہی تھا ۔ دونوں وہاں پہنچے ۔

محافظ نے سامنے خیمے کی طرف اشارہ کیا :

"امیر البحر اس خیمے میں غسل فرما رہے ہیں "۔

"ٹھیک ہے ۔ تم جا سکتے ہو "۔

محافظ کے جانے کے بعد ہرکارے نے تلوار نیام میں کر لی اور خیمے کے پردے کے پاس پہنچ کر آواز دی :

"میں نواب بہادر حیدر علی خاں کا حکم راجہ علی کو پہنچاتا ہوں کہ وہ جس حال میں ہوں میرے ساتھ حیدر نگر تشریف لے چلیں "۔

"میں اس بات کی وضاحت بھی کر دوں"۔

شاہی ہرکارے نے مزید کہا:

"کہ اگر راجہ علی نے تعمیلِ حکم میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر کی تو میں خیمہ میں داخل ہو کر انہیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا"۔

راجہ علی نے نواب بہادر حیدر علی خان کا یہ حکم سنا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ صرف ایک چادر جسم کے گرد لپیٹے ہوئے باہر نکل آیا۔

شاہی ہرکارے نے راجہ علی کو سلام کیا اور کہا:

"اگر راجہ علی نے نواب بہادر کا حکم نہیں سنا تو میں اسے دہرا سکتا ہوں"۔

راجہ علی سمجھ چکا تھا کہ ضرور اس کے خلاف کوئی بات ہوئی ہے ورنہ نواب بہادر ایسا سخت حکم نہ دیتے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"میں نواب بہادر کے حکم پر سر جھکاتا ہوں اور شاہی قاصد کے ساتھ نواب بہادر کے پاس چلنے کو تیار ہوں"۔

"تو پھر چلیے"۔

یہ کہہ کر ہرکارے نے پیٹھ گھمائی۔

راجہ علی نے درخواست کی:

"میں کپڑے پہن کے ابھی آتا ہوں"۔ اس نے عارضی غسلخانے کا رخ کیا۔

شاہی ہرکارہ پلٹا اور کڑک کر بولا:

"آپ کوئی کام نہیں کر سکتے راجہ علی۔ نواب بہادر کا حکم ہے کہ میں آپ کو جس حالت میں پاؤں اسی حالت میں ساتھ لے کر حیدر نگر واپس چلوں"۔

"بہتر ہے"۔

راجہ علی سہما سہما ہرکارے کے ساتھ چلنے لگا۔

شاہی ہرکارہ راجہ علی کو لے کر اس کے خیمے پر پہنچا تو خیمے کا محافظ بوکھلا گیا۔ اس کا آقا امیر البحر سلطنت میسور صرف ایک چادر میں لپٹا ہوا ننگے سر اور ننگے پیر شاہی قاصد کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

قاصد نے محافظ کو حکم دیا: "راجہ علی کا گھوڑا حاضر کیا جائے"۔

محافظ نے اپنے آقا کی طرف دیکھا،

"آقا، گھوڑے کے ساتھ لباس کونسا لاؤں آپ کے لیے؟"

قبل اس کے کہ راجہ علی کوئی جواب دے، شاہی ہرکارے نے اسے ڈانٹ دیا:

"تیری زبان بند نہ ہوئی تو میں یہ زبان قلم کر دوں گا"۔

راجہ علی نے بات سنبھالی اور محافظ سے کہا:

"جا جلدی سے گھوڑا لے آ۔ ایک لفظ زبان سے نکالنے کی ضرورت نہیں"۔

محافظ ڈر کر ایک طرف چلنے لگا۔

راجہ علی اسی حالت میں صرف ایک چادر باندھے ننگے سر ننگے پیر گھوڑے پہ سوار ہو گیا۔

شاہی ہرکارہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا۔

جب یہ دونوں سوار خیمے کے درمیانی راستہ سے گزرے تو ملاحوں اور بحری فوجیوں کا دونوں طرف ہجوم لگ گیا۔ راجہ علی جو اُن کا امیر البحر تھا قاصد کے ساتھ گردن نیچی کیے، نگاہیں سنبھالے بیٹھا تھا۔

خیموں کی قطاریں ختم ہوتے ہی شاہی ہرکارے نے لگامیں اٹھائیں اور دونوں گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔

گھوڑے بڑی تیزی سے حیدر نگر کی طرف دوڑ رہے تھے۔

راجہ علی اپنی قسمت اور نیرنگیٔ زمانہ پر آنسو بہا رہا تھا۔ وہ نواب بہادر جس نے اسے امیر البحر کا اعزاز دیا تھا، آج اسی نواب بہادر نے اسے گداگروں کی طرح پکڑ بلوایا تھا

مگر کیوں؟

ایسا کیوں ہوا؟؟

آخر اس نے ایسا کیا گناہ کیا تھا جس کے صلے میں اسے یہ سزا دی جا رہی تھی؟؟؟

راجہ علی نے اثنائے راہ شاہی ہرکارے سے اس سلسلے میں کئی بار گفتگو کی کوشش کی لیکن ہرکارہ اسے ٹال گیا۔ جب راجہ علی نے بہت زور دیا تو اس نے صاف الفاظ میں کہا:

"راجہ علی۔ آپ زیرِ عتاب ہیں۔ آپ کی قسمت کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ اگر آپ نے مجھے

زیادہ دق کیا تو میں نواب بہادر سے اس کی شکایت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

راجہ علی کی زبان بند ہو گئی۔ اسے اپنی غلطی یا سزا کا کوئی علم نہ تھا مگر وہ شاہی ہرکارے کو پریشان کر کے اس میں اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

ہرکارے کی خورجی میں خشک میوے بھرے تھے۔ دورانِ سفر دونوں یہ میوے استعمال کرتے رہے۔ راجہ علی کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ ہرکارہ بھوک کے وقت خورجی کھولتا اور اس کے سامنے رکھ دیتا۔

اسی طرح سفر کرتے ہوئے یہ دونوں تیسرے روز حیدر نگر پہنچ گئے۔

اس وقت نواب حیدر علی خاں اپنا دربار لگائے بیٹھے تھے۔ شاہی ہرکارے نے دربار کے دربان سے نواب بہادر کو اپنے واپس آنے اور راجہ علی کو ساتھ لانے کی اطلاع دینے کو کہا۔ نواب بہادر نے حکم دیا کہ راجہ علی کو کل تک کے لیے اس کے نائب کی حویلی میں ٹھہرایا جائے اور دوسرے دن دربار میں پیش کیا جائے۔

اسی رات نواب بہادر نے قاضیِ شہر کو پیغام بھیجا:

"ملزم امیر البحر راجہ علی حیدر نگر پہنچ چکا ہے۔ کل اس کا مقدمہ پیش ہو گا۔ آپ کی موجودگی ضروری ہے۔"

دوسرے حکم میں نواب بہادر نے ہندو راجہ کی رانی کو دوسرے دن دربار میں حاضری کی اطلاع بھجوائی۔ اسے بتایا گیا کہ ملزم امیر البحر راجہ علی کو صفائی پیش کرنے کے لیے حیدر نگر بلوا لیا گیا ہے۔

اس دن نصف شب تک حیدر نگر افواہوں کی لپیٹ میں رہا۔ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اس مقدمے پر تبصرہ کر رہا تھا۔

کٹر قسم کے لوگ امیر البحر کو حق بجانب سمجھتے تھے مگر سنجیدہ قسم کے مسلمانوں کا خیال تھا کہ امیر البحر نے ہتھیار ڈالنے والے راجہ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایک مجبور اور گرفتار شخص کی آنکھیں نکال کر اسے اندھا کر دینا ظلم نہیں تو اور کیا ہے!

دوسرے دن صبح کو نواب بہادر نے کھلے میدان میں دربار لگایا جہاں خواص کے علاوہ عوام کو

بھی آنے کی اجازت تھی۔

مقدمہ کی سنگینی کے پیشِ نظر عام لوگوں نے اس میں کافی دلچسپی کا اظہار کیا اور صبح ہی سے میدان میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ میدان میں دور دور تک فرش بچھا دیا گیا تھا۔ لوگ آتے اور بیٹھتے جاتے تھے۔

نواب بہادر حیدر علی خاں اپنے سرداروں کے ساتھ راجہ کے محل سے برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ سرداروں اور عمائدینِ سلطنت کے علاوہ قاضیِ شہر تھے۔

نواب بہادر کی مسند کے برابر قاضی صاحب کی مسند تھی۔ بائیں طرف کچھ ہٹ کے مدعیہ رانی کو بٹھایا گیا۔ نواب بہادر کے آنے پر تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

نواب بہادر نے بیٹھتے ہی حکم دیا:

"کنانور کے راجہ علی کو پیش کیا جائے!"

راجہ علی کو رات گزارنے کے لیے نائب کی حویلی پر رکھا گیا تھا۔ اسے آرام دہ بستر اور ایک خدمت گار بھی دیا گیا تھا لیکن خدمت گار کو راجہ علی سے گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی۔ راجہ علی جس چادر میں لپٹا ہوا آیا تھا، اب تک اسی میں ملبوس تھا۔ نائب نے اسے لباس مہیا نہیں کیا تھا۔

کنانور کے راجہ اور امیر البحر سلطنت میسور کو دربار میں لایا گیا تو لوگوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ راجہ علی صرف ایک چادر سے اپنا تن ڈھانپے ہوئے تھا۔

قاضیِ شہر نے چند آیات کی تلاوت کی اور دعا کے بعد دربار کی کارروائی شروع ہوئی۔ راجہ علی کو رانی کے سامنے دوسری طرف کھڑا کیا گیا تھا۔

راجہ علی نے اگرچہ دربار پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تھی مگر ندامت اور ایک نامعلوم احساسِ گناہ نے اس کی نظریں دھندلا دی تھیں۔ ممکن ہے کہ اس نے رانی کو دیکھا ہو مگر اس کو پہچانا نہ تھا۔ اسے ابھی تک کسی ذریعے سے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اس کی خطا یا گناہ کیا ہے؟

نواب بہادر حیدر علی خاں نے رانی کی طرف دیکھ کر کہا:

"رانی! ہمارے امیر البحر راجہ علی کے خلاف اپنا مقدمہ پیش کرے۔"

رانی اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت راجہ علی نے اسے پہچانا اور اسے یہ بھی اندازہ ہوا کہ رانی نے اپنے شوہر کی سزا کے متعلق نواب بہادر سے فریاد کی ہو گی اور فوراً ہی اس بات کی

تصدیق بھی ہو گئی۔

رانی نے واضح لہجے میں کہنا شروع کیا:

"اے عادل بادشاہ۔ دو بادشاہوں کے درمیان ہمیشہ سے جنگیں ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ جنگ میں ایک فتح حاصل کرتا ہے اور دوسرا شکست کھاتا ہے۔

آپ کے ان امیر البحر نے جو اس وقت دربار میں مسکین صورت بنائے کھڑے ہیں، ہمارے جزیروں پر حملہ کر دیا اور ایک ایک کر کے تمام جزیرے فتح کر کے ان پر آپ کا جھنڈا لہرا دیا۔ جزیروں کے راجہ یعنی میرے پتی نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ راجہ اور ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔

یہاں تک تو خیر غنیمت تھا کہ آپ کے امیر البحر نے مجھے اور میرے بچوں کو رہا کر دیا اور میں آپ کی پناہ میں حیدر نگر آ گئی۔"

اس وقت رانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور روتے ہوئے بولی:

"اے عادل حکمران! میرے یہاں آنے کے تیسرے دن میرے پتی راجہ کی دونوں آنکھیں نکلوا کر انہیں اندھا کر دیا گیا۔ میں آپ کی دہائی دیتی ہوں اور انصاف مانگتی ہوں۔ مجھے انصاف دیا جائے اے میسور کے حکمران۔ راجہ علی کو سخت سزا دیجیے۔ میرے پتی نے آخر اس کا کیا بگاڑا تھا کہ اسے ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے محروم کر دیا گیا؟"

رانی کے اس دردناک بیان سے عوام کی چیخیں نکل گئیں اور لوگوں کی سسکیوں کے درمیان، "انصاف انصاف" کی گھٹی گھٹی آوازیں ابھرنے لگیں۔

"راجہ علی!" نواب بہادر شیر کی طرح گرجے:

"ہمیں بتایا جائے کہ رانی کے بیان میں کس حد تک صداقت ہے؟"

نواب بہادر کی گرجدار آواز سے راجہ علی کے ہاتھ پیر کانپ گئے تھے۔ اس نے گلوگیر آواز میں جواب دیا:

"اے عادل حکمران۔ رانی کا یہ بیان درست ہے کہ اس کے شوہر کی آنکھیں نکلوا دی گئی ہیں"۔

اس وقت قاضیِ شہر اٹھ کے نواب بہادر کے قریب گئے اور جھک کے سرگوشی میں کچھ کہا۔ پھر اپنی جگہ واپس آ گئے۔

نواب بہادر نے دوسرا سوال کیا:

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اپنے اوپر لگائے جانے والے الزام کا اقبال ہے؟"

"جی ہاں اے عادل حکمران!"

راجہ علی نے تسلیم کیا:

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ راجہ کی دونوں آنکھیں میرے حکم سے نکالی گئیں لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے"۔

"ٹھیک ہے راجہ علی۔ تمہیں صفائی کا موقع ضرور دیا جائے گا"۔

نواب بہادر نے کہا:

"تم اگر درخواست نہ بھی کرتے تب بھی ہم تمہیں صفائی کا موقع ضرور دیتے اس لیے کہ ملزم کو جب تک صفائی کا موقع نہ دیا جائے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے"۔

"میں عادل حکمران کا شکر گزار ہوں"۔ راجہ علی جلدی سے بولا۔

"فرض کی ادائیگی میں کسی شکریہ کی ضرورت نہیں ہوتی"۔ نواب بہادر کے تلخ لہجے میں ایک کسک محسوس ہوتی تھی:

"بتاؤ کہ تم نے یہ گھناؤنا جرم کیوں کیا۔ کیا تم بھول گئے تھے کہ مالابار کا حکمران حیدر نگر میں موجود ہے اور بفضلِ خدا اس کے کان کھلے اور آنکھیں روشن ہیں۔ کیا تم یہ بھی بھول گئے تھے کہ حیدر علی انصاف کے معاملے میں کسی سے رعایت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اگر حیدر علی پر بھی کوئی الزام لگایا جائے تو وہ خود قاضیِ شہر کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرے گا اور اگر قاضیِ شہر نے اسے ملزم گردانا تو وہ تعزیر کو قبول کرے گا"۔

"اے عادل بادشاہ۔ میرے ذہن میں یہ باتیں روشن چراغوں کی طرح جگمگا رہی تھیں" راجہ علی نے اپنی صفائی میں کہا:

"لیکن حالات کچھ اس طرح کے ہو گئے کہ مجھے یہ اقدام کرنا پڑا"۔

"وقت ضائع نہ کرو راجہ علی"۔

نواب بہادر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی:

"تمہیں اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا ہے وہ صاف اور واضح الفاظ میں کہو"۔

"ٹھیک ہے اے شاہِ میسور۔ میں مختصر طور پر ان حالات کو بیان کرتا ہوں ــــ"

"نہیں راجہ علی"۔ نواب بہادر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا:

"ہم تمہیں اختصار پر مجبور نہیں کرتے۔ تم تفصیل سے بیان کر سکتے ہو بشرطیکہ اس تفصیل میں کچھ جان، کچھ وزن ہو۔"

"بہتر ہے اے عادل بادشاہ!"

راجہ علی نے سنبھل کر اپنا بیان شروع کیا:

"اے عادل حکمران۔ مجھے بحری بیڑا تیار کر کے جن جزائر پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، یہ وہی جزائر تھے جن پر آج تک دینِ اسلام کا سورج طلوع نہ ہوا تھا۔ جزائر کے تمام باسی اور ان کا راجہ مشرک اور بت پرست تھے۔ انہوں نے آغازِ اسلام کے وقت مالابار کے ساحلوں پر آباد مسلمان ماپلاؤں پر ظلم و ستم توڑنا شروع کر دیے تھے۔ خشکی کے ہندو راجاؤں اور جزیرے کے بت پرست ہندو دونوں مل کر آئے دن مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے اور قتلِ عام کا بازار گرم کرتے رہتے تھے۔ ان کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک میں کنانور کا راجہ نہ بنا۔

میرے کنانور کی گدی پر بیٹھنے سے خشکی کے راجہ بہت کچھ ٹھنڈے پڑ گئے مگر جزائر کے ظالموں کے ظلم میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اس غلام نے آپ کے حکم سے بحری بیڑا بنا کر ان ظالموں کو تہ و بالا کر ڈالا۔

اس دوران جزائر کے راجہ نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور خود کو اپنے خاندان سمیت میرے حوالے کر دیا۔

جب راجہ، رانی اور ان کے بچے گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیے گئے تو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے دل میں رانی اور اس کے بچوں کے لیے رحم کا جذبہ عود کر آیا۔ میں نے رانی اور بچوں کو رہا کر کے ان کی خواہش کے مطابق حیدر نگر بھجوا دیا۔

راجہ میری قید میں تھا اور ابھی میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ ماپلہ ملاحوں نے راجہ کو ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ راجہ کے حکم سے ماپلاؤں پر سینکڑوں حملے کیے گئے جن میں ہزاروں ماپلاؤں کا قتلِ عام ہوا۔ اس کے قصاص میں وہ لوگ راجہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا چاہتے تھے مگر میں نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔"

حیدر علی نے ایک بار پھر لقمہ دیا:

"تم نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا کہ راجہ کو ان کے حوالے کر دو۔ اس کے بجائے تم نے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ کیا یہ کھلا ہوا ظلم اور اختیارات کی حدود سے تجاوز نہیں؟"

"اے عادل بادشاہ!"

راجہ علی کا گلا خشک ہونے لگا:

"میں نے خود اپنے طور پر آنکھیں نکلوانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔"

"تو کیا ماپلاؤں نے راجہ کو اندھا کرنے کا مطالبہ کیا تھا؟" نواب بہادر نے درشت لہجے میں اس سے پوچھا۔

"یہ بات بھی نہیں تھی نواب بہادر"۔ راجہ علی نے کھنکار کر جواب دیا:

"میں نے اس سلسلے میں اپنے والد اور کنانور کے وزیرِ جنگ، جو میرا نائب ہے، دونوں سے مشورہ کیا۔ میرے والد نے راجہ کو معاف کر دینے کا مشورہ دیا جو میں نے تسلیم نہ کیا۔ میرے نائب نے رائے دی کہ ملاحوں کا کہنا ہے کہ اگر راجہ کو رہا کر دیا گیا تو وہ طاقت حاصل کر کے پھر ماپلاؤں پر حملہ کرے گا اس لیے راجہ کو چھوڑ دینے یا قتل کر دینے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا جائے تاکہ وہ کبھی طاقت حاصل نہ کر سکے۔

پس اس نے مشورہ دیا کہ راجہ کو اندھا کر دیا جائے تاکہ ماپلاؤں کے اڑے ہوئے جذبات سرد پڑ جائیں۔ یہ مشورہ مجھے پسند آیا اور میں نے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اگر یہ میری خطا ہے تو مجھے ضرور سزا دی جائے"۔

نواب بہادر کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے:

"راجہ علی۔ تمہارا بیان ہمیں قائل نہیں کر سکا۔ تمہارے صفائی پیش کرنے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ تم نے راجہ کو اندھا کرنے کا حکم خود اپنے طور پر نہیں دیا بلکہ تمہارے پیشِ نظر ماپلاؤں کا دباؤ اور تمہارے نائب کا مشورہ تھا جس نے تم سے یہ حکم صادر کرایا۔"

"جی ہاں نواب بہادر"۔ راجہ علی کو جیسے کچھ اطمینان حاصل ہوا:

"میں دراصل یہی کہنا چاہتا تھا"۔

نواب بہادر نے قاضیِ شہر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر نواب کے پاس آئے۔ نواب بہادر نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مسند پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ دونوں کچھ دیر آہستہ آہستہ گفتگو کرتے رہے۔ پھر قاضیِ شہر واپس اپنی نشست پر جا بیٹھے اور نواب بہادر نے مقدمے کا فیصلہ سنایا:

"رانی نے امیر البحر راجہ علی کے خلاف اپنا مقدمہ درست پیش کیا۔ رانی کی بیان کردہ کوئی بات غلط نہیں اس لیے کہ راجہ علی نے اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔

ہم نے راجہ علی کو صفائی کا پورا موقع فراہم کیا۔ اس نے ہمارے حکم کی تعمیل میں اس قدر عجلت کی کہ بغیر لباس تبدیل کیے غسل خانہ سے نکل کر حیدر نگر چل پڑا۔ اس کا جو حال ہے وہ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔

لیکن ـــ راجہ علی نے اپنی صفائی میں جو باتیں بیان کی ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ علی میں قوتِ فیصلہ کی شدید کمی ہے۔ وہ اگر دباؤ میں آکر راجہ کو قتل کرا دیتا تو ہمارا فیصلہ وہ نہ ہوتا جو ہم صادر کر رہے ہیں۔

قوتِ فیصلہ کی کمی کے ساتھ ساتھ راجہ علی صرف کنانور کا راجہ نہ تھا بلکہ ہم نے اسے اپنی سلطنت کا امیر البحر بھی مقرر کیا تھا۔ اس طرح اس کے پاس لامحدود اختیارات تھے۔ لیکن وہ ان لامحدود اختیارات کو کام میں لانے میں ناکام رہا۔

اس نے ملاحوں کے مطالبہ کو اگرچہ پوری طرح تسلیم نہ کیا مگر ان کے دباؤ میں آکر ایک معافی مانگنے والے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ہم راجہ علی میں قوتِ ارادی کی کمی، قوتِ فیصلہ میں ناکامی اور ملاحوں کی شورش کو دبانے میں ناکامیابی کی بنا پر امیر البحر سلطنت میسور راجہ علی کو اس کے عہدے سے معزول کرتے ہیں اور اسے اپنے تمام اختیارات اپنے نائب کے حوالے کرنے کے بعد کنانور جانے کا حکم دیتے ہیں۔ کنانور ریاست کا وہ حسبِ سابق راجہ رہے گا۔"

اس فیصلہ کے ساتھ ہی نواب بہادر نے عوامی دربار برخاست کر دیا۔

وہ ۱۶۵۷ء کی ایک روشن صبح تھی!

سرنگاپٹم جنوبی ہند کی ایک ریاست میسور کا صدر مقام تھا۔ اس شہر کی ایک چوڑی گلی میں چند بچے کھیل رہے تھے۔ تمام بچوں کی عمریں پانچ سے سات سال کے درمیان تھیں۔ اس عمر کے بچے عام طور پر کھیلتے وقت دھول دھپہ اور مار پیٹ کرتے ہیں مگر عجیب بات تھی کہ یہ تمام بچے نہایت اطمینان اور سکون سے اپنے کھیل میں مشغول تھے۔

ان بچوں میں ایک بچہ، جس کی عمر سات سال سے زیادہ نہ تھی، دوسرے بچوں سے کافی مختلف نظر آتا تھا۔ وہ چہرے مہرے سے سنجیدہ اور بردبار معلوم ہوتا تھا۔ کھیلتے ہوئے بچوں میں جب کوئی اختلاف یا جھگڑا ہو جاتا تو تمام بچے اس کے گرد آکر کھڑے ہو جاتے اور اپنی اپنی بات کہتے۔ اس طرح اس کے گرد ایک عدالت سی لگ جاتی اور یہ بچہ سب کے بیانات سن کر فیصلہ کرتا۔

تعجب کی بات یہ بھی تھی کہ اس کا فیصلہ ہر بچہ خاموشی سے تسلیم کر لیتا اور پھر دوبارہ سب کھیلنے میں مصروف ہو جاتے۔

راہ چلتے لوگ ان کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے لیکن بچوں سے کچھ دور بیٹھا ہوا ایک درویش صورت انسان بچوں کے کھیل اور خاص طور پر اس لڑکے کے فیصلہ کرنے کی حکمتِ عملی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ اس قدر کم عمر بچہ اپنے ساتھیوں پر کس قدر رعب رکھتا ہے کہ وہ اس کے ہر فیصلہ کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔

مشہور ہے کہ "پوت کے پاؤں پالنے میں" یعنی وہ بچے جن کا مستقبل تابناک اور روشن ہوتا ہے وہ اپنے بچپن ہی میں کچھ اس طرح کے کام یا حرکتیں کرتے ہیں کہ دیکھنے والے ان کے مستقبل کے بارے میں اندازہ لگا لیتے ہیں۔ جب عام لوگ مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں تو پھر اللہ والوں سے کسی بچے کا مستقبل کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے!

چنانچہ ـــ

وہ درویش صفت انسان، جو اپنے ظاہر و باطن دونوں ہی میں درویش تھے، انہوں نے اپنی ظاہری آنکھیں بند کیں اور دل کی آنکھیں کھول کر اس بچے کے مستقبل کی کتاب پڑھنا شروع کی۔ بچے کی زندگی کے اوراق جس انداز سے درویش کے ذہن میں کھلتے جاتے اسی طرح وہ اس بچے سے اور زیادہ متاثر ہوتے جاتے۔

اسی وقت وہ بچہ کھیلتا ہوا اس درویش کے قریب سے گزرا۔ درویش نے اسے روک کر دریافت کیا:

"بیٹا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

بچے نے جواب دیا:

"میری ماں مجھے ٹیپو مستان اور والد مجھے ٹیپو سلطان کہتے ہیں۔"

درویش نے فرمایا:

"دونوں ہی ٹھیک کہتے ہیں۔ تم دل کے مستان اور دماغ کے سلطان ہو۔"

پھر درویش نے اس سے پیار بھرے انداز میں کہا:

"بیٹے۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ آج تم جس طرح اپنے ساتھی بچوں کو ہدایات دے رہے ہو کل تم اسی طرح بادشاہ ہو کر اس سرزمین پر حکومت کرو گے اور یہ سب تمہارے ماتحت ہوں گے۔"

بچہ حیران حیران نظروں سے درویش کو دیکھے جا رہا تھا۔

"حیران نہ ہو میرے بیٹے۔" درویش نے پھر اپنی بات شروع کر دی:

"کل جب تم اس سرزمین کے بادشاہ ہو جاؤ تو اپنے مالکِ حقیقی یعنی اس تمام دنیا کے پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ کو ہرگز نہ بھولنا اور آج تم جس گلی میں کھیل رہے ہو اسی گلی میں ایک مسجد بنوا دینا تاکہ اس میں آ کر لوگ اللہ کی یاد کیا کریں اور تمہیں دعائیں دیا کریں۔"

درویش کی بات ختم ہوئی تو بچے نے مسکرا کر کہا:

"بابا۔ جب میں بادشاہ بنوں گا تو مسجد ضرور بنواؤں گا۔"

درویش نے خوش ہو کر دعا دی:

"خدا تمہاری عمر دراز ـــ"

درویش کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بچہ ایک بار پھر حیران ہوا:

"بابا۔ آپ رونے کیوں لگے؟"

مگر درویش نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح اشکبار آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔

بچہ منہ کھولے کھڑا انہیں دیکھتا رہ گیا۔

درویش سے باتیں کرنے والا یہ بچہ حیدر علی خاں کا فرزندِ اقبالمند سلطان ٹیپو تھا۔

سلطان ٹیپو بڑی منتوں، مرادوں اور دعاؤں کے بعد دیون ہلی میں پیدا ہوا تھا۔ حیدر علی کی پہلی بیوی معذور تھی۔ پھر اسی کے اصرار پر اس نے دوسری شادی کی تھی۔ جب دوسری بیوی سے بھی عرصہ دراز تک کوئی اولاد نہ ہوئی تو حیدر علی کچھ پریشان رہنے لگے۔

ان دنوں ارکاٹ کے درویش ولی مستان ٹیپو کے مزار کی کرامات کا دور دور تک چرچا ہو رہا تھا۔ مستان ٹیپو ولی کے مزار پر لوگوں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ مشہور تھا کہ جس نے اس در پر پہنچ کے مستان ٹیپو ولی کی وساطت سے خدا سے دعا مانگی اس کی دعا ضرور قبول ہوتی تھی۔

حیدر علی خود صوفی اور درویش خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انہیں صوفیوں اور درویشوں سے دلی عقیدت تھی۔ مستان ٹیپو ولی کے آستانے کی انہوں نے بھی شہرت سنی۔ ان کی بیوی کے کانوں تک محلے کی عورتوں نے مستان ٹیپو ولی کے فیوض و برکات کے قصے پہنچائے تو ایک روز بیوی نے میاں کے کان میں یہ بات ڈالی:

"دنیا والے دور دور سے مستان ٹیپو ولی کے مزار پر آتے اور مرادوں کی جھولیاں بھر بھر کے لے جاتے ہیں مگر آپ کو تیر تلوار سے چھٹی نہیں ملتی کہ کسی اور طرف توجہ کریں۔"

بیوی کا طنز جائز تھا۔ حیدر علی نادم ہو کے بولے:

"نیک بخت۔ میں مصروف تھا تو تم نے ہی کوئی قدم اٹھایا ہوتا۔ میں نے تمہیں منع تھوڑی کر رکھا ہے"۔

حیدر علی کی ندامت میں بھی مردانہ شان تھی۔ بیوی جل اٹھی:

"میں اکیلی پھرتی رہوں مزاروں پہ۔ لوگ تو یہی کہیں گے کہ نواب حیدر علی خاں کو تو بچے کی تمنا نہیں اور نہ بیوی ہے کہ مزاروں کے چکر کاٹتی پھرتی ہے"۔

"ناراض نہ ہو بیگم۔ بچے کی جتنی خواہش تمہیں ہے اتنی ہی مجھے بھی ہے"۔ آخر حیدر علی کو ہتھیار ڈالنے پڑے:

"تم جب کہو میں مزار پر حاضری کو جانے کے لیے تیار ہوں"۔

"جب اور کب کا کیا سوال ہے نواب بہادر"۔

بیوی کو غصہ آگیا تھا:

"اب اور ابھی کیوں نہیں۔ ارکاٹ کوئی لاکھ کوسوں تو ہے نہیں کہ وہاں جانے کے خصوصی انتظامات کرنے پڑیں"۔

"تو پھر چلو۔ ابھی اٹھ جاؤ۔ دیر کس بات کی"۔ حیدر علی خاں نے فیصلہ کر دیا۔

نیک بیوی تو چاہتی ہی تھی۔ حیدر علی نے بند گاڑی منگوائی اور بیوی جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح اٹھ کے گاڑی میں جا بیٹھی۔

دونوں میاں بیوی اور ایک گاڑی۔ نہ کوئی پہرے دار نہ سپاہی۔ دونوں آستانہ مستان ٹیپو ولی پر پہنچے تو جمعرات کا دن تھا۔ وہ بھیڑ تھی کہ خدا کی پناہ۔

حیدر علی نے آستانہ کی مسجد میں نماز پڑھی۔ پھر دونوں نے مزار پر حاضری دی۔ پتہ نہیں ان دونوں نے کن لفظوں میں دعا مانگی۔ شاید یہی کہا ہو گا کہ:

"اے خداوند۔ بابا مستان ٹیپو ولی کی برکت سے ایک ایسا چاند سا بیٹا عطا کر جس کی چاندنی پورے برصغیر میں پھیل جائے"۔

بہر حال خدا نے ان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ خزاں رسیدہ چمن میں بہار آئی اور ان کے گلشن میں وہ غنچہ پھوٹا جس کی خوشبو سے حریت پسندوں اور آزادی کے متوالوں کے دل و دماغ مہک اٹھے۔

سلطان ٹیپو کی پیدائش ۲۰۔ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۱ء کو ہوئی۔ اس سپوت نے آگے چل کر حیدر علی خاں کی قائم کردہ سلطنتِ خداداد کو عروج اور استحکام بخشا۔

اس اقبال مند بچے کا نام بھی ٹیپو رکھا گیا۔ ٹیپو کی پیدائش اس دعا کا نتیجہ تھی جو حیدر علی اور ان کی بیوی نے مستان ٹیپو ولی کے مزار پر حاضری کے وقت مانگی تھی۔ اس عقیدت کے اظہار میں حیدر علی نے بیٹے کا نام مستان ٹیپو ولی کی نسبت سے "ٹیپو" رکھا تھا۔ ٹیپو کے معنی "شیر" کے بتائے جاتے ہیں۔

حیدر علی خاں کو شیر پسند تھا کیونکہ وہ خود شیر صفت تھا۔ خوش قسمتی سے ٹیپو کو باپ سے کہیں زیادہ شیر سے رغبت تھی اور وہ شیر کے شکار کا شوقین ہونے کے علاوہ شیر کی بہادرانہ صفات کو بھی پسند کرتا تھا۔

برصغیر کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں صوفیائے کرام کو اکثر و بیشتر شاہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا جس کے معنی سلطان یا بادشاہ کے ہوتے ہیں۔ ٹیپو کا خاندان بھی شیوخ اور صوفیائے کرام سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ممکن ہے کہ ٹیپو کو خاندانی نسبت سے سلطان یا شاہ کا لقب دے دیا گیا ہو مگر اس کے بچپن کے تذکروں میں "سلطان" کا لقب نہیں ملتا۔

فرانسیسی تذکروں میں ٹیپو کے ساتھ "صاحب" کا لفظ ملتا ہے اور عام طور پر اسے ٹیپو صاحب کہتے تھے۔ خود ٹیپو کو بھی سلطان کا لفظ پسند نہ تھا اور وہ خود کو شہری ٹیپو کہلوانا پسند کرتا تھا لیکن انگریز مصنف اسے ٹیپو سلطان ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ صرف ٹیپو ہو، شہری ٹیپو ہو، ٹیپو صاحب ہو یا سلطان ٹیپو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ ہر حال میں سلطان ٹیپو ہی تھا۔

سلطان ٹیپو کوئی شہزادہ نہیں تھا۔ وہ ایک فوجی افسر کا بیٹا تھا اور اس نے ایسے ہی ماحول میں آنکھ کھولی۔ پھر جب وہ پانچ سال کا ہوا تو اس کے والد حیدر علی خاں نے اس کی تعلیم کا معقول انتظام کیا۔ عربی، فارسی کے علاوہ ٹیپو کے لیے فرانسیسی اور انگریزی تعلیم کے استاد بھی مقرر کیے تاکہ وہ اجنبی زبانوں میں مہارت حاصل کر سکے۔

واضح رہے کہ حیدر علی خاں خود ان پڑھ تھے۔

اس زمانے میں سب سے بڑا علم اور فن سپہ گری تھا۔ حیدر علی خاں نے ٹیپو کے لیے غازی خاں کو فنونِ سپہ گری کی تربیت کے لیے مقرر کیا اور ان استادوں کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ

سلطان ٹیپو نے مستقبل میں اپنے دوست اور دشمن، ہر ایک سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ پھر جب وہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچا تو اس نے ان زبانوں میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ وہ ہر مروّجہ زبان میں لکھ پڑھ اور گفتگو کر سکتا تھا۔

انہی دنوں یعنی عنفوانِ شباب میں اسے کتب بینی کا شوق چرایا۔ وہ ہمہ وقت مطالعے میں غرق رہنے لگا۔

ایک دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں اس قدر محو تھا کہ اسے یہ خبر بھی نہ ہو سکی کہ اس کا باپ حیدر علی اس کے کمرے میں داخل ہو کے اس کے قریب آ گیا ہے۔ حیدر علی ایک خالص سپاہی تھا۔ اسے بیٹے کے اس انہماک پر اس قدر طیش آیا کہ وہ زور سے گرج کر بولا:

"ٹیپو۔ تمہیں عالم فاضل بن کے کسی مدرسے کا استاد نہیں بننا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری طرح ایک نڈر اور حوصلہ مند سپاہی بنو۔ اس لیے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنے مطالعہ پر سپاہیانہ زندگی کو ترجیح دو۔"

حیدر علی خاں نے اگرچہ ٹیپو کی تعلیم کے لیے بھی استاد مقرر کیے تھے لیکن انہیں اس کا مطالعے میں اس قدر گہرا انہماک جو اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے، اس قدر ناگوار گزرا کہ انہوں نے ٹیپو کو اس قدر غصے سے تاکید اور تنبیہ کی جس کا اظہار پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

حیدر علی خاں کا ایک اور بیٹا بھی بتایا جاتا ہے مگر واقعات اور حالات یہی بتاتے ہیں کہ ان کی امیدوں کا مرکز صرف اور صرف سلطان ٹیپو ہی تھا۔

حیدر علی خاں غصے میں بھرے ہوئے ٹیپو سلطان کے کمرے سے باہر نکلے تو ان کو ٹیپو کی والدہ نظر آئیں۔ فاطمہ بیگم عرف فخر النسا، حیدر علی خاں کی دوسری بیوی تھیں اور انہیں سلطان ٹیپو کی والدہ ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ایک تو چہیتی بیوی، پھر ولی عہد کی والدہ۔ اس لیے حیدر علی خاں ان کا بہت لحاظ کرتے تھے مگر اس وقت وہ اس قدر غصے میں تھے کہ انہیں دیکھتے ہی بولے:

"دیکھتی ہیں فخر النسا آپ اپنے لاڈلے کی حرکتیں؟"

فخر النسا اگرچہ حیدر علی خاں کی تمام ڈانٹ پھٹکار سن چکی تھیں مگر اس گھڑی بالکل انجان بن گئیں:

"کیا غضب ہو گیا۔ کیا بری حرکت کی ہے میرے بیٹے نے؟"

حیدر علی اسی طرح غصے میں بولے:

"آپ کے بیٹے نے تلوار کو میان میں زنگ لگنے کے لیے ڈال لیا ہے اور کتابوں کا کیڑا بن گیا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ نہیں پائی۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" فخر النسا نہ صرف اور زیادہ انجان بنیں بلکہ مسکرا بھی دیں۔

"فخر النسا۔ آپ بیٹے کی حرکت پر مسکرا رہی ہیں!" حیدر علی خاں ٹیپو کو چھوڑ کر بیوی پر برس پڑے۔

فخر النسا کو شاید حیدر علی خاں کے غصے میں کچھ لطف آ رہا تھا اس لیے انہوں نے لگی میں ذرا اور لگا دی۔ بولیں:

"آپ کے خیال میں مجھے اس وقت رونا چاہیے!"

فخر النسا کے الفاظ اور انداز میں گہرا طنز تھا۔ حیدر علی خاں کا چہرہ لمحہ بھر کو متغیر ہو گیا مگر وہ ضبط کر گئے۔

"فخر النسا بیگم!" انہوں نے زور دے کر کہا:

"آپ خاصی سمجھدار خاتون ہیں۔ آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتیں؟"

"یہی تو کہہ رہی ہوں۔ مجھے سمجھائیے نا!"

"میں — میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صاحبزادے تلوار چھوڑ کر مطالعہ سے دل لگا بیٹھے ہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھ لکھ کے کسی مکتب میں مدرّسی کریں گے۔" حیدر علی خاں نے اپنے طور پر بیوی کو سمجھایا۔

فخر النسا بیگم پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ بگڑ کر بولیں:

"نواب حیدر علی خاں!"

بیگم نے اتنے زور سے کہا کہ راہداری سے گزرتی ہوئی کنیز ٹھٹک کر رک گئی۔ حیدر علی خاں حیرت سے بیوی کا منہ دیکھنے لگے۔

ایک لمبی سانس لے کے فخر النسا نے اپنا جملہ مکمل کیا:

"آپ کے خیال میں پڑھنا لکھنا اور مطالعہ کرنا ایک کارِ عبث ہے اور جو کچھ ہے وہ صرف تلوار ہے۔ میں آپ کی اس منطق کو پسند نہیں کرتی۔ علم اپنی جگہ اور سپہ گری اپنی جگہ۔ ہاں یہ ضرور ہے

کہ فنِ سپہ گری، علم کو کچھ نہیں دے سکتا جبکہ علم، سپہ گری پر احسان کرتا ہے کیونکہ تعلیم ہی سے فنِ سپہ گری میں جِلا پیدا ہوتی ہے۔ حکمتِ عملی تیار کرنے میں صرف علم کام آتا ہے۔ عقل راہیں دکھاتی ہے اور عقل اکثر علم کی محتاج رہتی ہے۔"

حیدر علی خاں خود علم سے نابلد تھے اور خط تک نہ پڑھ سکتے تھے لیکن اللہ نے انہیں عقل اور سمجھ بہت عطا کی تھی اور اسی کے زور پر آج وہ اس مقام تک پہنچے تھے۔ وہ فخر النساء کی علمی اور مدلل باتیں پوری طرح تو نہ سمجھ سکے مگر ان کی سمجھ میں یہ ضرور آ گیا کہ اگر انہوں نے بات آگے بڑھائی تو بیوی انہیں "بے علمی" کا طعنہ ضرور دے دیں گی۔ اسی لیے وہ خاموشی سے باہر چلے گئے۔

قبل اس کے کہ ہم شیرِ دکن سلطان ٹیپو کے حالات پر آگے بڑھیں، بہتر ہوگا کہ اس شیر کے خاندانی حالات اور اس کی جنوبی ہند میں آمد کے بارے میں مختصر طور پر کچھ بیان کر دیا جائے۔ تو آیئے پہلے اس طرف توجہ دیتے ہیں۔

جنوبی بھارت میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ کب شروع ہوا، اس کے متعلق صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاریخ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آغازِ اسلام ہی سے مالابار اور کوکن میں مسلمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ مالابار کا ضلع میسور کے جنوب میں اور کوکن، میسور کے شمال میں واقع ہے۔

ایک قیاس یہ بھی ہے کہ جنوبی بھارت میں ملک عرب سے آنے والے اولیاء اللہ اور اسلامی مبلغین نے اسلام پھیلایا اور ان کی کوششوں سے وہاں مسلمانوں کی آبادی ہوئی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ جزیرۃ العرب اور جنوبی بھارت میں زمانۂ قدیم سے تجارت کا سلسلہ جاری تھا اور عرب تاجر یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ پھر جب عرب میں اسلام پھیلا تو مسلمان عرب تاجر جنوبی بھارت یعنی مالابار اور کوکن وغیرہ آتے جاتے رہے۔ اسی طرح وہاں اسلام پھیلا۔

ظاہر ہے ان تجارتی جہازوں پر مسلمان عرب ملاح بھی جنوبی بھارت آتے تھے۔ ان میں سے کچھ وہاں آباد بھی ہو گئے اور پھر ان کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

جنوبی ہند میں نواب حیدر علی خاں کے زمانہ میں مالابار کے علاقہ میں بہت کثرت سے مسلمان آباد تھے۔ ان مسلمانوں کو ماپلہ کہا جاتا تھا۔ اس کا پتہ تو نہیں چل سکا کہ ان کو ماپلہ کیوں کہا جاتا

تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہوا کہ ماپلہ مسلمان بہترین ملاح ہوتے تھے اور جب نواب حیدر علی خاں نے ایک بحری بیڑے کی ضرورت محسوس کی تو انہیں ماپلہ مسلمانوں کی صورت میں بہترین بحری فوجی دستیاب ہوتے تھے۔

جنوبی ہند میں مسلمانوں کی موجودگی کا پتہ مشہور سیاح ابنِ بطوطہ کے سفرنامہ سے بھی چلتا ہے جب ملک کافور نے میسور پر حملہ کیا تو وہاں کے ہندو راجہ بلال دیو سوم کے پاس ۲۰ ہزار مسلمان سپاہی موجود تھے۔

ابنِ بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:

"راجہ بلال دیو حاکم دہور سمند میسور کے پاس بیس ہزار مسلمانوں کی فوج تھی جن میں زیادہ تر جنگی قیدی اور غلام تھے۔"

مسلمان جنگی قیدیوں اور غلاموں کا تذکرہ ہوئے سالا کی تاریخ میں بھی ملتا ہے جس میں لکھا ہے کہ حاکم بلال دیو یا بلالا دیو نے کوکن پر کئی بار حملہ کیا تھا اور اس کی وجہ سے کوکن سے مسلمان قیدی آئے تھے۔

اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دکن میں ملک کافور سے پہلے بھی مسلمان آباد تھے جنہیں ملک کافور کے حملے کے بعد اہمیت حاصل ہوئی۔

ملک کافور کا نام آیا ہے تو اس کے حملہ کی تھوڑی سی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اسی حملے نے دکنی بھارت میں مسلمانوں پر بہت اثر ڈالا تھا۔

ملک کافور دراصل سلطان علاء الدین خلجی کا ایک زرخرید غلام تھا جو بعد میں اس کا جنرل بنا اور جنوبی ہند میں علائی فوجوں کی کمان کی۔

سلطان علاء الدین سے پہلے دہلی میں جو بادشاہ اور سلطان ہوئے انہوں نے شمالی ہند پر ہی اپنی توجہ رکھی۔ حالانکہ خاندانِ غلاماں کے سلطان التمش، سلطان بلبن وغیرہ بڑے زبردست بادشاہ گزرے ہیں اور وہ چاہتے تو جنوبی ہند کو فتح کر سکتے تھے مگر ان کی توجہ اس طرف نہیں گئی اور یہ اعزاز سلطان علاء الدین خلجی کے حصہ میں آیا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ برصغیر میں دو مسلمان بادشاہ ایسے ہوئے ہیں جو بالکل اَن پڑھ تھے لیکن اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر انہوں نے بڑا عروج پایا۔

ان میں سے ایک بادشاہ مغلیہ خاندان کا جلال الدین اکبر ہے جس کے مذہبی رجحانات سے

اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی اسے "اکبرِ اعظم" تسلیم کیا جاتا ہے۔ اکبر بالکل اَن پڑھ تھا اور شاید اسی بنا پر اس نے ایک نیا دین جاری کیا جسے دینِ الٰہی کہا گیا لیکن یہ خود اس کے قریب ترین احباب میں بھی مقبول نہ ہو سکا۔

اسی طرح دہلی کے مغل خاندان سے پہلے خلجی خاندان کا سلطان علاء الدین خلجی بھی تعلیم سے بالکل نابلد تھا لیکن وہ بڑا جری، نڈر اور ذہین تھا۔

علاء الدین خلجی پر بھی جلال الدین اکبر کی طرح ایک نیا مذہب جاری کرنے کا خبط سوار ہوا۔
اس نے سنا تھا کہ مذہبِ اسلام جاری کرنے والے نبیِ آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چار یار یعنی چار نائب تھے جن کے زور پر اسلام پھیلا۔ چنانچہ اس نے اپنے نئے مذہب کے لیے اسی کو جواز بنایا۔ اس نے کہا:

"جس طرح بانیِ اسلام کے چار نائب حضرات، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ تھے اسی طرح میرے بھی چار نائب موجود ہیں۔"

یہ نائب تھے:

۱۔ ظفر خاں
۲۔ الغ خاں
۳۔ نصرت خاں
۴۔ الپ خاں

بلاشبہ علاء الدین کے یہ چاروں جرنیل اپنی مثال آپ تھے اور اس کی سلطنت انہی چار ستونوں پر قائم تھی۔

نیا مذہب جاری کرنے کے علاوہ اس کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ وہ سکندرِ اعظم کی طرح اپنا لشکر لے کر نکلے اور تمام دنیا کو فتح کر لے۔

وہ اپنے ان دونوں منصوبوں کو بے دھڑک دربار میں بیان کرتا مگر لوگ اس کے خوف کی وجہ سے اس پر نہ تو اعتراض کرتے اور نہ مخالفت کی مجال رکھتے تھے۔

جب اس کے ان منصوبوں کا چرچا دربار سے عوام میں پہنچا تو وہاں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔
اور لوگوں نے اس کے منصوبوں کی مخالفت شروع کر دی۔ آخر لوگوں کو ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو سلطان تک ان کے خیالات پہنچائے۔

اس زمانے میں علاء الملک ہی ایک ایسی ہستی تھی جس کی بات سلطان توجہ سے سنتا بھی تھا اور مانتا بھی تھا۔

پس عوام کا وفد علاء الملک کے پاس پہنچا اور ان سے عرض کیا:

"محترم و مکرم علاء الملک صاحب! آپ نے بھی سلطانِ معظم کے منصوبے سنے ہوں گے براہِ کرم آپ سلطان کو ایسے خام خیالات سے باز رکھنے کی کوشش کیجیے ورنہ لوگوں میں بغاوت پھیل جانے کا خطرہ ہے۔"

علاء الملک عوامی نمائندوں کے خیالات اور گفتگو سن کے پریشان ہو گئے۔ وہ خود سلطان کے ان منصوبوں کے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے وفد کو مطمئن کر کے واپس کر دیا اور خود سلطان کے پاس پہنچے۔

"علاء الملک۔ ہم تمہیں یاد کر رہے تھے۔ اچھا ہوا کہ تم خود آ گئے۔" سلطان نے انہیں دیکھا تو مسکرا کر کہا۔

"میں حاضر ہوں۔ ارشاد فرمائیے۔ کیا حکم ہے؟"

علاء الملک خود شکوہ کرنے آئے تھے لیکن جب سلطان کو گفتگو پر آمادہ پایا تو بات اسی پر ڈال دی۔ سلطان نے کہا:

"ہم نے دربار میں اپنے دو منصوبوں کا ذکر کیا تھا، وہاں تم بھی موجود تھے لیکن تم نے ہمیں کوئی مشورہ نہیں دیا۔"

علاء الملک کو بولنے کا موقع مل گیا:

"سلطانِ معظم!" اس نے ادب سے عرض کیا:
"میں آپ کو مشورہ تو نہیں دے سکتا۔ ہاں اس سلسلے میں کچھ گزارشات ہیں۔ حکم ہو تو عرض کروں؟"

"ضرور ضرور۔" سلطان نے بڑی شگفتگی سے کہا:
"وہی تو ہم سننا چاہتے ہیں۔"
علاء الملک نے بڑی متانت سے کہا:
"سلطانِ عالی مقام۔ جہاں تک نئے مذہب کو جاری کرنے کا تعلق ہے اس کے لیے عرض یہ ہے کہ نبی اقتدار اور سلطنت سے نہیں ہوا کرتے بلکہ وہ خدائے ذوالجلال کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں

ہماری سلطنت دہلی یعنی خلجی حکومت تو ایک اسلامی حکومت ہے اور مسلمان ہمارے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبیِ آخر الزماں مانتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس لیے اگر آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کوئی نیا مذہب جاری کرنے کی کوشش کی تو تمام مسلمان آپ کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔

اب رہا آپ کا دوسرا منصوبہ یعنی تسخیرِ عالم کا خیال تو یہ کچھ بُرا ارادہ نہیں لیکن سکندرِ اعظم جس نے تسخیرِ عالم کا منصوبہ بنایا تھا اس کے پاس ارسطو جیسا باتدبیر وزیر اور استاد موجود تھا جس نے اس کی سلطنت سنبھالے رکھی۔ آپ کے پاس کوئی قابل وزیر نہیں جو آپ کی عدم موجودگی میں خلجی سلطنت کو سنبھال سکے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ابھی سلطنتِ خلجی کے تحت برِصغیر کے بہت سے علاقے نہیں آئے ہیں۔ پھر کیوں نہ تسخیرِ عالم کے بجائے پورے برِصغیر کی تسخیر کے لیے علائی لشکر کو استعمال کیا جائے۔"

سلطان علاء الدین خلجی اَن پڑھ ہونے کے باوجود بڑا ذہین تھا۔ علاء الملک کی کہی ہوئی دونوں باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں اور اس نے اپنے دونوں منصوبوں کو اپنے دل ہی میں دفن کر دیا اور پھر کبھی ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

اس نے اپنے دونوں منصوبوں کو ختم ہی نہیں کیا بلکہ علاء الملک کے سمجھانے پر برِصغیر کے ان علاقوں کو تسخیر کرنے کا فیصلہ کر لیا جو اَب تک سلطنتِ دہلی میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

شمالی ہند کی تین بڑی ہندو ریاستیں اب تک سلطنتِ دہلی کے ماتحت نہیں آئی تھیں۔ یہ تینوں ریاستیں تھیں:

۱۔ گجرات
۲۔ رنتھمبور
۳۔ چتوڑ

ریاست گجرات پر سلطان محمود غزنوی اور سلطان قطب الدین ایبک نے حملہ کیا تھا مگر انہیں غزنی یا دہلی کی ریاستوں میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ سلطان خلجی نے سب سے پہلے اپنے لشکر کو گجرات پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

الغ خاں و نصرت خاں، علائی لشکر کے ساتھ گجرات پر حملہ آور ہوئے۔ وہاں کا راجہ کرن اپنی

رانی کملا دیوی کو چھوڑ کر جنوبی ہند کی ریاست دیوی گری بھاگ گیا اور رانی کملا دیوی خود اپنی مرضی سے مسلمان ہو کر سلطان خلجی کے حرم میں داخل ہوئی۔

اس سے دو سال بعد یعنی ۱۲۹۹ء میں سلطان خلجی کے انہی دو جرنیلوں نے رنتھمبور پر حملہ کیا اس حملہ میں نصرت خاں ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گیا تو سلطان علاء الدین خود وہاں پہنچا اور رنتھمبور کو فتح کر کے سلطنت میں شامل کر لیا۔

شمالی ہند کی تیسری بڑی ریاست میواڑ کی تھی۔ اس کا قلعہ چتوڑ مسلمانوں کے دست برد سے آج تک محفوظ تھا۔ اس کا محلِ وقوع اس قسم کا تھا کہ اسے ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ قلعہ پر حملہ میں سلطان خلجی نے خود بھی حصہ لیا اور بآخرکار اسے فتح کر لیا۔

قلعہ چتوڑ کے سلسلے میں بعض مؤرخین نے بغیر تحقیق کے چتوڑ کی رانی پدمنی اور سلطان علاء الدین خلجی کا اس پر عاشق ہو جانے کا ایک فرضی قصہ بیان کیا ہے۔ یہ قصہ بھی دراصل اسی سازش کا ایک حصہ ہے جس میں برِصغیر کے ہندوؤں اور بدیسی حکمرانوں یعنی انگریزوں نے گٹھ جوڑ کر کے مسلمان بادشاہوں اور سلطانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس قصے کی حقیقت یہ تھی کہ فتح چتوڑ کے ۲۰۰ سال بعد قصبہ جائس کے ایک شاعر نے جس کا نام ملک محمد جائسی تھا، ایک منظوم قصہ لکھا جس میں سلطان خلجی کا رانی پدمنی سے عشق کا قصہ بیان کیا کہ سلطان خلجی آئینے میں رانی کا عکس دیکھ کر اس پر عاشق ہوا، پھر اسے زبردستی دہلی کے قلعے میں لے جانا اور راجپوتوں کا ڈولیوں میں بیٹھ کر قلعہ دہلی میں جانا اور وہاں سے رانی کو چھڑا کر واپس لانا، وغیرہ وغیرہ بیان کیا گیا ہے۔

ملک محمد جائسی کی یہ منظوم داستان اسی طرح کی ہے جس طرح بغداد کے عباسی خلیفہ کو بدنام کرنے کے لیے الف لیلیٰ لکھی گئی تھی۔ چونکہ نظم دلچسپ تھی اس لیے ہندو اور انگریز گٹھ جوڑ نے اسے برِصغیر کی تاریخ میں شامل کر دیا تاکہ وہ عظیم الشان سلطان جس نے پہلی مرتبہ جنوبی ہند کو فتح کیا تھا، اسے بدنام کیا جائے۔

مقامِ شکر ہے کہ پاکستان میں لکھی جانے والی تواریخ میں اس واقعہ کو ایک نوٹ لکھ کر حذف کر دیا گیا ہے مگر بعض تاریخی افسانے لکھنے والے اب بھی اس واقعہ کو تاریخی قصہ اور تاریخ کا حصہ بنا کر سلطان خلجی کی بدنامی کا داغ خود اپنے دامن پر لگاتے ہیں۔

بہرحال ـــ

* یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کے ذکر سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس سلطان نے پہلی مرتبہ جنوبی ہند کی تسخیر کی۔

۱۳۰۷ء میں علائی لشکر ملک کافور کی سرکردگی میں دیوی گری پہنچا۔ اس کی فتح کے بعد ورنگل، دوار سمدر اور معبر وغیرہ نے اطاعت قبول کر لی اور بہت سے مسلمان جنوبی ہند کے علاقوں میں آباد ہوئے جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں کیا ہے۔

سلطان ٹیپو کے آباؤ اجداد کے نام و نسب اور وطن کے بارے میں بہت سی روایتیں مشہور ہیں لیکن ہمارے خیال میں سلطان کے بزرگ مسلمان اور صرف مسلمان تھے۔ اور مسلمان ہونا ہی ایک طرۂ امتیاز ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلم قوم ہی کو دنیا کی اعلیٰ ترین قوم کہا ہے۔ اس لیے کسی کو ذات برادری کی وجہ سے بلند درجہ دینا غلط ہے بلکہ اصل بات اس کا ذاتی کردار ہے جیسا کہ حالیؔ نے کہا ہے:

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ہے کیا
مگر وصفِ ذاتی کا ڈنکہ بجے گا

سلطان کے آباؤ اجداد کے بارے میں مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ ۱۶۲۰ء میں پنجاب سے آنے والا ایک قافلہ دہلی ہوتا ہوا جنوبی ہند کے اس شہر میں پہنچا جہاں شاہ بندہ نواز گیسو دراز سو رہے ہیں اور ان کی درگاہ مرجع خلائق ہے۔

اس قافلہ میں ایک افغان خاندان تھا۔ ولی محمد خاں نام کا ایک صوفی منش بزرگ صورت انسان اس خاندان کا سربراہ تھا۔ واضح رہے کہ بعض مؤرخوں نے اس خاندان کو پنجاب کا بیان کیا ہے۔

ولی محمد خاں کو حضرت بندہ نواز سے بے پناہ عقیدت تھی اور یہ عقیدت ہی انہیں پنجاب سے گلبرگہ کھینچ لائی تھی۔ گلبرگہ کا علاقہ ریاست بیجاپور کے ماتحت تھا اور اس وقت بیجاپور پر عادل شاہ حکمرانی کر رہا تھا۔

ولی محمد خاں اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس درگاہ شریف میں اترے تو ان کی درویشی اور بزرگی سے متاثر ہو کر درگاہ کے متولی نے درگاہ کی طرف سے ان کے اخراجات کے لیے وظیفہ مقرر کرا دیا اور اپنی بیٹی کی شادی ولی محمد کے بیٹے محمد علی سے کر دی۔

ولی محمد خاں کا دل گلبرگہ سے اچاٹ ہوا تو وہ بیجاپور پہنچے اور جب بیجاپور پر زوال آیا تو نقل مکانی کر کے کرناٹک کے قصبہ کولار چلے گئے۔ حاکمِ کولار شاہ محمد ولی نے ان کی بہت

آؤ بھگت کی۔

ولی محمد خاں کے چار بیٹے تھے:

فتح محمد　　محمد امام　　محمد الیاس　　محمد علی

یہ تمام بیٹے درویشی کے بجائے سپاہیانہ زندگی کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ باپ کی وفات کے بعد یہ چاروں "تلاشِ معاش" میں ادھر ادھر نکل کھڑے ہوئے۔

فتح محمد خاں نے نواب ارکاٹ سعادت اللہ خاں کے ہاں ملازمت کی اور اپنی ذاتی استعداد اور کارکردگی سے علم، نقارہ اور ہاتھی کا اعزاز حاصل کیا۔

فتح محمد نے تنجاور کی ایک درویش زادی سے شادی کی جس سے دو بچے شہباز اور حیدر علی پیدا ہوئے۔ یہی حیدر علی خاں، سلطان ٹیپو کے والد بزرگوار ہیں۔

حیدر علی خاں کے حالاتِ زندگی اور ان کے مجاہدانہ کارنامے تاریخ برصغیر کا ایک الگ باب ہیں جنہیں دو چار صفحات میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ اب سلطان ٹیپو کے کارناموں اور واقعات کو تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے اس لیے ہم گزشتہ واقعات کو نہیں دہرائیں گے۔ نواب حیدر علی خاں اور سلطنتِ خداداد میسور کے سلسلے میں صرف یہ بات یاد رکھیے کہ جس وقت نواب نے ریاست میسور کی ملازمت اختیار کی تو وہاں کا راجہ اوڈیر خاندان کا ہندو راجہ کرشنا اوڈیر حاکم تھا اور ریاست میسور صرف ۳۲ گاؤں پر مشتمل تھی مگر جب حیدر علی خاں نے اس ریاست کا نظام خود سنبھالا تو ۳۲ گاؤں کی یہ ریاست ۸۰ ہزار مربع میل تک وسیع ہو گئی۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نواب حیدر علی خاں اور ان کے سپوت سلطان ٹیپو نے اس ریاست کو وسعت دینے کو کیا کچھ نہ کیا ہو گا۔

ٹیپو سلطان کو حیدر علی خاں نے ایک بار بچپن میں سخت تنبیہ کی تھی کہ وہ کتابی کیڑا بننے کی بجائے سپاہیانہ زندگی اختیار کرے۔ شاید اس تنبیہ اور نصیحت کا ہی نتیجہ تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ "پہلی جنگ میسور" میں بحیثیت ایک جرنیل کے شامل ہوا تو اس نے حیدر علی پر ثابت کر دیا کہ اس نے ان کی نصیحت پر پورا پورا عمل کیا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سلطان ٹیپو نے پہلی جنگِ میسور سے پہلے میدانِ جنگ کی صورت ہی نہیں دیکھی تھی۔ ۱۷۶۲ء میں جب اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی تو نواب حیدر علی خاں نے اپنے اس

شہزادے کو سالار کے طور پر بدنور اور کنانور وغیرہ کے میدانوں میں اپنے ساتھ رکھا ان جنگوں کے دوران حیدری لشکر کو دور دراز اور دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزرنا پڑا اور طرح طرح کی تکالیف اٹھانا پڑیں۔ اس وقت شہزادہ بھی لشکر میں موجود تھا اور اس نے جنگ کے سرد و گرم دیکھے تھے۔

میسور کی جنگِ اول سے پہلے ۱۷۶۵ء میں شہزادہ ٹیپو ہمیں ایک اور معرکہ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ معرکہ کرگ کی سرحد پر پالیگاروں کی بغاوت کا ہے۔

شہزادہ ٹیپو کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی۔ کرگ کی سرحد کے پالیگاروں نے متحد ہو کر نواب حیدر علی خاں کے خلاف بغاوت کر دی اور ایسی جرأت کا مظاہرہ کیا کہ سرنگاپٹم جو ریاست میسور کا دارالسلطنت، تھا، کے علاقوں میں داخل ہو گئے۔

اس وقت حیدر علی خاں بدنور، چیتل درگ فتح کرنے کے بعد مالابار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس دوران انہیں دو بار مرہٹوں سے سابقہ پڑا۔ انہیں شکست دینے کے بعد حیدر علی خاں کالی کٹ کے ان پالیگاروں کی سرکوبی کے لیے بڑھے۔

سب سے پہلے حیدر علی خاں نے تعلقہ بل کے پالیگاروں پر چڑھائی کی۔ اس علاقہ کے لوگ معہ اہل و عیال کے قریبی جنگل میں جا چھپے۔ حیدر علی خاں نے بل پر قبضہ کیا اور پیڑوں کی آڑ لیتے ہوئے جنگل میں چھپے ہوئے پالیگاروں کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہاں سے حیدری لشکر پالیگاروں پر برق بن کر گرا۔

اس معرکے میں ہزاروں کی تعداد میں پالیگار مارے گئے۔ کچھ بھاگ نکلے اور باقیوں نے معافی مانگ کر پناہ حاصل کی۔

ادھر تو حیدر علی خاں اس معرکہ میں مصروف تھے اور ان سے کچھ فاصلہ پر شہزادہ ٹیپو ایک اور مہم سر کرنے میں مشغول تھا۔

شہزادہ تین ہزار کی فوج لے کر پیچھے جنگل میں جا گھسا اور اس نے پالیگاروں کی سپلائی لائن پر قبضہ کر لیا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ اس سپلائی لائن پر پالیگاروں کی عورتوں کی ڈیوٹی تھی۔ شہزادے نے تمام عورتوں کو گرفتار کر کے سپلائی لائن کاٹ دی اور قیدی عورتوں کو حیدر علی خاں کے سامنے پیش کیا۔

نواب بیٹے کی اس کارکردگی سے بہت خوش ہوئے اور اسے داد دی۔

پالیگاروں کے سردار کو جب اپنی عورتوں کی گرفتاری کی خبر ملی تو اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر نواب حیدر علی خاں کے سامنے پیش ہوا اور ان سے اپنی عورتوں کی رہائی کی درخواست کی۔

نواب بہادر نے ان کی درخواست منظور کی اور عورتوں کو رہا کر دیا۔ پالیگار ان کے اس قدر احسان مند ہوئے کہ انہوں نے عورتوں کے صلے میں نواب کو ہاتھی دانت اور جواہرات سے لدے ہوئے ۵۰ اونٹ نذر کیے اور اطاعت و وفاداری کی قسم کھائی۔

اس سے اگلے سال یعنی ۱۷۶۶ء میں میسور کے راجہ کرشن اوڈیر کا انتقال ہو گیا۔ یہ اوڈیر خاندان کا سولھواں راجہ تھا۔

راجہ کرشن اوڈیر نے حیدر علی خاں کے خلاف کئی بار بغاوت کرائی اور انہیں قتل کرانے کی کوشش کی اس لیے حیدر علی خاں نے مجبور ہو کر اسے ریاست کے انتظامی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا تھا تاہم اس کی شان و شوکت برقرار رکھی تھی اور اسے اخراجات کے لیے معقول وظیفہ دیا جاتا تھا۔

حیدر علی خاں نے اگرچہ ریاست کے تمام اختیارات ہاتھ میں لے لیے تھے مگر راجہ کو تمام تہواروں پر دربار منعقد کرنے کی اجازت تھی اور اسے حسبِ سابق نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ خود حیدر علی خاں ایک ملازم کی حیثیت سے دربار میں پیش ہوتے اور راجہ کے حضور نذر گزارتے مگر راجہ ہمیشہ ان کا مخالف ہی رہا اور انہیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔

راجہ کرشن اوڈیر کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کے جانشین کے انتخاب کا مسئلہ اٹھا۔ اس موقع پر نواب حیدر علی خاں نے راج محل میں دربار لگایا اور اوڈیر خاندان کے تمام بچوں کو اس دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

جس وقت بچے دربار میں آئے تو ان کے لیے ہزاروں قسم کے کھلونے وہاں موجود تھے۔ حیدر علی نے بچوں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی پسند کے کھلونے اٹھا لیں اور انہیں اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔

بچے کھلونے دیکھ دیکھ کر بے حد خوش ہو رہے تھے۔ جب نواب نے انہیں اپنی پسند کے کھلونے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تو وہ کھلونوں پر ٹوٹ پڑے اور ہر ایک نے اپنی اپنی پسند کے کھلونے اٹھا لیے۔

نواب حیدر علی خاں اپنے سرداروں اور شہزادہ ٹیپو کے ساتھ کچھ دور بیٹھے بچوں کی کھلونوں کے

سلسلے میں چھینا جھپٹی بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

کھلونے اٹھانے کے بعد نواب کے حکم سے تمام بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ تب نواب نے ہر بچے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھلونے کو دیکھا۔

ان میں ایک بچہ ایسا تھا جس نے کسی کھلونے کے بجائے، کھلونوں کے ساتھ پڑی ہوئی چھوٹی سی تلوار اٹھائی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ میں چند لیموں تھے جسے وہ بچہ تلوار سے کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نواب حیدر علی نے نئے راجہ کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا:

"ان تمام بچوں میں صرف ایک بچہ میسور کا راجہ بننے کے قابل ہے اور وہ بچہ اپنے ہاتھوں میں تلوار اور لیموں پکڑے ہوئے ہے۔"

غلاموں نے فوراً اس بچے کو نواب بہادر کے سامنے پیش کیا۔ نواب بہادر نے اس بچے کو متبنیٰ کرنے کی رسم ادا کرائی اور اس کے راجہ میسور ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس کے باوجود ہندو اور انگریز مورخ نواب بہادر کو غاصب کہتے ہیں۔ اگر نواب بہادر غاصب ہوتے تو اوڈیر خاندان کے بچے کے بجائے اپنے بیٹے کو راجہ میسور بناتے۔ انہیں اس اقدام سے کون روک سکتا تھا؟

اس جگہ نواب حیدر علی خاں کے بعض واقعات کا اعادہ اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر سلطان ٹیپو کی شخصیت پوری طرح ابھر نہیں سکتی۔

ان دنوں کرناٹک میں محمد علی اپنی نوابی قائم کر رہا تھا۔ وہ انگریزوں کی مدد سے اس علاقے کا حکمران بن گیا تھا۔ اس کے صلے میں اسے انگریزوں کی مدد کرنا پڑ رہی تھی۔ چنانچہ اگلے معرکوں میں وہ حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے خلاف انگریزوں کی مدد کرتا رہا۔ آخر مغل شہنشاہ دہلی نے اسے والاجاہ کا منصب و خطاب عطا کر دیا۔

انگریز اس سے پہلے بنگال پر قبضہ کر چکے تھے اور انہوں نے بمبئی اور مدراس سے اپنا ہیڈ کوارٹر کلکتہ منتقل کر لیا تھا۔

واضح رہے کہ بنگال کے نواب سراج الدولہ کو انگریزوں نے غدارِ ملک و ملت میر جعفر کی مدد سے شکست دے کر بنگال پر قبضہ کیا تھا۔

نواب حیدر علی خاں اپنے لشکر کی تنظیم و ترتیب میں پوری طرح منہمک تھے۔ انہوں نے لشکر کی تنظیم میں اس مرتبہ ان کے لباس اور ترتیب میں رنگوں کے انتخاب پر بھی خاص توجہ دی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے ایک منظم اور مضبوط لشکر تیار کر لیا۔

ان کے لشکر کے سواروں کی وردیاں اس قسم کی تھیں کہ وہ دور سے پھریرے سے اڑتے دکھائی دیتے تھے۔ بندوقچیوں کی وردیاں سبز، سرخ، زرد اور سیاہ بانات سے تیار کی گئی تھیں۔

حیدر علی خاں کے لشکر میں تین ہزار سواروں پر مشتمل ایک آہن پوش دستہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہزار سواروں کا ایک دستہ شتر سواروں کا تھا۔ یہ اونٹ انہوں نے دشمن کی فوجوں سے حاصل کیے تھے۔ پیادہ فوج میں سولہ ہزار باقاعدہ فوجی تھے۔ چالیس ہزار کے قریب کرناٹکی پیادے اور بیس ہزار جنگی سوار تھے۔ نواب حیدر علی خاں کے اس عظیم لشکر سے انگریز گھبرانے لگے تھے۔

کرناٹک کے محمد علی خاں نے نواب بنتے ہی نظام حیدرآباد کی سیادت کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا تھا۔ والی دکن نواب نظام علی خاں نے بھی اس منہ زور کو لگام دینے کے لیے لشکر تیار کر کے کرناٹک پر حملہ کر دیا تھا مگر والاجاہ اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ سے وہ گھبراتا تھا اس لیے نواب حیدرآباد نے حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اس نے نواب حیدر علی خاں کو ایک خط لکھا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

"تاجر پیشہ انگریز کرناٹک کے سرکش صوبے دار کے ذریعے اپنی حکمرانی کے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ انہوں نے کرناٹک پر کھلے طور پر اپنا تسلط جما لیا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ آپ کے تعاون سے اس علاقے (کرناٹک) کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے آئیں۔"

نظام حیدرآباد کا یہ خط حیدر علی خاں کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی کرناٹک کے نواب والاجاہ محمد علی خاں کے پاس پہنچ گیا۔

نظام کے خط کا راز افشا ہونے اور خط کے والاجاہ کے پاس پہنچ جانے کے پس منظر میں ایک عجیب داستانِ محبت ہے۔ اس داستان میں نہ صرف عشق کی کارفرمائیاں اور بوالعجبیاں ہیں بلکہ داستان کے کرداروں نے اپنے ذاتی مفاد کی بنا پر کچھ ایسے اقدام کیے جنھوں نے جنوبی ہند اور

خاص کر سلطنتِ میسور کی تاریخ کے دھارے کو بڑی حد تک موڑنے کے لیے رکھ دیا۔

ان حالات کی بنا پر اس داستان کا مختصراً تذکرہ قارئین کی دلچسپی کے لیے تحریر کیا جاتا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب حاکم کرناٹک محمد علی خاں صرف حاکم تھا۔ نہ تو اسے کرناٹک کی نوابی ملی تھی اور نہ وہ نظام حیدر آباد کی ماتحتی سے آزاد ہوا تھا۔

اُس وقت تک کرناٹک، نظام حیدر آباد کے ماتحت تھا اور وہاں کا حاکم نظام حیدر آباد ہی مقرر کرتا تھا اور اس کی سند شہنشاہ دہلی شاہ عالم ثانی دیا کرتا تھا۔

روایت ہے کہ ۱۷۵۰ء کے قریب نظام الملک نے دہلی دربار میں خفیہ طور پر اپنا ایک وفد بھیجا شہنشاہ دہلی کو تحفے تحائف کے ساتھ اس نے چھ کنیزیں اور چھ غلام بھی نذر کے لیے بھیجے۔

اس زمانہ کے بادشاہوں اور حاکموں میں دستور تھا کہ وہ جب ایک دوسرے کو خط لکھتے تو قاصد کے ہاتھ قیمتی تحائف اور لونڈی غلاموں کی نذر بھی روانہ کرتے تھے۔ یہ غلام نہایت تنومند اور شہ زور ہوتے اور کنیزیں اپنی خوبصورتی یا پھر چرب زبانی کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہوتی تھیں۔

مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی، جس کی شہنشاہیت کی حدود دہلی بلکہ قلعۂ دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں اس نے نظام الملک کے وفد کو اذنِ باریابی دیا اور باقاعدہ دربار منعقد کر کے قاصد سے خط اور تحفے وصول کیے۔

شہنشاہ کا اقتدار اگرچہ محدود ہو گیا تھا مگر برصغیر ہند کے شمالی اور جنوبی اور مشرق و مغرب کے وہ تمام صوبے جو کبھی سلطنتِ مغلیہ میں شامل رہ چکے تھے، اب بھی شہنشاہِ دہلی کو اپنا شہنشاہ کہتے تھے اور پرانے دنوں کی طرح تمام بڑے عہدوں پر اپنے پسندیدہ لوگوں کو مقرر کر کے اس کی منظوری شہنشاہ سے حاصل کرتے تھے۔ برصغیر میں یہ طریقہ شاید بغداد کی عباسی خلافت کی تقلید میں اختیار کیا گیا تھا۔

بغداد میں اگرچہ عملاً عباسی خلافت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور عباسی خلیفہ کا سکہ صرف حدودِ بغداد تک محدود ہو چکا تھا مگر عراق، مصر اور ہند و ستان تک کے تمام مطلق العنان بادشاہ اور سلطان، تختِ سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد خلیفۂ بغداد سے اپنے لیے سندِ خلافت منگواتے اور بالکل اسی طرح کا دستور وہاں رائج تھا۔

مختصر یہ کہ شہنشاہ دہلی نے نظام الملک، نظام دکن کے خط کا جواب دیا اور جب وفد واپس جانے لگا تو حسبِ دستور شہنشاہ نے بھی نظام الملک کے لیے دو کنیزیں اور دو غلام تحفے کے طور پر بھیجے۔

ان بھیجے جانے والے غلاموں کے متعلق تو کچھ علم نہیں کہ وہ کس صورت، شکل اور عادات و اطوار کے مالک تھے مگر نظام الملک کو جو دو کنیزیں بھیجی گئیں ان میں ایک کا نام "طرحدار" تھا۔

مشہور تھا کہ طرحدار کہنے کو تو کنیز تھی مگر وہ تقریباً تمام شاہی بیگمات پر حکمرانی کرتی تھی۔ بے انتہا ذہین تھی اور اسی قدر خوبصورت۔

اسے دیکھ کے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ طرحدار کسی اعلیٰ گھرانے کی دوشیزہ ہے لیکن اس کی اصلیت کا پتہ نہ چل سکا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ حاکم بٹھنڈہ نے اس کنیز کو شہنشاہ کی نذر کیا تھا اور یہ نذر ایسی خوش نصیب تھی کہ شاہی محل میں پہنچتے ہی سب کی نظروں میں چڑھ گئی۔ کیا شہنشاہ، کیا ملکائیں، کیا شہزادے اور کیا شہزادیاں، سب ہی طرحدار کا دم بھرتے تھے۔

ذہانت اور خوبصورتی کے علاوہ طرحدار میں یہ صفت بھی تھی کہ وہ ہر ایک کام ہر وقت کرنے کو تیار رہتی اور بڑے سے بڑے اور مشکل سے مشکل کام کو چٹکیوں میں کر دیتی تھی۔ اس لیے سب اس سے محبت کرتے اور اس کی عزت بھی کرتے تھے۔

شہنشاہ دہلی نے اس خطرے کے پیشِ نظر کہ کہیں کوئی شہزادہ، طرحدار کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر نہ ہو جائے، اس کی شادی ایک سردار سے طے کر دی تاکہ طرحدار شاہی محل سے نکل جائے۔ مگر۔

جب شہنشاہ کی کنیزِ خاص نے طرحدار کو بتایا کہ شہنشاہ نے اس کی شادی فلاں سردار سے طے کر دی ہے اور کچھ دن بعد وہ محل سے رخصت ہو جائے گی تو طرحدار پھیل گئی اور ملکہ عالم کے پاس پہنچ کر ان کے پیر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

طرحدار کو ملکہ کا بڑا مان تھا۔ ملکہ واقعی اسے بہت مانتی تھیں۔ ان کے تمام چھوٹے بڑے کام طرحدار ہی کرتی تھی اور کام بھی ایسے سلیقے سے کرتی کہ ملکہ کا جی خوش ہو جاتا۔

"پیر چھوڑ طرحدار۔ بات کیا ہے؟" ملکہ نے محبت سے پوچھا۔

"پیر تو نہیں چھوڑوں گی ملکہ عالم!" طرحدار نے اپنا سر بھی ملکہ کے قدموں میں رکھ دیا۔

"اری کیا ہوا تجھے۔ عقل ٹھکانے ہے تیری!" ملکہ نے پیر کھینچنے کی کوشش کی۔

"ملکہ عالم۔ مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیے۔ میں مر جاؤں گی۔" طرحدار کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ڈھلک کر شہابی رخساروں پر آ گئے۔

"تو رو رہی ہے طرحدار"۔ ملکہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا:

"کس نے تیرا دل دکھایا ہے۔ مجھے بتا۔ پھر دیکھ میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں؟"

ملکہ سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے محبت سے دھکا دے کر طرحدار کو پیروں سے ہٹایا اور خود ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

ملکہ نے طرحدار کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور آپ ہی آپ بولنے لگی:

"میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں تو چپ چپ ہے۔ چہرے کا رنگ پھیکا ہو رہا ہے۔ چلتی ہے تو جیسے بیمار۔ جبھی تو میں کہوں کیا ہوا میری طرحدار کو؟"

یہ ملکہ ہند کی طرحدار کے ساتھ بڑھی ہوئی محبت تھی جو الفاظ میں ڈھل رہی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور صبح سے طرحدار، ملکہ کے پاس کم از کم دس مرتبہ آ چکی تھی مگر اس سے پہلے وہ بالکل ٹھیک تھی۔ ہنس بول رہی تھی۔ دوسری کنیزوں کو چھیڑ رہی تھی۔ ملکہ ہند بھی اس کی مسکراہٹوں اور قہقہوں میں شریک رہی تھی۔ اس وقت طرحدار نے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا نہ اس کا اس طرح چہرہ اترا تھا۔

"اے بولتی کیوں نہیں کم بخت۔ ڈھیر ڈھیر آنسو بہا رہی ہے اور منہ سے کچھ پھوٹتی نہیں۔ گھگھے بھرے ہیں کیا؟"

ملکہ ہند ایک کنیز کی ناز برداری میں لگی تھیں۔

آخر طرحدار نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور موٹی موٹی غلافی آنکھیں اوپر اٹھائیں:

"ملکہ عالم ـــ"

اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"پھر وہی۔ روئے چلی جا رہی ہے کم بخت۔ بتاتی کیوں نہیں کچھ!"

ملکہ ہند کا دل بھی شاید بھر آیا تھا:

"جب تک تو بتائے گی نہیں۔ میں کیا کر سکوں گی تیرے لیے؟"

طرحدار ہچکیوں میں بولی:

"کہہ تو رہی ہوں ملکہ عالم۔ مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیے۔ دوسری جگہ جا کے میں مر جاؤں گی۔"

"دوسری جگہ!" ملکہ ہند کی تیوریوں پر بل پڑ گئے:

"کون بھیج رہا ہے تجھے دوسری جگہ!"

"ظلِ سبحانی کا حکم ہے۔" طرحدار نے پلو سے آنسو پونچھے۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھیں۔

ظلِ سبحانی کے نام پر ملکہ نے چونک کر طرحدار کو دیکھا۔ پھر ذرا رک کے بولی:

"کیا ظلِ سبحانی نے تم سے کہا ہے کہ قلعہ چھوڑ کے چلی جاؤ؟"

"یہی سمجھیے ملکۂ عالم!"

اور ـــ طرحدار کے پھر آنسو چھلکنے لگے۔

"پھر وہی ـــ تو میری بات سنتی نہیں۔ چلی جا رہی ہے معموں میں باتیں کرتی۔"

ملکہ کچھ چڑ سی گئی:

"صاف صاف بتا۔ کیا کہا ہے ظلِ سبحانی نے؟"

"ظلِ سبحانی میری شادی کر رہے ہیں ملکہ عالم" ـ طرحدار بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہوں۔ تو یہ بات ہے!" ملکہ مسکرائی:

"پھر رو کیوں رہی ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے!"

"خوشی کی کیا بات ہے ملکہ عالم۔" طرحدار نے سنبھل کر کہا:

"میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیوں نہیں کرنا چاہتی۔" ملکہ نے مصنوعی غصہ دکھایا:

"کیا عمر بھر کنواری بیٹھی رہے گی؟"

"ظلِ سبحانی میری شادی کر کے قلعہ سے باہر بھیج دیں گے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ آپ کے پاس سے نہیں جاؤں گی۔" طرحدار گڑگڑانے لگی۔

ملکہ کچھ سوچنے لگی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تاجدارِ ہند کو طرحدار کی شادی کی کیوں فکر پڑ گئی اور انہوں نے بغیر ملکہ کو اطلاع دیے اس کی شادی بھی طے کر دی۔ کیوں؟

طرحدار نے ملکہ کو خاموش دیکھا تو پھر التجا کی:

"ملکہ عالم۔ آپ شہنشاہ سے کہہ کر یہ شادی رکوا دیجیے۔"

ملکہ کو شاید اس پر رحم آ گیا۔

"میں کوشش کروں گی۔" اس نے کہا:

"کہ تمہیں قلعہ نہ چھوڑنا پڑے بشرطیکہ تمہاری شادی میں شہنشاہ کی کوئی سیاسی مصلحت نہ ہو ـــ"

اُسی شب ـــــ ملکہ نے شہنشاہ کے حضور عرض کیا:

"میں نے سنا ہے کہ عالم پناہ میری کنیز طرحدار کی شادی کسی سردار سے کر رہے ہیں؟"

"کیا ملکۂ ہند کو کوئی اعتراض ہے؟" شہنشاہ مسکرایا۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ عالم پناہ کی اس میں ضرور کوئی سیاسی مصلحت ہو گی۔" ملکہ کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"بالکل نہیں۔ کوئی سیاسی مصلحت نہیں۔"

شہنشاہ نے انکار کیا:

"ہم دراصل قلعہ کے ماحول کو کسی غیر متوقع فتنے سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا ایک ادنیٰ کنیز قلعہ میں کوئی فتنہ پیدا کر سکتی ہے؟"

ملکہ کی انا کو جیسے ٹھیس لگی:

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تاجدارِ ہند نے یہ فیصلہ کس کے کہنے پر کیا ہے؟"

"ملکہ ناراض نہ ہوں۔" شہنشاہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"دراصل ہمیں برابر شکایتیں مل رہی ہیں کہ طرحدار، شہزادگان سے بہت گھل مل گئی ہے اور کسی وقت بھی کوئی فتنہ کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"تاجدارِ ہند کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری کنیز کا دامن اب تک پاک ہے۔ خود شہزادے اُسے گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ طرحدار تو انہیں منہ بھی نہیں لگاتی۔"

"بات ایک ہی ہے ملکہ!" شہنشاہ نے جواب دیا:

"چھری سیب پر گرے یا سیب چھری پر۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ تو ایک ہی نکلے گا۔"

ملکہ نے شہنشاہ سے کچھ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیں کہ شہنشاہ کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ تاہم شہنشاہ نے ملکہ کو اس بات پر ضرور آمادہ کر لیا کہ آئندہ کسی موقع پر اس خوبصورت بلا یعنی طرحدار کو قلعے سے کہیں دور بھیج کر قلعہ کو اس کے شر سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے گا۔

طرحدار کی بدقسمتی کہ شہنشاہ کو یہ موقع جلد ہاتھ آ گیا۔ نظام دکن حیدر آباد نے شہنشاہ کے پاس ایک وفد بھیجا جو حضورِ شہنشاہ کچھ التماسات لے کر دہلی گیا تھا۔ حسبِ دستور نظام نے شہنشاہ کے لیے چھ غلام اور چھ کنیزیں نذر بھیجیں۔

شہنشاہ نے وفد کی واپسی پر اس کے ساتھ دو غلام اور دو کنیزیں روانہ کر دیں۔ ان میں ایک

کنیز طرحدار تھی۔

طرحدار کو بھیجنے کا انداز یہ تھا کہ شہنشاہ نے اسے اپنے حضور طلب کر کے حیدر آباد جانے کا حکم دیا۔ طرحدار، شہنشاہ کے حکم سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

شہنشاہ کا حکم بھی نادر شاہی تھا:

"حیدر آباد کا وفد جانے کے لیے تیار ہے۔ جاؤ اس میں شامل ہو جاؤ۔"

طرحدار روتی ہوئی واپس آئی۔

ملکہ ہند کو اسی وقت معلوم ہو گیا تھا کہ طرحدار کو حیدر آباد جانے کا فرمان جاری ہو گیا ہے۔ انہوں نے طرحدار کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور طرحدار منہ بسورتی قلعہ دہلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جنوبی ہند روانہ ہو گئی۔

سچ کہا ہے کسی نے کہ بادشاہوں اور ملکاؤں کی آنکھیں سر پہ ہوتی ہیں۔ ان کی تلون مزاجی مشہور ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ ایک وہ دن تھا کہ وہ طرحدار کے لیے شہنشاہ سے لڑ پڑی تھیں، اور ایک یہ دن کہ انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔

طرحدار جب تک قلعہ معلّٰی دہلی میں رہی، سیدھی چلتی رہی۔ شاید اس لیے کہ ملکہ ہند بہت نیک اور پرہیزگار خاتون تھیں اس لیے ان کی کنیزیں بھی ادھر ادھر منہ بھٹکتی تھیں لیکن حیدر آباد دکن کا ماحول کچھ مختلف تھا۔

وہاں کے محلات میں ہر طرح کی آزادی تھی۔ نہ ہنسنے مسکرانے پر پابندی اور نہ غلاموں اور کنیزوں کی آپس میں گفتگو پر کوئی قدغن تھی۔ اس لیے طرحدار، دکن میں آ کر کھل کھیلی اور ایسی کھیلی کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔

جوانی یوں بھی پکا ہوا آم ہوتی ہے۔ آم جب تک ڈال پر رہے، محفوظ ہے مگر جہاں اس پر کسی کا ہاتھ لگا تو یہ بس ہاتھ کے بجائے گود میں آ رہتا ہے۔

طرحدار پہ جوانی ٹوٹ کے آئی تھی اور اس کی خوبصورتی ایک اضافی چیز تھی۔ طرحدار شاہی محل میں پہنچی تو جیسے طوفان آ گیا۔

محل میں گو کہ ایک سے ایک خوبصورت کنیز تھی لیکن طرحدار خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ

طرحدار بھی تھی۔ یہ طرحداری دکن میں آ کے کھلی۔ وہاں اس نے آنکھیں مٹکانا اور ہاتھ چلانا سیکھا۔ اندازِ دلنوازی اسے دوسری کنیزوں نے سکھا دیے۔

اور پھر ـــــ

طرحدار جوانی کے راستوں پہ چل پڑی۔

شاہی محل کی نصف کنیزیں طرحدار کا دم بھرتی تھیں اور اس کی دوستی پر فخر کرتی تھیں۔ شاہی محلات کا داروغہ بھی ایک سجیلا اور طرحدار جوان تھا۔ پھر جب دو طرحدار نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو ملی ہی رہ گئیں۔

محلات شاہی میں سے ایک محل کی ڈیوڑھی طرحدار اور داروغۂ محلات کی رازدار بن گئی۔ وہ ڈیوڑھی اگرچہ شام ہی کو بند ہو جاتی تھی مگر کنیزوں کا کہنا تھا کہ ڈیوڑھی بند ہونے کے بعد اصل میں جاگتی ہے اور رات گئے تک طرحدار اور داروغہ کی موجودگی سے جاگتی رہتی ہے۔

طرحدار کے عشاق میں صرف داروغہ ہی شامل نہ تھا بلکہ محلات کے الگ الگ نائب داروغہ بھی اس کے تیرِ نظر کا شکار تھے۔ یہ سب داروغہ محلات کے ماتحت تھے اور اپنے افسر کی وجہ سے کھل کے تو طرحدار سے نہ مل سکتے تھے کیونکہ ان پر بڑے داروغہ کا خوف غالب رہتا تھا۔

دوسری طرف طرحدار بھی محتاط رہتی تھی اور داروغہ کو شکایت کا موقع نہ دیتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ داروغۂ محلات اپنے عشق میں کامیاب ہوا۔ اس کے نائب کوشش ہی کرتے رہ گئے اور داروغہ، طرحدار کو لے اڑا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ داروغہ، طرحدار کو لے بھاگا بلکہ ان دونوں کی شادی کی باقاعدہ تحریک ہوئی جس میں نظام دکن اور اس کی ملکہ نے پوری پوری دلچسپی لی۔ ان کی دلچسپی کا کوئی خاص سبب نہ تھا بلکہ یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا جس طرح بچپن میں بچے بچیاں گڑیا گڈے کی شادی کرتے ہیں اور اگر وہ خوش قسمتی سے اہلِ ثروت میں تو گڑیا گڈے کی شادی تمام رسومات کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔

پس ـــــ

ایک دن نظام دکن نے اپنی ملکہ کو پیغام دیا:

"اے ملکۂ دکن! ہم اپنے داروغۂ محلات کا آپ کی کنیز طرحدار کے لیے پیغام دیتا ہوں۔ امید ہے آپ ہمارے داروغہ کو اپنی غلامی میں قبول فرمائیں گی!"

اس پیغام کے پس منظر میں داروغہ محلات کی نظام دکن سے وہ درخواست کارفرما تھی جو اس نے ایک ہفتہ پیشتر نظام کے حضور اس وقت پیش کی تھی جب نظام کو کسی علاقہ کے فتح ہونے کی خبر ملی تھی اور وہ حد سے زیادہ خوش نظر آتا تھا۔

شاہی ادوار میں بلکہ آج بھی شاید یہ دستور رہے کہ ماتحت لوگوں کی اکثر شادیاں ان کے افسروں کے توسط اور کوشش سے ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت شاہِ وقت مالک کا اور ملکہ، مالکن کا کردار ادا کرتے تھے جبکہ آج مالک کا کردار بیوروکریٹ کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور ان کی بیگمات مالکن کا کردار ادا کرتی ہیں۔

"شاہ دکن کا پیغام ہمارے گوش گزار ہوا۔" نظامِ دکن کے پیغام کا ملکہ دکن نے پُر غرور لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہم ضرور اس پر غور فرمائیں گے"۔

نظام نے اصرار کیا:

"ہم یہ چاہتے ہیں کہ ملکہ دکن ہمارے اس پیغام کا جواب آج اور اسی وقت عنایت فرمائیں"۔

ملکہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی:

"ہم حضور پرنور شاہ کی گستاخی کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے لیکن یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ شادی بیاہ کا معاملہ بچوں کا کھیل نہیں۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اس سلسلے میں طرحدار کی رضامندی کو مقدم خیال کرتے ہیں۔ بغیر اس کی رضا کے ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے"۔

نظام بھی جیسے اپنی بات پر اڑ گیا۔ اس نے مسکرا کر کہا:

"ملکہ ہند کی توجہ کے لیے ہم انہیں مطلع کرتے ہیں کہ ان کی کنیز طرحدار نے اس شادی کی پہلے ہی اجازت اور منظوری دے دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب ملکہ بھی اس رشتے کی منظوری میں کسی تاخیر کو روا نہ رکھیں گی"۔

ملکہ دکن کی شکنوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور اس بات کا جواب دیتے وقت اس کے لہجے میں کچھ تلخی بھی آ گئی:

"کیا شاہِ دکن اس بات کی وضاحت کرنا گوارا فرمائیں گے کہ میری کنیز طرحدار نے ان کے حضور اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کیا ہے؟"

"یہ بات یوں نہیں ہوئی ملکۂ دکن!" نظام نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا:

"بلکہ ہمارے دارو غہ نے یہ خبر ہمیں پہنچائی تھی"۔

ملکہ دکن کی تلخی میں کمی نہ ہوئی۔ اس نے کہا:

"اس خبر میں داروغہ کی یہ غرض بھی پوشیدہ ہو سکتی ہے کہ وہ بالا ہی بالا ہماری اور شاہ دکن کی اجازت حاصل کر کے شادی کی تاریخ مقرر کرا دے تاکہ طرحدار کو انکار کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکے"۔

نظام دکن میں بھی کچھ چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔ اس نے ناگوار لہجے میں کہا:

"اس کا مطلب ہے کہ ملکہ کو ہماری اور ہمارے داروغہ کی بات پر اعتبار نہیں اور وہ اس رشتہ کو منظور کرنے سے انکار کر رہی ہیں"۔

"یقیناً۔" ملکہ نے مضبوط لہجے میں کہا:

"ہم بغیر طرحدار کی اجازت حاصل کیے، یہ رشتہ منظور نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر شاہ دکن کا رشتے کا پیغام، پیغام نہیں بلکہ حکم ہے تو ہم اسے منظور کرتے ہیں کیونکہ شاہ کے حکم سے انکار کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے"۔

"نہیں نہیں۔ ملکہ دکن۔ آپ ناراض نہ ہوں"۔

نظام دکن شاید شرمندہ ہو گیا:

"ہم نے کوئی حکم نہیں دیا۔ حکم دینا ہوتا تو ہم رشتے کا پیغام کیوں دیتے۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ ملکہ اس رشتے کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کو ضرور پیش نظر رکھیں کہ ہمارا داروغہ اور آپ کی کنیز اس رشتے کے لیے اپنے اپنے طور پر تیار ہیں۔ اب جبکہ میاں بیوی راضی تو پھر کیا کرے گا قاضی کے مصداق آپ کو اس معاملہ میں دخل نہ دینا چاہیے"۔

"ہم شاہ سے بصد ادب گزارش کرتے ہیں کہ اگر یہ حکم نہیں ہے تو پھر ہم اپنی کنیز طرحدار سے بات کرنے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ اس لیے شاہ سے دوسری ملاقات تک اس پیغام کو تعطل میں رکھا جائے"۔ ملکہ نے بڑے سلیقے سے اپنی بات برقرار رکھی۔

نظام دکن کو خاموش ہونا پڑا۔

واضح رہے کہ نظام اور ملکہ کی یہ ساری گفتگو نظام دکن کے محل میں اس وقت ہوئی جب ملکہ کسی ضرورت سے نظام کے محل میں گئی ہوئی تھی ورنہ اس کا اپنا الگ محل تھا اور وہ اپنی تمام کنیزوں کے ساتھ دوسرے محل میں رہتی تھی۔

نظام دکن کے محل میں اس کی رہائش کے علاوہ کئی سرکاری دفاتر بھی تھے۔ ان میں سب سے اہم فوج اور مالیات کے دفاتر تھے۔ یہ محل "بڑے محل" کے نام سے بھی مشہور تھا۔

ملکہ دکن نے بڑے محل سے واپس آتے ہی طرحدار کو طلب کر لیا۔

طرحدار بڑی شاطر عورت تھی۔ ملکہ کی اس غیر معمولی طلبی سے اس کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے ملکہ کا پیغام لانے والی کنیز سے سن گن لینے کی کوشش کی مگر وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ بتا سکی کہ ملکہ بڑے محل سے بڑے غصے میں واپس آئی ہیں۔ ہو سکتا ہے نظام دکن نے انہیں کچھ سخت سست کہا ہو۔

طرحدار کو اور ہول پڑ گیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے ملکہ کے پاس پہنچی۔

"کیوں ری طرحدار"۔

ملکہ دیکھتے ہی اس پر برس پڑی:

"تو نے داروغہ محل کو اپنے ساتھ شادی کی منظوری دیدی ہے؟"

طرحدار کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ملکہ کو صرف یہ بتایا تھا کہ کئی کنیزوں نے اسے یہ بتایا ہے کہ داروغہ محلات اس کے ساتھ شادی کرنے کی کوششوں میں ہے لیکن طرحدار نے ابھی اسے کوئی جواب نہیں دلوایا ہے۔ پس اس نے یہی بات پھر دہرائی۔

"ملکۂ ہند۔ میری جان آپ کے صدقے۔ بھلا ایسی بے غیرت ہو سکتی ہوں کہ داروغہ سے اپنی شادی کا اقرار کر لوں اور وہ بھی آپ کی اجازت کے بغیر۔ مجھے تو محل کی کنیزوں نے بتایا تھا کہ اس کا کچھ ایسا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی میں نے آپ کے حضور عرض کر دیا تھا تاکہ کسی قسم کی کوئی بدگمانی نہ پیدا ہو"۔

ملکہ کو کچھ اطمینان ہوا تو نرمی سے بولی:

"مگر شاہ دکن تو یوں فرما رہے تھے جیسے تم نے اقرار کر لیا ہو؟"

"میری زبان کٹ جائے ملکہ حضور۔ اگر میں نے کسی سے بھی اقرار کیا ہو۔ میں جھاڑو پھیرتی ہوں اس موئے داروغہ پر جس نے میری ملکہ کا دل میلا کر دیا۔ میں اب زندگی بھر اس کی طرف رخ

بھی نہ کروں گی"۔

طرحدار اپنے آپ کو بچانے کے لیے صاف مُکر گئی۔ حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ طرحدار اور داروغہ کی گھنٹوں گفتگو چلتی تھی اور اس نے داروغہ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے شادی کا پیغام بھیجا تو وہ اسے قبول کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرے گی۔

ملکہ کچھ دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ اس نے طبیعت بحال کرنے کے لیے پوچھا:

"کیوں ری طرحدار۔ اگر داروغہ کا پیغام تیرے لیے آئے تو تُو کیا جواب دے گی؟"

طرحدار جیسی چالاک عورت بھی ملکہ کے اس اچانک سوال سے گھبرا گئی مگر فوراً ہی سنبھلی اور بولی:

"ملکہ دکن۔ طرحدار کے لیے پیغام کا جواب خود ملکہ دکن دیں گی کیونکہ طرحدار نے اپنی تمام خواہشات آپ کی جوتیوں تلے دبا دی ہیں"۔

یہ اتنی زبردست خوشامد تھی کہ ملکہ کا دل باغ باغ ہو گیا۔

"اچھا تو پھر کل ہم خود شاہ دکن سے بات کریں گے"۔ ملکہ نے طرحدار کے دل کی کلی کھلا دی۔

طرحدار نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

ملکہ دوسرے دن بڑے محل گئی اور جب واپس آئی تو اس کے محل میں اعلان ہو گیا کہ طرحدار اور داروغہ کی شادی آئندہ جمعرات کو ہو رہی ہے۔

طرحدار کی تو گڈی خوب چڑھی ہوئی تھی۔ تمام بیگمات اور کنیزیں اسے پسند کرتی تھیں۔ غلاموں میں بھی اسے سب ہی پسند کرتے تھے اور اسے حاصل کرنے کے خواہش مند تھے مگر اپنے داروغہ کی وجہ سے وہ طرحدار کو اپنے دل کے گوشوں میں چھپائے رکھتے تھے اور اب تو داروغہ اور طرحدار کی شادی ہو رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان یادوں کو ہمیشہ کے لیے دل ہی میں دفن کر دیا اور اس شادی میں جی بھر کے حصہ لیا۔

چونکہ یہ ملکہ دکن کی کنیز کی شادی تھی اس لیے اس تقریب میں محلات کے باہر سے کسی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ نظام دکن اور ملکہ دکن کے علاوہ محلات کی تمام خواتین، کنیزیں اور غلام اس بارات میں شامل تھے۔

شادی کے دونوں طرف کے اخراجات شاہی خزانہ نے برداشت کیے تھے۔ تمام دن کنیزیں اور غلام خوشیاں مناتے اور دھوم مچاتے رہے۔ پھر مغرب کے بعد قاضیٔ شہر نے دونوں کا عقد کیا اور کھانے کے بعد طرحدار عروسی جوڑے میں اپنے دولہا یعنی داروغہ محلات کے ساتھ رخصت ہو کے اس کی حویلی پہنچ گئی۔

کہتے ہیں اس شب طرحدار کے چہرے پر روپ ٹوٹ کے برس رہا تھا۔

طرحدار کی شادی کا ہنگامہ ایک ہی دن میں ختم ہو گیا اور وہ اپنے گھر کی ہو گئی مگر جس طرح طرحدار کی شادی جلدی سے ہو گئی تھی اسی طرح اس نے اولاد پیدا کرنے میں بھی جلدی کی اور اس کے گھر ایک سال کے اندر ہی اندر اولاد کی خوشی آ گئی۔

یہ خوشی بھی دُہری تھی۔ طرحدار نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا جن میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔

لڑکے کا نام گلنام اور لڑکی کا نام گلرخ رکھا گیا۔

طرحدار اور داروغہ کے دن رات بظاہر ہنسی خوشی گزر رہے تھے مگر پھر اچانک داروغہ کو طرحدار کی طرف سے ایک دھچکا لگا اور اس کے دل میں بال پڑ گیا۔

ہوا یوں کہ ایک شب داروغہ خلافِ معمول بڑے محل سے جلدی واپس آ گیا۔ وہ گھر کے قریب پہنچا تھا کہ اسے اپنے دروازے پر دو سائے لہراتے نظر آئے۔ داروغہ نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔

ادھر گھوڑے کی ٹاپیں سن کر سایوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ ایک اندر چلا گیا اور دوسرا سایہ تیزی سے مڑ کر دوسری طرف چل پڑا۔ داروغہ نے گھوڑا وہیں چھوڑا اور پا پیادہ سائے کے پیچھے بھاگا سایہ ابھی زیادہ دور بھی نہ گیا تھا کہ داروغہ نے اسے جا لیا۔

داروغہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکنا چاہا۔ جواب میں سائے نے پلٹ کر داروغہ پر خنجر کا وار کیا۔ خنجر اس کے سینے میں اتر گیا نہ کوئی غل نہ شور۔ داروغہ نے ایک سسکی لی اور دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ اسے مارنے والا بھاگ کے آگے نکل گیا۔

داروغہ کا گھر ایک پُر رونق جگہ پر تھا لیکن رات کی وجہ سے لوگوں کی آمد و رفت تقریباً ختم ہو چکی تھی اس لیے صبح تک کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس مقام پر شاہی داروغہ محلات کا قتل ہو گیا ہے۔

دوسرے دن ——

طرحدار جو اَب طرحدار بیگم بن گئی تھی، دونوں شیر خوار بچوں کو لے کر نظام کے پاس دادرسی کے لیے پہنچی۔

اس نے بیان دیا کہ وہ تمام رات اپنی بوڑھی ساس اور دو نوں کنیزوں کے ساتھ جاگتی اور شوہر کا انتظار کرتی رہی مگر صبح کو چند آدمیوں نے دستک دے کر اس کے شوہر کی لاش اس کے حوالے کی۔ اس لیے درخواست ہے کہ قاتل کو گرفتار کر کے سزا دی جائے۔

نظام دکن نے کوتوالِ شہر کو تحقیقات کی ذمہ داری سونپی اور طرحدار بیگم کے لیے حکم ہوا کہ مقتول داروغہ کی تنخواہ اس کی بیوہ کو ماہ بماہ اس وقت تک پہنچائی جائے جب تک طرحدار بیگم کے دونوں بچے جوان ہو کر اس کے کفیل نہیں ہو جاتے۔ یا پھر طرحدار بیگم کسی سے عقدِ ثانی نہیں کرتی۔

طرحدار تو شاید دل سے یہی چاہتی تھی۔ اس نے نظام کے اس فرمان کے بعد قاتل کی گرفتاری کے بارے میں کوئی درخواست نہ دی۔ اس طرح معاملہ غتر بود ہو گیا۔

داروغہ محلات کی اسامی بہت اہم تھی کیونکہ محلات کی حفاظت کے علاوہ داروغہ تمام بیگمات اور شہزادیوں کی ضروریات پوری کرنے کا بھی ذمے دار تھا۔ صبح ہوتے ہی بیگمات اور شہزادیوں کی کنیزیں ضروریات کی فہرست داروغہ کے حوالے کر دیتی تھیں۔ پھر داروغہ اس کام پر مامور ملازمین کے ذریعے تمام سامان منگوا کر فرداً فرداً ہر محل پر بھجوا دیتا تھا۔ اس کے حساب کتاب کے لیے منشی خانہ کے دو منشی اسے دیے گئے تھے۔

اب ایک ایسے اہم کارکن کا عہدہ کب تک خالی رہ سکتا تھا۔ نظام نے تیسرے ہی دن مقتول داروغہ کے نائب کو ترقی دے کر داروغہ مقرر کر دیا۔

طرحدار، تیز طرار تو پہلے ہی تھی۔ شادی کے بعد اس میں اگر کچھ جھجک تھی تو وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اور اب تو وہ خیر سے دو بچوں کی ماں تھی۔ چنانچہ عدت کے دن پورے ہوتے ہی اس نے ہاتھ پیر نکالنا شروع کیے۔

نائب داروغہ جو اب داروغہ محلات ہو گیا تھا اور جس کے متعلق عام لوگوں خصوصاً کنیزوں اور غلاموں کا خیال تھا کہ سابق داروغہ کا قاتل یہی ہے اور یہ کہ طرحدار بیگم اور اس میں شادی کے بعد ہی سے محبت کی پینگیں بڑھنا شروع ہو گئی تھیں اور جس کا انجام داروغہ کے قتل پر ہوا — تعلقات تو دونوں میں پہلے ہی سے تھے اب دنیا کو دکھانے کے لیے نئے داروغہ نے طرحدار سے باقاعدہ نکاح کیا اور اسے معہ بچوں کے رخصت کرا کے اپنے گھر لے آیا۔ احتیاط کے طور پر داروغہ نے

اپنی شادی کی اطلاع منشی خانہ کو بھیج دی۔

اس طرح طرحدار بیگم کی شاہی خزانے سے آنے والی تنخواہ تو بند ہو گئی مگر اس کے شوہر کے سر سے قتل کا الزام ہمیشہ کے لیے ہٹ گیا۔

طرحدار بیگم اولاد کے معاملے میں بڑی زرخیز تھی۔ پہلی مرتبہ بھی اس کے جڑواں بچے ہوئے تھے اور اس بار بھی شادی کے گیارہویں مہینے میں اس کے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ یہ بچے بھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھے۔ اس طرح طرحدار بیگم تیسرے سال چار بچوں کی ماں بن گئی۔

وہ ہر طرح سے مطمئن تھی۔ کسی طرف سے بھی اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔

مگر —

اچانک اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔

خوش بختی بد بختی میں تبدیل ہو گئی اور اس کا اچھا بھلا شوہر کسی نامعلوم بیماری میں مبتلا ہو کر چٹ پٹ ہو گیا اور طرحدار بیگم دوسرا حکیم بھی نہ بدل سکی تھی کہ تیسرے دن اس کا شوہر اسے روتا ہوا چھوڑ گیا۔ اب تو طرحدار پر جیسے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

چار شیر خوار بچوں کا ساتھ۔ شوہر کی تنخواہ بند ہو چکی تھی۔ اس کا منہ نہ پڑتا تھا کہ اپنی دوسری بار بیوگی کا رونا نظام دکن کے حضور جا کے روتے۔ نظام سرکار کی طرف سے جو دو کنیزیں اسے ملی ہوئی تھیں، دوسری شادی پر ان کی خدمات بھی سرکار کو واپس ہو گئی تھیں۔

طرحدار بیگم نے جتنا عیش کیا تھا اور رنگ روپ نکالا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ گال پچک گئے اور آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ اب طرحدار کو دیکھ کر خوف آتا ہے۔

وہ تو اچھا ہوا کہ اُسے اللہ نے جلد ہی اس دنیا سے اٹھا لیا۔ اس کے دوسرے شوہر سے جو دو بچے ہوئے تھے ان میں سے لڑکے کا نام سردار اور لڑکی کا نام کنیز رکھا گیا تھا۔ کنیز نے بھی ماں کا ساتھ جلد ہی چھوڑ دیا۔ جس وقت طرحدار کا انتقال ہوا اس کے تین بچے زندہ تھے۔ پہلے شوہر کے گلفام اور گلرخ اور دوسرے شوہر کا سردار۔

انتقال کے وقت طرحدار کے سرہانے محلہ کی ایک خدا ترس عورت موجود تھی۔ اسی نے طرحدار کے مرنے کی اطلاع ملکہ دکن تک پہنچائی۔ اس طرح طرحدار کے کفن دفن کا انتظام سرکاری طور پر کیا گیا۔

ملکہ نے چند کنیزوں اور غلاموں کو بھی طرحدار کے گھر بھجوا دیا تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ طرحدار کے تینوں بچے تین کنیزوں میں بٹ گئے، جو بے اولاد تھیں۔

یوں طرحدار کی کہانی تو ختم ہو گئی اور ان تین شیر خوار بچوں کی اک نئی کہانی نے جنم لیا۔ کنیزوں نے ان بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا اور انہیں ماں باپ سے محرومی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔

مگر ــــ

جب یہ بچے جوان ہوئے تو قسمت نے انہیں مختلف شہروں میں بھیج دیا۔

گلفام تو اپنی ماں کے ساتھ شاہی محل ہی میں رہا اور جوان ہونے پر نظام دکن کا خاص مصاحب مقرر ہوا۔

اس کی بہن گلرخ کو اس کی ماں نواب کرناٹک کے پاس لے گئی اور اس کی پرورش کرناٹک ہی میں ہوئی۔

تیسرے بیٹے سردار کی ماں کسی طرح سرنگاپٹم پہنچی۔ سردار وہیں جوان ہوا اور لشکر حیدری میں ملازم ہو گیا۔

واضح رہے کہ ان سگے اور سوتیلے بہن بھائیوں میں جدائی اس وقت ہوئی جب ان کی عمریں دس گیارہ سال کے قریب تھیں۔

جب تک یہ تینوں نظام دکن کے محل میں تھے تو روز ہی ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اس عمر میں عشق و محبت کا تو کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا، سوائے اس کے کہ گلرخ اپنے سوتیلے بھائی سردار میں زیادہ دلچسپی لیتی تھی اور یہ بات اس کے سگے بھائی گلفام کو بہت بری لگتی تھی اور وہ سردار سے کئی بار لڑ چکا تھا۔

سب کے الگ الگ ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ تو ختم ہو گیا مگر گلفام کے دل میں گلرخ کی محبت کچھ ایسی بیٹھی کہ وہ گلرخ کے لیے دیوانہ ہو گیا۔ اس میں گلفام کی غلطی کے ساتھ ان کنیزوں کی بھی غلطی یا زیادتی تھی جنہوں نے گلفام کے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ گلرخ اس کی سگی نہیں سوتیلی بہن ہے اور اس کا باپ دوسرا تھا۔

گلفام اور گلرخ کو جن کنیزوں نے پالا تھا ان کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور کوئی بھی صحیح شہادت دینے والا موجود نہ تھا کہ کون کس کا سگا اور کون سوتیلا ہے۔

ادھر گلرخ کو یقین تھا اور اس نے اس بات کی دوسری کنیزوں سے تصدیق بھی کی تھی کہ وہ اور

گلفام ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ اسی لیے وہ گلفام سے برادرانہ محبت تو کر سکتی تھی لیکن وہ اس کی اس پاگل پن کی محبت کے سخت خلاف تھی۔

دس سال کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوتی لیکن گلرخ نے ایک دن گلفام کو ڈانٹ دیا تھا:

"گلفام۔ ہوش کی باتیں کرو۔ تم میرے سگے بھائی جیسے نہیں بلکہ سگے بھائی ہو۔ میں تم سے بھائیوں جیسی تو محبت کر سکتی ہوں مگر اس کے آگے کچھ نہیں۔"

مگر اس کے ہم عمر گلفام نے بڑے والہانہ انداز میں جواب دیا تھا:

"نہیں گلرخ۔ تم میری سگی بہن نہیں ہو۔ میں تم سے بڑا ہو کر شادی کروں گا۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے!"

اور گلرخ نے غصہ سے اس کے منہ پر ایک طمانچہ جڑ دیا تھا۔

اس دن کے بعد گلفام نے اسے چھیڑنا اور اپنی بے تکی باتوں سے تنگ کرنا تو چھوڑ دیا تھا مگر گلرخ کی محبت اس کے دل سے پھر بھی نہ نکل سکی۔

پھر جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تو گلفام کی محبت میں کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہو گیا۔

یہ ۱۷۶۶ء کا آغاز تھا۔

نظام الملک نظام دکن نے والی ارکاٹ والاجاہ نواب محمد علی خاں کو سزا دینے کے لیے نواب حیدر علی والیِ میسور کو ایک نامہ روانہ کیا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

یہ بات نہیں تھی کہ نظام دکن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ والاجاہ نواب ارکاٹ کو شکست دے سکے بلکہ بات یہ تھی کہ بدیسی تاجر یعنی انگریز والاجاہ نواب محمد علی کے حلیف تھے اور خطرہ یہ تھا کہ اگر نظام نے ارکاٹ پر حملہ کیا تو والاجاہ اپنے حلیف کو پکارے گا اور انگریزی فوجیں فوراً اس کی مدد کو پہنچ جائیں گی۔

اس متوقع اتحاد سے نظام دکن پریشان تھا اور اسی بنا پر اس نے نواب حیدر علی خاں کو خط لکھا تھا اور ان سے تعاون کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

یہ نامہ جب لکھ کر تیار ہوا تو اس پر نظام دکن کے دستخط ہو کر مہر لگ گئی۔ پھر نظام نے اپنے خاص غلام گلفام کو طلب کیا۔ وہ اس کا معتمدِ خاص تھا۔

"گلفام!" نظام نے اسے مخاطب کیا:

"یہ خط بہت اہم اور خفیہ ہے۔ اسے لے کر تمہیں سرنگا پٹم جانا ہے اور صرف نواب حیدر علی خاں کے ہاتھ میں دینا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تم اس خط کی پوری پوری حفاظت کرو گے"۔

"شاہ بہادر۔ اطمینان رکھیے"۔

گلفام نے بڑے وثوق سے کہا:

"میں اس اہم نامہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا اور نواب حیدر علی خاں کو پہنچا کے آپ کی نظروں میں سرخرو ہوں گا"۔

"ہمیں تم سے یہی امید ہے گلفام"۔

نظام نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا:

"تم کافی سمجھدار ہو اور تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم اس نامہ کو جسم کے کون سے حصے میں چھپاؤ گے"۔

"آپ بالکل فکر نہ فرمائیے شاہ بہادر"۔

گلفام نے سینہ تان کر کہا:

"میں اس سے پہلے بھی آپ کے اعتماد پر پورا اتر چکا ہوں۔ اسی طرح اب بھی میں اعتماد بحال رکھوں گا"۔

"ٹھیک ہے گلفام"۔

نظام کو اطمینان ہو گیا:

"اب اس سلسلے میں ایک انتہائی خاص بات بھی سن لو۔ وہ یہ کہ دو بادشاہوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی ہے اس کی تفصیل کبھی قاصد کو نہیں بتائی جاتی لیکن اس خط کے مضمون سے تمہیں آگاہ کیا جا رہا ہے اس لیے کہ اگر خدا نخواستہ راستے میں کوئی ایسا وقت آ جائے جب تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ خط تم سے چھین لیا جائے گا، اس صورت میں تمہیں اختیار حاصل ہو گا کہ تم اس خط کو فوراً ضائع کر دو اور سرنگا پٹم پہنچ کر نواب حیدر علی خاں کے سامنے اس خط کے مضمون کو زبانی عرض کر دو"۔

گلفام کی سمجھ میں نہ آیا کہ نظام دکن کیا کہنا چاہتا ہے:

"میں سمجھ نہیں سکا شاہ معظم۔ نواب حیدر علی خاں سے میں کیا عرض کروں گا"۔

نظام دکن مسکرایا۔ وہ سمجھ گیا کہ گلفام الجھ گیا ہے:

"تم نواب بہادر سے وہی کہو گے جو ہم تمہیں بتائیں گے۔ اگر تمہیں خط ضائع کرنا پڑے تو نواب سے کہنا کہ کرناٹک کے والا جاہ نے بغاوت کر دی ہے۔ اسے ہم سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس کام میں نواب بہادر ہم سے تعاون کریں"۔

"میں سمجھ گیا"۔ گلفام نے فوراً جواب دیا:

"بالکل سمجھ گیا شاہِ معظم"۔

نظام دکن نے گلفام کو ایک سربمہر لفافہ دیا۔ گلفام نے لفافہ لے کر نظام کو سلام کیا اور واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ نظام کی آواز سنائی دی:

"گلفام۔ تمہیں مزید کسی تاکید کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی پھر بھی دوبارہ یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ کام نہایت خفیہ اور اہم ہے"۔

گلفام نے پلٹ کر اس طرح سر کو خم کیا جیسے دل و جان سے حاضر ہو۔

گلفام جب نظام کا نامہ لے کر گھر پہنچا تو اسے کچھ اور ہی خیالوں نے گھیر لیا۔

اس نے اس بات پر پہلے غور ہی نہیں کیا تھا کہ سرنگا پٹم میں اس کا ایک بھائی سردار بھی موجود ہے۔ یہ اس کا وہی بھائی تھا جس سے اس کی بچپن میں جنگ ہوا کرتی تھی اور اس جنگ کا باعث ان کی بہن گلرخ تھی۔

گلرخ کا خیال آتے ہی اس کا دماغ الٹ گیا۔

پچھلے سال ایک آدمی کرناٹک جا رہا تھا تو اس نے گلرخ کو ایک محبت بھرا خط لکھا تھا۔ اسے اب تک یہی یقین تھا کہ گلرخ اس کی سوتیلی بہن ہے اور وہ اس سے رشتہ جوڑ سکتا ہے مگر الگ الگ مقامات پر رہنے کی وجہ سے ان کی محبت پروان چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

گلرخ، گلفام اور سردار ——

اس مثلث نے اس کا دماغ گھما کے رکھ دیا۔ وہ تمام رات انہی خیالوں میں الجھا رہا اور لمحہ بھر نہ سو سکا۔

صبح کو اس کا بدن بے خوابی سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے نظام سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی سرنگا پٹم روانہ ہو جائے گا مگر دوپہر تک وہ بستر سے نہ اٹھ سکا۔

شاہی محل کے اندر ہی غلام گردش میں اس کی کوٹھڑی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ گلفام نظام کا منہ چڑھا غلام ہے اس لیے سب اس سے دور ہی دور رہتے تھے اور اس کے معاملات میں قطعی دخل نہ دیتے تھے۔

شام ہوتے ہوتے اس کا دماغ کچھ ٹھکانے لگا۔ وہ نہادھو کے تیار ہوا۔ وہ ایک نئے فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

گلفام مختصر سفری سامان لے کر گھوڑے پر سوار ہوا مگر جب اس نے گھوڑے کو ایڑ دی تو اس کا رخ سرنگا پٹم کے بجائے کرناٹک کی طرف تھا۔

اس نے واقعی ایک زبردست فیصلہ کیا تھا۔

گلفام اپنی بہن گلرخ کی محبت میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے شاہی راز کو دشمن کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس نے کرناٹک جانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہ نواب والاجاہ محمد علی کے ہاتھ اس راز کو فروخت کرنا چاہتا تھا۔

گلفام نے چلنے سے پہلے اس معاملہ پر اچھی طرح سوچ بچار کر لیا تھا۔ اس کا یہ قدم انتہائی خطرناک تھا۔ وہ کھلے طور پر اپنے آقا اور اپنے ملک دکن سے غداری کر رہا تھا کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سرنگا پٹم کے بجائے کرناٹک پہنچ کے نواب والاجاہ کو یہ یقین دلا دے گا کہ نظام دکن، اس کے خلاف نواب حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا ثبوت وہ خود یعنی گلفام ہے جو نظام کا پیغام لے کر نواب بہادر کے پاس جا رہا ہے۔

پھر جب گلفام نے کرناٹک پہنچ کر نواب والاجاہ کو یہ خبر بھجوائی کہ نظام دکن کا ایک خاص ہرکارہ والاجاہ کو ایک اہم راز سے آگاہ کرنے آیا ہے تو والاجاہ واقعی چونک پڑا۔

"نظام دکن کا ہرکارہ اور کرناٹک کے دربار میں۔"

اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

والاجاہ نے گلفام کو فوراً اپنے پاس طلب کر لیا۔

"تمہارا نام؟" نواب والاجاہ نے گلفام کے فرشی سلام کے جواب میں سوال کیا۔

"غلام کو گلفام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔" اس نے ادب سے جواب دیا۔

"ہم نے سنا ہے تمہارے پاس نظام دکن کا کوئی راز ہے۔" والاجاہ نے اس سے دوسرا

سوال کیا۔

"اعلیٰ حضرت والاجاہ کو صحیح اطلاع دی گئی۔" گلفام نے مختصر جواب دیا۔

"اور یہ راز تم ہم پر ظاہر کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ بھی درست ہے اعلیٰ حضرت!"

"مگر یہ راز تو نظام دکن کا ہے ہمیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

والاجاہ بڑا ہوشیار حکمران تھا۔ وہ گلفام پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ راز معلوم کرنے کے لیے بے چین ہے۔ پس اس نے پہلو بدل کے اس انداز سے کہا جیسے یہ بات اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

"مگر اعلیٰ حضرت والاجاہ۔" گلفام گھبرا گیا۔

اس کا اندازہ تھا کہ والاجاہ راز معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو جائے گا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔

اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور حوصلے سے کہا:

"اعلیٰ حضرت یہ درست ہے کہ راز نظام دکن کا ہے مگر اس راز یا اطلاع کا تعلق براہِ راست حکومت کرناٹک سے ہے اور اگر وہ اطلاع آپ کے گوش گزار نہ کی گئی تو آپ کی حکومت کو زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

والاجاہ پھر بھی لاپرواہ بنا رہا۔ وہ بولا:

"اچھا۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تمہارے پاس جو راز ہے اس کا تعلق ہماری سلطنت کرناٹک سے ہے اور تم اسے ہم پر ظاہر بھی کرنا چاہتے ہو تو بھی تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم نظام دکن سے غداری کر رہے ہو۔ ایک ملک کے راز کو دوسرے ملک کے ہاتھ فروخت کرنا غداری کے سوا اور کسی نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟"

"غلام کو افسوس ہے کہ اسے غلط سمجھا جا رہا ہے۔"

گلفام نے مضبوط لہجے میں کہا:

"حالانکہ میں نے اعلیٰ حضرت پر خود اس راز کو افشا کرنے کی پیش کش کی ہے۔ اسے راز کو فروخت کرنے کا نام نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ میں نے اس کی کوئی قیمت طلب نہیں کی۔"

والاجاہ نے دیکھا کہ غلام تو ہتھے سے اکھڑا جا رہا ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ بتائے بغیر ہی ناراض ہو کر چلا جائے۔ اس نے فوراً نرم پڑتے ہوئے کہا:

"ہمیں تمہاری صاف گوئی سے بہت خوشی ہوئی گلفام۔ دراصل ہم تمہارا امتحان لے رہے تھے۔ اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ ادھر ادھر کے لوگ غلط اطلاعات فراہم کر کے بھاری معاوضہ وصول کر لیتے ہیں۔

بہرحال تم وہ راز ظاہر کرو۔ ہم تمہاری خاطر خواہ خاطر مدارات کریں گے اور اگر کوئی مطالبہ کرو گے تو اسے بھی پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"

"اعلیٰ حضرت۔ اس معاملہ میں چونکہ ذرا سی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اس لیے میں درخواست کروں گا کہ پہلے اسے دور کر لیا جائے۔" گلفام نے بڑی ذہانت سے اپنی اہمیت جتائی۔

والاجاہ جلدی سے بولا:

"ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں۔ تم بے فکر رہو گلفام۔"

"غلام اعلیٰ حضرت کا شکر گزار ہے۔"

گلفام نے بات آگے بڑھائی:

"مگر میں پھر بھی یہ چاہتا ہوں کہ اپنی شخصیت، دیانت اور شرافت کے ثبوت میں آپ کے محل سے ایک گواہ پیش کروں۔"

والاجاہ نے چونک کر گلفام کو دیکھا:

"کیا کہا تم نے۔ گواہ اور ہمارے محل میں۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" اور والاجاہ کے چہرے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

"جی ہاں عالی جاہ!" گلفام نے جواب میں کہا:

"آپ کے محل میں گلرخ نام کی ایک کنیز ہے۔ آپ اسے طلب کیجیے۔ وہ میری گواہی دے گی۔"

والاجاہ کو تعجب سا ہوا:

"میری کنیز اور تمہاری گواہی۔ تمہاری بات کچھ مبہم ہے۔"

"عالی جاہ۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ گلرخ کو بلوائیے تو۔ پھر دیکھیے وہ میری گواہی دیتی ہے یا نہیں۔" گلفام نے زور دے کر کہا۔

نواب والاجاہ محمد علی خاں نے گلرخ کو طلب کر لیا۔

وہ اس اچانک طلبی پر سہم گئی۔ دربار میں پہنچ کے گلفام کو دیکھا تو بھونچکی رہ گئی۔ ادھر گلفام اسے بڑے پیار بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"کیوں کنیز۔" والاجاہ نے سخت لہجے میں دریافت کیا:

"کیا تم اس آدمی کو پہچانتی ہو؟"

گل رخ سہمی ہوئی تو پہلے ہی تھی، ہکلاتی ہوئی بولی:

"جی ہاں سرکار۔ یہ میرا بھائی گلفام ہے جو نظام دکن کی نوکری

"کس طرح کی نوکری کرتا ہے یہ؟" والاجاہ نے وضاحت چاہی۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی سرکار۔"

گل رخ جان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی:

"یہ بہت پرانی بات ہے۔ آٹھ سال پہلے کی۔ جب میں نظام دکن کے محل میں رہتی تھی اس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ پتہ نہیں یہ تب کیا کرتا تھا اور اب کیا کر رہا ہے۔"

"جب گلفام تمہارا بھائی ہے تو اتنے عرصے تک تم نے اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" والاجاہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"سرکار۔ چھوٹے دیس کا رشتہ ہی کیا۔ میں کرناٹک سرکار کی نمک خوار ہوں اور یہ نظام سرکار کا غلام۔ رشتہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب میں کرناٹک آ گئی تھی۔" گلرخ نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔

"تم جا سکتی ہو کنیز۔" نواب والاجاہ نے اسے واپس کر دیا۔

"گلفام۔ ہمیں تم پر پہلے ہی اعتماد ہو گیا تھا۔"

والاجاہ نواب محمد علی خاں نے کہا:

"ہم نے تمہاری خواہش پر کنیز کو طلب کیا تھا۔ اس نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ تمہارا تعلق نظام حکومت سے ہے۔ اب تم بے دھڑک اس راز کو ظاہر کر سکتے ہو۔"

خیال رہے کہ خواہ زمانہ قدیم کے شاہی محلات ہوں یا آج کل کے حکومتی ایوانات، وہاں ہونے والی تمام گفتگو کنیزیں اور غلام چھپ چھپ کے سنتے تھے اور معقول معاوضہ پر دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ چونکہ یہ کام مشترکہ طور پر ہوتا تھا اس لیے کوئی کنیز یا غلام دوسرے کی شکایت نہ

کرتا تھا۔

اس ترقی یافتہ دور میں بھی بڑی بڑی حکومتوں کے اہم ترین راز ایسے ہی لوگوں کے ذریعے افشا ہوتے اور بھاری معاوضہ پر دوسروں تک پہنچ جاتے ہیں۔

نواب والاجاہ نے جب گلرخ کو طلب کیا تھا، اسی وقت تمام محل میں کھلبلی مچ گئی تھی اور اکثر کنیزیں اور غلام اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کے دربار میں ہونے والی گفتگو سننے میں لگ گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گلفام، گلرخ اور نواب والاجاہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو سنی تھی۔

اس کے بعد جب گلرخ دربار سے واپس گئی تو اسے بھی فکر ہوئی کہ آخر گلفام، نواب بہادر کے پاس کس غرض سے آیا ہے؟ پس وہاں سے باہر نکلتے ہی وہ بھی ایک ایسی جگہ چھپ کے کھڑی ہو گئی جہاں سے وہ دربار میں ہونے والی گفتگو سن سکتی تھی۔

نواب والاجاہ نے گلفام سے تنہائی میں گفتگو کی تھی۔ دربار کے پہلو والے جس کمرے میں دونوں میں گفتگو ہوئی تھی اس کے باہر صرف غلام پہرے پر تھا۔

گلفام چونکہ خود بھی ایک درباری غلام تھا اس لیے اس نے کرناٹک کے دربار میں داخل ہوتے ہوئے ایک سرسری نگاہ میں ہر چیز دیکھ لی تھی۔

جب والاجاہ نے گلفام کو راز ظاہر کرنے کو کہا تو اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا:

"اعلیٰ حضرت۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ دروازے پر پہرے دار موجود ہے۔ مجھے راز ظاہر کرنے میں کوئی عذر نہیں بشرطیکہ آپ مطمئن ہوں۔"

نواب نے اس کی احتیاط کو سراہا:

"تم نے درست کہا گلفام۔"

پھر نواب نے تالی بجا کر پہرے دار کو اندر بلوایا:

"تم دربار کے بڑے دروازے پر جا کے پہرہ دو۔۔۔ اور خبردار کسی کو اس طرف ہرگز نہ آنے دینا۔"

پہریدار نواب کا حکم سن کر باہر چلا گیا۔ اس طرح پہرے دار کے گفتگو سن لینے کا خطرہ بھی ختم ہو گیا مگر نواب والاجاہ محمد علی خاں اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کی کنیز گلرخ کمرے کی اس

کھڑکی سے چمٹی کھڑی ہے جہاں سے وہ تمام گفتگو بآسانی سن سکتی ہے۔ صرف وہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ایک اور کنیز اور ایک غلام بھی دربار کی گفتگو سننے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد گلفام نے اپنی مکمل غداری کا ثبوت دیتے ہوئے نظام دکن کا راز افشا کیا:

"اعلیٰ حضرت۔ میرے آقا نظام دکن نے حیدر علی خاں والی سرنگا پٹم کو میرے ذریعے پیغام بھیجا ہے کہ تاجر پیشہ انگریز کرناٹک کے سرکش صوبیدار محمد علی خاں کی ملی بھگت سے جنوبی ہند میں اپنی حکمرانی کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے اس لیے نظام دکن یہ چاہتے ہیں کہ وہ حیدر علی خاں کے تعاون سے کرناٹک کے صوبے دار اور اس کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے آئیں۔"

گلفام نے سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی:

"یہ پیغام لے کر میں سرنگا پٹم جا رہا ہوں اور جو جواب حیدر علی خاں مجھے دے گا وہ میں نظام کو پہنچاؤں گا۔

میں نے اس مسئلے پر جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اس نتیجہ پہ پہنچا کہ اگر نظام دکن اور حیدر علی خاں کا مشترکہ لشکر کرناٹک پہ حملہ آور ہوا تو بہت خون بہے گا اور ہزاروں بے گناہ مارے جائیں گے اور۔۔۔ اور۔۔۔"

گلفام کہتے کہتے گھبرا گیا۔ اس کی آواز گلے میں اٹک گئی۔ اس موقع پر نواب والاجاہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا:

"کہو کہو۔ اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اور یہ کہ اعلیٰ حضرت جانتے ہیں کہ یہاں میری بہن گلرخ بھی موجود ہے۔" آخر گلفام نے دل کی بات اگل دی۔

"تمہیں اپنی بہن سے بہت محبت ہے گلفام؟" نواب والاجاہ نے بڑی تیکھی نظروں سے گلفام کو دیکھا۔

گلفام کا سر جھکا ہوا تھا اس لیے وہ نواب کی نظریں اور تلخ لہجہ محسوس نہ کر سکا۔

"جی ہاں اعلیٰ حضرت۔ گلرخ صرف میری بہن ہی نہیں بلکہ منگیتر بھی ہے مگر ذرا بد دماغ سی واقع ہوئی ہے۔"

والاجاہ چونک پڑا:

"اچھا تو یہ بات ہے۔ خیر ہم تمہارا خیال رکھیں گے۔ تم دو چار دن ہمارے مہمان رہو۔ ہم کچھ غور و فکر کریں گے اور اس دوران گلرخ سے بھی دریافت کریں گے۔"

گلفام کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اس نے سمجھ لیا کہ بس اب پالا مار لیا۔ اس کا چھوٹا دماغ اس کے سوا اور سوچ بھی کیا سکتا تھا۔

نواب والاجاہ کے حکم پر گلفام کو شاہی مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا اور وہ اپنے تصور میں گلرخ کو لیے مہمان خانے کے لوازمات میں پھنس گیا۔

ادھر والاجاہ کو اپنی فکر پڑ گئی۔ کرناٹک کا صوبہ اگرچہ ایک علیحدہ حکومت تھی جس کا وہ بلا شرکت غیرے حکمران تھا لیکن دہلی دربار کے فرمان کے مطابق نظام دکن کو کرناٹک کی یہ سیادت دی گئی تھی کہ کرناٹک کا ہر نیا نواب نظام دکن کی مرضی سے مقرر ہوتا تھا۔

نواب والاجاہ بالکل خود مختار صوبے دار تھا لیکن اسے دہلی دربار کی یہ شق بھی گوارا نہ تھی کہ کرناٹک کے گورنر کا تقرر نظام دکن کی مرضی سے کیا جائے۔

دہلی دربار کے فرمان کی اس شق کو دور کرنے کے لیے نواب محمد علی خان نے تگ و دو شروع کی اور آخر وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔

دہلی دربار سے تاجدارِ ہند کا ایک فرمان جاری ہوا جس میں نواب محمد علی خان کو کرناٹک کا نہ صرف خود مختار حکمران تصور کیا گیا بلکہ اسے "والاجاہ" کا خطاب بھی دیا گیا۔

اس فرمان سے نظام دکن پر جیسے بجلی گر پڑی۔ نواب والاجاہ نے اس فرمان کے جاری ہوتے ہی نظام دکن سے آنکھیں پھیر لیں اور اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اس نے انگریزوں سے ایسا گٹھ جوڑ کیا کہ انگریز اور والاجاہ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو گئے۔

نواب والاجاہ کی اس سرکشی اور غرور کے پیشِ نظر ہی نظام دکن نے نواب حیدر علی خاں کے تعاون سے کرناٹک پر قبضہ کرنے کا سوچا تھا اور اس سلسلے میں ایک خط اپنے خاص غلام گلفام کے ہاتھ سرنگاپٹم بھجوایا تھا لیکن غدار گلفام نے اس راز کو اپنی یک طرفہ محبت پر قربان کر دیا اور اپنی محبوبہ گلرخ کو حاصل کرنے کے لیے کرناٹک پہنچ گیا۔

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ گلفام اور گلرخ سگے بہن بھائی تھے مگر گلفام کے دماغ میں یہ بیٹھ گیا تھا یا کسی نے بٹھا دیا تھا کہ وہ گلرخ کا سوتیلا بھائی ہے اور یہ کہ وہ گلرخ سے شادی کر سکتا ہے جبکہ گلرخ کو اپنے سوتیلے بھائی سردار علی سے محبت تھی جو ان دنوں سرنگاپٹم میں نواب حیدر علی خاں کی فوج

میں ملازم تھا۔

نواب والاجاہ نے گلفام کو مہمان خانے میں بھیج کے فوراً اپنے نائب کو بلوایا اور اسی وقت اپنے حلیف انگریزوں کو ایک خط لکھوایا:

"ہمارے فوجی جاسوسوں نے نظام الملک نظام دکن کے ایک نامہ بر کو گرفتار کیا ہے جس کے قبضہ سے ایک اہم خط برآمد ہوا۔ اس خط میں نظام دکن نے نواب حیدر علی خاں کو لکھا ہے کہ غیر ملکی انگریز تاجر، والیٔ کرناٹک یعنی میرے تعاون سے جنوبی ہند پر قبضہ کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے اس لیے نواب حیدر علی خاں اور نظام دکن کو مشترکہ لشکر کے ساتھ انگریزوں اور کرناٹک کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔

خط لے جانے والا قاصد ہمارے قبضے میں ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ فوری طور پر آپ نظام دکن کو حیدر علی خاں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے سے کسی بھی طرح روکنے کی کوشش کیجیے اور نظام کو کچھ لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کیجیے کہ وہ حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کے بجائے آپ کا اور ہمارا تعاون حاصل کرے تاکہ ہم سب مل کر حیدر علی کی زور پکڑتی طاقت کو ختم کر دیں۔"

والاجاہ نے یہ خط انگریزی میں ترجمہ کرا کے انگریزوں کے صدر مقام مدراس روانہ کیا۔ اس بر وقت اطلاع کے ملنے سے والاجاہ بہت خوش تھا کیونکہ نظام اور حیدر علی کے گٹھ جوڑ میں انگریزوں سے زیادہ اس کا نقصان مضمر تھا۔ کرناٹک پر حملہ کی صورت میں انگریز کرناٹک کی مدد کو ضرور آتے، کیونکہ والاجاہ دراصل انگریزوں کا ماتحت ہو گیا تھا لیکن انگریزوں کی طاقت اس قدر نہ تھی کہ وہ نظام اور حیدر علی کے دُہرے حملے کا مقابلہ کر سکتے۔

والاجاہ کے شاہی محل سے شام کے وقت ایک قاصد مدراس روانہ ہوا اور اسی محل سے نصف شب کے بعد ایک اور قاصد روانہ ہوا مگر اس کا رخ کرناٹک سے مدراس کے بجائے سرنگاپٹم کی طرف تھا۔ یہ قاصد شاہی محل کا ایک غلام تھا جسے گلرخ نے اپنے تمام زیورات حوالے کر کے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ فوراً سرنگاپٹم پہنچے اور وہاں سردار علی سے جو حیدری فوج میں ملازم ہے، ملے اور اسے یہ پیغام دے کہ نظام دکن کا قاصد سرنگاپٹم روانہ ہوا تھا مگر والاجاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہے اور

اس نے تمام راز اگل دیا ہے ـــــ اور اس نے والاجاہ کو بتایا ہے کہ نظام دکن، نواب حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پس اگر نظام دکن کا قاصد گلفام سرنگاپٹم پہنچے تو اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کیا جائے بلکہ نواب حیدر علی خاں کو اپنے طور پر جنگ کی تیاری کرنی چاہیے کیونکہ والاجاہ نے انگریزی فوج کو بلوانے کے لیے قاصد روانہ کر دیا ہے اور سرنگاپٹم پر چند دنوں بعد حملہ ہو سکتا ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ کرناٹک کے شاہی محل سے چلنے والے دونوں نامہ بر اور پیامبر اپنے اپنے مقام پر پہنچے۔ والاجاہ کا نامہ بر مدراس پہنچا۔

اور ـــــ

گلرخ کے بھیجے ہوئے پیامبر نے سرنگاپٹم میں قدم رکھا۔



سردار علی حیدری فوج کا ایک عام سپاہی تھا۔

مگر ـــــ یہ عام سپاہی اپنی ہنس مکھ طبیعت، چٹکلوں اور لطیفوں کی وجہ سے خاص آدمی بن گیا تھا۔ حیدری فوج کے تمام چھوٹے بڑے عہدیدار سردار علی کی پُرلطف باتوں سے محظوظ ہوتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ فوجیوں کی محبوب اور مقبول شخصیت بن گیا تھا۔

چنانچہ ـــــ

ارکاٹ سے آنے والے اس غلام کو جو گلرخ کا پیغام لے کر سرنگاپٹم پہنچا تھا سردار علی کو تلاش کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔

پیامبر نے فوجی بستی میں پہنچ کے جب سردار علی کے بارے میں دریافت کیا تو کئی فوجی اسے ساتھ لے کر سردار علی کے پاس پہنچے۔

"لو سنبھالو اپنے مہمان کو۔" ایک نے ہنس کر کہا۔

"سردار۔ ہم نے مہمان کو تمہارے پاس پہنچا تو دیا ہے مگر اپنے مہمان کی وجہ سے ہمیں فراموش نہ کر دینا۔" ایک دوسرے سپاہی نے اسے چھیڑا۔

"میرے بھائیو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میرے مہمان کو مجھ تک پہنچا دیا۔" سردار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"مگر اب خدا کے لیے میری جان چھوڑو تاکہ میں اپنے مہمان کی خاطر مدارات کر سکوں۔ اس سے

باتیں کر سکوں۔

اس مختصر نوک جھونک کے بعد جب سردار علی کے یار دوست رخصت ہو گئے تو اس نے اپنے مہمان سے دریافت کیا۔

"میرے مہمان بھائی۔ ان کم بختوں کی بک بک میں میں آپ سے ایک بات بھی نہیں کر سکا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس سے پہلے آپ کو کہاں دیکھا تھا!"

ارکاٹ کے قاصد نے جواب دیا:

"سردار بھائی۔ آپ اپنی یادداشت پہ زور نہ دیجیے اس لیے کہ آپ مجھ سے کبھی نہیں ملے اور نہ میں نے آپ کو اس سے پہلے دیکھا ہے"۔

"آپ بڑے سچے اور کھرے آدمی معلوم ہوتے ہیں" سردار نے بڑے خلوص سے کہا:

"کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"

قاصد نے جواب میں کہا:

"میرے بھائی سردار علی۔ میں ارکاٹ سے آیا ہوں جہاں کے حکمران نواب محمد علی والا جاہ ہیں"۔

"اچھا تو آپ ارکاٹ سے تشریف لائے ہیں!" ارکاٹ کا نام سن کر سردار علی کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

"جی ہاں۔ میں ارکاٹ سے آیا ہوں اور آپ کے لیے گلرخ کا ایک نہایت اہم پیغام لایا ہوں"۔

قاصد نے بے دھڑک ہو کے گفتگو شروع کی۔

"گلرخ؟"

سردار علی نے حیران نظروں سے پیامبر کو دیکھا:

"کیا تم گلرخ کو جانتے ہو؟"

"شاید تم ہوش میں نہیں ہو سردار علی"۔ پیامبر نے جواب دیا:

"میں کہہ رہا ہوں کہ میں گلرخ کا پیغام لایا ہوں اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کیا میں گلرخ کو جانتا ہوں۔ تم ہوش میں آؤ تو میں تمہیں وہ اہم پیغام سناؤں جسے سنانے کے لیے میں خطروں کی پرواہ نہ کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں اور جس کے لیے گلرخ نے مجھے منہ مانگا معاوضہ ادا کیا ہے!"

"ہاں ہاں ضرور سناؤ۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ بس ذرا یونہی ـــ" اور سردار علی کہتے کہتے رک گیا جیسے شرما گیا ہو۔

قاصد نے ادھر ادھر دیکھ کر رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا:

"ذرا کان کھول کے سنو سردار علی۔ میں اس وقت تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں یہی کچھ تم نواب حیدر علی خاں کے سامنے دہراؤ گے ـــ"

"میں ـــ میں نواب بہادر کے پاس کیسے جاؤں گا؟" سردار علی نے بات کاٹ دی:

"مجھ جیسے معمولی سپاہی سے نواب بہادر کیوں ملیں گے؟"

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو گئے سردار علی"

قاصد نے اسے تسلی دی:

"یہ بات اتنی اہم ہے کہ نواب بہادر تمہیں انعام دیں گے۔ پہلے تم سن تو لو!"

"اچھا۔ تم کہتے ہو تو سنے لیتا ہوں"۔

سردار کو پسینہ آ گیا تھا۔

قاصد نے آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کے گلرخ کا پیغام سنایا۔ پیغام سن کے سردار علی اور زیادہ گھبرا گیا۔

"قاصد بھائی"۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا:

"تم جو پیغام لائے ہو وہ ضرور سچ ہو گا مگر میں نواب بہادر کے سامنے اسے کس طرح بیان کر سکوں گا۔ میں تو ان کے سامنے بول ہی نہ سکوں گا"۔

"سردار علی۔ تم بڑے بزدل آدمی ہو۔ سپاہی ہو کر ایسے ڈرپوک۔ معلوم نہیں تم میدانِ جنگ میں کیسے لڑتے ہو گے؟" قاصد بڑبڑانے لگا۔ اسے سردار علی پہ غصہ آ رہا تھا۔

"دیکھو بھائی۔ میدانِ جنگ اور جگہ ہے اور نواب بہادر کا دربار اور جگہ"۔ سردار علی نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی:

"پھر بھی اگر تم مجھے ڈرپوک کہتے ہو تو میں تسلیم کیے لیتا ہوں لیکن میں نواب بہادر کے سامنے یہ سب کچھ نہ کہہ سکوں گا"۔

"پھر اور کون کہے گا؟" قاصد بگڑ گیا:

"اس بے چاری گلرخ نے تم تک یہ بات پہنچانے کے لیے مجھے اپنے سارے زیور دے دیے

ہیں اور ایک تم ہو کہ جسے نہ گلرخ کا خیال ہے اور نہ اس بات کی اہمیت کا کوئی احساس ہے۔"

"قاصد بھائی!" سردار لجاجت سے بولا:

"میں گلرخ کا اور تمہارا دونوں کا بہت بہت شکر گزار ہوں اور تم سے امید کرتا ہوں کہ جس حفاظت سے تم نے یہ پیغام مجھ تک پہنچایا ہے بالکل اسی طرح تم اسے نواب بہادر تک پہنچا دو گے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

قاصد کا پارہ چڑھ گیا:

"میں نے پیغام پہنچانے کا کام انجام دے دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں واپس ارکاٹ جا رہا ہوں۔"

قاصد واقعی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

سردار علی نے اس کے پیر پکڑ لیے:

"میرے بھائی۔ میرے دوست۔ میں تمہارے ساتھ نواب بہادر کے پاس چلوں گا لیکن ان سے بات تم کرو گے۔ خدا کے لیے مجھ پر یہ احسان کر دو۔"

قاصد کو اس پر رحم آ گیا۔ پھر وہ مسکرانے لگا:

"اچھا۔ مجھے لے چلو نواب بہادر کے پاس۔ میں خود بات کر لوں گا ان سے۔"

سردار علی خوش ہو گیا — اور قاصد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا:

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں نواب بہادر سے اجازت لے کر ابھی آتا ہوں۔"

نواب بہادر حیدر علی خاں اپنے ایک سردار ہیبت خاں سے گفتگو کر رہے تھے کہ ان کے محافظ نے داخل ہو کر عرض کیا:

"نواب بہادر کا اقبال بلند ہو۔ سردار علی نام کے ایک سپاہی نے درخواست پیش کی ہے کہ اس کے پاس ارکاٹ سے ایک قاصد آیا ہے۔ اس کے پاس نواب بہادر کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔ اجازت ہو تو ان دونوں کو حاضر کیا جائے؟"

نواب بہادر نے حیرانگی سے پہلے محافظ اور پھر ہیبت خاں کو دیکھا:

"ارکاٹ سے قاصد آیا ہے۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ والاجاہ محمد علی تو انگریزوں کے جوتے

چاٹنے والا ہے۔ وہ ہمیں کیا پیغام بھیج سکتا ہے۔ کیوں ہیبت خاں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

ہیبت خاں خود بہت حیران تھا۔ اس نے کہا:

"نواب بہادر صاحب نے درست فرمایا۔ نواب ارکاٹ تو ہمارا سخت مخالف ہے۔ پھر بھی قاصد کی بات سننے میں کیا حرج ہے۔ میری درخواست ہے کہ اسے حاضر ہونے کی اجازت دی جائے۔"

"ٹھیک ہے۔"

نواب بہادر نے محافظ کی طرف دیکھا:

"ان دونوں کو پیش کیا جائے۔"

محافظ کے جانے کے بعد نواب بہادر پھر ہیبت خاں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

اس دوران محافظ نے باہر جا کر سردار علی کو بتا دیا کہ وہ ارکاٹ کے قاصد کو جا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ نواب بہادر نے ان دونوں کو باریابی کی اجازت دے دی ہے۔

سردار علی بھاگتا ہوا قاصد کے پاس پہنچا اور ذرا دیر بعد ہانپتا کانپتا قاصد کو لے کر واپس آ گیا۔

"ہم حاضر ہیں۔ ہمیں پیش کرا دو نواب بہادر کے حضور۔" سردار علی نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

محافظ نے دونوں کو نواب بہادر کے سامنے پیش کیا۔ سردار علی اور ارکاٹ کے قاصد نے ان کو تعظیم پیش کی اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔

"تم میں سردار علی کون ہے؟" نواب بہادر نے دریافت کیا۔

"میں ہوں نواب بہادر۔" سردار علی نے سر اٹھایا۔

"ارکاٹ سے تمہارے پاس کوئی پیغام آیا ہے؟"

"جی نواب بہادر۔"

سردار نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا:

"پیغام میرے نام آیا ہے مگر وہ آپ کے لیے یعنی سرنگاپٹم کے حکمران کے لیے ہے۔"

"بیان کرو۔ کس کا پیغام ہے اور کیا پیغام ہے؟"

سردار نے قاصد کو کہنی ماری:

"قاصد بھائی جو پیغام لائے ہو بیان کر دو"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

ارکاٹ کے قاصد نے سر اٹھا کر کہنا شروع کیا:

"اے نواب بہادر۔ اے مسلمانوں کے سچے ہمدرد حکمران! ارکاٹ سے پیغام لے کر میں آیا ہوں۔ یہ پیغام ارکاٹ کے شاہی محل کی ایک کنیز گلرخ کی طرف سے سردار علی، جو سرنگاپٹم کی فوج کا ایک سپاہی ہے، کے نام ہے لیکن پیغام میں جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق سلطنتِ میسور اور سرنگاپٹم سے ہے جسے میں آپ کے دربار میں پیش کر رہا ہوں۔

عالی مقام نواب بہادر۔ حیدر آباد دکن کے حکمران نظام دکن نے ایک خط اپنے قاصد گلفام کے ہاتھ آپ کے پاس روانہ کیا تھا جس میں انہوں نے یہ خواہش کی تھی کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو وہ آپ کے تعاون سے انگریزوں اور ان کے حلیف نواب ارکاٹ کا خاتمہ کرنے پر آمادہ ہیں لیکن گلفام اس خط کو لے کر سرنگاپٹم آنے کے بجائے نواب ارکاٹ کے پاس جا پہنچا اور اس نے نواب پر یہ راز افشا کر دیا۔ راز افشا کرنے اور نواب سے صلہ حاصل کرنے کے بعد وہ اب آپ کے پاس آ رہا ہے آپ کو یہ اطلاع دینا اس لیے ضروری تھا کہ نواب ارکاٹ نے اس راز کو پاتے ہی فوراً اپنا ایک قاصد انگریزوں کے پاس روانہ کر دیا ہے کہ وہ ایک تو نظام دکن کو سرنگاپٹم کے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے انگریزوں اور نواب ارکاٹ سے تعاون پر مجبور کریں۔ پھر دونوں لشکر مل کر سرنگاپٹم پر حملہ کر دیں"۔

نواب بہادر نے یہ اہم پیغام بڑی توجہ سے سنا۔ پھر سردار علی سے سوال کیا:

"سردار علی۔ ہم تمہاری نیت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کرتے لیکن یہ ضرور معلوم کرنا چاہیں گے کہ نواب ارکاٹ کے محل سے پیغام بھیجنے والی کنیز سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"عالی جاہ۔ گلرخ میری بہن اور قاصد گلفام میرا سوتیلا بھائی ہے"۔ سردار علی جواب دے کر خاموش ہو گیا۔

دراصل نواب حیدر علی خاں کا اپنے لشکر پر بڑا رعب تھا۔ وہ خوش ہوتے تو جاں نثاروں کو نہال کر دیتے اور غداروں کے ساتھ وہ قطعی طور پر کوئی رعایت نہ کرتے تھے۔

"سردار علی"۔ نواب بہادر نے نرم لہجے میں کہا:

"مانا کہ پیغام بھیجنے والی کنیز تمہاری بہن ہے لیکن اس نے یہ پیغام بھیج کر کیا اپنے آقا نواب والاجاہ سے غداری نہیں کی؟"

سردار علی، نواب بہادر کے اس چبھتے ہوئے سوال سے پریشان ہو گیا مگر فوراً ہی سنبھل کر اس نے کہا:

"عالی جاہ۔ ارکاٹ کے قاصد نے جو پیغام مجھے دیا تھا اس میں کچھ اور باتیں بھی تھیں مثلاً یہ کہ اگر خدانخواستہ نواب ارکاٹ اور انگریزوں نے نظام دکن کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تو حکومتِ سرنگاپٹم بڑی مشکل میں گرفتار ہو جائے گی اور اگر جنگ ہوئی تو دونوں طرف سے مسلمان لڑیں گے اور بھائی بھائی کا گلا کاٹے گا۔

اس کے علاوہ عالی جاہ گلرخ میری سوتیلی بہن کے ساتھ ساتھ منگیتر بھی ہے۔ اسے یہ امید ہے کہ نواب بہادر ارکاٹ پر قبضے کے بعد ہم دونوں کی شادی کرا دیں گے"۔

نواب بہادر کا ذہن اگرچہ اس خبر سے پریشان ہو گیا تھا لیکن وہ سردار علی کے آخری جملے پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"ٹھیک ہے سردار علی۔ تم جا سکتے ہو لیکن ارکاٹ کے قاصد کو چند روز تک تم اپنا مہمان رکھو گے اور پوری طرح اس کی حفاظت کرو گے۔ تمہارے سگے اور سوتیلے رشتوں کے بارے میں چند دن کے بعد ــــ"

نواب حیدر علی کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ پہرے دار نے اندر آ کر اطلاع دی:

"نواب بہادر کا اقبال بلند ہو۔ نظام دکن کا قاصد حاضر ہے اور اذنِ باریابی چاہتا ہے"۔

حیدر علی خاں نے سردار علی کو دوسرے راستے سے باہر بھیج دیا۔ پھر نظام دکن کے قاصد کو اندر بلوایا۔

نظام دکن کا قاصد، گلرخ کا سگا اور سردار علی کا سوتیلا بھائی گلفام، نواب بہادر کے سامنے پیش کیا گیا۔ گلفام آداب بجا لایا۔

نواب بہادر نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر پوچھا:

"تمہارا نام گلفام ہے؟"

گلفام کو ذرا تعجب ہوا مگر وہ سنبھل کر بولا:

"اعلیٰ حضرت نے درست فرمایا۔ میرا نام گلفام ہے"۔

"کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ہم تمہارا نام جانتے ہیں؟" نواب بہادر نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اعلیٰ حضرت۔ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ میرا سوتیلا بھائی سرنگاپٹم کی فوج میں ہے، اس نے آپ کو بتایا ہوگا۔" گلفام نے اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔

نواب بہادر نے محسوس کیا کہ قاصد کافی چالاک ہے۔

"خیر۔ تم اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔"

گلفام نے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک بند لفافہ نکالا اور نواب بہادر کے سامنے پیش کیا۔ حیدر علی خاں نے لفافہ لے کر قریب کھڑے اپنے میر منشی کے حوالے کیا۔

خیال رہے کہ گلفام کے پاس یہ خط اس وقت بھی تھا جب اس نے والاجاہ محمد علی والیٔ ارکاٹ سے اس سلسلے میں گفتگو کی تھی مگر اس نے والاجاہ کو زبانی ہی سب کچھ بتایا تھا اور خط دکھانے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔

گلفام نے خط دیتے ہوئے کہا:

"اعلیٰ حضرت، نظام دکن کا یہ والا نامہ میں اپنی جان پر کھیل کر اور سینے سے لگا کے لایا ہوں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ اس میں کیا تحریر کیا گیا ہے لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ اس میں یقیناً کوئی اہم بات لکھی ہوگی اس لیے کہ اعلیٰ حضرت اپنے اہم خطوط کے لیے مجھے ہی نامہ بر بناتے ہیں۔"

حیدر علی خاں، گلفام کی اس لفاظی پر دل میں ضرور ہنسے ہوں گے مگر انھوں نے اسے اس پُر فریب گفتگو کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ میر منشی کو حکم دیا:

"نظام دکن کا نامہ پڑھا جائے۔"

میر منشی نے القاب و آداب کے بعد اصل مضمون پڑھا۔ لکھا تھا:

"یہ تاجر پیشہ انگریز کرناٹک کے سرکش صوبے دار کے ذریعے
اپنی حکمرانی کی زمین ہموار کرنے میں لگے ہیں اور علاقہ کرناٹک میں کھُلے
طور پر اپنا تسلّط جما چکے ہیں۔
ہمارا ارادہ ہے کہ آپ کے تعاون سے اس علاقہ (کرناٹک) کو دوبارہ
اپنے قبضے میں لے آئیں۔"

نظام دکن کے اس خط میں وہی بات تحریر تھی جو سردار علی کے پاس آنے والے قاصد نے ابھی ذرا دیر پہلے حیدر علی خاں کو بتائی تھی۔ اس سے سب سے پہلے تو حیدر علی خاں کو اس بات کی خوشی ہوئی

کہ ارکاٹ (کرناٹک) کے قاصد نے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

دوسری بات انہوں نے یہ محسوس کی کہ خط لانے والا قاصد گلفام بڑا شاطر اور چالاک ہے اور باتیں بنانا بھی خوب جانتا ہے۔

"تو ــــ یہ خط تم سینے سے لگا کر لائے ہو اور تم نے اس کی پوری طرح حفاظت کی ہے؟" نواب بہادر نے گلفام کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"جی اعلیٰ حضرت۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایک معتبر قاصد کو سلام و پیام اور خطوط کی کس طرح حفاظت کرنی چاہیے!" گلفام، حیدر علی خاں کی تیکھی نظر کو شاید محسوس نہ کر سکا اور اپنی شیخی بگھارنے لگا۔

"گویا، تم یہ نامہ نظام دکن کے ہاتھ سے لے کر سیدھے میرے پاس آ رہے ہو؟" نواب بہادر کے لہجے میں سختی کچھ اور بڑھ گئی تھی مگر گلفام اسے محسوس نہ کر سکا۔

"جی اعلیٰ حضرت۔ میں بالکل سیدھا آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ میں نے راستے میں اپنے آرام کی کوئی فکر نہ کی تھی۔"

گلفام نے پہلے سے زیادہ وثوق سے کہا اور اس طرح نواب حیدر علی خاں کی طرف دیکھا جیسے وہ اپنی محنت اور کارنامے کی داد چاہتا ہو۔

مگر ــــ

نواب حیدر علی خاں سے نظریں ملتے ہی وہ جھجکا اور اس کی نظریں جھک گئیں۔

"او نمک حرام قاصد۔ تو نے صرف اپنے آقا ہی کو دھوکہ نہیں دیا بلکہ ہمیں بھی فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے۔"

نواب بہادر شیر کی طرح گرجے:

"کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو اس خط کے ساتھ پہلے والاجاہ محمد علی کے پاس کرناٹک گیا تھا اور اس پر یہ راز ظاہر کرنے کے بعد ہمارے پاس آیا ہے؟"

گلفام ہکا بکا رہ گیا۔

موت اس کی نظروں میں ناچنے لگی۔ اس کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا، سوائے اس کے کہ وہ فوراً زانوؤں پر جھک گیا اور گڑگڑایا:

"نواب بہادر۔ رحم کیجیے۔ میں خطا وار ہوں۔ آپ کا مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے نواب بہادر۔"

"نمک حرام اور غدار کو معاف کرنا فتنہ اور بدی کی پرورش کرنا ہے۔" نواب بہادر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

اسی وقت شہزادہ ٹیپو دربار میں داخل ہوا اور دربار کا بگڑا رنگ دیکھ کر گھبرا گیا۔ شہزادے کو دیکھ کر حیدر علی خاں کے غصے میں کچھ کمی آگئی۔

نواب بہادر، قاصد سے منہ پھیر کر شہزادے سے مخاطب ہوئے:

"دیکھتے ہو جانِ پدر۔ دنیا میں کیسے کیسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ یہ کمبخت نظام دکن کا خط ہمارے نام لے کر چلا اور بجائے یہاں آنے کے پہلے والاجاہ محمد علی کے پاس پہنچ گیا۔ اسے تمام باتوں سے آگاہ کرنے کے بعد ہمارے پاس آیا ہے اور اب شیخیاں بگھار رہا ہے۔"

گلفام نے شہزادے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ فوراً شہزادے کی طرف رخ کر کے سجدہ ریز ہو گیا اور التجا کی:

"شہزادہ بہادر۔ خدا کے لیے میری جاں بخشی کرا دیجیے۔ میں نے غلطی کی ہے۔ میں گنہ گار ہوں آپ ــ آپ ــ"

"او بدبخت انسان۔ سجدے سے سر اٹھا، تو مجھے بھی گنہ گار کر رہا ہے۔" شہزادے نے تلخ لہجے میں کہا،

"اگر غلطی کرنے سے پہلے انجام پر نظر ڈال لی ہوتی تو آج تو اس حال میں نہ ہوتا۔"

نواب حیدر علی خاں نے گلفام کو قتل تو نہ کرایا تاہم اسے جیل بھجوا دیا تاکہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں۔

نواب حیدر علی خاں، نظام دکن کی طرف سے پہلے ہی بددل تھا۔ اس لیے کہ نظام، والاجاہ کا مخالف ہونے کے باوجود انگریزوں سے ساز باز کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ پھر بھی اگر گلفام، نظام کا خط لے کر سیدھا ان کے پاس آیا ہوتا تو شاید وہ [illegible]س کے خط پر کچھ غور کرتے لیکن اب تو انہیں تمام باتوں کا علم ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے نظام دکن کو [illegible] بھیجنے کے بجائے اپنی فوجی قوت کو بڑھانا شروع کر دیا تاکہ اگر کسی سمت سے حملہ ہو تو وہ ا[illegible] قرار واقعی تدارک کر سکیں۔

دوسری طرف جب نواب والاجاہ محمد علی کا [illegible] مدراس پہنچا اور وہاں کے انگریز جنرل اسمتھ کو معلوم ہوا کہ نظام دکن نے نواب بہادر حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ہے تو اس نے فوری طور پہ اس کے تدارک کی کوششیں شروع کر دیں۔

جنرل اسمتھ نے نظام دکن کو حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے سے باز رکھنے کے لیے خط وکتابت شروع کرنے کے بجائے نظام کے پاس اپنا ایک معتمد روانہ کیا۔

یہ ایک انتہائی چالاک قسم کا انگریز تھا۔ اس نے نظام دکن کے سامنے ایک اور ہی منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبہ کی جنرل اسمتھ نے پہلے ہی منظوری دے دی تھی۔

چنانچہ ـــ

انگریز معتمد نے نظام کو "شاہ" کے لقب سے مخاطب کیا:

"اے شاہِ دکن! ہمارے جنرل اسمتھ کو جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ سرنگا پٹم کا خود سر سردار حیدر علی آپ کے ملک پر حملہ کرنے والا ہے۔ دراصل وہ جنوبی ہند میں صرف اور صرف اپنی عملداری اور حکومت چاہتا ہے۔

اس سلسلے میں اس نے فرانسیسیوں سے بھی ساز باز کی ہے۔ ہماری ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس اگرچہ اپنی ایک الگ اور مضبوط طاقت ہے لیکن ہم تاجر لوگ ہیں۔ آپ لوگوں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہتے مگر ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ حیدر علی کی طاقت اس قدر بڑھ جائے کہ وہ ہماری کمپنی کے لیے بھی خطرہ بن جائے۔"

نظام دکن نے انگریز معتمد کی باتیں بڑے غور سے سنیں۔ اسے بھی سیاسی چالیں چلنے کا ملکہ حاصل تھا اس لیے اس نے سب کچھ سن کر بھی خود کو بالکل ایسا بنایا جیسے وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکا ہو۔

چنانچہ اس نے "پہلے سامنے والے کی بات سنو۔ پھر غور کر کے جواب دو" کے مقولے پر عمل کیا اور محسوس کیا کہ انگریز قاصد نے جو کچھ کہا تھا اس میں نظام دکن کے خیال کے مطابق تھوڑی بہت سچائی ضرور تھی لیکن قاصد نے اپنی طویل تقریر میں یہ نہ بتایا تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے یا پھر انگریز، نظام کو کیا مشورہ دینا چاہتے ہیں۔

آخر بہت سوچ کر نظام نے معصومیت سے کہا:

"ہم جنرل اسمتھ کے اس پیغام کے لیے بہت بہت شکر گزار ہیں اور ہماری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیا جائے۔"

اتنا کہہ کر نظام خاموش ہو گیا۔

انگریز قاصد دیر تک نظام کا منہ تکتا رہا کہ شاید وہ کچھ اور کہے گا مگر نظام نے تو جیسے چپ سادھ لی تھی آخر قاصد کو خود ہی بولنا پڑا۔

"اے شاہِ دکن۔ میں آپ کا شکریہ جنرل اسمتھ تک پہنچا دوں گا لیکن صرف شکریہ ادا کرنے سے تو وہ خطرہ نہیں ٹلے گا جس کی اطلاع جنرل صاحب نے آپ کو میرے ذریعے دی ہے۔"

" قاصد نے ٹھیک کہا۔"

نظام دکن اور زیادہ معصوم بن گیا:

"لیکن جنرل اسمتھ کی اطلاع کے تحت میں سوائے اپنا دفاع مضبوط کرنے کے اور کیا کر سکتا ہوں ـــ!"

انگریز قاصد تو موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے فوراً کہا:

"شاہ محترم! صرف مضبوط دفاع ہی دشمن کے حملے کو نہیں روک سکتا۔ آپ مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہیں۔ آپ کو ضرور یہ علم ہوگا کہ بعض اوقات دشمن کا حملہ روکنے کے لیے خود اس پر حملہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔"

نظام نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"لیکن شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ حیدر علی کی طاقت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ہم خود اس پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ حیدر علی کو فرانسیسیوں کا تعاون بھی حاصل ہے۔"

"اسے فرانسیسیوں کا تعاون حاصل ہے تو آپ ہماری کمپنی کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔" انگریز قاصد نے فوراً کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو قاصد۔ کمپنی سے ہمارا کوئی فوجی معاہدہ نہیں۔ ہم اسے اپنی مدد کے لیے کیسے بلا سکتے ہیں۔"

نظام نے فوراً گرفت کی تھی۔ اسے شبہ ہو گیا تھا کہ قاصد، جنرل اسمتھ کا کوئی منصوبہ لے کر آیا ہے اور نظام کو بتانے سے فی الحال گریز کر رہا ہے۔

آخر انگریز قاصد کو اپنا منصوبہ اگلنا پڑا۔

"شاہ محترم!" انگریز قاصد کو خود ہی کہنا پڑا: "آپ جانتے ہیں کہ کمپنی ہند کے ملکی معاملات

میں دخل نہیں دیتی لیکن اس ملک سے ہمارے تجارتی مفادات وابستہ ہیں اس لیے ہمیں اچھے دوستوں کی ہر وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

چونکہ شاہِ دکن ہمیشہ سے ہمارے دوستوں کی فہرست میں شامل رہے ہیں اس لیے ہم انہیں اس اہم موقعہ پر تنہا نہیں چھوڑیں گے۔"

نظام دکن کو اس کی طرف سے اشارہ ملا تو وہ بھی بولا:

"اس کا مطلب ہے کہ حیدر علی سے جنگ کی صورت میں انگریز فوج ہمارا ساتھ دے گی؟"

نظام کا انداز سوالیہ تھا۔

انگریز قاصد نے فوراً جواب دیا:

"بالکل ـــ آپ کا ساتھ ضرور دیا جائے گا۔ انگریز لشکر کو آپ ہر وقت اپنی مدد کے لیے آمادہ پائیں گے۔"

نظام دکن بہت چالاک تھا۔ اس نے دریافت کیا:

"ہماری مدد کی صورت میں انگریز ہم سے کس قسم کے صلہ کی توقع رکھتے ہیں۔ آپ لوگ یعنی کمپنی والے چونکہ تجارت پیشہ ہیں اس لیے نفع نقصان کی بات پہلے طے کر لی جائے تو بہتر معلوم ہوتا ہے۔"

جنرل اسمتھ کو پہلے ہی قدم پر نفع حاصل ہو گیا۔

وہ تو اپنی جگہ گھبرایا ہوا تھا اور ہر صورت میں نظام دکن کا تعاون چاہتا تھا تاکہ حیدر علی خان کی بڑھتی ہوئی طاقت پر قابو پایا جا سکے مگر اب اس کے قاصد نے سفارتی سطح پر پہلے ہی فتح حاصل کر لی تھی اور نظام دکن کچھ حاصل کرنے کے بجائے انگریز کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنی طرف سے کچھ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

قاصد نے بڑی شان سے کہا:

"شاہ بہادر ـــ میں دراصل آپ کو خطرے سے آگاہ کرنے آیا تھا۔ جہاں تک کمپنی کے تعاون اور صلہ کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں کوئی بات میرے ذہن میں نہیں ہے۔ اگر شاہ والا تبار اس سلسلہ میں میری کچھ رہنمائی کریں تو عین نوازش ہوگی۔"

نظام دکن کو دراصل ایک طرف تو حیدر علی سے خطرہ تھا اور دوسری طرف وہ کمپنی کی طاقت سے بھی خائف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نواب والا جاہ محمد علی انگریزوں کی گود میں بیٹھا ہے۔ یہ بات بھی

نظام کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی اس لیے وہ کمپنی کے تعاون کو ہر قیمت پر خریدنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اس نے قطعی فیصلہ کرنے کے بعد کہا:

"جنرل اسمتھ سے ہمارا سلام کہا جائے اور اس کے بعد کہا جائے کہ ہم کمپنی کے تعاون کی پیشکش کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور عملی مدد کی صورت میں ہم ان کے لشکر کے اخراجات کے لیے معقول علاقہ پیش کریں گے۔"

یہ سن کے انگریز قاصد کے تو جیسے پر لگ گئے۔ وہ بڑی تیزی سے مدراس پہنچا اور اس نے جنرل اسمتھ کو خوشخبری سنائی:

"محترم جنرل! آپ کی قسمت بہت یاوری کر رہی ہے۔ میں نے نظام دکن کو خطرے سے آگاہ کیا تو وہ پکے ہوئے آم کی طرح میری گود میں آ گرا۔ اس نے مجھ سے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ کمپنی کی طرف سے عملی مدد کی صورت میں وہ کمپنی کو فوج کے اخراجات کے لیے ایک معقول علاقہ بھی دے گا۔"

پھر اس نے بڑی تفصیل سے اپنی اور نظام کی گفتگو بیان کی۔

جنرل اسمتھ کے لیے واقعی یہ ایک بڑی خوشخبری تھی۔ اسے اگرچہ والاجاہ محمد علی کا پورا پورا تعاون حاصل تھا یہاں تک کہ اس نے کرناٹک کا پورا علاقہ اور فوج انگریزوں کے ماتحت کر دی تھی لیکن والاجاہ کا ملک ایک چھوٹا علاقہ تھا جبکہ نظام دکن جنوبی ہند کی ایک اہم شخصیت اور بڑی طاقت تھی۔

چنانچہ کمپنی اور نظام دکن میں گفت و شنید شروع ہوئی۔

نظام دکن اپنے اس قاصد کے لیے ضرور پریشان تھا جسے اس نے سرنگاپٹم بھیجا تھا، حالانکہ اب حالات بدل چکے تھے اور نظام کو حیدر علی سے زیادہ طاقتور فوج کی حمایت حاصل ہو رہی تھی اس لیے اس نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ:

"جنگ اور محبت میں ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔"

آخر طے یہ ہوا کہ نواب حیدر علی خاں کے خلاف انگریزوں اور نظام دکن کا متحدہ لشکر کارروائی کرے گا۔ اس میں نواب والاجاہ کا لشکر بھی شامل ہو گا مگر یہ چونکہ پہلے ہی سے انگریزوں کی زیر کمان ہے اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

اس سلسلہ میں اگر اسے نظام دکن کی خوش قسمتی کہا جائے تو ٹھیک ہو گا کہ اسے ایک مرہٹہ سردار کا بغیر کسی معاوضے کے تعاون بھی حاصل ہو گیا۔

اس مرہٹہ سردار کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا اور یہ پونا کے مرہٹہ پیشوا سے الگ رہ کر جنوبی ہند میں ادھر ادھر لوٹ مار کرتا پھر رہا تھا۔

مرہٹہ سردار کو جب معلوم ہوا کہ نظام دکن اور انگریز کمپنی کی متحدہ فوجیں شیر دکن حیدر علی خاں کے خلاف صف آرا ہو رہی ہیں تو اس نے لوٹ مار کرنے اور مال غنیمت کے لالچ میں خود ہی نظام دکن کو اپنے تعاون کی پیشکش کر دی۔

نظام نے یہ پیشکش انتہائی مسرت کے ساتھ قبول کر لی۔

حالات یہاں تک پہنچنے کے بعد نظام دکن اور کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے نظام دکن نے شمالی سرکار کا علاقہ انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ پھر انگریزوں کے منصوبہ کے مطابق تینوں طاقتوں یعنی نظام دکن، مرہٹہ لشکر اور کمپنی کی فوجوں نے متحدہ طور پر حیدر علی کے علاقہ بالاگھاٹ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اس جنگ کا آغاز انگریز کمپنی، نظام دکن اور ایک مرہٹہ سردار نے کیا لیکن انگریزوں کی شہ پر ہندوستان کی تاریخوں میں لکھا گیا کہ یہ جنگ جسے انگریزوں کی پہلی جنگ کا نام دیا گیا ہے اور ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک لڑی گئی، اس کا ذمہ دار سرنگاپٹم کا حکمران حیدر علی خاں تھا۔

اس بات میں رتی بھر بھی شبہ نہیں کہ یہ انگریزوں، نظام دکن اور مرہٹہ سردار کا گٹھ جوڑ تھا، جو اپنی اپنی جگہ پر حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھے۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ نظام دکن نے قاصد کے ذریعے حیدر علی خاں کو ایک خط بھیجا تھا جس میں اس نے والاجاہ محمد علی کو ختم کرنے کے لیے حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ قاصد یعنی گلفام اس جنگ کے وقت سرنگاپٹم میں قید تھا مگر تاریخ میں یہ لکھا گیا کہ یہ جنگ اس وجہ سے شروع ہوئی کہ حیدر علی خاں نے نظام دکن کے حیدر آباد کے کچھ علاقوں پر حملہ کر دیا تھا۔

اس کی تردید خود انگریز مؤرخین نے بھی کی ہے۔

مورخ ڈیلا فوسی "تاریخ ہند" میں لکھتا ہے:

"فتوحاتِ حیدری سے خوفزدہ ہو کر نظام الملک اور مرہٹوں نے انگریزوں سے گٹھ جوڑ کیا۔ ان کا متحدہ لشکر کرنل (اسے جنرل بھی لکھا گیا ہے) اسمتھ کی سرکردگی میں میسور پر چڑھ دوڑا۔"

مورخ سنکلیر "تاریخِ ہند" میں لکھتا ہے:

"۱۷۶۷ء میں انگریزوں کو معلوم ہوا کہ حیدر علی خاں فرانسیسیوں سے سازش کر رہے ہیں تاکہ ان کی مدد سے انگریزوں کو ہند سے نکال باہر کریں۔ پس انگریزوں نے نظام دکن اور مرہٹوں سے مدد مانگی اور پھر تینوں فوجیں یعنی نظام، انگریزی فوج (جس میں والاجاہ کی فوج بھی شامل تھی) اور مرہٹہ فوجیں میسور پر حملہ آور ہوئیں۔"

اسی طرح تھامسن "تاریخِ ہند" میں رقم طراز ہے:

"نظام دکن ہمیشہ حیدر علی خاں کا حاسد رہا اس لیے اس نے انگریزوں اور مرہٹوں کی مدد سے میسور پر حملہ کر دیا۔"

"رولرس آف انڈیا" میں تحریر ہے:

"حیدر علی کے خوف سے نظام الملک انگریزوں سے مل گیا اور مرہٹوں کے تعاون سے میسور پر حملہ کر دیا۔"

اب حیدر آباد دکن کی مطبوعہ تاریخ سے ایک حوالہ ملاحظہ ہو:

"چونکہ اس زمانہ میں کمپنی کو حیدر علی خاں کی روز افزوں ترقی سے خوف پیدا ہو گیا تھا کیونکہ حیدری فوجیں آئے دن کرناٹک اور انگریزی کمپنی کے علاقہ پر حملے کرتی رہتی تھیں اس لیے یہ ضروری تھا کہ اس کا سدِّباب کیا جائے۔ چنانچہ انگریز کمپنی نے بندگانِ عالی (نظام دکن) کو حیدر علی خاں کے خلاف کھڑا کر دیا۔"

بقول محمود بنگلوری:

"سچ تو یہ ہے کہ نظام علی خاں کو ایک اور اسلامی طاقت (حیدر علی) کا ابھرنا سخت گراں گزر رہا تھا مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ خود اس پر حملہ کرتا۔ دوسری طرف انگریزوں کو یہ خوف پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں

حیدر علی خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت انہیں ہندوستان سے نہ نکال دے۔ چنانچہ سازشیں دونوں طرف سے شروع ہوئیں اور ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے نظام نے علاقہ شمالی سرکار، انگریزوں کے حوالے کر دیا اور لشکر لے کر میسور پر حملہ آور ہوا۔"

ان حوالوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دورِ انگلشیہ میں جس قدر تاریخی کتب لکھی گئیں یا تاریخیں ترتیب دی گئیں ان میں انگریز اور ہندو مفادات کو پیشِ نظر رکھا گیا اور مسلمانوں کے سرداروں بادشاہوں اور سلطانوں پر طرح طرح کے الزامات تراش کر انہیں بدنام کیا گیا۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کے قیام کو ۴۵ سال گزرنے کے باوجود سرکاری یا نجی طور پر کوئی ایسی جامع کوشش نہیں کی گئی جو مسلمانانِ برصغیر کے صحیح کارناموں کو اجاگر کرتی اور ان واقعات اور حالات کو ہماری تاریخوں سے نکال دیتی جو ہمارے مشاہیر کی ذات پر ایک بدنما دھبہ ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا

حیدر علی خاں کے کان اس سازش سے باخبر ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اپنے لشکر کو ترتیب دے کر مدافعت کے لیے نکلے۔

نواب بہادر نے اپنے لشکر کے پانچ حصے کیے۔ ایک حصے پر ٹیپو سلطان، دوسرے پر محمد علی کیدان، تیسرے پر بخشی ہیبت جنگ اور چوتھے پر میر علی رضا خاں کو سردار مقرر کیا۔ باقی لشکر انہوں نے اپنے ساتھ رکھا۔

اس دور کی جنگی حکمتِ عملی اور چالوں میں سب سے اہم چال یہ تھی کہ دشمن کی رسد کو روکا جائے کیونکہ اگر رسد بند ہو جائے تو لشکر لڑنے سے معذور ہو جاتا ہے۔

رسد کو روکنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ان علاقوں کو تباہ کر دیا جائے جہاں سے دشمن کو رسد مل سکتی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

یہ فعل اگرچہ غیر انسانی معلوم ہوتا ہے لیکن اس زمانے میں ہر لشکر اس حکمتِ عملی پر عمل کرتا تھا۔ اس لیے حیدر علی پر اس کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

حیدر علی نے رسد کو روکنے کے علاوہ دشمن کے بڑھتے ہوئے لشکر پر شب خون مارنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

حیدری لشکر شب خون مارنے میں بڑا ماہر تھا اور اس کے مخصوص دستے چند گھنٹوں کی کوشش سے بڑے سے بڑے لشکر کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتے تھے۔ پس اس دُہری مار سے دشمن سخت پریشان ہوا اور اس کی پیش قدمی کی رفتار کم ہو گئی۔

اس موقعہ پر انگریزوں نے ایک زبردست جنگی چال چلی۔

انہوں نے اپنے بمبئی کے کمپنی آفس کو حکم دیا کہ وہ بمبئی سے ایک فوج منگلور کے ساحل پہ اتار دے جو آگے بڑھ کر بدنور پہ قبضہ کر لے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ یہ علاقے حیدر علی خاں نے فتح کیے تھے اور ان پہ حیدری پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ علاقے سلطنت میسور کے لیے انتہائی اہمیت رکھتے تھے۔ انگریزوں کے منصوبے کے مطابق بمبئی سے ایک فوج منگلور کے ساحل پر اتر گئی۔ وہاں مدافعت نہ ہونے کے برابر تھی۔

جب حیدر علی خاں کو اس اچانک اور غیر متوقع حملے کی اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً سلطان ٹیپو کو بدنور کی طرف روانہ کیا مگر اس خیال سے کہ شہزادہ ناتجربہ کار ہے کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے، انہوں نے مشرقی محاذ کو میر علی رضا خاں اور محمد علی کیدان کے سپرد کیا اور خود بھی لشکر کے ساتھ بدنور روانہ ہو گئے۔

انگریزوں کی اس حکمت عملی نے حیدر علی خاں کے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مشرقی محاذ سے سلطان ٹیپو اور حیدر علی خاں کے بدنور چلے جانے سے اتحادی فوجوں کو پیش قدمی کا موقع مل گیا اور انہوں نے بڑھ کر وانباڑی، ترا تور، کنگن گڑھ، چکدیو، دھرم پوری، کولار اور ہوسکوٹہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ میر علی رضا خاں اور محمد علی کیدان سے کچھ بنائے نہ بنا اور انہیں پسپا ہونا پڑا۔

اب جو اتحادیوں کو فتوحات نصیب ہوئیں تو نواب والا جاہ (جس کی فوجیں اتحادی لشکر میں انگریزوں کے ماتحت شامل تھیں) فوراً ارکاٹ سے چل کر کولار پہنچ گیا اور اس نے کولار کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔

جیسا کہ قارئین جانتے ہیں کہ کولار نواب حیدر علی خاں کی جائے پیدائش تھا۔ والا جاہ نے کولار کو اس لیے اپنا صدر مقام بنایا کہ حیدر علی خاں اپنے جائے پیدائش پہ قبضہ ہو جانے سے اس کے مطیع ہو جائیں گے۔

حالانکہ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

(یہ صرف خیال تھا بلکہ محال تھا اور پاگل پن تھا)

مگر — والا جاہ محمد علی اس وقتی فتح پر اس قدر مسرور اور مغرور ہوا کہ اس نے فوراً مراری لال حاکم گتی کو بلوایا اور اسے تمام مفتوحہ علاقوں کا حاکم مقرر کر دیا۔ گویا یہ تمام علاقے اس کی اپنی فوجوں نے فتح کیے تھے اور والا جاہ دکن کا بادشاہ بن گیا تھا۔

مغربی محاذ پہ بمبئی سے آنے والی انگریز فوج نے منگلور کے قلعہ پر قبضہ جما لیا تھا۔ ٹیپو سلطان بڑی تیز رفتاری سے اس محاذ پر پہنچا اور اس نے جاتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کو چند ہی دن گزرے تھے کہ نواب حیدر علی خاں بھی بیٹے کی مدد کو منگلور پہنچ گئے۔

انگریزوں کو منگلور کے قلعے پر قبضے سے دُہرا فائدہ پہنچا۔ ایک تو یہ کہ حیدری فوجیں دو حصوں میں تقسیم ہو کر آدھی فوجیں مغرب کو چلی گئیں اور آدھی فوجیں مشرقی محاذ پر رہ گئیں۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے مشرق میں کولار اور ہوسکوٹہ تک کا علاقہ فتح کر لیا اور اب مزید فتوحات کے منصوبے بنائے جانے لگے۔

دوسری طرف حیدری لشکر کی آدھی فوجیں مغرب میں منگلور کے قلعہ پہ لگ گئیں۔ ٹیپو سلطان اور خود حیدر علی خاں کو مشرقی محاذ چھوڑ کر آنا پڑا۔ حیدر علی خاں کے ساتھ بھی اتنی فوج نہ تھی کہ وہ قلعہ پہ فوری حملہ کر کے انگریزوں کو مار بھگاتے۔

اس موقع پر نواب حیدر علی خاں کی ذہانت نے انہیں ایک راستہ دکھایا۔ جس طرح انگریزوں کی حکمت عملی نے حیدری فوجوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اسی طرح نواب بہادر نے بھی ایک ایسی چال چلی کہ انگریز دنگ رہ گئے۔

ذہین اور زیرک نواب حیدر علی خاں نے قرب و جوار کے تمام بڑھیوں (ترکھانوں) کو بلوایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ لکڑی کی بندوقیں تیار کریں جن کی شکلیں بالکل اصلی بندوقوں کی مانند ہوں۔ چنانچہ لکڑی کے کاریگروں نے بندوقیں بنانا شروع کر دیں۔

دوسری طرف حیدر علی خاں نے رنگ برنگ کے جھنڈے اور نشان تیار کر لئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے آٹھ ہزار آدمیوں کو فوری طور پر ملازم رکھا۔ یہ نئے ملازم بظاہر حیدر علی خاں کے فوجی تھے، حالانکہ وہ بندوق پکڑنا بھی نہیں جانتے تھے۔

ایک طرف دھڑا دھڑ بندوقیں تیار ہو رہی تھیں۔

دوسری طرف نشان اور علم بن رہے تھے۔

تیسری جانب ان نئے بھرتی ہونے والوں کو علم اور بندوق پکڑنا سکھایا جا رہا تھا۔

یہ تمام کام مہینوں میں نہیں، دنوں میں ہو گئے۔ کیونکہ حیدر علی خاں جانتے تھے کہ وہ جب تک مغربی محاذ پر الجھے رہیں گے اس وقت تک مشرقی محاذ پر متحدہ دشمن فتوحات حاصل کرتا رہے گا۔

حیدر علی خاں کی ان تیاریوں کے بعد ایک دن ایسا ہوا کہ قلعہ منگلور کی طرف آٹھ ہزار کا بندوق بردار لشکر، پھریرے اڑاتا اور نشان لہراتا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

آٹھ ہزار کے علاوہ حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان کا لشکر الگ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منگلور کے قلعہ پر لاکھوں کا لشکر ایک دم چڑھ دوڑا ہے۔

قلعہ منگلور پر بمبئی سے آئے ہوئے انگریز لشکری پہرے چوکی پر چوکس کھڑے تھے۔ انہوں نے جب اڑتے ہوئے پھریروں کا سیلاب اور حیدری فوج کا رنگ برنگا ٹڈی دل قلعے کی طرف بڑھتے دیکھا تو ان کے ہاتھ پیر پھول گئے اور رگوں میں خون جمنے لگا۔ فصیل اور برجیوں کے کچھ پہرے دار گرتے پڑتے نیچے کی طرف بھاگے۔

فوج کا سردار نیچے ایک کمرے میں بیٹھا اطمینان سے صبح کا ناشتہ کر رہا تھا کہ فصیل کے سپاہی آگے پیچھے اس کے کمرے میں گھس آئے۔

وہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا:

"تم ۔۔۔ تم ۔۔۔ بغیر اجازت کمرے میں ۔۔۔" اس کے منہ میں نوالہ پھنسا ہوا تھا اور اس کی آواز ٹھیک سے نہ نکل رہی تھی۔

"سردار ۔۔۔ سردار ۔۔۔ غضب ہو گیا۔ ٹڈی دل ۔۔۔ ٹڈی دل ۔۔۔" ایک پہرے دار نے ہانپتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔

"ٹڈی دل ۔۔۔ کیسا ٹڈی دل ۔۔۔ کدھر ہے ٹڈی دل؟" سردار نے سنبھل کر پوچھا۔

پہرے دار بھی اپنے اوپر قابو پا چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے بتایا:

"سردار بہادر۔ دشمن نے لاکھوں سپاہیوں کے ساتھ حملہ کر دیا ہے!"

"لاکھوں سپاہی؟" سردار نے گھبرا کر اسے دیکھا: "کہاں ہیں لاکھوں سپاہی؟"

ایک پہریدار جو سب سے اونچے برج سے اتر کر آیا تھا، اس نے بتایا:

"سردار۔ دشمن کے کئی لاکھ فوجی ایک ساتھ قلعے کی طرف بڑھ رہے ہیں"۔

"کئی لاکھ؟"

اور سردار کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

پھر اسے ہوش آیا تو تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر کی طرف بھاگا۔ اسے اطلاع دینے والے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

انگریز فوج کے سردار نے فصیل سے جھانک کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ حیدری لشکر تھا کہ لہریں مارتا سمندر۔

قوس قزح کے رنگوں میں لپٹا ہوا حیدری لشکر تلواریں چمکاتا اور بندوقیں ہوا میں لہراتا آہستہ آہستہ قلعہ منگلور کی طرف آ رہا تھا۔ اس لشکر کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ان گنت گھڑ سوار بھی تھے۔

انگریز سردار نے پلٹ کر کہا:

"ہم منگلور پر قبضہ قائم نہیں رکھ سکتے"۔

چند لمحے رک کر اس نے حکم دیا:

"بمبئی واپس جانے کی تیاری کی جائے"۔

اس کے ساتھ ہی پورے قلعے میں "واپسی۔ واپسی" کی آوازیں گونجنے لگیں۔ فوجیوں نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا اور ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔

اسی وقت افواہ گرم ہوئی کہ دشمن کی سوار فوج نے قلعہ پر حملہ کر دیا ہے اور وہ قلعہ کے صدر دروازے تک پہنچ چکی ہے۔

اور یہ حقیقت بھی تھی۔

حیدری فوج میں اصلی اور نقلی لشکریوں کی کثیر تعداد دیکھ کر قلعہ پر متعین فوجیوں میں سراسیمگی پیدا ہو گئی تھی اور وہ سب ایک ایک کر کے فصیل اور برجیوں سے نیچے اتر گئے تھے۔ اس بات سے شہزادہ ٹیپو نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ قابض فوج بھاگنے کی تیاری کر رہی ہے۔

پس ۔۔۔

ٹیپو سلطان اپنے چند سوار دستوں کے ساتھ قلعہ کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ سواروں کو

آتا دیکھ کر قلعہ والوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور وہ بے انتہا بدحواسی کے عالم میں قلعہ خالی کر کے ساحل کی طرف بھاگے اور جہازوں میں سوار ہو کر لنگر اٹھا دیے۔

منگلور کا وہ مضبوط قلعہ جو ٹیپو سلطان اور حیدر علی خاں کی متحدہ فوجوں سے اس قدر جلد فتح ہونا مشکل تھا وہ قلعہ حیدر علی خاں نے بڑی آسانی سے فتح کر لیا۔ یہ اس کی ذہانت کا کرشمہ تھا اور اب حیدری پرچم قلعہ منگلور پر لہرا رہا تھا۔

حیدری فوج کا ایک لشکری بھی ضائع نہ ہوا۔ صرف چند گولے قلعے کی فصیل پر پھینکے گئے جن کا مقصد قلعہ والوں کو ہراساں کرنا تھا۔

حیدر علی کی حکمتِ عملی کی یہ ایک کامیاب فتح تھی۔ اس سے ایک طرف تو منگلور کا قلعہ بغیر خون بہائے فتح ہو گیا اور دوسری طرف ٹیپو سلطان کے سواروں کو وہ بے شمار سامان جو گولہ بارود اور بندوقوں پر مشتمل تھا، ہاتھ لگا۔

قلعہ منگلور دشمنوں سے واپس لینے کے بعد حیدر علی اور ٹیپو سلطان مغرب سے مشرق کی طرف واپس ہوئے۔ اس وقت انگریزی فوج کا پڑاؤ نرسی پور میں تھا۔

نرسی پور کے ایک بازار میں مراری لال نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ نواب حیدر علی خاں نے کیمپ پر اچانک شب خون مارا اور بہت سا مال و اسباب حاصل کر کے سات گڑھ کی طرف روانہ ہوئے۔

اس دوران مدراس سے انگریزوں کا ایک لشکر جنوب کی طرف بڑھا اور اس نے ڈنڈیگل اور دھارا پور پر قبضہ کر لیا۔

اس قبضہ کی خبر جب نواب بہادر کو ملی تو انہوں نے شہزادہ ٹیپو کو جنرل اسمتھ کے مقابلے پر چھوڑا اور خود فوجیں لے کر دھارا پور کی طرف بڑھے۔

نواب بہادر کی فوجیں ابھی دھرمپوری کے راستہ ہی میں تھیں کہ انہیں چار ہزار بیلوں کا ایک قافلہ ملا (ممکن ہے یہ قافلہ بیل گاڑیوں کا ہو)۔ ان بیلوں پر انگریزی فوجوں کے لیے رسد کا سامان بار تھا۔ حیدر علی نے اس رسد پر قبضہ کر لیا۔

حیدر علی اس سامانِ رسد کے ساتھ دھرمپوری پہنچے۔ یہاں تھوڑی سی لڑائی ہوئی اور حیدری

فوجوں نے دھرمپوری پر قبضہ کر لیا۔

دھرمپوری کے بعد حیدری فوجوں نے ہوسکوٹہ کا رُخ کیا۔ یہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور دشمن کی بیشتر فوجیں وہاں مقیم تھیں۔

دوسری طرف محمد علی کمیدان نے ہنور پہنچ کے اس پر قبضہ کر لیا۔ شہزادہ ٹیپو بھی اپنی فوجوں کے ساتھ محمد علی کمیدان کے پاس پہنچ گیا۔

اسی جگہ ٹیپو سلطان کو مخبر نے اطلاع دی:

"جنرل اسمتھ اپنے لشکر کے ساتھ کولار سے نکل چکا ہے"۔

"مبہم بات نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ جنرل اسمتھ کس طرف جا رہا ہے؟" ٹیپو سلطان نے اپنے مخبر سے وضاحت چاہی۔

مخبر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"شہزادہ بہادر۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسمتھ کس طرف جائے گا"۔

"پھر وہی بے تکی بات"! شہزادہ ٹیپو چڑ گیا:

"اسمتھ جب کولار سے نکل چکا ہے تو کسی طرف تو جا رہا ہو گا۔ آخر اس کا رُخ کس سمت ہے؟"

"شہزادے بہادر۔ میں بتا تو رہا ہوں"! مخبر نے کہا:

"اسمتھ کولار سے نکلا۔ چار میل جنوب کی طرف چلا۔ پھر ایک دم اس نے لشکر کو مشرق کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

جب لشکر چار یا پانچ میل چل چکا تو اس نے پھر اپنا راستہ بدل دیا اور لشکر کو شمال کی طرف چلنے کا حکم دیا ـــ مگر شاید اسے کچھ شبہ ہوا اور اس نے اپنے لشکر کو واپس کولار جانے کا حکم دے دیا"۔

ٹیپو نے حیران نظروں سے مخبر کو دیکھا۔ پوچھا:

"اب اس کا لشکر کہاں ہے؟"

مخبر نے سر جھکا کر جواب دیا:

"جی۔ وہ کولار کے سامنے خیمہ زن ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔ ٹیپو نے مسکرا کر کہا: "اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا"۔

اب مخبر کے بوکھلا جانے کی باری تھی ۔ اس کا خیال تھا کہ جنرل اسمتھ ایک بے وقوف آدمی ہے جو اپنے لشکر کو محض اپنی طاقت کے اظہار کے لیے ادھر ادھر گھماتا پھر رہا ہے لیکن ٹیپو نے اس کے خیال کی تردید کر دی تھی۔

مخبر کے دل میں عجیب طرح کی الجھن پیدا ہو گئی ۔ اس سے رہا نہ گیا اور آخر وہ پوچھ بیٹھا:

"شہزادے بہادر ۔ میرے خیال میں جنرل اسمتھ ایک احمق آدمی ہے جو اپنی فوج کو ادھر ادھر بھٹکاتا پھر رہا ہے مگر آپ فرما رہے ہیں کہ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا ۔ میری یہ جرأت تو نہیں کہ میں آپ سے سوال کروں لیکن میں دل میں الجھ رہا ہوں۔"

ٹیپو نے پُرسکون لہجے میں کہا:

"تم نے مجھ سے سوال نہیں کیا لیکن میں تمہیں جواب ضرور دوں گا ۔ تم ایک لشکری ہو مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم دشمن کے لشکر میں گھس جاتے ہو اور تمہیں کوئی شناخت نہیں کر پاتا ۔ پھر کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے کہ تم دشمن کے دل میں اتر جاتے ہو اور جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے اسے معلوم کر کے اپنے آقا تک پہنچاتے ہو ۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"شہزادے بہادر نے بالکل درست کہا۔" مخبر نے جواب دیا :

"بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"تم اپنے اس کام کو ہوشیاری یا چالاکی کہتے ہو مگر فوجی اصطلاح میں اسے "حکمتِ عملی یا جنگی چال" کہا جاتا ہے۔

جنرل اسمتھ کولار سے فوج لے کر چلا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر واپس کولار آ گیا ۔ اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں ۔ اوّل یہ کہ کولار سے نکلنے کے بعد جنرل اسمتھ کا دماغ الجھ کر رہ گیا اور وہ کوئی مستقل فیصلہ نہ کر سکا کہ کس طرف جائے اس لیے وہ شمال جنوب اور مشرق مغرب میں بھٹکتا رہا ۔ پھر پریشان ہو کر واپس چلا گیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ جس کا امکان زیادہ ہے وہ یہ ہو سکتی ہے کہ کولار سے نکلنے کے بعد جنرل اسمتھ کو یہ شبہ ہوا یا اسے اطلاع دی گئی کہ اس کے دشمن کے جاسوس اس کی پیشقدمی پر نظریں لگائے ہوئے ہیں اور یہ بات اس کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے اس لیے اس نے اپنے دشمن کے جاسوسوں کو دھوکا دینے کے لیے لشکر کو ادھر ادھر گھمایا پھرایا ۔ پھر کولار واپس چلا گیا۔

اگر اس نے واقعی یہ حکمتِ عملی برتی ہے تو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ایک دو دن میں کولار سے

پھر نکلے گا اور جدھر سے جانا ہے اس طرف بے خوف و خطر چلا جائے گا۔"

مخبر نہ تو زیادہ پڑھا لکھا تھا اور نہ اسے زیادہ تجربہ تھا ۔ اس نے شہزادے کی باتیں سنیں تو حیران رہ گیا۔

"شہزادے بہادر ۔ آپ نے اتنی سی عمر میں اتنا سارا تجربہ کیسے حاصل کر لیا ۔ یہ باتیں تو شاید بڑے بڑے سرداروں کو بھی نہ آتی ہوں گی۔"

"ایسا نہ کہو ۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے تمام سردار بڑے تجربہ کار اور وفادار ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سردارِ اعلیٰ ہمارے بابا خان نواب بہادر ہیں ۔ میں نے ان کے ساتھ رہ کر ہی یہ تجربہ حاصل کیا ہے ۔

تمہیں شاید یہ علم نہیں کہ مجھے بابا خان نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں میدانِ جنگ میں طلب کر لیا تھا ۔ جب سے میں میدانِ جنگ میں دشمن سے نبرد آزما ہوں۔"

"بے شک بے شک ۔ خدا شہزادے کی عمر دراز کرے۔"

مخبر نے شہزادے کو دل سے دعا دی :

"شاید اسی لیے یہ مثل مشہور ہے کہ :

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"

(یعنی ہونہار باپ کی اولاد بھی ہونہار ہوتی ہے)

اس گفتگو کے دوسرے ہی دن ٹیپو سلطان کی بات سچ ثابت ہو گئی ۔

پہلے مخبر کا ایک ساتھی جسے وہ اپنی جگہ کولار میں چھوڑ آیا تھا، ایک تیز رفتار گھوڑے پر ٹیپو کے پاس ہنتور پہنچا۔

"شہزادے بہادر ۔ جنرل اسمتھ ایک بڑے لشکر کے ساتھ ہوسکوٹہ جا رہا ہے" ۔ اس نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

یہ خبر پاتے ہی ٹیپو سلطان نے فوراً لشکر کو کوچ کا حکم دیا اور اپنے ساتھی سردار محمد علی کیدان سے کہا:

"ہماری اطلاع کے مطابق بابا خان بھی ہوسکوٹہ کی سمت جا رہے ہیں ۔ انہیں فوراً اطلاع دی جائے کہ جنرل اسمتھ کولار سے ہوسکوٹہ کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔

انہیں یہ خبر بھی دی جائے کہ ہم جنرل اسمتھ کو راستہ میں روکنے کی کوشش کریں گے ۔ بابا خان

بے فکر ہو کے قلعہ ہوسکوٹہ پہنچ کے اسے فتح کریں۔"

محمد علی کمیدان نے ٹیپو سلطان کے دونوں احکامات پر فوری عمل کرایا۔ اس نے ایک سوار نواب بہادر کی طرف بھیجا اور دوسری طرف ہتور میں مقیم فوج کو اس قدر جلد تیار کیا کہ وہ دن ڈھلنے سے پہلے جنرل اسمتھ کو روکنے کے لیے چل پڑے۔

جنرل اسمتھ نے واقعی فوجی چال چلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر دشمن کے جاسوس اس کے لشکر کے گرد موجود ہیں تو وہ مطمئن ہو جائیں کہ انگریز فوجیں کولار میں خاموش ہو کے بیٹھ گئی ہیں۔ اس کی یہ جنگی چال ضرور کامیاب ہو جاتی اگر حیدری فوج کے جاسوس کولار میں موجود نہ ہوتے۔

چنانچہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی بیدار مغزی کی وجہ سے جنرل اسمتھ کی یہ جنگی چال ناکام ہو گئی۔ جنرل اسمتھ کی فوج کے گرد نہ صرف ٹیپو سلطان کے مخبر منڈلا رہے تھے بلکہ نواب بہادر کے مخبر بھی کولار میں موجود تھے اور وہ نواب بہادر کو، جو ہوسکوٹہ کے راستے میں تھے، لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچا رہے تھے۔

نواب بہادر کو ہوسکوٹہ کے راستے ہی میں معلوم ہو گیا کہ جنرل اسمتھ ایک بڑی فوج کے ساتھ ہوسکوٹہ کو بچانے کے لیے بڑھا چلا آ رہا ہے۔

اس اطلاع سے ان کی پیش قدمی پر اثر پڑا اور کچھ دیر کے لیے فوجوں کو روک کر انہیں یہ سوچنا پڑا کہ آیا انہیں پہلے جنرل اسمتھ کی فوج سے مقابلہ کرنا چاہیے یا ہوسکوٹہ کی طرف پیش قدمی جاری رکھنا چاہیے۔

نواب بہادر حیدر علی خاں اسی تذبذب میں تھے کہ ان کے پاس محمد علی کمیدان کا قاصد پہنچا۔

اس نے عرض کیا:

"سردار محمد علی کمیدان نے ہتور سے نواب بہادر کی خدمت میں پیغام بھیجا ہے کہ نواب بہادر بے خطر ہو کر ہوسکوٹہ کی طرف پیش قدمی جاری رکھیں کیونکہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ کولار سے آنے والے جنرل اسمتھ کے لشکر کو راستے ہی میں الجھا لیں گے اور اسے ہوسکوٹہ پہنچنے نہیں دیں گے۔"

نواب بہادر کو اس اطلاع سے بڑی مسرت ہوئی مگر بیٹے کی طرف سے ابھی وہ مطمئن نہیں تھے

انہوں نے مخبر سے دریافت کیا:

"محمد علی کمیدان کو شہزادے ٹیپو کے بارے میں کیا معلومات ہیں؟"

"نواب بہادر۔ آپ شہزادے کی طرف سے بالکل مطمئن رہیے۔ شہزادہ بہادر اپنی فوج کے ساتھ محمد علی کمیدان کے ہمراہ ہتور میں موجود تھے۔ میں انہی کے حکم سے آپ کی طرف آیا ہوں۔"

"مگر تم تو کہہ رہے ہو کہ شہزادہ بہادر وہاں موجود تھے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شہزادہ ٹیپو اس وقت کہاں ہیں؟"

نواب بہادر ایک نئی فکر سے دوچار ہو گئے۔

لیکن ___ خبر لانے والے نے انہیں مطمئن کر دیا:

"نواب بہادر۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ شہزادہ بہادر اور سردار محمد علی کمیدان اس وقت لشکر کے ساتھ جانے کے لیے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے جس وقت میں ہتور سے چلا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس وقت جنرل اسمتھ کے مقابلہ پر پہنچ چکے ہوں۔"

"شکر ہے خداوند تعالیٰ کا۔" حیدر علی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

اب حیدری لشکر ایک بار پھر ہوسکوٹہ کی طرف رواں دواں تھا۔

مخبری دونوں طرف سے ہو رہی تھی۔ انگریز، مرہٹہ اور نظام دکن کی متحدہ فوجیں ایک طرف تھیں اور حیدر علی کا لشکر دوسری طرف۔ ان کے جاسوس اُن کے لشکر کی مخبری کر رہے تھے اور اُن کے مخبر ان کے لشکر میں موجود تھے۔ دونوں طرف کے مخبر اپنے اپنے آقاؤں کو خبریں پہنچا رہے تھے۔

جنرل اسمتھ لشکر لے کر کولار سے بڑے اطمینان سے نکلا۔ اس کا رخ ہوسکوٹہ کی جانب تھا لیکن رفتار انتہائی سست تھی اور اسی سست رفتاری کی وجہ سے ٹیپو سلطان اور محمد علی کمیدان کی فوجیں جنرل اسمتھ تک اس وقت پہنچ گئیں جب جنرل اسمتھ ہوسکوٹہ سے ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔

ٹیپو اپنی فوجوں کے ساتھ جنرل اسمتھ کے لشکر کے سامنے نمودار ہوا تو وہ حیران رہ گیا۔ پہلے تو اسے یہی خیال ہوا کہ یہ لشکر حیدر علی خاں کا ہے جو ہوسکوٹہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور شاید جنرل کے لشکر کی آمد کی اطلاع پا کر لوٹ پڑا ہے۔ جنرل نے فوراً لشکر کو رکنے کا حکم دیا تاکہ تازہ حالات

معلوم کیے جاسکیں۔

جنرل اسمتھ کو جلد ہی علم ہو گیا کہ سامنے آنے والا لشکر حیدر علی خاں کا اصل لشکر نہیں بلکہ اس کے لشکر کا وہ حصہ ہے جو شہزادہ ٹیپو اور محمد علی کمیدان کی سرکردگی میں مختلف علاقوں میں فتوحات حاصل کر رہا ہے۔

اسے یہ بھی بتایا گیا کہ یہ لشکر ہتور کی طرف سے آیا ہے جس پر حیدری فوجوں نے چند دن پہلے ہی قبضہ کیا ہے۔

جنرل اسمتھ کے ہوسکوٹہ پہنچنے کے لیے اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ پہلے اس ناگہانی آفت سے نجات حاصل کرے اور اس سے نجات کی صورت صرف یہ تھی کہ ٹیپو کی فوجوں پر حملہ کر کے راستہ صاف کیا جائے۔

یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ جنرل اسمتھ نے اپنی رفتار سست کیوں رکھی تھی!

جنرل اسمتھ کا منصوبہ یہ تھا کہ حیدر علی خاں کے لشکر کو ہوسکوٹہ (اسے بعض تواریخ میں ہسکوٹہ بھی لکھا گیا ہے) پہنچنے دیا جائے۔ پھر جب حیدر علی کا لشکر قلعہ ہوسکوٹہ کا محاصرہ کر کے اس پر حملہ شروع کرے تو جنرل اسمتھ اس کی پشت پر نمودار ہو۔ اس طرح سامنے سے قلعہ والے حیدر علی پر حملہ کریں اور پیچھے سے جنرل اسمتھ حملہ آور ہو اور حیدری لشکر کو دو سمتوں سے اس طرح پیس کر رکھ دے جیسے چکی کے دو پاٹوں میں اناج۔

لیکن ـــــ

جنرل اسمتھ کا یہ منصوبہ شہزادہ ٹیپو کے لشکر نے ناکام بنا دیا۔ ٹیپو سلطان اور محمد علی کمیدان نے جنرل کا نہ صرف راستہ روک لیا بلکہ اس پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ جنرل اسمتھ بدحواس ہو گیا مگر اس نے جلد ہی سنبھل کر مورچے قائم کر لیے۔ اس طرح ٹیپو اور جنرل اسمتھ کے درمیان ایک طویل جنگ کا آغاز ہو گیا۔

جنرل اسمتھ نہیں چاہتا تھا کہ جنگ طول کھینچے کیونکہ اس کا مقصد تو جلد سے جلد ہوسکوٹہ پہنچ کے اسے حیدر علی کے ہاتھوں سے بچانا تھا مگر ٹیپو نے اسے اس طرح الجھایا تھا کہ جنگ طول پکڑتی جا رہی تھی۔ ٹیپو سلطان کا مقصد بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس جنگ کو اس وقت تک طول دیا جائے جب تک نواب حیدر علی خاں قلعہ ہوسکوٹہ پر قابض نہیں ہو جاتے۔

اُدھر ہوسکوٹہ پر حیدر علی نے محاصرہ سخت کر دیا تھا اور دباؤ برابر بڑھا رہے تھے۔ وہ خود

چاہتے تھے کہ قلعہ پر جلد سے جلد قبضہ ہو جائے تاکہ وہ یہاں سے فارغ ہو کے شہزادہ ٹیپو کی مدد کو پہنچیں۔

قلعہ ہوسکوٹہ پر رات دن گولہ باری جاری تھی اور فصیل پر چڑھنے کی بھی کئی بار کوشش کی گئی تھی۔

آخر ایک شدید جنگ کے بعد حیدری فوج کے جانباز سیڑھیاں لگا کر قلعہ کی فصیل پر پہنچ گئے اور پہریداروں کو قتل کرتے ہوئے قلعہ کے دروازے پر پہنچ کے اسے کھول دیا۔ حیدری لشکر دھڑا دھڑ قلعہ میں داخل ہو گیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں نے اسی وقت ایک قاصد کے ذریعے اس کی اطلاع شہزادہ ٹیپو کو بھجوائی اور یہ بھی کہلوایا کہ وہ دو تین دن میں قلعہ کا انتظام کر کے اس کے پاس پہنچ رہے ہیں۔

ٹیپو سلطان دشمن کو بری طرح الجھائے ہوئے تھا۔ جنرل اسمتھ کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو رہی تھی۔ اور وہ ہر وقت دانت کٹکٹاتا رہتا تھا۔

انہی دنوں ہوسکوٹہ کی فتح کی خبر لے کر ایک سوار ٹیپو سلطان کے پاس پہنچا۔ ٹیپو اسی وقت سجدۂ شکر بجا لایا۔ پھر وہ اس رات محمد علی کمیدان اور دوسرے سرداروں کے ساتھ نئی حکمتِ عملی ترتیب دیتا رہا۔

جب صبح ہوئی تو ٹیپو سلطان نے جنرل اسمتھ کے سامنے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا جیسے وہ آج فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتا تھا۔ جنرل اسمتھ خود بھی اس جنگ کا جلد سے جلد فیصلہ چاہتا تھا۔ وہ بھی اپنے پورے لشکر کو مقابلہ پر لے آیا۔

پہل ٹیپو کی طرف سے ہوئی اور اس نے اسمتھ کے لشکر پر ایک سخت حملہ کیا۔ جنرل اسمتھ کے لشکر کی تعداد ٹیپو سلطان کے لشکر سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے یہ حملہ روک لیا اور کچھ دیر بعد جوابی حملہ کر دیا۔

جنرل اسمتھ کا حملہ اس شدت کا تھا کہ ٹیپو کا لشکر اپنے حملہ میں جس قدر آگے بڑھ گیا تھا اسے وہیں واپس آنا پڑا۔ پھر دشمن کے دباؤ کی وجہ سے اس کے لشکر کے قدم وہاں بھی نہ ٹھہر سکے اور اسے پسپا ہونا پڑا۔

ٹیپو سلطان کے لشکر کی پسپائی اگرچہ منظم اور بہت سست تھی مگر پسپائی تو شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ وہ جس قدر پیچھے ہٹ رہا تھا، جنرل اسمتھ اس پر اتنا ہی زیادہ دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا۔
دوپہر ہونے تک ٹیپو سلطان کا لشکر اس قدر پسپا ہو گیا کہ اس کے مورچوں اور خیموں پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

مگر ——

عجیب بات یہ تھی کہ ٹیپو کا لشکر برابر پسپا ہو رہا تھا مگر نہ تو ہتھیار ڈالتا تھا اور نہ میدان چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ انگریز لشکر اسے برابر دباتا چلا آ رہا تھا۔
خیال رہے کہ یہ صرف انگریزوں کا لشکر نہ تھا بلکہ اس میں نظام دکن کے دستے، مرہٹہ فوجی اور والاجاہ کے بیشتر لشکری بھی شامل تھے۔
پھر ٹیپو سلطان کا پسپا ہوتا ہوا لشکر چند اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان آ گیا جن کے ساتھ اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ اس وقت جنرل اسمتھ نے اپنے وہ دستے جنہیں اس نے اب تک محفوظ رکھا تھا، انہیں بھی جنگ میں جھونک دیا اور ایک شدید اور فیصلہ کن حملے کا حکم دے دیا۔
جنرل اسمتھ کی فوج چیلوں کی طرح ٹیپو سلطان کے فوجیوں پر ٹوٹ پڑی۔

اور ——

اسی وقت ٹیپو سلطان کی پسپا ہوتی ہوئی فوج اک دم جم کے کھڑی ہو گئی۔
جنرل اسمتھ نے ٹیپو سلطان کے فوجیوں کی اس حرکت کو ضرور حیرت سے دیکھا ہو گا مگر اس کی یہ حیرت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ان بے جان ٹیلوں اور اونچی اونچی جھاڑیوں نے انسان اگلنا شروع کر دیے۔

یہ ٹیپو سلطان کے وہ فوجی تھے جنہیں رات کو اس کمین گاہ میں چھپا دیا گیا تھا۔ یہ منصوبہ خود ٹیپو سلطان نے بنایا تھا۔ اس نے اپنا ایک تہائی لشکر اس کمین گاہ میں پوشیدہ کر دیا تھا اور باقی دو تہائی لشکر کے ساتھ جنرل اسمتھ پر حملہ کیا تھا۔ پھر جب جنرل اسمتھ نے جوابی حملہ کیا تو منصوبے کے مطابق ٹیپو سلطان کا لشکر پورے نظم و ضبط کے ساتھ پیچھے ہٹنا شروع ہو گیا۔
جنرل اسمتھ کو اپنی فتح نظر آ رہی تھی اس لیے وہ برابر بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ دوسری جانب ٹیپو کا لشکر آہستہ آہستہ دشمن کو کمین گاہ تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہاں چھپے ہوئے تازہ دم فوجی نعرے لگاتے ٹیلوں اور جھاڑیوں سے گروہ در گروہ نکلنا شروع ہو گئے۔

جنرل اسمتھ کو فوراً احساس ہوا کہ دشمن نے اسے سخت دھوکا دیا ہے۔ اس نے اپنے لشکر کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر کمین گاہ کی تازہ دم فوج نے اتنا سخت حملہ کیا کہ جنرل کی فوج کے قدم نہ جم سکے اور وہ میدان چھوڑ بھاگی۔
جنرل اسمتھ جدھر سے آیا تھا ادھر ہی کو واپس ہو گیا یعنی وہ میدانِ جنگ سے بھاگا تو اس نے کولار جا کر دم لیا۔
ایک روایت کے مطابق ٹیپو سلطان نے جنرل اسمتھ کی فوج کے لیے بنگلور کے نواح میں کمین گاہ تیار کرائی تھی جہاں چھپے ہوئے فوجیوں نے جنرل اسمتھ اور اس کی فوجوں کو شکست سے دوچار کیا تھا۔

نواب حیدر علی خاں قلعہ ہوسکوٹ (ہسکوٹہ) کے انتظام سے فارغ ہو کے نرسی پور پہنچے اور وہاں قیام کیا۔
یہ وہی مقام تھا جہاں چند دن پہلے تک انگریزی فوجیں رہا کرتی تھیں۔ یہاں قیام کے دوران ہی حیدر علی کو اطلاع ملی کہ انگریزی فوج کے لیے مدراس سے سامانِ رسد آ رہا ہے۔ انہوں نے فوراً چند دستے بھیج کر اس سامان پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ہرین ہلی کے قریب پیش آیا تھا۔
اس کے بعد تو نواب بہادر نے انگریزی، مرہٹہ اور دکنی فوجوں پر شب خون مارنے کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا اور اس قدر شب خون مارے کہ مرہٹے اور نظام دکن کی فوجیں چیخ اٹھیں ——
مرہٹے تو آئے دن کے ان حملوں سے بے انتہا تنگ آئے ہوئے تھے اور ہر صورت میں ان سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔
نواب حیدر علی خاں کو معلوم تھا کہ مرہٹوں کا مقصد محض دولت حاصل کرنا ہے اس لیے نواب بہادر نے ان کے آگے ہڈی ڈال دی اور ایک رقم کی پیش کش کی۔
مرہٹے تو ایسے موقع کی تلاش ہی میں تھے۔ وہ فوراً راضی ہو گئے۔ نواب بہادر نے ان کو ۳۲ لاکھ روپے اور ایک چھوٹا سا علاقہ دے کر متحدہ لشکر سے الگ کرا دیا اور مرہٹے متحدہ لشکر چھوڑ کر (ایک خیال کے مطابق پونا کی طرف) چلے گئے۔
اب تو نظام دکن کے حواس جاتے رہے اور ہاتھ پیر سرد پڑ گئے۔ اس نے فوراً اپنے سردار

سے واپسی کے مشورے شروع کردیے۔ حالانکہ اس کے پاس اس وقت بھی ایک بہت بڑی فوج موجود تھی۔

موسیو مڈلٹ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

"نواب نظام علی خاں کے پاس گنتی گنانے کے لیے ایک لاکھ سوار اور پیادوں کی جمعیت تھی لیکن ان میں شاید دو ہزار بھی اچھے بندوقچی اور جانباز نہیں تھے۔ نواب کے سرداروں میں ایک رام چندر مرہٹہ، تین نواب شاہنور، کرٹپہ اور کانور بھی شامل تھے۔ نظام کی لشکرگاہ میں رقاصاؤں کی کوئی کمی نہ تھی۔ نواب دکن کے دیوان رکن الدولہ نے انگریزوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود نواب حیدر علی خاں سے صلح کے لیے سلسلۂ جنبانی کیا۔"

نظام دکن کے دیوان رکن الدولہ کا قاصد حیدر علی خاں کے پاس پہنچا تو نواب بہادر نے اس کی پذیرائی کی اور اسے عزت سے ٹھہرایا گیا۔ حیدر علی خاں خود بھی نظام سے الجھنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے مرہٹوں کو تو متحدہ لشکر سے پہلے ہی الگ کرا دیا تھا۔ اب ان کی خواہش تھی کہ نظام دکن بھی انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دے تو وہ انگریزوں کی چالبازیوں کا پورا پورا بدلہ لیں۔

حیدر علی خاں کو انگریزوں سے زیادہ نواب ارکاٹ والاجاہ محمد علی سے کد اور نفرت تھی تمام فتنوں اور جھگڑوں کی جڑ وہی شخص تھا۔

اگر والاجاہ، نظام دکن کے قاصد گلفام کو روک کر انگریزوں کو خبر نہ کرتا تو نظام اور حیدر علی خاں کی صلح پہلے ہی ہو چکی ہوتی لیکن والاجاہ نے نہ صرف انگریزوں کو نظام اور حیدر علی کے متوقع معاہدہ کی اطلاع دی بلکہ ان پر یہ زور بھی دیا کہ وہ نظام کو بالاگھاٹ پر حملہ کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیں۔

اس طرح اب تک جو خونریزی ہوئی تھی اس کا ذمہ دار نواب ارکاٹ والاجاہ محمد علی تھا اور حیدر علی خاں اسے سزا دینے کے لیے بے چین تھے۔

ان کی بے چینی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ والاجاہ نے ان کی جائے پیدائش کولار کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔

نظام دکن کی طرف سے قاصد آنے پر نواب بہادر اس لیے بھی خوش تھے کہ نظام سے صلح کے بعد

وہ اپنے ذلیل دشمن کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکیں گے۔

انہوں نے نظام کے قاصد سے ابھی گفتگو نہیں کی تھی صرف اسے مہمان کے طور پر ٹھہرایا تھا لیکن قاصد کا یہ کہنا کہ وہ نظام دکن کی طرف سے صلح کی گفتگو کے لیے آیا ہے، حیدر علی خاں کے لیے باعثِ اطمینان تھا۔

چنانچہ قاصد سے گفتگو سے پہلے حیدر علی نے اپنے تمام بڑے بڑے سرداروں کو بلوایا۔ ان سرداروں میں شہزادہ ٹیپو کے علاوہ میر رضا علی خاں، سید صاحب، اسمٰعیل صاحب، ہیبت خان، اور محمد علی کمیدان شامل تھے۔

حیدر علی نے نواب محفوظ خاں کو بھی بلوایا تھا مگر وہ کسی وجہ سے اب تک نہ پہنچ سکا تھا۔ اس وقت اسی کا انتظار ہو رہا تھا۔

"میر رضا علی! ذرا دیکھو تو محفوظ خاں کہاں ہیں۔ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے؟" حیدر علی نے ذرا بے چینی سے میر کو مخاطب کیا۔

میر رضا علی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے:

"میں ابھی لے کے آتا ہوں انہیں"۔

یہ کہتے ہوئے وہ باہر چلے گئے۔

حیدر علی دوسرے سرداروں سے گفتگو کرتے رہے مگر یہ گفتگو نظام دکن کے بارے میں نہ تھی۔ حیدر علی اس اہم مسئلہ پر اس وقت تک گفتگو نہ کرنا چاہتے تھے جب تک محفوظ خاں نہ آ جاتے۔ اس کی موجودگی اس لیے ضروری تھی کہ محفوظ خاں، نواب ارکاٹ والاجاہ محمد علی کا بڑا بھائی تھا۔ ارکاٹ کی نوابی کا اصل حقدار وہ تھا لیکن والاجاہ محمد علی نے سازش کر کے اسے اس کے حق سے محروم کر دیا تھا۔

محفوظ خاں چند ماہ پہلے ہی والاجاہ کی قید سے بھاگ کر حیدر علی کے پاس پہنچا تھا۔ میر رضا علی اسے ڈھونڈنے باہر آئے تو لوگوں نے انہیں بتایا:

"محفوظ خاں لشکریوں کے خیموں میں کسی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں"۔

ایک دوسرے آدمی نے کہا:

"ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے"۔

تیسرے نے ٹکڑا لگایا:

"عورت بہت خوبصورت ہے"۔

میر رضا علی یہ باتیں سن کے بہت حیران ہوئے۔ نواب محفوظ کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ ان کی ایک بچی شادی کے قابل ہو چکی تھی۔ پھر اس عمر میں انہیں کیا سوجھی کہ کسی خوبصورت عورت کے ساتھ لشکریوں کے خیمے جھانکتے پھر رہے ہیں۔ بات ایسی نازک تھی کہ وہ اس سلسلے میں دوسرے آدمیوں سے کچھ پوچھ بھی نہ سکتے تھے۔

میر رضا علی نے یہ باتیں اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔ انہیں کسی کی ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کیا حق تھا؟ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ محفوظ خاں اگر غلط راستے پر چل پڑے ہیں تو وہ خود بھگتیں گے۔

پھر انہیں ایک دم حیدر علی خاں کا خیال آ گیا۔ ان کا خیال آتے ہی جیسے ان کے پیروں میں پہیے لگ گئے۔

میر رضا علی کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ محفوظ خاں لشکریوں کے خیموں میں کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے کسی سے مزید بات کیے بغیر خود بھی لشکریوں کے خیموں میں جھانکنا شروع کر دیا۔

ایک خیمہ —

دو خیمے —

دس پندرہ خیمے —

اس بھاگ دوڑ میں وہ کئی لشکریوں سے ٹکرا بھی گئے۔ لشکری انہیں پہچانتے تھے کہ وہ ایک بڑے سردار ہیں اس لیے وہ ان سے تو کچھ نہ کہتے مگر ان کی بدحواسی پر مسکراتے ضرور تھے۔

آخر میر رضا علی نے محفوظ خاں کو ایک خیمے میں جا پکڑا۔ لیکن جب ان کی نظر محفوظ خاں کے اردگرد پڑی تو انہوں نے گھبرا کر خیمے سے اپنی گردن باہر کی طرف کھینچ لی۔

انہوں نے دیکھا تھا کہ خیمے میں محفوظ خاں دری کے فرش پر بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ایک خوبصورت نوعمر عورت بھی براجمان ہے۔ دوسری طرف ایک لشکری ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

میر رضا علی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ واپس ہو جائیں اور نواب بہادر سے جا کر وہ کچھ بیان کر دیں جو ان کی نظروں نے دیکھا تھا کہ اسی وقت محفوظ خاں ہنستے ہوئے خیمے سے باہر آ گئے۔

"ارے بھائی رضا علی۔ تم خیمے میں جھانک کر واپس کیوں آ گئے۔ خیریت تو ہے؟"

میر صاحب نے جواب دیا:

"خیریت کہاں ہے خان صاحب۔ نواب بہادر بے چینی سے آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔ میں

آپ کو تلاش کرنے آیا ہوں"۔

محفوظ خاں نے دریافت کیا:

"مجھے تلاش کرنے آئے تھے تو مجھے بتایا کیوں نہیں۔ جھانک کے واپس جا رہے ہو"۔

میر رضا علی کہتے ہوئے ذرا جھجکے:

"وہ — وہ بات یہ تھی کہ آپ کسی خاتون سے مخاطب تھے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس عالم میں آپ کو —"

محفوظ خاں نے زور کا قہقہہ لگایا:

"ارے وہ عورت. . . . . خیر وہ تو بعد میں بتاؤں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ نواب بہادر نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے۔ خیریت تو ہے؟"

"وہ — نظام دکن کا قاصد پیغام لے کر آیا ہوا ہے —"

میر رضا علی نے تمہید باندھنا شروع کی تو محفوظ خاں نے ٹوک دیا:

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ قاصد آیا ہوا ہے لیکن میرا اس قاصد سے کیا تعلق۔ نواب بہادر نے مجھے کیوں بلوایا ہے؟"

محفوظ خاں کو اپنی فکر پڑ گئی۔ وہ نواب بہادر کے پاس نیا نیا آیا تھا۔ حیدر علی نے اگرچہ اسے یک مہمان کی طرح ٹھہرایا تھا لیکن غیر جگہ — غیر دربار — سرکار دربار میں لوگ خواہ مخواہ مخالف ہو جاتے ہیں۔

محفوظ خاں اس لیے پریشان ہو گیا تھا کہ کہیں کسی نے اس کی بدگوئی تو نہیں کی۔ میر رضا علی نے سے تسلی دی:

"فکر کی ضرورت نہیں خان صاحب۔ نواب بہادر نے دکن کے قاصد کے سلسلے میں سرداروں سے گفتگو کرنا ہے۔ اس لیے آپ کو بھی بلوایا تھا۔ آپ اپنی جگہ موجود نہ تھے اس لیے مجھے بھیجا گیا"۔

محفوظ خاں نے اطمینان کا سانس لیا:

"میر صاحب۔ میں پردیسی، اتنے دنوں بعد قید خانہ سے نجات ملی ہے۔ اب قدم قدم پر جی ڈرتا ہے۔ خیر چلیے!"

"مگر —؟" میر رضا علی کہتے کہتے رک گئے۔

"مگر کیا؟" محفوظ خاں پھر گھبرا گئے:

"کیا کوئی اور بھی حکم ہے؟"

"نہیں خانصاحب۔ اور کوئی حکم نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ جو خاتون ہیں ان کا کوئی ٹھکانہ کر دیں۔ پھر چلیں!"

محفوظ خاں بڑی شگفتگی سے بولے:

"ارے واہ — کس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے اس کے لیے کچھ انتظام کر دیا ہے۔ باقی واپس آ کے کروں گا۔"

پھر وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نواب بہادر کی طرف چلے۔ نواب بہادر واقعی ان کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

یہ دونوں داخل ہوئے تو نواب بہادر نے کہا:

"واہ میر رضا علی۔ ہم نے تمہیں محفوظ خاں کو بلانے بھیجا تھا اور تم خود بھی ان کے ساتھ ہی گم ہو گئے!"

"بہت بہت معذرت خواہ ہوں نواب بہادر"۔ میر رضا علی نے محفوظ خاں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب میں کہا:

"دراصل محفوظ خاں کچھ اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ ان کی وجہ سے آنے میں دیر ہو گئی"۔

نواب بہادر نے محفوظ خاں کی جانب دیکھا:

"کیوں محفوظ خاں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

نواب بہادر کا لہجہ بڑا شگفتہ تھا:

"ہم تمہارے لیے کچھ اور سوچ رہے ہیں اور تم ہو کہ خود کو ادھر ادھر الجھاتے پھر رہے ہو"۔

"توبہ توبہ اعلیٰ حضرت"! محفوظ خاں خجل سے ہو گئے:

"دراصل مجھ پر کسی کا ایک احسان تھا۔ بس اس سے سبکدوش ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی تفصیل سے آپ کو پھر کسی وقت آگاہ کروں گا۔ مختصر یہ ہے کہ —"

"تمہارا مختصر قصہ ہم بعد میں سنیں گے۔ پہلے اس اہم کام سے فارغ ہو لیں"۔ نواب بہادر نے انہیں مزید بات کرنے سے روک دیا۔

پھر —

نواب بہادر نے خود ہی اصل بات شروع کی:

"جنوبی ہند کے جو حالات ہیں اور ان بدیسی کمپنی والوں نے جو کھیل شروع کر رکھا ہے، اس سے سب واقف ہیں۔ ہم نے مرہٹہ سردار کو کچھ لے دے کے ٹال دیا ہے اور وہ متحدہ لشکر جو ہمیں تباہ کرنے اور بالاگھاٹ پر قبضہ کرنے کے لیے آیا تھا اس میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ نظام دکن کے تمام کس بل نکل گئے ہیں اور وہ فرار کا راستہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے قاصد کا آنا اس بات کی صاف دلیل ہے کہ وہ ہر شرط پر صلح کرنے کا خواہشمند ہے۔

ہم خود بھی نظام دکن کو ختم کرنا نہیں چاہتے، اس لیے کہ وہ ہماری اپنی طاقت ہے۔ ہمارے ملک کی طاقت ہے۔ اب طے یہ کرنا ہے کہ نظام کے ساتھ کن شرائط پہ معاہدہ کیا جائے"۔

محفوظ خاں نے کھڑے ہو کر کہا:

"کیا اعلیٰ حضرت نے قاصد سے گفتگو کی ہے۔ آخر وہ کیا شرائط لے کر آیا ہے؟"

"محفوظ خاں"! حیدر علی نے نرمی سے کہا:

"نظام دکن کیا کہتا ہے اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہم کن شرطوں پہ اسے مجبور کر سکتے ہیں۔

تمہاری اطلاع کے لیے میں یہ بتا دوں کہ ہم نے نظام کے قاصد کو ابھی عرضداشت پیش کرنے کی اجازت نہیں دی ہے"۔

اس وقت محمد علی کمیدان نے جرأت کی۔ وہ بولا:

"آقائے محترم۔ اس تمام فتنے کی جڑ، والیٔ ارکاٹ والاجاہ محمد علی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اسے معزول کرنا ہے"۔

"ہمیں تمہاری رائے پسند آئی محمد علی کمیدان"۔

نواب حیدر علی نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا:

"مگر والاجاہ براہِ راست نظام دکن کا ماتحت نہیں ہے۔ اس کی پشت پر تو انگریز کمپنی ہے ہاں ہم اس معاہدے میں اس طرح کی کوئی شرط ضرور رکھ سکتے ہیں"۔

نظام دکن اگرچہ کوئی بڑی طاقت نہ تھی لیکن جنوبی ہند میں اس کی اہمیت ضرور تھی۔ انگریز اس کے زور پر بہت پھولتے تھے اس لیے حیدر علی، نظام دکن سے صلح کے خواہش مند تھے۔ چونکہ مسئلہ بہت اہم تھا اس لیے گفتگو طول کھینچتی رہی مگر کسی متفقہ فیصلے کی صورت سامنے نہ آ سکی۔ پھر یہ طے پایا کہ شام کو اس سلسلے میں پھر گفتگو ہو اور کل صبح نظام دکن کے قاصد کو اذنِ باریابی

دیا جائے۔

شام کی محفل میں بھی "شرائطِ صلح" زیرِ بحث رہیں۔ خوب مباحثہ ہوا مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر یہ طے پایا کہ دوسرے دن نظام کے قاصد کو گفتگو کا موقع دیا جائے شاید اس کی روشنی میں کوئی معاہدہ طے پا جائے۔

دوسری صبح نواب حیدر علی خاں نے نظام دکن کے قاصد کو طلب کیا۔ اس وقت دربار یعنی نواب بہادر کے خیمے میں صرف محفوظ خاں اور میر رضا علی موجود تھے۔

نواب بہادر نے قاصد سے خود کلام کیا۔ ان کا لہجہ بڑا دوستانہ اور مشفقانہ تھا۔ نواب بہادر نے دریافت کیا:

"میں نظام دکن کے قاصد کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ والیٔ دکن بخیر و عافیت ہوں گے۔"

قاصد کو نواب بہادر کے لہجے سے بڑا حوصلہ ہوا۔ اس نے ادب سے عرض کیا:

"والیٔ دکن نظام علی خاں بہادر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم اور نواب بہادر کی دعاؤں سے بخیریت ہیں۔ انہوں نے آپ کے لیے نیک خواہشات اور دوستی کا پیغام بھیجا ہے۔"

"اس خلوص کے لیے والیٔ دکن کو ہمارا شکریہ پہنچایا جائے۔" نواب بہادر نے بھی رسمی سا جواب دیتے ہوئے کہا۔

دونوں طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ قاصد شاید آغاز کے لیے الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔ نواب بہادر نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ انہوں نے کہا:

"والیٔ دکن سے ہم بھی دوستی کے خواہشمند ہیں مگر اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ والیٔ دکن کے ذہن میں اس کا کیا تصور ہے؟"

قاصد کو واقعی موقع مل گیا۔ اس نے فوراً کہا:

"اعلیٰ حضرت والیٔ دکن نے اس ناچیز کو اسی لیے نواب بہادر کی خدمت میں بھیجا ہے اور اس امر کی خواہش کی ہے کہ سلطنت میسور کی طرف سے خود نواب بہادر یا ان کا کوئی اہم نمائندہ اعلیٰ حضرت نظام دکن سے گفتگو کے لیے تشریف لائے تاکہ دوستی اور خلوص کے معاہدے کی شرائط طے کی جا سکیں۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن، میسور کے نمائندے کو خوش آمدید کہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم نظام کی خواہش کا احترام کرتے ہیں۔" نواب حیدر علی خاں نے مزید وضاحت کے لیے کہا:

"لیکن ہمیں یہ بتایا جائے کہ کیا والیٔ دکن کے ذہن میں صلحنامہ کا کوئی ہلکا سا خاکہ موجود ہے اگر ہے تو کیا ہے؟"

قاصد نے ذرا ٹھہر کر جواب دیا:

"محترم نواب بہادر۔ میں اس کا صحیح طور پر جواب نہیں دے سکتا لیکن مجھے یہ حکم ضرور ہے کہ میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کروں کہ میسور سے گفتگو کے لیے جو بھی تشریف لائے وہ نہ صرف با اختیار ہو بلکہ کھلے دل سے گفتگو کرے تاکہ جو بات طے پائے طرفین اس کے پوری طرح پابند ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہارا مقصد سمجھ گئے۔"

نواب بہادر نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"تم اگر ٹھہرنا چاہو تو ہمارے مہمان کی حیثیت سے ٹھہر سکتے ہو اور اگر واپس جانا چاہتے ہو تو تمہیں اجازت ہے۔ ہم بہت جلد اپنا وفد والیٔ دکن کے پاس بھیجیں گے۔" نواب بہادر نے بھی پوری وضاحت سے جواب دیا تھا۔

"نواب بہادر کا میں بہت شکر گزار ہوں۔" قاصد نے کہا:

"میں واپس جانے کی اجازت چاہتا ہوں اور نواب بہادر سے امید ہے کہ وہ اس گفتگو کے اختتام سے پہلے کسی فوجی کارروائی کا حکم نہ دیں گے۔"

نواب بہادر نے اسے مطمئن کیا:

"تم بالکل اطمینان رکھو۔ گفتگو کے کامیاب یا ناکام ہونے تک ہماری طرف سے کوئی فوجی کارروائی نہ ہوگی۔"

قاصد نے رخصتی سلام کیا۔ نواب بہادر نے اشارے سے جواب دیا اور اشارے ہی سے اسے روک لیا۔

پھر انہوں نے بائیں ہاتھ کی انگلی سے ایک چاندی کی انگوٹھی اتاری جس میں الماس جڑا ہوا تھا۔

نواب بہادر نے فرمایا:

یہ انگوٹھی ہم تمہیں دیتے ہیں۔ اسے تم ایک یادگار کے طور پر قبول کر سکتے ہو۔ چونکہ ہم اسے تمہیں خلوصِ دل سے عنایت کر رہے ہیں اس لیے اسے کسی طرح بھی رشوت نہیں کہا جا سکتا۔"

قاصد نے جھک کر نواب بہادر کو درباری تعظیم پیش کی اور انگوٹھی ان کے ہاتھ سے لیکر پہلے پیشانی سے لگائی۔ پھر اپنی انگلی میں پہن لی۔

خان بہادر کی مجلس برخاست ہونے کے بعد محفوظ خاں سیدھے اس خیمے میں پہنچے جہاں سے میر رضا علی انہیں نواب بہادر کے پاس لے گئے تھے۔

خیمے میں نواب بہادر کا ایک لشکری تھا اور اس کے سامنے ایک خوبصورت عورت بیٹھی تھی۔

محفوظ خاں کو آتے دیکھ کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

محفوظ خاں نے عورت سے کہا:

"گلرخ۔ تمہارا احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اگر تم کوشش نہ کرتیں تو کرناٹک کی قید سے مجھے عمر بھر رہائی نہ ملتی۔"

"خان صاحب"۔ گلرخ نے بڑے سلیقے سے جواب دیا:

"آپ بار بار اس واقعے کا ذکر کر کے کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ اگر میں نے آپ کی کوئی خدمت کی تھی تو آپ نے مجھے اس کا صلہ بھی تو دے دیا۔ اگر آپ مدد نہ کرتے تو میں سردار علی کو کس طرح ڈھونڈتی۔

یہ سب آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج میں سردار علی تک پہنچی ہوں۔" یہ کہہ کر گلرخ نے بڑے پیار سے اس لشکری کی طرف دیکھا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔

قارئین گلرخ اور سردار علی کے ناموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پچھلے صفحات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ارکاٹ کے نواب والاجاہ محمد علی کے محل کی ایک کنیز گلرخ نے محل کے ایک غلام کے ہاتھوں اپنے سوتیلے بھائی سردار علی، جس کی وہ منگیتر تھی، کے پاس ایک اہم پیغام بھیجا تھا۔

گل رخ کے بھیجے ہوئے پیغام ہی سے نواب بہادر حیدر علی کو یہ معلوم ہوا تھا کہ نظام دکن کا قاصد نواب بہادر کے پاس آنے کے بجائے والاجاہ کے پاس پہنچ گیا ہے اور والاجاہ نے فوراً اپنے

حلیف انگریزوں کو نظام دکن اور حیدر علی کے متوقع گٹھ جوڑ سے باخبر کر دیا ہے۔

اس طرح نظام دکن اور حیدر علی میں دوستی ہونے کے بجائے انگریزوں نے بالاگھاٹ پر حملے کا لالچ دے کر نظام دکن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اس کے نتیجے میں انگریزوں کی یہ پہلی لڑائی شروع ہوئی تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ گلرخ نے جو کچھ کیا تھا اس میں اس کا مفاد پوشیدہ تھا۔ وہ اس طرح کہ اگر نواب بہادر حیدر علی، اس کے منگیتر سے خوش ہو گئے تو یہ ممکن تھا کہ جس وقت نواب بہادر ارکاٹ فتح کرتے یا گلرخ سرنگاپٹم پہنچتی تو نواب بہادر گلرخ اور سردار علی کی شادی کر دیتے، جیسا کہ اس وقت صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔

گلرخ نے صرف یہی ایک کام نہ کیا تھا بلکہ اس نے محفوظ خاں جو نواب والاجاہ محمد علی کے بڑے بھائی تھے اور جن کا حق مار کر والاجاہ نے ارکاٹ کی نوابی حاصل کی تھی، پر ایک بڑا احسان کیا تھا۔

محفوظ خاں کافی عرصہ سے والاجاہ کی قید میں تھے۔ گلرخ کی ایک گہری سہیلی ماہرو بھی محل میں کنیز تھی اس کی شادی ارکاٹ کے قید خانے کے ایک محافظ سے طے پا گئی تھی مگر ماہرو کی مالکن، جو والاجاہ محمد علی کی تیسری بیوی تھی، اسے چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھی۔

ماہرو اکثر اپنی بپتا گلرخ کو سناتی اور دونوں مل کر رویا کرتی تھیں۔ آخر گلرخ نے ایک تدبیر سوچی۔

ایک دن وہ ماہرو کی مالکن کے پاس گئی اور اس سے کہا:

"ملکہ محترم۔ آپ کی کنیز ماہرو کی شادی ہونے والی ہے۔ کیا آپ کو اس کا علم ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہو گیا ہے"۔ ملکہ نے جواب دیا:

"مگر اس کی شادی اس وقت تک کیسے ہو سکتی ہے جب تک میں اسے اس بات کی اجازت نہ دوں"۔

"آپ نے درست فرمایا ملکہ محترمہ!" گل رخ نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"لیکن اگر ماہرو چپکے سے شادی کر کے اپنے میاں کے ساتھ یہاں سے بھاگ جائے تو پھر آپ کیا کریں گی؟"

ملکہ گھبرا گئی۔ اس نے کہا:

"یہ تو ہو سکتا ہے۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے گلرخ۔ تم مجھے کوئی ترکیب بتاؤ کہ ماہرو میرے

پاس سے کہیں اور نہ جائے"۔

گلرخ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا:

"اے ملکہ محترمہ۔ آپ ماہرو پر جھاڑو کیوں نہیں پھیر دیتیں۔ اس کی جگہ کسی اور کنیز کو اپنی خدمت میں لے لیجیے۔"

"یہ تو میں کر سکتی ہوں۔ داروغائن میری بات بھی مانتی ہے مگر اس سے اچھی کنیز مجھے ملے گی کہاں!"

"تو کیا میں اس سے بُری ہوں"۔ گل رخ نے فوراً خود کو پیش کر دیا۔

ملکہ کی تو باچھیں کھل گئیں۔

"ارے تم۔ تم تو پورے محل میں نمبر ایک ہو۔ تم راضی ہو تو میں آج ہی داروغائن سے بات کروں؟"

گل رخ نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

ملکہ نے اسی وقت داروغائن کو بلوایا اور ماہرو کی جگہ گلرخ کو اپنی خدمت کے لیے لگانے کو کہا۔ داروغائن نے گلرخ سے دریافت کیا۔ اس نے ہاں کر دی۔ پس گلرخ ماہرو کی جگہ ملکہ کی خدمت میں آ گئی۔

گلرخ کی اس "ہاں" کا ایک سبب تو ماہرو کو شادی کی اجازت دلوانا تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ کنیزوں اور غلاموں کا ایک گروہ والاجاہ محمد علی کے بڑے بھائی محفوظ خاں کو آزاد کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

ملوکیت یعنی بادشاہی زمانے میں شاہی محلات طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز ہوا کرتے تھے اور کنیزیں اور غلام وہ کام کر جاتے تھے جو شاہی لشکر بھی نہ کر سکتا تھا۔

پس۔

اس سازشی گروہ نے جو "محفوظ خاں" کو ایک بھاری معاوضے کے صلے میں آزاد کرانے کی فکر میں تھا، گلرخ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گروہ کو علم تھا کہ گلرخ اور ماہرو میں گہری چھنتی ہے اور ماہرو کا منگیتر قید خانے کی اس کوٹھڑی کا پہرے دار ہے جس میں محفوظ خاں قید ہیں۔

محل کے لونڈی غلام ایک دوسرے کے مخالف تو ہوتے تھے مگر جب ان کا مفاد مشترک ہوتا

تو وہ متحد ہو جاتے تھے۔

گلرخ نے اس سلسلے میں ماہرو سے بات کی اور اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اگر وہ اپنے منگیتر کو آمادہ کر لے تو محفوظ خاں کے ساتھ ساتھ ماہرو اور اس کے منگیتر کو بھی ارکاٹ سے سرنگا پٹم بھیجا جا سکتا ہے۔

ماہرو محل کی روز روز کی دانتا کِل کِل سے پریشان تھی۔ گلرخ اس کی سہیلی تھی اور اس پر اس نے احسان بھی کیا تھا۔ اس نے اپنے منگیتر سے مشورہ کیا۔ وہ بھی اپنی موجودہ ملازمت سے بے حد پریشان تھا۔ پھر محفوظ خاں کے آزاد کرانے میں یہ مفاد بھی مضمر تھا کہ ممکن ہے محفوظ خاں ارکاٹ کا نواب ہو جائے تو اس کے پو بارہ ہو جائیں۔

آخر "محفوظ خاں" کو قید سے نکالنے، پھر انہیں ماہرو اور اس کے منگیتر سمیت سرنگا پٹم پہنچانے کا منصوبہ تیار ہوا۔ جس معاملہ میں محل کے چار غلام اور چار کنیزیں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہوں وہ بخیر و خوبی کیوں نہ انجام پائے۔ یہ غلام اور کنیزیں تو اس قدر طاقتور ہوتے تھے کہ شاہِ وقت کو بھی قتل کر دیا کرتے تھے۔

اس طرح ایک شب قیدی محفوظ خاں معہ اپنے محافظ اور اس کی منگیتر کے ارکاٹ سے اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

نواب والاجاہ محمد علی کو بھائی کے قید سے اس طرح فرار ہونے کی خبر ملی تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

والاجاہ نے تمام غلاموں کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ غلاموں نے صاف انکار کر دیا کہ یہ کام صرف محفوظ خاں کے محافظ کا ہے اور یہ کہ انہیں اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔

محافظ کو پوری ریاست میں تلاش کیا گیا مگر وہ کہاں ملتا۔ اس طرح ہاتھی معہ ہودہ غائب کی مثل صادق آئی۔

محفوظ خاں اور اس کا محافظ معہ ماہرو کے بڑی حفاظت سے سرنگا پٹم پہنچ گئے۔ محفوظ خاں نے جب خود کو نواب بہادر حیدر علی خاں کے سامنے پیش کیا تو نواب بہادر نے ان کی بڑی عزت افزائی کی اور وعدہ کیا کہ وہ ارکاٹ کی نوابی اُسے دلانے کی کوشش کریں گے۔

گلرخ نے ماہرو سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود بھی بہت جلد سرنگا پٹم پہنچنے کی کوشش کرے گی کیونکہ اس کا منگیتر سردار علی بھی تو سرنگا پٹم ہی میں ہے۔

محفوظ خاں کو نواب بہادر نے اپنے لشکر میں ایک بڑے سردار کا عہدہ دیا۔ محفوظ خاں کی ہی سفارش پر ماہرو کے منگیتر کو بھی فوج میں ملازم رکھ لیا گیا اور ان دونوں کی شادی کر دی گئی۔

گل رخ اپنے وعدے کے مطابق ایک رات چپکے سے ارکاٹ سے نکلی اور سرنگاپٹم پہنچ گئی۔ ماہرو نے گلرخ کے بارے میں اپنے منگیتر اور محفوظ خاں کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ چنانچہ جب گلرخ نے سرنگاپٹم آ کے محفوظ خاں کو پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ خانصاحب، نواب بہادر کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہیں اور سردار علی بھی ان کے ساتھ ہی ہے۔

گل رخ کو کسی طرح چین ملا تو وہ فوراً محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئی اور محفوظ خاں کو تلاش کرتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔

محفوظ خاں بھی اس کے احسان مند تھے۔ وہ اسے خود اپنے ساتھ لے کر سردار علی کے پاس اس کے خیمے میں پہنچے۔

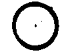
نواب بہادر کی مجلس برخاست ہونے کے بعد محفوظ خاں دوبارہ سردار علی کے خیمے میں پہنچے جہاں گلرخ اور سردار علی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔

محفوظ خاں نے انہیں خوشخبری سنائی۔

"تمہارا آنا مبارک ہوا گلرخ۔ نظامِ دکن سے صلح کی بات چیت کامیاب ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس سے قطع نظر میں ایک دو دن میں نواب بہادر سے تم دونوں کی شادی کی اجازت حاصل کر لوں گا۔ اس وقت تک تمہیں میرے اہلِ خانہ کے ہمراہ رہنا ہوگا۔"

گلرخ مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔





امیرالبحر راجہ علی کی معزولی کا سب کو افسوس ہوا۔

مشہور مقولہ ہے کہ "خود کردہ را علاجے نیست"۔

اسے اردو میں یوں کہہ سکتے ہیں "اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا"۔

راجہ علی کی معزولی خود اس کے اعمال کا نتیجہ تھی۔ نواب بہادر حیدر علی خاں نے راجہ علی کا بحیثیت امیرالبحر اس لیے انتخاب کیا تھا کہ راجہ علی ایک ماپلہ (مسلمان) پالیگار خاندان کا ایک پُرجوش جوان تھا۔ وہ کنانور کا راجہ تھا اور سمندر سے محبت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ہر ماپلہ جوان ایک اچھا ملّاح ہوتا تھا۔

اس خیال کے پیشِ نظر جب راجہ علی، کنانور کے نائروں کی شورش کو دبانے کے لیے نواب بہادر سے فوجی امداد مانگنے حیدر نگر گیا تو نواب بہادر نے اس کی دمکتی پیشانی اور مضبوط اعضا سے اندازہ لگایا کہ وہ ایک بہترین بحری فوجی افسر ہو سکتا ہے۔

نواب بہادر کے ذہن میں "حیدری بحریہ" کے قیام کا منصوبہ گزشتہ کئی سال سے پرورش پا رہا تھا مگر اس بحریہ کی سرداری کے لیے وہ ایک معقول آدمی کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلی ہی نظر میں راجہ علی کو اپنے مجوّزہ بحری بیڑے کا امیرالبحر منتخب کر لیا۔

راجہ علی کا انتخاب کچھ غلط بھی نہ تھا۔ اس لیے کہ اس پُرجوش جوان نے ایک ماہ کے مختصر عرصہ میں ایک بڑا بحری بیڑا تیار کر لیا۔ اس بیڑے میں جنگی کشتیوں کی تعداد بعض جگہ صرف ایک سو

لکھی گئی ہے جو زیادہ درست معلوم نہیں ہوتی۔ بہرحال ـــ راجہ علی نے ایک ماہ میں نہ صرف بحری تیار کیا بلکہ اس بیڑے کے لیے بحری فوج بھرتی کر کے انہیں تربیت بھی دلائی۔ پھر اس نیم تربیت یافتہ فوج کے ساتھ اس کے بحیرۂ عرب کے ان ہند جزیروں پر قبضہ کیا جو صدیوں سے ہندو راجاؤں کی ملکیت چلے آرہے تھے۔

یہاں تک تو نواب بہادر حیدر علی خان کا راجہ علی کے بارے میں اندازہ صحیح ثابت ہوا مگر وہ یہ اندازہ نہ کر سکے کہ یہ شجاع اور بہادر جوان قوتِ فیصلہ سے عاری ہے اور تاریخِ اسلام سے بالکل ناواقف اور کورا ہے۔

کسی بھی فوجی افسر کے لیے اس کی ذاتی شجاعت، دلیری اور فوجی سوجھ بوجھ کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں حلم، بردباری، تحمل، قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ ہونا بھی لازمی صفات ہیں۔

اس سلسلے میں تاریخِ اسلام کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس واقعہ کا تعلق جس شخص سے ہے اس کا نام ابراہیم یا ادھم یا ابراہیم ادھم تھا۔ میرے حافظے میں اس کا نام محفوظ نہیں۔ دراصل یہ واقعہ میں نے بچپن میں ایک انگریزی نظم کی صورت میں پڑھا تھا۔

نظم کچھ اس طرح تھی کہ:

ایک جوان مسلمان کے باپ کو کسی نے قتل کر دیا۔ اس جوان نے قسم کھائی کہ جب تک وہ اپنے باپ کے قاتل سے انتقام نہیں لے گا اس وقت تک نہ چارپائی سے پیٹھ لگائے گا اور نہ پیٹ بھر کھانا کھائے گا۔

ابراہیم کو بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کسی شخص سے اپنے باپ کے قاتل کا نام معلوم ہو گیا۔ نام بتانے والے نے قاتل کے شہر اور محلّہ کا نام بھی بتایا مگر جب ابراہیم اس محلّہ میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اس نام کا ایک شخص یہاں رہتا ضرور تھا مگر چھ سات ماہ پہلے وہ یہ محلہ چھوڑ کر کسی نامعلوم جگہ منتقل ہو گیا ہے۔

دوسری طرف ابراہیم کے باپ کے قاتل کو بھی کسی طرح معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ سے قتل ہونے والے شخص کا بیٹا اسے تلاش کر رہا ہے اور اس نے قاتل سے انتقام لینے کی قسم کھائی ہے۔ اس خوف سے وہ ہر ماہ اپنی رہائش بدل دیتا تھا۔

پہلے تو اس نے اپنے شہر میں اپنے دوستوں کے گھروں میں باری باری پناہ لی لیکن کوئی کسی کو کب تک پناہ دے سکتا ہے! جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ جس کو وہ پناہ

دے رہا ہے وہ ایک شخص کا قاتل ہے اور مقتول کا بیٹا اسے جگہ جگہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔

اس طرح قاتل کو کچھ عرصہ بعد اس کے دوستوں نے بھی جواب دے دیا اور اسے صاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ ایک قاتل کو پناہ دے کر اپنے لیے مصیبت مول نہیں لے سکتے۔

اس طرح قاتل کو اپنا شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا۔ وہ اپنے شہر سے دوسرے شہر گیا مگر کچھ عرصہ بعد اسے شبہ ہوا کہ کوئی شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے اور اگر وہ اس شہر میں رہا تو ضرور پکڑا جائے گا۔ اس خوف سے اس نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور تیسرے شہر پہنچا۔

دراصل اس پر موت کا خوف طاری ہو گیا تھا جو اس کے دل میں خواہ مخواہ کے وسوسے پیدا کرتا تھا اور اسے چین سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔

جس طرح ابراہیم نے اپنے باپ کی صورت نہ دیکھی تھی اور اسے صرف اس کا نام معلوم تھا اسی طرح قاتل کو بھی نہ تو مقتول کے بیٹے کا نام معلوم تھا اور نہ اس نے اسے دیکھا تھا۔ مگر دونوں اپنی تگ و دو میں لگے تھے۔ ابراہیم، قاتل کو اس کے نام کی مدد سے شہر شہر ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور قاتل اپنے نامعلوم تلاش کرنے والے کے خوف سے شہروں شہروں بھاگتا اور چھپتا پھر رہا تھا۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔

نہ ابراہیم کو قاتل مل سکا اور نہ قاتل کو کسی جگہ قرار آیا۔ اس طویل عرصے میں ممکن ہے کہ کبھی دونوں کا آمنا سامنا بھی ہوا ہو مگر دونوں ہی ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔

وقت آہستہ آہستہ کھسکتا رہا اور ایک سال اور گزر گیا اور ابراہیم کی کوشش کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکی۔

ابراہیم نے اپنا یہ دستور بنا لیا تھا کہ وہ صبح کو ایک نئے عزم اور جوش کے ساتھ اپنے باپ کے قاتل کی تلاش میں نکلتا اور شام کو تھکا ہارا

گھر واپس آ کر دو نوالے کھاتا اور ایک الگ کمرے میں منہ لپیٹ کر پڑا رہتا۔

ایک شام وہ کچھ زیادہ تھکا ہوا تھا۔ دو لقمے لے کے اس نے فرش سے کمر لگائی تو اسے فوراً نیند آ گئی۔ نہ معلوم وہ کتنی دیر سویا تھا کہ کسی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

ابراہیم اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔

"کون ہے؟" اس نے اندر سے پوچھا۔

"دروازہ کھولیے۔ میری جان خطرے میں ہے۔ دشمن میرا پیچھا کر رہا ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ میں آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔" باہر سے کوئی گھبرائے ہوئے لہجے میں گڑگڑا کر دروازہ کھولنے کی درخواست کر رہا تھا۔

ابراہیم کے جذبۂ رحم نے جوش مارا۔ وہ یہ برداشت نہ کر سکا کہ کوئی بے سہارا انسان اپنے دشمن کے ہاتھوں مارا جائے۔ اس کے دل نے کہا کہ اے ابراہیم! مجبور پر رحم کر کہ اللہ رحم کرنے والے پر خود بھی رحم فرماتا ہے۔

ابراہیم نے فوراً دروازہ کھول کر اسے اندر کھینچ لیا۔ پھر دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔

"میں آپ کا یہ احسان تمام عمر نہ بھولوں گا۔" ادھیڑ عمر کے خوفزدہ آدمی نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا:

"آپ مجھے پناہ نہ دیتے تو وہ ضرور مجھے مار ڈالتا۔"

ابراہیم نے اسے تسلی دی:

"فکر نہ کرو محترم۔ اب تمہیں کوئی نہیں مار سکتا۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ تم میری پناہ میں ہو۔"

نووارد نے متشکرانہ نگاہوں سے ابراہیم کو دیکھا:

"قابلِ احترام جوان۔ کیا تم مجھے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر میں پناہ دے سکو گے۔ مجھے باہر ہر طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی دیتا ہے۔"

ابراہیم نے اعلیٰ حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کیا:

"فکر نہ کرو محترم۔ کچھ دن کیا، تم جب تک چاہو میرے گھر میں رہ سکتے ہو۔ تم اب میری پناہ میں ہو۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

اظہارِ شکر گزاری کے طور پر نووارد کی آنکھوں نے دو آنسو ٹپکا دیے اور اس نے سسکیاں لینا شروع کر دیں۔

"محترم۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ تمہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں۔"

ابراہیم نے اسے تسلی دی:

"جب تک چاہو تم یہاں رہ سکتے ہو۔"

نووارد مطمئن ہو گیا۔ ابراہیم نے اس کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ اس نے گھر والوں کو سمجھا دیا کہ اس کے ایک دوست کچھ دن کے لیے اس کے مہمان ہیں۔ وہ باہر کے لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے اس لیے ان کے بارے میں کسی سے کوئی تذکرہ نہ کیا جائے۔

نووارد کو ابراہیم کے گھر میں رہتے ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔ اب اس کی وحشت بھی دور ہو گئی اور اس کی دہشت بھی جاتی رہی تھی۔ ابراہیم سے اس کی ملاقات صرف شام کے وقت ہوتی جب وہ اپنے کام سے واپس آتا۔ اس وقت بھی وہ صرف چند لمحوں کے لیے نووارد کے پاس ٹھہرتا۔ اس کی خیریت دریافت کرتا۔ پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

نووارد نے محسوس کیا کہ صبح کو جب ابراہیم اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا ہے تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر نظر آتا جیسے وہ پرعزم ہو، پرامید ہو مگر جب وہ شام کو اور اکثر رات گئے گھر واپس آتا تو وہ ایک ہارا ہوا جواری نظر آتا۔ اس کا چہرہ پھیکا پھیکا ہوتا اور یوں دکھائی دیتا جیسے اسے کوئی شدید صدمہ پہنچا ہو۔

یہاں تک کہ نووارد کو ابراہیم کو اس طرح جاتے آتے دیکھ کر کوفت سی ہونے لگی، ساتھ ہی وہ احساس سے شرمندہ شرمندہ سا رہنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ وہ بھی کس قدر بدقسمت ہے کہ اپنے محسن کا دکھ درد بھی نہیں بٹا سکتا۔ پتہ نہیں اس کا محسن کیا کام کرتا ہے۔ وہ صبح کو کہاں جاتا ہے۔ جاتے وقت وہ پرعزم دکھائی دیتا ہے مگر واپسی پر نڈھال ہوتا ہے۔ کاش وہ اس کی کوئی مدد کر سکتا۔

آخر نووارد سے اپنے محسن کا غمزدہ چہرہ دیکھا نہ گیا اور ایک دن وہ ابراہیم کی واپسی پر اس کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا:

"میرے دوست۔ میرے محسن!" نووارد نے جی کڑا کر کے کہا:

"مجھ سے اب تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ کیا غم ہے تمہیں۔ آخر کس بات نے تمہیں نڈھال کر رکھا ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں میرے دوست"۔ ابراہیم نے افسردہ آواز میں جواب دیا:

"تم میرے مہمان ہو اور میں اپنے غم کو مہمانوں میں نہیں بانٹا کرتا۔"

"میرے محسن۔ میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں"۔ نووارد نے کہا:

"میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا مگر میں نے سنا ہے کہ اپنا غم اگر دیواروں سے بھی بیان کیا جائے تو اس کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ تم مجھ سے کم از کم اپنا غم تو بیان کرو۔ ممکن ہے اس طرح تمہارا دل کچھ ہلکا ہو جائے"۔

ابراہیم نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا:

"اس وقت میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ کل واپسی پر تم سے بات کروں گا۔"

ابراہیم اپنے کمرے میں چلا گیا اور نووارد اس کے غم پر آنسو بہاتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ ابراہیم کے گھر پناہ ملنے سے اسے اپنے دشمن کا کوئی دھڑکا نہ رہ گیا تھا مگر ادھر کچھ دنوں سے وہ ابراہیم کے غم سے غمزدہ ضرور رہنے لگا تھا۔ وہ رات اور دوسرا دن اس نے بڑی بے چینی سے کاٹا۔ پھر شام ہوتے ہی وہ ابراہیم کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

اس دن اتفاق سے ابراہیم بھی جلد ہی آ گیا اور نووارد کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ابراہیم نے نووارد کو کل کی طرح راستہ میں کھڑے دیکھا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا:

"میرے دوست! فکر نہ کرو۔ آج میں تمہیں اپنے غم میں ضرور شریک کروں گا۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد خود تمہارے پاس آؤں گا۔"

نووارد نے اس سے کوئی سوال نہ کیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اپنے وعدہ کے مطابق ابراہیم آ گیا۔ پھر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"اب پوچھو۔ تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" ابراہیم نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"میرے محسن!" اجنبی نے لجاجت سے کہا:

"میں کتنے دنوں سے تمہیں صبح ہی صبح کہیں جاتے اور تمام دن بعد واپس آتے دیکھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تم کیا کاروبار کرتے ہو یا کہاں ملازم ہو۔ یہ پوچھنے کا مجھے کوئی حق بھی نہیں لیکن مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ جس وقت تم گھر سے روانہ ہوتے ہو اس وقت تمہارا چہرہ پُرعزم اور پُرامید دکھائی دیتا ہے لیکن جب تم رات کو واپس آتے ہو تو انتہائی دل شکستہ اور پریشان ہوتے ہو۔

تمہارے بارے میں میرے یہ خدشات ہیں۔ اگر تم چاہو تو میرے دل میں اٹھتے ہوئے ان وسوسوں کو دور کر سکتے ہو۔ ہاں اگر تمہیں اس کے اظہار سے تکلیف کا امکان ہو تو میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں۔"

"میرے اجنبی دوست"۔ ابراہیم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا کہ میں صبح کو جاتے وقت پُرعزم ہوتا ہوں اور واپسی پر دل شکستہ دکھائی دیتا ہوں۔

ہر روز جب میں گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے اپنی کامیابی کی پوری پوری امید ہوتی ہے اسی لیے میں پُرعزم ہوتا ہوں مگر جب تمام دن کی کوشش کے باوجود میں اپنے مقصد تک نہیں پہنچ پاتا تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے اور میں اسی حالت میں گھر آ کر پڑ رہتا ہوں۔ دوسری صبح میں پھر اسی عزم و حوصلہ کے ساتھ گھر سے نکلتا ہوں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔

گزشتہ دو سال سے میری یہی کیفیت ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا، نہ تو میں چارپائی پر سوؤں گا اور نہ پیٹ بھر روٹی کھاؤں گا۔"

اجنبی نہایت توجہ سے ابراہیم کی بات سن رہا تھا۔ جب وہ سانس لینے کے لیے رکا تو اجنبی نے بے چینی سے پوچھا:

"میرے محسن۔ یہ تمام باتیں تو میں اپنی آنکھوں سے ہر روز دیکھتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے اس غم یا مقصد سے آگاہ نہ کرو گے جس نے تمہاری نیند حرام کر دی ہے اور بھوک اڑا دی ہے"۔

"سنو میرے اجنبی ہمدرد"۔ ابراہیم نے سنبھل کر کہنا شروع کیا:

"میرا غم یہ ہے کہ میرا باپ ایک شخص کے ہاتھوں مارا گیا ہے اور میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں باپ کے خون کا بدلہ نہ لے لوں گا اس وقت تک آرام نہ کروں گا۔ پیٹ بھر غذا نہ کھاؤں گا۔

میں روز صبح اس قاتل کی تلاش میں اس امید پر نکلتا ہوں کہ شاید آج میں اسے پا سکوں مگر دن بھر کی ناکام تلاش کے بعد گھر واپس آتا ہوں اور منہ لپیٹ کر پڑ رہتا ہوں۔"

ابراہیم یہ کہہ کر خاموش ہوا اور اس نے اجنبی مہمان کی طرف دیکھا۔ اس کا مہمان کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

ابراہیم نے کہا:

"میرے ہمدرد۔ تم میرے غم کو اپنے دل سے کیوں لگا رہے ہو۔ یہ غم تو میری زندگی کے ساتھ چلتا رہے گا۔ اور شاید قبر میں بھی میرے ساتھ جائے گا۔"

اجنبی چونکا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا:

"میرے محسن۔ تمہیں اس قدر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ کامیابی کسی وقت بھی تمہارے قدم چوم سکتی ہے۔ ہاں ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا تم اپنے باپ کے قاتل کا نام جانتے ہو؟"

"ہاں اجنبی۔ میں نے اس کا نام معلوم کر لیا ہے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" ابراہیم نے اس سے سوال کیا۔

"بس یونہی پوچھ لیا کہ شاید میں اسے جانتا ہوں۔" اجنبی نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میرے باپ کے قاتل کا نام مجھے اسحٰق بتایا گیا ہے۔" ابراہیم نے بڑے دکھ سے کہا۔

"اسحٰق!" اجنبی نے دہرایا:

"تم نے اسحٰق کو کہیں دیکھا ہے؟"

"نہیں اجنبی۔ نہ میں نے اسے دیکھا ہے اور نہ اسے پہچان سکتا ہوں۔" ابراہیم کے لہجے سے غم جھلک رہا تھا۔

"میرے محسن! کیا تم اپنی تلوار یہاں لا سکتے ہو؟" اجنبی نے ایکدم سوال کر دیا۔

ابراہیم نے حیران نظروں سے مہمان کو دیکھا:

"میں سمجھ نہیں سکا تم کیا کہہ رہے ہو۔ تلوار کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟"

"تلوار کی ضرورت مجھے نہیں ہے میرے محسن۔" اجنبی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا:

"تمہیں تلوار کی ضرورت پڑے گی۔ تلوار لے آؤ میرے محسن!"

ابراہیم کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مہمان کی خاطر اپنے کمرے میں گیا اور وہ تلوار لے آیا جسے لیکر وہ ہر صبح اپنے باپ کے قاتل کی تلاش میں نکلتا تھا۔

ابراہیم نے تلوار مہمان کے سامنے رکھ دی:

"تلوار حاضر ہے مہمان۔ اب بتاؤ تم اس سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟"

"یہ تلوار تم اٹھاؤ میرے محسن!" اجنبی نے ابراہیم سے درخواست کی اور خود فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

ابراہیم نے مہمان کی درخواست پر تلوار اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔

اجنبی مہمان نے حسرت ناک نظروں سے اپنے محسن کو دیکھا اور جیسے خوابوں میں کہنا شروع کیا:

"قدرت کے بھی کیا کھیل ہیں۔ اس کے رازوں سے کوئی واقف نہیں۔ کہتے ہیں کہ بھاگا بھاگتا جائے اور بھاگ ساتھ جائے۔ میں جس کے خوف سے ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں بھاگتا پھرتا تھا، قسمت مجھے اسی کے دروازے پر لے آئی۔

ابراہیم۔ تم میرے محسن ہو۔ تم نے مجھے پناہ دی ہے۔ میں تمہارا احسان صرف اپنی جان دے کر اتار سکتا ہوں۔

اے غمزدہ ابراہیم۔ تلوار کھینچو اور مجھے قتل کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لو اس لیے کہ جس اسحاق کی تلاش میں تم اتنے عرصے سے سرگرداں ہو وہ اسحاق یعنی تمہارے پیارے باپ کا قاتل میں ہی ہوں۔ میرا ہی نام اسحاق ہے جس کی تمہیں تلاش تھی اور جو تمہارے خوف سے چھپتا ہوا تمہارے ہی گھر میں آ کر پناہ گزین ہو گیا۔"

ابراہیم نے یہ سن کر کہ اس کا مہمان ہی اس کے باپ کا قاتل ہے، ایک اضطراری کیفیت کے تحت تلوار تو کھینچ لی مگر تلوار صرف کھنچ کے رہ گئی تھی اور ابراہیم گم سم کھڑا تھا۔

اجنبی مہمان، اسحاق جو اس کے باپ کا قاتل تھا، اس نے ابراہیم کے سامنے اپنا سر جھکا دیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

جب اسحاق پر دیر تک تلوار کا وار نہ ہوا تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے ابراہیم شمشیر بکف کھڑا تھا مگر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں سامنے کی طرف جمی ہوئی تھیں اور وہ پتھر کے بت کی مانند بے حس و حرکت تھا۔

"میرے محسن!" اسحاق نے ذرا اونچی آواز میں کہا:

"جلدی کرو۔ میرا سر تن سے جدا کر دو، قبل اس کے کہ مجھ میں زندہ رہنے کی آرزو پیدا ہو جائے اور میں جان بچانے کے لیے یہاں سے بھاگنے کی سوچنے لگوں۔"

اس وقت ابراہیم نے ایک جھٹکے کے ساتھ کھنچی ہوئی تلوار دیوار پہ دے ماری اور وحشت ناک

آواز میں کہا:

"اے اسحاق۔ اے میرے باپ کے قاتل۔ تم رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ کہیں دور بھاگ جاؤ!"

پھر ابراہیم نے اپنی جیب سے ایک تھیلی نکالی جس میں کچھ رقم تھی اور تھیلی کو اسحاق کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا:

"جلدی کرو اسحق۔ میں اپنے باپ کے قاتل کو تو قتل کر سکتا ہوں لیکن اپنی پناہ میں آئے ہوئے انسان کو یا اپنے مہمان کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔

میں تمہارا خون بہا کر اسلامی روایات کا خون نہیں کر سکتا۔ پناہ اور مہمان کی روایات کا خاتمہ نہیں کر سکتا۔ خدا کے لیے تم جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان مجھ پر غالب آ جائے اور میں تمہارا خون کر کے عربوں کی روایت اور اسلامی مہمان نوازی کا گلا دبا دوں۔ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔"

اسحاق اس کے اصرار پہ کھڑا ہو گیا۔ وہ مضمحل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے دروازہ کھول کر ایک نظر ابراہیم کے پھیکے چہرے پر ڈالی اور دوسرے لمحے اس نے دروازے کو اپنے پیچھے بند کر کے خود کو تاریکی کے سمندر میں ڈبو دیا۔

یہ قصہ تھا ایک عرب جوان کا۔ جس نے باپ کا انتقام لینے کے لیے کھانا اور سونا حرام کر لیا تھا مگر جب قسمت سے اسے باپ کا قاتل اپنے ہی گھر میں مل گیا تو وہ اس پر ہاتھ اٹھانے اور قتل کرنے سے باز رہا کیونکہ کسی کو پناہ دینے کے بعد اسے قتل کرنا عرب اور اسلامی روایات کے خلاف تھا اور اس قدر خلاف تھا کہ ابراہیم نے نہ صرف اپنے باپ کے قاتل سے انتقام کو درگزر کیا بلکہ اپنے پاس سے کچھ رقم دے کر اسے گھر سے فوراً بھگا دیا۔ مبادا اس کے انتقامی جذبات بھڑک اٹھیں اور وہ اس شخص کو قتل کر ڈالے جسے وہ پناہ دے چکا تھا۔

عربوں کی یہ روایت ان کے دورِ جاہلیت سے ہی جاری تھی۔ عرب زمانۂ قدیم میں باوجود ہر طرح کے عیوب اور غلط کاریوں میں گرفتار ہونے کے ایک تو اپنے مہمان کا حد درجہ احترام کرتے تھے بلکہ پناہ دیے جانے والے شخص کو کسی حالت میں بھی نہ خود قتل کرتے تھے اور نہ کسی اور کو اس کی اجازت دیتے تھے۔

اسلام لانے کے بعد ان کی یہ خوبیاں اسی طرح قائم رہیں بلکہ ان میں کچھ اور شدت پیدا ہو گئی

کیونکہ اسلام سلامتی کا مذہب ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا سب سے بڑا علمبردار بھی ہے۔ اسلام ہمیں درس دیتا ہے کہ کسی سے کیے ہوئے عہد کو جان دے کر بھی برقرار رکھو۔ کسی کو پناہ دینا ایک قسم کا وعدہ ہوتا ہے۔

اس قصہ کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جزائر پر حملہ ہونے کے بعد وہاں کے ہندو راجہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور وہ امیر البحر راجہ علی کی پناہ میں آ گیا تھا مگر راجہ علی نے اپنے مالابار فوجیوں اور ملاحوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں اور اسے اندھا کر دیا تھا۔

اس کے اس اقدام کو نہ تو نواب حیدر علی نے پسند کیا اور نہ شرعی حیثیت سے قاضی القضاۃ نے راجہ علی کو کوئی رعایت دی۔ انہوں نے بھی اسے مجرم گردانا اور اس کے معزول کیے جانے پر شرعی مہر لگا دی۔

اس دن دربار ختم ہونے کے بعد راجہ علی نے نواب بہادر کے پاس حاجب کے ذریعے سے درخواست کی کہ اسے رخصتی سلام کرنے کی اجازت دی جائے مگر نواب بہادر نے اُس کی اس درخواست کو شرفِ قبولیت نہ بخشا اور حاجب کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ:

"راجہ علی کو معقول لباس مہیا کیا جائے اور اسے کمالِ حفاظت سے اس کی ریاست کنانور پہنچا دیا جائے"۔

راجہ علی جس عالم میں دارالسلطنت حیدر نگر روانہ ہوا تھا اس سے لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ امیر البحر راجہ علی کسی وجہ سے نواب بہادر کے زیرِ عتاب آ گیا ہے اور پتہ نہیں اب اس کا کیا حشر ہو!

یہ خبر فوراً ہی رانی کنانور سلمہ کو پہنچا دی گئی۔ اس منحوس خبر کو سنتے ہی سلمہ فوراً اپنے خسر سے ملنے روانہ ہو گئی۔

ادھر جب راجہ علی کے باپ کو یہ خبر ملی تو وہ بھی بدحواس ہو گئے مگر انہوں نے فوراً خود کو سنبھالا اور کنانور روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی غمزدہ بہو رانی سلمہ کی اشک شوئی کریں۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ دونوں کی ملاقات راستے میں ہو گئی۔ رانی سلمہ کی بند گاڑی سواروں کے پہرے میں آ رہی تھی اور راجہ علی کے والد دو سواروں کے ساتھ کنانور جا رہے تھے۔ اگر دونوں کی ملاقات نہ ہوتی تو اور زیادہ پریشانی ہوتی۔

اس اتفاقیہ ملاقات کے وقت دونوں ہی افسردہ اور غمگین تھے۔ راجہ علی کے والد نے رانی سلمہ

کو مشورہ دیا کہ اس وقت کنانور میں اس کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ صرف وہی کنانور واپس نہ جائے بلکہ راجہ علی کے والد نے خود بھی راجہ علی کی واپسی تک کنانور میں قیام کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ رانی سلمہ، اپنے خسر کو ساتھ لے کر کنانور واپس آ گئی۔

راجہ علی کی امیرالبحر کے عہدے سے معزولی کی خبر اس کے کنانور پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی راجہ کنانور میں داخل ہوا تو بڑا پژمردہ اور دل برداشتہ تھا۔

رانی کو راجہ علی کے آنے کے دن اور تاریخ کا علم ہو گیا تھا اس لیے وہ راجہ کے استقبال کو اپنے خسر اور ریاست کے نئے سپہ سالار کے ساتھ سرحد پر پہنچی۔ ریاست کے پہلے سپہ سالار کو راجہ علی نے امیرالبحر ہونے پر اپنا نائب بنا کر کنانور سے بلوا لیا تھا اور اس کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی کو سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا۔

رانی سلمہ نے اشکبار آنکھوں سے اپنے محبوب شوہر کا استقبال کیا۔ رانی ہی کیا، راجہ کے والد اور دوسرے تمام استقبال کرنے والوں کے چہرے بھی دھواں دھواں تھے۔ رانی سلمہ کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کے اپنے محبوب کے گلے سے لگ جائے مگر دوسروں کی موجودگی میں اسے اپنے جذبات پر قابو رکھنا پڑا۔

یہ ایک معزول امیرالبحر کا دکھا پھیکا استقبال تھا جس میں ہر شخص مغموم نظر آ رہا تھا۔

راجہ علی کی ریاست کنانور اپنی جگہ قائم تھی۔ نواب بہادر نے اسے ریاست کی گدی سے محروم نہیں کیا تھا لیکن کنانور کے نائر (ہندو برہمن) جو راجہ علی کے امیرالبحر بنائے جانے سے دب کے بیٹھ گئے تھے وہ راجہ کی معزولی کی خبر پاتے ہی ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور جگہ جگہ شورشیں برپا ہونے لگیں۔

نائر اس لیے نڈر ہو گئے تھے کہ راجہ علی کو اب نواب بہادر سے کوئی فوجی مدد نہیں مل سکتی تھی کیونکہ اسے معزول کر دیا گیا تھا۔

ساحل مالابار کے سیاسی حالات دو ڈھائی ماہ کے اندر اندر دو مرتبہ تبدیل ہوئے تھے۔ کنانور میں راجہ علی کے خلاف نائروں نے صرف تین ماہ پیشتر شورش برپا کی تھی لیکن یہ شورش کچھ زیادہ تیزی نہ پکڑ سکی تھی اس لیے کہ راجہ علی کو نواب بہادر نے راجہ کنانور تسلیم کر کے ساتھ اپنے

مجوزہ بحری بیڑے کا امیرالبحر بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس طرح ریاست کنانور بالواسطہ نواب بہادر کے زیر تسلط آ گئی تھی۔ اس سے باغی نائر کان دبا کر کونوں میں چھپ گئے تھے۔

اس دوران راجہ علی نے حیدری بحری بیڑا تیار کیا اور اس کی مدد سے بحیرۂ عرب کے ساحل مالابار کے قریب کے تمام ہندو جزائر پر قبضہ کر لیا۔

نائر، راجہ علی کی اس فتح سے اور زیادہ خائف ہو گئے لیکن تیسرے ہی مہینے راجہ علی کو امیرالبحر کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اب نائروں نے اس خیال سے کہ راجہ علی تنہا رہ گیا ہے اور نواب بہادر حیدر علی خاں اس کی سرپرستی سے دست کش ہو گئے ہیں، انہوں نے پھر شورش برپا کر دی۔ راجہ علی کی پوزیشن واقعی بہت کمزور تھی۔

راجہ علی کے ہندو سپہ سالار نے مشورہ دیا:

"راجہ بہادر۔ نائروں کی شورش نے بغاوت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس وقت اگر ہمیں باہر سے کمک نہیں ملتی تو ریاست کنانور میں کچھ بھی ہو سکتا ہے"۔

"کچھ بھی" سے اس کی مراد یہ تھی کہ کنانور ایک مرتبہ پھر ہندو ریاست بن جائے گی اور راجہ علی اور رانی سلمہ کو اس ریاست کو خیرباد کہنا ہو گا۔

سپہ سالار کا مشورہ درست تھا مگر راجہ علی، اس سے ان دنوں اس لیے خفا تھا کہ اسی کے مشورہ پر راجہ علی نے ہندو راجہ کی آنکھیں نکلوا دی تھیں۔ ہندو سپہ سالار کا یہ مشورہ راجہ علی اور ریاست کے مفاد میں تھا۔ راجہ علی کے خلاف ماپلاؤں (مسلمانوں) نے بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہندو راجہ کو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ سرعام اسے قتل کر کے ان ہزاروں مسلمانوں کے خون کا بدلہ لے سکیں جنہیں راجہ کی فوج آئے دن تہ تیغ کرتی رہتی تھی۔

راجہ علی اگرچہ اسلامی روایات سے پوری طرح واقف نہ تھا مگر اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ ہتھیار ڈالنے والے مفتوح راجہ کو قتل کرنا اسلامی اور فوجی نقطۂ نظر دونوں طرح سے ناجائز تھا اس لیے اس نے ماپلاؤں کو صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ راجہ کو ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔

اس سے حالات بہت زیادہ بگڑ گئے۔

تب راجہ علی کے والد اور ہندو سپہ سالار دونوں نے راجہ علی کو مشورہ دیا کہ ماپلاؤں کی شورش کو ختم کرنے کے لیے اگر ہندو راجہ کو باغیوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم اسے اندھا کر دیا جائے تاکہ ماپلاؤں کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے ہو جائیں۔

اس طرح راجہ علی نے باپ اور اپنے سالار کے مشورے سے راجہ کی آنکھیں نکلوا کر اسے اندھا کر دیا۔

اس سے مالپاؤں کی شورش اور بغاوت تو ختم ہو گئی مگر جب یہ خبر نواب بہادر حیدر علی خاں کو ہوئی تو انہوں نے راجہ علی کو بلوا کر واقعہ کی تحقیقات کی اور اسے امیر البحر کے عہدے سے معزول کر دیا۔

اس وجہ سے راجہ علی نے سپہ سالار کے مشورے کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔

کنانور کے حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ نائروں نے بے خوف ہو کر بعض جگہوں پر مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرب و جوار کی تمام مسلمان آبادیاں نقل مکانی کر کے شہر کے اندر آنا شروع ہو گئیں اور ایک عجیب طرح کی افراتفری پیدا ہو گئی۔

سپہ سالار نے راجہ علی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر خاموشی اختیار کر لی۔

راجہ علی کے والد اگرچہ کنانور میں موجود تھے لیکن وہ بھی راجہ علی کو کوئی مشورہ دیتے ڈرتے تھے کہ ان کے پہلے مشورہ سے راجہ علی کو نقصان پہنچا تھا۔

اب صرف رانی سلمہ ایک ایسی ہستی رہ گئی تھی جو راجہ علی سے کھل کر گفتگو کر سکتی تھی لیکن وہ ایک بالکل غیر سیاسی شخصیت تھی اور ملکی معاملات سے ہمیشہ پہلو بچاتی تھی۔ یہ بات راجہ علی کے والد اور سپہ سالار کنانور کو معلوم تھی مگر اب حالات ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ ان کے سنبھالنے کے لیے سب کو مل جل کر کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔

ایک دن سپہ سالار نے راجہ علی کے والد سے ملاقات کی۔

"بزرگ محترم۔ آپ ریاست کے حالات دیکھ رہے ہیں؟" اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

"جی ہاں سیناپتی۔ میں سب دیکھ رہا ہوں مگر کیا کر سکتا ہوں۔ کاش میں اپنے بیٹے اور ریاست کنانور کے لیے کچھ کر سکتا۔"

راجہ علی کے والد جذباتی ہو گئے:

"کاش میرا خون اور بوڑھی ہڈیاں ریاست کے کام آ سکتیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں محترم۔ آپ یا میں کچھ نہیں کر سکتے۔"

سیناپتی کا دل بھی دکھا ہوا تھا:

"کرنے کا کام راجہ بہادر کا ہے مگر ان سے کہے کون؟ ادھر حالات ہیں کہ دن بدن بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔"

"راجہ علی سے کہنے کو تو میں کہہ دوں مگر مجھے ڈر ہے کہ وہ میری بات پر کوئی توجہ نہ دیں گے۔"

راجہ کے والد نے کہا:

"وہ مجھ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں اس لیے کہ راجہ کی آنکھیں نکلوانے کا مشورہ انہیں میں نے ہی دیا تھا۔"

"نہیں محترم!" سیناپتی نے تردید کی:

"مشورہ دراصل میں نے دیا تھا۔ ہاں تائید آپ نے کی تھی۔"

"خیر بات ایک ہی ہے۔" والد بولے:

"مگر اب کیا کیا جائے۔ نائروں سے نمٹنے کے لیے ہمیں بیرونی امداد ملنا ضروری ہے۔"

"ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے اگر آپ اتفاق کریں۔" سپہ سالار نے کہا۔

"ضرور بتائیے۔" راجہ کے والد نے کہا:

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"ہمیں چاہیے کہ ہم رانی سلمہ سے درخواست کریں کہ وہ راجہ بہادر پہ زور دے کر انہیں نواب بہادر کے پاس فوجی مدد کے لیے بھیجنے کی کوشش کریں۔" سپہ سالار نے ایک اہم مشورہ دیا۔

"بات تو بہت معقول ہے۔" والد نے تائید کی:

"کیا خیال ہے میں آپ کو رانی سلمہ کے پاس لے چلوں؟"

"ہم دونوں ہی رانی صاحبہ کے پاس چلیں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ریاست کنانور کی خاطر راجہ بہادر کو حیدر نگر جانے پر مجبور کریں۔" سپہ سالار نے کہا اور راجہ کے والد نے اس کی رائے سے پورا اتفاق کیا۔

راجہ کے والد اور سپہ سالار دونوں نے ایک کنیز کے ذریعے رانی سلمہ کو پیغام بھیجا کہ وہ رانی سے تنہائی میں ایک اہم معاملہ پر مشورے کے لیے حاضر ہونا چاہتے ہیں۔

جس وقت کنیز نے رانی سلمہ کو پیغام پہنچایا اس وقت رانی کے پاس راجہ علی بھی بیٹھا تھا۔

رانی نے راجہ سے دریافت کیا:

"اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں ریاست کے دونوں ہمدردوں سے ملاقات کر لوں؟"

"مجھے کیوں ناگوار ہوگا سلمہ"۔ راجہ علی جو حالات سے بے حد دل شکستہ تھا اس نے کھوکھلی آواز میں جواب دیا:

"مجھے اعتماد ہے کہ وہ دونوں ہمارے وفادار اور ہمدرد ہیں۔ وہ ضرور کوئی اچھا مشورہ دینا چاہتے ہوں گے۔ میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں تم انہیں یہیں بلوا لو۔"

"جی نہیں۔ آپ یہیں تشریف رکھیے۔ میں ان سے دوسرے کمرے میں ملوں گی۔"

رانی نے اٹھ کے کنیز کو کچھ تاکید کی۔ کنیز باہر کی طرف چلی گئی اور رانی دوسرے کمرے میں آنے والوں کا انتظار کرنے لگی۔

رانی اور دونوں وفاداروں میں صرف چند منٹ گفتگو ہوئی۔ دونوں نے درخواست کی کہ راجہ علی کو مجبور کیا جائے کہ وہ حیدر نگر جا کر نواب بہادر سے فوجی کمک مانگیں۔

رانی نے جواب میں کہا:

"آپ بزرگوں کی رائے انتہائی معقول ہے۔ میں خود بھی انہی خطوط پر غور کر رہی تھی۔ آپ نے مجھے بہت حوصلہ دیا ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ میں راجہ کو رضامند کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گی۔

آپ لوگ یہ بھی یقین رکھیے کہ کل ریاست کنانور سے کوئی نہ کوئی اہم ہستی حیدر نگر کی طرف ضرور روانہ ہو گی۔"

سپہ سالار اور راجہ علی کے والد کو رانی کی باتوں سے بڑا اطمینان ہوا اور وہ خوشی خوشی واپس ہوئے۔ ان کے محل سے واپس جانے کے بعد راجہ علی کے دل میں بھی خلش پیدا ہوئی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ رانی اور ملاقاتیوں میں کیا باتیں ہوئیں مگر اس کی رانی سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

رانی نے بھی اس سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔ اس کی خاموشی بڑی تعجب خیز تھی لیکن راجہ علی نے اسے نہیں چھیڑا۔

اس شب جب رانی سلمہ اور راجہ علی دونوں مسہریوں پر لیٹے بے چینی سے کروٹیں بدل رہے تھے کہ رانی ایک جھٹکے سے اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"راجہ ۔۔۔ کیا سو گئے؟" رانی سلمہ نے آواز دی۔

"ان حالات میں نیند کیسے آ سکتی ہے رانی سلمہ"۔ راجہ ہلکی سی آواز میں بولا۔

"حالات آپ کو سونے نہیں دیتے لیکن ان حالات کو بدلنے کی آپ کوئی کوشش نہیں کرتے"۔ رانی کے لہجے میں تلخی اور طنز تھا۔

"رانی ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

راجہ علی، رانی کے تلخ لہجے پر تڑپ اٹھا:

"تم بھی ان حالات کا ذمے دار مجھے سمجھتی ہو؟"

"نہیں پیارے علی۔ یہ بات نہیں ہے"۔

رانی سلمہ اٹھ کے راجہ علی کی مسہری پر آ گئی:

"میں جانتی ہوں کہ حالات تم نے نہیں بگاڑے مگر ان کے سنبھالنے کی ذمہ داری تم پر ضرور عاید ہوتی ہے۔ تم اگر نواب بہادر سے اس وقت بھی درخواست کرو تو وہ تمہاری مدد سے انکار نہیں کریں گے"۔

رانی نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

"رانی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں۔ نواب بہادر نے مجھے کس قدر ذلیل کر کے دربار سے نکالا ہے"۔ راجہ علی کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے:

"اب میں ان کے پاس کس منہ سے جاؤں؟"

"سنو راجہ علی!" رانی سلمہ مسہری سے اٹھ کر فرش پر کھڑی ہو گئی:

"ناپلاؤس کا قتلِ عام تم یہاں بیٹھے دیکھتے رہو مگر کنانور کی رانی اپنے عوام کا یہ قتلِ عام برداشت نہیں کر سکتی۔

میں نے فیصلہ کیا ہے، کل میں حیدر گڑھ روانہ ہو جاؤں گی اور نواب بہادر کے دربار میں برہنہ سر ہو کر بے گناہ ماؤں کے خون کی فریاد کروں گی"۔

راجہ علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بھی فرش پر اتر آیا۔ رانی سلمہ کا چہرہ جوش اور غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"نہیں رانی۔ میں تمہیں رسوا نہیں ہونے دوں گا"۔

راجہ علی نے فیصلہ کر لیا:

"تم محل میں رہو گی اور میں نواب بہادر کے پاس مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے جاؤں گا"

"مجھے تمہارے فیصلے سے خوشی ہوئی علی۔" رانی نے زہر خند کیا:

"لیکن میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔ تم اگر جاؤ گے تو میرے ساتھ ورنہ میں تنہا حیدر نگر جاؤں گی۔ تم مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔" راجہ علی نے کہا:

"مگر میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

رات کے اسی پہر راجہ علی نے سپہ سالار اور اپنے والد کو بلوا بھیجا۔ اس نے انہیں بتایا کہ کل وہ اور رانی سلمہ حیدر نگر جا رہے ہیں۔

اس فیصلے سے وہ دونوں خوش ہوئے۔ پھر دیر تک اس سلسلے میں گفت گو ہوتی رہی۔ طے یہ پایا کہ راجہ علی اور رانی سلمہ کے حیدر نگر جانے کی خبر پوشیدہ رکھی جائے اور وہ دونوں بھیس بدل کر جائیں تاکہ نائڑ ان کا راستہ نہ روک سکیں۔

ان کے جانے کے بعد رانی اور راجہ دیر تک اس سلسلے میں گفت گو کرتے رہے۔ پھر ایک ہی مسہری پر دونوں سوگئے۔

انہیں کئی دنوں کے بعد سکھ کی نیند آئی تھی مگر وہ دیر تک نہ سو سکے۔ رانی کی کنیزِ خاص نے انہیں جلدی ہی جگا دیا تاکہ وہ جانے کی تیاری کر سکیں۔

کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔

نائڑوں نے کنانور کے مسلمانوں کو بے دست و پا سمجھ کے ان کا قتلِ عام شروع کر دیا لیکن قدرت کو تو ماپلاؤں سے ابھی بہت کام لینے تھے۔ پھر بھلا ان کا قتلِ عام قدرت کیسے برداشت کرتی۔

ادھر راجہ علی اور رانی سلمہ حیدر نگر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہندو جٹا دھاری سادھوؤں کے لمبے چغے پہن لیے تھے۔ جسم کے تمام کھلے حصوں پر راکھ مل لی تھی اور ہاتھوں میں دو چمٹے لے لیے تھے۔ غرضیکہ انہوں نے سادھوؤں کا ایسا روپ دھارا تھا کہ سپہ سالار اور راجہ علی کے والد کو بھی شبہ ہو گیا کہ وہ واقعی سادھو ہیں۔

دوسری طرف قدرت مسکرا رہی تھی۔

پھر قدرت کی مسکراہٹ نے ایک تیز رفتار قاصد سوار کا روپ اختیار کیا۔ یہ سوار گھوڑا بھگاتا، خاک اڑاتا اور گرد و غبار میں اٹا ہوا کنانور کے راج محل پر پہنچا اور گھوڑے سے کود کر جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ایک دربان نے اسے بڑھ کر روکا تو اس نے ہانپتے ہوئے کہا:

'راجہ بہادر کو جا کے خوشخبری سنا دو کہ حیدری لشکر ہماری مدد کو آ گیا ہے'۔

دربان تو یہ سن کر خوشی سے چیختا ہوا اندر کی طرف بھاگا اور خبر لانے والا سوار وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

تاریخ "سلطنتِ خداداد میسور" کے مصنف اس موقعہ پر یوں رقم طراز ہیں:

'ماپلاؤں نے صرف دو یا تین مہینے آرام و اطمینان سے زندگی بسر کی تھی کہ راجہ علی کی معزولی کی خبر مالابار میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ نائڑوں نے سمجھا کہ نواب حیدر علی ماپلاؤں سے دست کش ہو گئے ہیں۔ لہٰذا قتلِ عام کا بازار گرم ہو گیا۔ ماپلاؤں کی ایک زبردست سفارت منگلور پہنچی جہاں حیدر علی مقیم تھے۔

تاریخ آگے بتاتی ہے کہ:

'سفارت کا بیان سن کے حیدر علی بیس ہزار سوار فوج لے کر مالابار کی طرف بڑھے۔ کنانور کے قریب راجہ علی نے ان کا استقبال کیا اور نواب حیدر علی کی رکاب کو بوسہ دیا۔ نواب نے اس کی عزت افزائی کرتے ہوئے اپنے ساتھ لے لیا۔'

اس طرح "سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں"۔ راجہ علی کی غلطی معاف ہوئی اور نواب بہادر نے اسے اپنی عافیت میں لے لیا۔

کنانور اور آس پاس کے تمام نائڑ ندی کنارے نواب حیدر علی کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ نواب نے بھی قریب ہی پڑاؤ ڈالا۔

دوسرے دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور ایک شدید جنگ ہوئی۔ نائڑوں کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا لیکن حیدری لشکر کے آزمودہ اور منجھے ہوئے سواروں نے نائڑوں کا ناطقہ بند کر دیا اور شام ہوتے ہوتے نائڑ پسپا ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

اس جنگ میں راجہ علی نے اپنی بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ نائروں کے پسپا ہونے پر نواب حیدر علی، کالی کٹ پر قبضہ کے لیے آگے بڑھے۔

اس جگہ ایک بات کی وضاحت بہت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جس وقت راقم الحروف "سلطان ٹیپو شہید" پر ناول لکھنے کے لیے متعلق کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا تو اس دوران جناب کوثر کی کتاب "سیکرٹ کرسپانڈنس آف ٹیپو سلطان" SECRET CORRESPONDENCE OF TIPU SULTAN" میری نظر سے گزری تھی جس میں ایک جگہ درج تھا:

"جس وقت حیدر علی خان نے ۱۷۶۰ء میں مالابار پر حملہ کیا تو ٹیپو سلطان ان کے ساتھ تھے"۔

راقم نے اس تحریر پر نشان لگا کر رکھ دیا تھا کہ جب میرا ناول مالابار پر حملہ تک پہنچے گا تو میں اس تحریر پر ایک نوٹ ضرور لکھوں گا۔ چنانچہ اب میں اس کی وضاحت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

سلطنتِ خداداد میسور کے بانی یعنی نواب حیدر علی کے حالات، واقعات اور کارنامے اب اپنے اختتام کو پہنچ رہے ہیں اور اس جد وجہد کا آیندہ باب میں ٹیپو سلطان شامل ہو جائیں گے اس لیے یہی وقت اس وضاحت کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

مندرجہ بالا کتاب میں سلطان ٹیپو کو ۱۷۶۰ء میں مالابار کے اس میدانِ جنگ میں دکھایا گیا ہے جس میں ایک طرف جنوبی ہند کے تمام نائر (ہندو برہمن) یکجا ہو کے، طاقت پکڑتی ہوئی سلطنتِ خداداد میسور کو مٹانے کے لیے آئے تھے اور دوسری طرف بانیِ سلطنت نواب حیدر علی خان، ان ماپلاؤں کی مدد کو آئے تھے جن پر ہندو نائروں نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور روانہ کسی محلے یا آبادی میں ان کا قتلِ عام کیا جاتا تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مالابار کی یہ جنگ ایک بھرپور جنگ تھی اور اسے کسی سرحدی جھڑپ یا شورش کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

سلطان ٹیپو شہید کی زندگی اور کارناموں کا جائزہ تو ہم اگلے صفحات میں لیں گے۔ یہاں صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عام تاریخوں نے سلطان شہید کو ۱۷۶۷ء میں میدانِ جنگ میں دکھایا اور تمام مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ جنوبی ہند میں انگریزوں (یا میسور کی) پہلی جنگ "جو ۱۷۶۷ء میں شروع ہوئی" اس میں سلطان ٹیپو پہلی مرتبہ شریک ہوئے۔

مگر ــــ

انگریزی کتاب کے مطابق سلطان ٹیپو شہید پورے سات سال پہلے ہی ایک ایسی جنگ میں شریک تھے جو واقعی ایک عظیم اور خوفناک جنگ تھی۔

یہاں پر اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ سلطان شہید کی پیدائش (تفصیل اپنی جگہ بیان ہو گی) ۱۷۵۰ء / ۱۷۵۱ء میں ہوئی تھی۔ اس طرح جنگ مالابار جس میں سلطان شہید نے پہلی مرتبہ شرکت کی، اس وقت ان کی عمر صرف نو یا دس سال تھی جبکہ اب تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سلطان شہید کی میدانِ جنگ میں پہلی آمد ۱۷۶۷ء میں یعنی پہلی جنگِ میسور کے موقع پر ہوئی جب ان کی عمر سترہ سال ہو چکی تھی۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب سلطان ٹیپو شہید پہلی جنگِ میسور میں بھرپور طریقے سے شریک ہوئے تو وہ کوئی نووارد شمشیر زن نہیں تھے بلکہ انہیں پورے سال کا میدانِ جنگ کا عملی تجربہ حاصل تھا اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا ایسا مظاہرہ کیا کہ دیکھنے اور سننے والے دنگ رہ گئے۔

بعض خطوط کے مطالعہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بعض قارئین کو یہ شکایت ہے کہ میں ایک قصے میں دوسرا قصہ اور ایک ناول میں دوسری کہانی شروع کر دیتا ہوں۔ اس کے لیے عرض ہے کہ تاریخ نویس یا ناول نگار کا مقصد آپ کو تاریخ پڑھانا نہیں بلکہ تاریخ سنانا ہوتا ہے۔ اگر ناول برصغیر پر لکھا جا رہا ہے اور ناول نگار کا قلم آپ کو برصغیر سے ایران، مشرقِ وسطیٰ یا مغربِ اقصیٰ کی سیر کرانے لگتا ہے تو اس کا مقصد موضوع سے ہٹنا نہیں بلکہ اپنے موضوع کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنا ہوتا ہے۔ بہرحال ــــ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ اپنے قاری کی دلچسپی کے لیے لکھتا ہوں۔

آمدم برسرِ مطلب!

نائر پسپا ہو کر پیچھے ہٹ گئے تو نواب بہادر نے کالی کٹ کا رخ کیا۔ واضح رہے کہ نائروں کی اس نگ میں، جو جنگِ مالابار کہلاتی ہے، سلطان ٹیپو شریک تھے۔ نواب بہادر نے سلطان ٹیپو کے لیے لم کلام اور عربی، فارسی کے دوسرے مضامین کے الگ الگ استاد مقرر کیے تھے لیکن نواب بہادر ر سپاہی اور خاندانی سپاہی زادے تھے اس لیے انھوں نے ٹیپو کے مجلسِ علم کے علاوہ علم سپہ گری پر بھی گہری نظر رکھی۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ سلطان ٹیپو کو صرف نو سال کی عمر میں اپنے ساتھ اس مہیب جنگ پر لے گئے تھے۔ شہسواری اور شمشیر زنی میں شہزادہ ٹیپو اس کم سنی ہی میں کافی مہارت حاصل کر چکا تھا ــــ

نواب بہادر کا اسے میدانِ جنگ میں لے جانے کا مقصد یہ تھا کہ راستے اور میدانِ جنگ کے خطرناک لمحات کا شہزادہ اپنی آنکھوں سے نظارہ کر سکے۔

حیدری لشکر کالی کٹ کے قلعہ کے قریب ٹھہرا۔ نواب بہادر لشکر کو تھکن دور کرنے کا موقع دینا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے خیمے نصب کرنے کا حکم دے دیا۔

ابھی بار برداری کے جانوروں، چھکڑوں اور گاڑیوں پر سے سامان اترنا شروع ہوا تھا کہ قلعہ کالی کٹ کا صدر دروازہ کھلا اور اس سے ایک درجن سے زیادہ سوار برآمد ہوئے جن کے نیزوں پر سفید پرچم لہرا رہے تھے۔

سفید پرچم امن، سلامتی اور دوستی کا نشانی ہوتے ہیں۔ نواب بہادر نے قدرے تعجب سے آنے والوں کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی سپہ سالار اور نائب فضل اللہ خاں ہیبت جنگ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ امن کے پیامبروں کو آنے دیا جائے۔

امن کی یہ سفارت نواب بہادر سے پچاس قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ سفارت میں پندرہ سوار تھے۔ درمیان کا سوار جو پگڑی باندھے تھا، اس کے سامنے کی طرف ایک بڑا ہیرا دکھائی دے رہا تھا۔ قرائن سے وہ کوئی بڑا سردار معلوم ہوتا تھا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں گھوڑے پر سوار اپنے سرداروں کے ساتھ آنے والے وفد کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ نواب بہادر کے دائیں جانب دو قدم پیچھے ہٹ کر ان کا نائب ہیبت جنگ تھا اور بائیں طرف راجہ علی تھا۔

نواب بہادر نے گردن گھما کر راجہ علی کو اشارہ کیا۔ راجہ علی گھوڑا بڑھا کر وفد کے قریب پہنچا اور مقامی زبان میں ان سے گفتگو کرتا رہا۔ وہاں سے واپس آ کر راجہ علی نے نواب بہادر کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

"نواب بہادر۔ کالی کٹ کا راجہ زامرن اپنے سرداروں کے ساتھ آپ کا استقبال کرنے کو حاضر ہوا ہے۔ وہ سلامی کی اجازت چاہتا ہے اور آپ کے دامنِ عافیت سے وابستہ ہونا چاہتا ہے۔"

نواب بہادر کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا:

"اجازت ہے۔ راجہ کو پیش کیا جائے۔"

راجہ علی واپس گیا اور راجہ زامرن کو جس کی پگڑی میں ہیرا لگا تھا، اپنے ساتھ لے آیا۔ راجہ علی اور راجہ زامرن، نواب بہادر کے قریب پہنچ کے گھوڑے سے اترے۔ انہیں گھوڑوں سے اترتے دیکھ کر نواب اور ان کے سرداروں نے بھی گھوڑے سے چھوڑ دیے۔

راجہ زامرن نے کمر سے تلوار اتار کر دونوں ہاتھوں پر رکھی اور نواب بہادر کو پیش کر دی۔ نواب بہادر نے راجہ علی کو تلوار لینے کا اشارہ کیا۔ راجہ علی نے راجہ زامرن سے لے کر تلوار نواب بہادر کو پیش کر دی۔

اب نواب بہادر، راجہ زامرن کی تلوار لے کے اس کے قریب پہنچے اور تلوار دوبارہ راجہ کی کمر میں لگا دی۔

راجہ نے فوراً سر کو خم دے کر تعظیم پیش کی۔ نواب بہادر نے اس کی تعظیم قبول کی اور اس طرح اطاعت کی رسم پوری ہو گئی۔

راجہ نے ادب سے کہا:

"کالی کٹ کا راجہ زامرن، نواب بہادر والیٔ میسور سے قلعہ کالی کٹ میں فروکش ہونے کی درخواست کرتا ہے۔"

نواب بہادر نے راجہ علی سے کہا:

"راجہ زامرن کی دور اندیشی ہمیں پسند آئی۔ ہم نے راجہ کی اطاعت بھی قبول کی۔ راجہ کی گدی بحال رہے گی۔ اس کے اختیارات میں کوئی کمی نہیں آئے گی نہ ان میں کوئی دخل دیا جائے گا۔ سب لوگ سوار ہو جائیں ہم قلعے میں قیام کریں گے۔"

سب لوگ سوار ہوئے۔ آگے آگے راجہ زامرن اپنے سواروں کے ساتھ امن کے سفید پھریرے اڑاتا چل رہا تھا۔

اس سے بیس قدم پیچھے نواب بہادر سینہ تانے گھوڑے پر پورے جاہ و جلال سے سوار آ رہے تھے۔ دائیں بائیں نواب کے حواری او عمائدینِ سلطنت، پھر ان کے پیچھے لشکرِ حیدری معہ خیموں ڈیروں کے چل رہا تھا۔

قلعہ والے سمجھ گئے کہ سفارت کامیاب ہوئی اور کالی کٹ کے راجہ زامرن کی اطاعت قبول ہو گئی ہے۔

قلعہ والوں نے صدر دروازے کے دونوں پٹ پوری طرح کھول دیے اور آنکھیں فرشِ راہ

کر دیں۔ ذرا دیر میں کالی کٹ کا قلعہ لشکرِ حیدری سے بھر گیا۔

قلعہ کے بڑے میدان میں سواروں کے خیمے نصب ہوئے۔ زینیں اتار کر گھوڑوں کو آزاد کیا گیا۔ سواروں نے کمریں کھول دیں۔ سرداروں کو بیرک میں کمرے دیے گئے۔ نواب بہادر قلعدار کے محل میں اترے۔

راجہ زامرن نے عرض کیا:

"نواب بہادر۔ وفادار کو اجازت مرحمت فرمایئے کہ شاہی مہمانوں اور لشکریوں کے طعام و قیام کا معقول انتظام کیا جائے۔"

نواب بہادر نے راجہ کو اجازت دے دی۔ وہ سلام کر کے اپنے محل میں چلا گیا۔

راجہ زامرن نے کالی کٹ کو خونریزی سے بچا لیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ حیدری لشکر کے اس سیلاب کے آگے بند باندھنا ناممکن ہے، پھر کیوں نہ باعزت سمجھوتہ کر لیا جائے۔ اس طرح اس نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی مختصر فوج اور عوام کو جنگ و جدل کی خونریزی سے بچا لیا تھا مگر جب راجہ زامرن اپنے راج محل پہنچا تو وہاں الٹا پیچ پڑ گیا۔

راجہ نے کالی کٹ والوں کے ساتھ بھلائی کی تھی مگر وہ بے چارہ الٹا برائی میں پکڑا گیا۔ راجہ کے عزیز و اقارب اور بہت سے عمائدینِ سلطنت اس کے سخت خلاف ہو گئے۔ کالی کٹ کے مہامنتری نے راجہ زامرن کو آڑے ہاتھوں لیا:

"راجہ زامرن نے ملیچھ مسلمانوں کو قلعہ حوالے نہیں کیا بلکہ ہم سب کی عزت کا نیلام کر دیا۔"

دوسرے وزیر نے لگی میں اور لگائی:

"ہم نسل کے راجپوت ہیں۔ ہمارا رشتہ شمال کے سورج بنسیوں اور چندر بنسیوں سے بنتا ہے۔ لڑنا مرنا ہمارا دھرم ہے۔ راجہ نے ہماری ناک کٹوا دی۔"

راجہ زامرن کو طعنوں تشنعوں کے اس قدر تیر لگے کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ وہ چیخ اٹھا:

"تم احسان فراموش ہو۔ میں نے تمہارے مشورے سے صلح کا راستہ اختیار کیا ورنہ اس وقت قلعہ اور محل آگ اور خون کی ہولی کھیل رہا ہوتا۔ اب تم مجھے الزام دے رہے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

مہامنتری نے صاف لفظوں میں کہہ دیا:

"ہم تمہیں اپنا راجہ نہیں مانتے۔ تم نے ہماری عزتوں کا سودا کیا ہے۔ نکل جاؤ محل سے۔ تم محل میں آنے کے قابل نہیں۔"

تو تو میں میں زیادہ بڑھ گئی۔ راجہ کے بھی کچھ ہمدرد پیدا ہو گئے۔ اس طرح دو گروہ بن گئے اور ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔

راجہ زامرن کا گروہ کمزور تھا۔ اس کی اور راجہ کی خوب پٹائی ہوئی۔ پھر ایک بیان کے مطابق، مخالف گروہ نے راجہ کو پکڑ کے ایک کمرے میں بند کر دیا اور بند کمرے کو آگ لگا دی اور راجہ اس میں جل کر مر گیا۔

دوسرا بیان یہ ہے کہ اپنے ہی آدمیوں کی لعن طعن سے راجہ اس قدر شرمندہ اور خجل ہوا کہ اس نے اپنا کمرہ بند کر کے خود کمرے میں آگ لگا دی اور جل مرا۔

اس آگ سے صرف راجہ کا کمرہ ہی نہیں جلا بلکہ پورا راج محل جل کر راکھ ہو گیا۔

نواب بہادر نے راج محل کو جلتے دیکھ کر اپنے لشکریوں کو آگ بجھانے کا حکم دیا مگر معلوم نہیں کہ آگ کس طرح لگی یا لگائی گئی تھی کہ اس نے چشم زدن میں پورے محل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سب کچھ جل کر رہ گیا۔ اس سے قطع نظر، کالی کٹ پر نواب بہادر کا قبضہ بغیر جنگ و جدل کے ہو گیا۔

نواب بہادر کا لشکر کالی کٹ میں تھا کہ نائروں نے ایک بار پھر جمع ہو کر ان پر حملہ کیا۔ وہ دراصل اپنی پہلی شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر ان کی یہ آرزو ایک بار پھر دھری کی دھری رہ گئی۔ انہوں نے حملہ تو بڑے جوش سے کیا تھا مگر زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکے اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

نواب بہادر نائروں کا تعاقب کرتے ہوئے کوچین پہنچے۔ راجہ کوچین بلاعذر نواب بہادر کی اطاعت میں آ گیا۔ کوچین کے ساتھ ہی پونانی پر بھی قبضہ ہو گیا۔

خطہ مالابار میں برسات کے موسم میں شدید بارش ہوتی ہے اور ندی نالے ابل پڑتے ہیں۔ نواب بہادر حیدر علی خاں کو مالابار کے موسم برسات کی تباہ کاریوں کا علم تھا اس لیے انھوں نے برسات میں مالابار سے دور ہی رہنا مناسب سمجھا اور کچھ فوج پونانی اور کالی کٹ میں چھوڑ کے بقیہ

لشکر کے ساتھ کوئمتور چلے گئے۔

یہ مقام مالابار سے قریب تر تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ موسمِ برسات کوئمتور میں گزاریں گے تاکہ لشکر کو آرام مل سکے اور مالابار کی برسات سے بھی دُور رہے۔

نائروں کو نواب بہادر کے کوئمتور جانے کی خبر ملی تو انہوں نے پھر ماپلاؤں پر ظلم و ستم شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر اطراف و جوانب کے تمام نائر جمع ہوئے اور انہوں نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ کالی کٹ اور پونانی کا محاصرہ کر لیا۔

نائروں نے یہ جرأت موسمِ برسات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ بارشوں کی وجہ سے حیدر علی، مالابار کا رُخ نہ کریں گے اور اس دوران وہ ماپلاؤں کا کھلے بندوں قتلِ عام کر سکیں گے اور کالی کٹ اور پونانی کو بھی آزاد کرا لیں گے۔

کالی کٹ اور پونانی کے محصورین نے فوراً خفیہ قاصدوں کے ذریعے ایک طرف تو کوئمتور میں مقیم نواب بہادر کو حالات سے آگاہ کیا اور دوسری طرف یہی خبر میر رضا علی کو بھیجی گئی، جو اس وقت مدگری میں قیام پذیر تھے۔

میر رضا علی خاں خبر پاتے ہی فوج لے کر کالی کٹ کی مدافعت کے لیے پہنچ گئے۔ ادھر جب نواب بہادر کو کالی کٹ اور پونانی کے حالات کا علم ہوا تو وہ اپنے پندرہ ہزار سواروں اور پیادہ فوج کے ساتھ مالابار کے طوفانی موسم میں ندی نالے عبور کرتے ہوئے پونانی کے قریب پہنچے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اس جنگ میں نواب بہادر نے اپنے آٹھ نو سالہ فرزند شہزادہ ٹیپو کو ساتھ رکھا تھا تاکہ وہ سفر کی تکالیف اور دشواریوں کا عادی ہو جائے۔ نواب بہادر نے حکم دیا تھا کہ گھوڑوں پر زین نہ کسی جائے اور ننگی پیٹھ پر سفر کیا جائے۔ شہزادہ ٹیپو بھی ایک گھوڑے کی ننگی پیٹھ سے چمٹا ہوا سفر کر رہا تھا۔

پیادوں کو موم جامے اور چھتریاں دی گئی تھیں۔ خود نواب بہادر حیدر علی خاں اس سفر میں ایک عام سپاہی کی طرح لشکر کے ساتھ چل رہے تھے اور یہ لشکر تمام راستے بھیگتا اور نالوں کو پھاندتا ہوا پونانی پہنچا۔

نائروں کے بارے میں پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ یہ ہندوؤں کا سب سے کٹّر اور متعصب فرقہ تھا۔ مسلمان اور مسلم ریاست کے یہ سخت مخالف تھے۔ ان کا مرتبہ اگرچہ برہمنوں سے کم تھا مگر اپنی سپاہیانہ پیشہ وری کی وجہ سے یہ خود کو سب سے افضل سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے کئی بار

شکست کھا چکے تھے مگر اپنی بدطینت طبیعت کی وجہ سے باز نہ آتے تھے۔

اب انہوں نے پونانی کے باہر ایک گہری خندق میں مورچے لگا رکھے تھے اور توپ خانہ ایک اونچی جگہ نصب کیا تھا۔

نائروں کی یہ تیاریاں محض احتیاط کے طور پر تھیں اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ نواب بہادر کم از کم برسات میں پونانی کا رخ نہیں کریں گے اور اس موسم میں وہ بڑے اطمینان کے ساتھ کالی کٹ اور پونانی کے مسلمانوں کا قتلِ عام کر سکیں گے۔

بعض دور اندیش نائر سرداروں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ نواب بہادر کی طرف سے غافل ہونا سخت غلطی ہے اس لیے مسلمانوں کے قتلِ عام کے ساتھ ساتھ نواب بہادر کے خطرے کے تدارک کے لیے پورے دفاعی انتظامات کیے جائیں۔

پس —

خندق میں مورچے لگانا اور خندق کے اوپر لکڑیوں کی بنی ہوئی ایک ہلالی دیوار کھڑی کرنا ان کی دفاعی حکمتِ عملی تھی۔

چنانچہ — جب نواب بہادر پونانی پہنچے اور انہوں نے نائروں کے مضبوط دفاعی انتظامات دیکھے تو انہوں نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔

نواب بہادر کے لشکر میں پرتگیزی اور فرانسیسی کثرت سے بھرتی کیے گئے تھے اور وہ واقعی نواب بہادر کی کمان میں بڑی دلیری سے لڑتے تھے۔

نواب نے پرتگیزی فوج پر ایک پرتگیزی سالار مقرر کیا اور اسے دایاں بازو یعنی میمنہ سپرد کیا۔ بائیں جانب کے حصۂ فوج پر انہوں نے ایک انگریز کو افسرِ اعلیٰ لگایا۔ یہ انگریز نواب بہادر کا ملازم تھا اور بڑی وفاداری سے خدمات انجام دے رہا تھا۔

فوج کے تیسرے حصہ کو جس میں فرانسیسی زیادہ تھے، نواب نے ریزرو (محفوظ) فوج کے طور پر رکھا۔ اس کا سالار ایک فرانسیسی افسر تھا۔

جنگ کا آغاز نواب بہادر نے میمنہ کی فوج کے حملہ سے کیا۔ حملہ کا حکم پا کر پرتگیزیوں کی یہ فوج بڑی تیزی سے گولیاں چلاتی ہوئی خندق کی طرف بڑھی۔ دشمن گولی کا جواب گولی سے دے رہا تھا اور اس کا بلند مقام پر نصب توپ خانہ الگ آگ برسا رہا تھا۔

پرتگیزی بڑی بہادری سے بڑھتے ہوئے لکڑی کی دیوار تک پہنچ گئے مگر انہیں یہ نہ معلوم ہوا

کہ دشمن کا کس قدر نقصان ہوا ہے جبکہ خود پرتگیزیوں کا کافی جانی نقصان ہوا تھا۔

نواب بہادر نے اپنے میمنہ کو تقویت دینے کے لیے میسرہ یعنی بائیں بازو کی فوج کو حملہ کا حکم دے دیا۔

میسرہ کا حاکم انگریز تھا۔ اس نے بڑا زبردست حملہ کیا اور فوج گولیاں کھاتی خندق تک پہنچ گئی۔ مگر لکڑی کی دیوار، جس کے سوراخوں سے گولیاں برس رہی تھیں، ان کے لیے بھی سدِ سکندری بن گئی۔

میمنہ اور میسرہ پر گولیاں برس رہی تھیں مگر نہ گولی چلانے والا دکھائی دیتا تھا اور نہ انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گولیوں سے دشمن کا کتنا نقصان ہوا۔

اس وقت نواب بہادر کے دونوں بازو بہت نقصان اٹھا چکے تھے اور نواب بہادر جوش اور غصہ سے دونوں طرف گھوڑا دوڑا رہے تھے۔

اسی وقت ریزرو فوج کے فرانسیسی کمانڈر نے عرض کیا:

"نواب بہادر۔ اجازت دی جائے کہ میں حملہ کروں!"

"تم —"

نواب بہادر نے ایک لمحہ کے لیے سوچا:

"مگر تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارا دایاں اور بایاں بازو کس مشکل میں ہے۔"

"اسی لیے تو اجازت چاہتا ہوں نواب بہادر"۔ سالار کے لہجے میں بڑی عاجزی اور التجا تھی۔

آخر نواب بہادر نے اپنی محفوظ فوج کی بازی لگا دی اور اسے حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

میمنہ اور میسرہ دونوں بازوؤں نے بڑی جوانمردی سے حملہ کیا تھا اور شدید نقصان اٹھانے کے باوجود وہ اب تک مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے — مگر محفوظ فوج کے فرانسیسی سالار کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ لکڑی کی دیوار سے نکلنے والی گولیاں اور اوپر سے آگ برسانے والا توپ خانہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور بندوق کی گولی کی طرح لپکتے بلکہ دوڑتے ہوئے وہ خندق پر پہنچے اور پانی سے بھری خندق کو لمحوں میں پار کر کے لکڑی کی دیوار سے، جس سے ہزاروں گولیاں نکل رہی تھیں ٹکرائے اور لکڑی کے تختے توڑ ڈالے۔ دیوار گرا دی اور نائروں کا قتل شروع کر دیا۔

فرانسیسیوں پر مشتمل یہ فوج اس قدر بے جگری سے لڑی کہ ہزاروں نائر مارے گئے۔ بورچہ پر قبضہ ہو گیا اور شہر میں آگ لگا دی گئی۔

اس وقت قلعہ کے محصور لشکری بھی نکل آئے اور انہوں نے بھاگتے ہوئے نائروں کا خوب خوب صفایا کیا۔ نائروں کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے ہزاروں کی تعداد میں آدمی مارے گئے۔

نواب بہادر حیدر علی خاں خود ایک بہادر انسان اور دلیر جرنل تھے اس لیے وہ بہادری اور بہادروں کی قدر بھی کرتے تھے۔ فرانسیسی افسر کی بہادری سے وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے فوراً اسے دس ہزار افواج کا سپہ سالار بنایا اور ساتھ ہی توپ خانے کا افسر بھی مقرر کر دیا۔

نواب بہادر کی اس فتح سے ان کی ہیبت چاروں طرف طاری ہو گئی۔ نائر اپنے اپنے دیہات خالی کر کے بھاگنے لگے۔

نواب بہادر کا عام نائروں سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ انہوں نے برہمنوں کو بلا کر حکم دیا کہ نائروں میں امن کا اعلان کیا جائے اور انہیں واپس لا کر ان کے گھروں اور دیہاتوں میں آباد کیا جائے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں دی جائے گی اور ان کی جانوں کی حفاظت کی جائے گی۔

لیکن — نائر اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ برہمن اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے۔ انہوں نے واپس آ کر نواب بہادر کو مطلع کر دیا۔

نواب بہادر نے اسی وقت دوسرا اعلان کرایا جس کے مندرجات اس طرح تھے:

۱۔ پنج اقوام، نائروں کے جلوس میں غلاموں کی طرح دوڑتی تھیں، اب یہ رسم موقوف کی جاتی ہے۔

۲۔ اب تک صرف نائر ہتھیار باندھا کرتے تھے، اب پنج ذاتیں بھی ہتھیار باندھا کریں گی۔

۳۔ جو نائر مسلمان ہو گا اس کے پچھلے تمام حقوق بحال اور برقرار رہیں گے۔

۴۔ جو بھی غیر مسلم، مسلمان ہو گا، اسے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو نو مسلم نائروں کو حاصل ہوتے ہیں۔

۵۔ اب تک نائروں کا درجہ صرف برہمنوں سے کمتر تھا مگر اب وہ اس سے بھی کمتر درجہ کے متصور ہوں گے۔

نواب بہادر کے اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہو گئے!

نواب بہادر کو مالابار میں مصروف دیکھ کر بدنور (حیدر نگر) کے ہندوؤں نے مرہٹوں سے درخواست کی کہ وہ ہندو ریاست بدنور کو نواب حیدر علی خاں کے قبضہ سے نجات دلائیں۔ مرہٹے ایسے ہی کسی موقع کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کی درخواست قبول کر لی اور لشکر لے کر بدنور کی طرف چلے۔

حیدر نگر کے جاسوسوں نے فوراً نواب بہادر کو اطلاع دی کہ مرہٹہ لشکر بدنور کی طرف بڑھ رہا ہے۔

نواب بہادر حیدر علی کو حیدر نگر سب شہروں سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ اس خبر سے کچھ پریشان ہوئے۔ انہوں نے مالابار کا انتظام میر رضا علی خاں کے سپرد کیا جو مدگری سے لشکر لے کر آئے ہوئے تھے۔

پھر نواب بہادر باگیں اٹھا کے حیدر نگر کو بچانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک مرہٹے بدنور پر قابض ہو چکے تھے مگر بارش کی وجہ سے وہ قبضہ برقرار نہ رکھ سکے اور مرہٹوں کا لشکر واپس ہو گیا۔ اس طرح نواب بہادر کو حیدر نگر کے لیے کوئی جنگ نہ کرنا پڑی۔

مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد نواب بہادر نے چتلارگ پر فوج کشی کی اور حیدری لشکر کا چتلارگ کے مضافات پر قبضہ ہو گیا۔

اب انہوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ طول کھینچ گیا۔ پانچ ماہ بعد نواب بہادر نے محاصرہ اٹھا لیا۔

اب وہ شاہنور کی طرف متوجہ ہوئے اس لیے کہ مرہٹوں کے بدنور پر حملہ کے وقت والئ شاہنور نواب عبدالحکیم نے مرہٹوں کو اپنی افغانی فوج کی کمک بھیجی تھی۔

نواب بہادر کے دل میں اس کا ملال تھا۔ انہوں نے ایک لشکر اپنے نائب ہیبت خاں کی سرکردگی میں شاہنور روانہ کیا اور خود بھی فوج لے کر چلے۔

شاہنور کے قریب پہنچ کے نواب بہادر نے اپنی فوج کمین گاہ میں چھپا دی اور پنڈاروں کو حکم دیا کہ وہ شاہنور پر حملہ کریں اور نواب عبدالحکیم کی فوج کو شکست کا فریب دے کر اس جگہ لے آئیں جہاں نواب بہادر کی فوج کمین گاہ میں تیار کھڑی ہے۔

منصوبہ کے تحت پنڈارہ فوج نے عبدالحکیم خاں کے افغانی لشکر پر زبردست حملہ کیا۔ افغانی فوج مقابلہ کے لیے قلعہ سے باہر آئی۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد پنڈاروں نے پسپا ہونا

شروع کر دیا جسے دیکھ کر افغانی یہ سمجھے کہ انہوں نے پنڈاروں کو شکست دے دی ہے۔ پس انہوں نے زور کا حملہ کیا تاکہ پنڈارے میدان چھوڑ بھاگیں۔ مگر پنڈارے بھاگنے کے بجائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہے اور افغانی انہیں دباتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ پنڈارے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پر حیدری لشکر کمین گاہ میں موجود تھا۔

اس وقت حیدری لشکر نے اچانک کمین گاہ سے نکل کر شاہنور کے افغانی لشکر پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے افغانی گھبرا گئے اور نواب بہادر کے لشکر نے انہیں کاٹ کے رکھ دیا۔

نواب عبدالحکیم خاں کو اس شکست کی اطلاع پہنچی تو اس نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ حاصل کی اور قلعہ بند ہو گیا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں کو اس پر سخت غصہ تھا انہوں نے فوراً قلعہ کے گرد محاصرہ ڈال دیا۔

جب کئی دن محاصرہ کو گزر گئے تو نواب عبدالحکیم نے یہ سمجھ لیا کہ اب نواب بہادر کچھ کیے بغیر یہاں سے ٹلنے والے نہیں۔ چنانچہ اس نے صلح کا پیغام بھیجا اور ایک کروڑ نقد اور مضافات کے چند قلعے نواب بہادر کو پیش کیے۔

نواب بہادر نے اسے غنیمت سمجھا اور محاصرہ اٹھا لیا۔

اس کے بعد نواب بہادر نے آس پاس کے علاقوں کے راجاؤں اور پالیگاروں کی طرف لشکر روانہ کیے۔

ایک لشکر جو مرزا علی حسین علی بیگ کی سالاری میں گیا تھا اس نے بسواری درگ کو فتح کیا اور وہاں کے راجہ نے نواب بہادر کی خدمت میں مروارید، یاقوت اور جڑاؤ زیورات کے بیس صندوق بطور تاوان روانہ کیے۔

نواب بہادر حیدر علی خاں نے ۱۷۶۰ء میں مالابار کی طرف سے کوچ کیا تھا اور مسلسل ۴ سال سے فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔

نوعمر شہزادہ سلطان ٹیپو ان کے ساتھ تھا اور راہ کی صعوبتوں، حملہ کی سختیوں اور جنگی مورچوں پر شمشیرزنی اور گولہ باری کے مناظر نہ صرف اس کی نظروں سے گزر رہے تھے بلکہ وہ خود بھی ان تمام مہمات میں عملی طور پر شریک تھا۔ شہزادہ کا یہی عملی تجربہ تھا جس نے اسے کم عمری ہی میں ایک تجربہ کار

جرنل کی تمام خوبیوں سے آراستہ کر دیا تھا۔

نواب بہادر کو چار سال تک برابر فتوحات حاصل ہوتی رہیں لیکن اب ان کے سامنے مرہٹوں کی طاقت ایک مضبوط دیوار بن کے آگئی۔

جنگ پانی پت میں مرہٹوں کی طاقت کا تقریباً خاتمہ ہو گیا تھا مگر جب مادھوراؤ ان کا نیا پیشوا بنا تو اس نے مرہٹوں کی طاقت کو از سر نو ترتیب دیا۔ اسے نواب بہادر کی مالابار کی فتوحات کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ بدنور، مالابار اور شاہنور وغیرہ پر نواب بہادر کا قبضہ اسے سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ اور وہ اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت کے وجود کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا۔

آخر مادھوراؤ ایک منظم لشکر کے ساتھ نواب حیدر علی خاں کے زور کو توڑنے کے لیے میسور کی طرف بڑھا۔

اس وقت اس کی کمان میں ایک لاکھ سوار، ساٹھ ہزار پیادے اور پچاس ہزار تیر اندازوں کے علاوہ ایک بڑا توپ خانہ بھی تھا۔ یہ ایک لشکر نہ تھا بلکہ ایک ایسا طوفان تھا جس نے راستے میں آنے والی طاقتوں کو پیس کے رکھ دیا۔

نواب بہادر کو اس خطرناک لشکر کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت فکر مند ہوئے مگر ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کے بجائے جو کچھ فوج اکٹھا ہو سکی، اسے لے کر سرنگا پٹم سے بنگلور آئے۔

اس دوران مادھوراؤ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شاہنور پہنچا۔ نواب عبدالحکیم خان جس نے کچھ دن پہلے ہی نواب بہادر کی اطاعت قبول کی تھی، غداری کرتے ہوئے مرہٹوں سے مل گیا۔ چتلارگ کے راجہ نے بھی مرہٹوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔

مادھوراؤ یہاں سے آگے بڑھ کر سرا پہنچا۔ یہاں کا صوبیدار میر رضا علی خاں تھا۔ اس نے قلعہ بند ہو کر چند دن مقابلہ کیا۔ پھر ملک اور قلعہ دشمن سے بچانے کے لیے اس نے قلعہ مادھوراؤ کے حوالے کر دیا۔

ادھر نواب حیدر علی خاں نے بنگلور میں بیٹھ کے پنڈاروں کی ایک فوج صحرائے ماگڑی روانہ کی کہ وہ مرہٹہ لشکر پر چھپ کر شبخون مارتے رہیں۔

مادھوراؤ نے بھی قلعہ ماگڑی کا رخ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا لیکن قلعدار سردار خاں نے اس کا مقابلہ کیا۔ چار دن تک مرہٹہ فوج قلعہ پر حملے کرتی رہی مگر سردار خاں نے اس کی ایک نہ چلنے دی

ہر حملہ پسپا کر دیا۔

اس وقت راجہ چتلارگ جو قلعہ ماگڑی کے خفیہ راستوں سے واقف تھا اس نے اپنے آدمیوں کو پوشیدہ راستوں سے قلعہ پر چڑھا دیا۔

اس طرح قلعہ ماگڑی پر دشمن کا قبضہ ہو گیا مگر قلعہ دار سردار خاں نے ہتھیار نہیں ڈالے اور اپنے رفیقوں کے ساتھ صرف تلواروں سے مرہٹہ لشکر کا مقابلہ کیا۔

سردار خاں اور اس کے رفقا نے بہادری اور شجاعت کا ایک نیا باب رقم کیا۔ سردار خاں کے تمام ساتھیوں نے لڑتے لڑتے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ خود سردار خاں تنہا ان کا مقابلہ کرتا رہا اور جب شدید زخمی ہو کر گرا تو اس وقت اسے گرفتار کیا گیا۔

ماگڑی کے صحرا میں چھپی ہوئی پنڈاروں کی فوج نے مرہٹہ لشکر پر کئی شب خون مارے اور بلاشبہ انہوں نے ہزار سے زیادہ مرہٹے فوجیوں کو قتل کر دیا تھا مگر لاکھوں کے لشکر میں ہزار آدمیوں کی کمی سے کیا فرق پڑتا۔

ماگڑی کے بعد مادھوراؤ نے بالاپور، کڑپہ، کولار، ملباگل، گرم کنڈہ پر قبضہ کیا اور اب اس کے سامنے سرنگا پٹم تھا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں کی سلطنت خداداد کو ابھی پوری طرح استحکام حاصل نہ ہوا تھا کہ انہیں ایسے زبردست غنیم کا سامنا کرنا پڑا جو تقریباً دو لاکھ کی نفری، جس میں سوار، پیادے، تیر انداز اور پنڈارے شامل تھے، لے کر ان کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

پنڈاروں کا یہ حال تھا کہ وہ نصف کے قریب مرہٹہ پیشوا مادھوراؤ کے ساتھ اور اتنے ہی نواب بہادر حیدر علی خاں کے ساتھ تھے اور دونوں طرف سے کمال وفاداری سے لڑ رہے تھے۔

نواب بہادر کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اگر سرنگا پٹم پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا تو ان کی سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر وہ کمزور دل انسان نہیں تھے۔ وہ ہر قسم کے حالات میں مستقل مزاج اور بے خوف رہنے کے عادی تھے۔

ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے زیر اثر تمام پالیگار اور راجے ان سے منہ موڑ کر مادھوراؤ کے تلوے چاٹ رہے تھے مگر بغیر ہراساں ہوئے وہ اپنی فوج لے کر ماگڑی کے صحرا میں پہنچ گئے۔

مادھوراؤ کو اپنی فتوحات پر مغرور ہونا ہی چاہیے تھا۔ ہندو بغلیں بجا رہے تھے اور مادھوراؤ کی فتوحات پر اتراتے پھرتے تھے۔

مادھوراؤ نے چنتامنی کو اپنا مستقر بنا کر پچاس ہزار کا ایک لشکر جس کے ساتھ بھاری توپخانہ بھی تھا، سرنگاپٹم کی طرف روانہ کیا اور ایک دوسری فوج بارہ محل پر قبضہ کے لیے بھیجی۔

نواب بہادر کے لیے مادھوراؤ کو روکنے کا یہ آخری موقع تھا اور انہوں نے اپنی ذہانت اور جسارت سے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

نواب بہادر نے اپنی طاقت ماگڑی کے جنگل میں اکٹھا کر دی تھی اور وہ بے چینی سے اس پچاس ہزار مرہٹہ فوج کا انتظار کر رہے تھے جو ہراول دستے کے طور پر سرنگاپٹم جا رہی تھی۔

ایک روز، آدھی رات گزرتے ہی نواب بہادر اپنے برق رفتار دستوں کے ساتھ ماگڑی سے نکلا اور مرہٹہ فوج پر ایک زبردست شب خون مارا۔

نواب بہادر کا یہ شب خون اس قدر زبردست تھا کہ مرہٹوں کی نصف کے قریب فوج اس میں کٹ کے رہ گئی اور باقی فوج تمام سامانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

نواب بہادر کو اس کامیابی کے علاوہ ایک اور کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ یہ کامیابی ان پنڈاروں کی تھی جنہیں نواب بہادر نے مرہٹوں کی اس فوج کو روکنے کے لیے بھیجا تھا جو بارہ محل پر قبضہ کے لیے جا رہی تھی۔ اس فوج پر بھی حیدری پنڈاروں نے شب خون مار کر اسے واپسی پر مجبور کر دیا تھا۔
ان دو فتوحات نے نواب بہادر کے اکھڑے ہوئے پیروں کو پھر سے جما دیا۔

مرہٹہ پیشوا کو جب اپنی فوج کی دونوں جگہ شکست کی خبر ملی تو وہ گھبرا گیا۔ اس لیے کہ اس کی تقریباً نصف بہترین فوج یا تو کٹ گئی تھی یا بے سہارا ہو کر صحرا میں بھٹک رہی تھی۔ مادھوراؤ نے فوراً چنتامنی سے اپنا صدر مقام تبدیل کیا اور امباجی درگ پہنچ گیا۔

اس زبردست شکست نے اس کے حواس غائب کر دیے تھے۔ اس شرمناک ہار کے بعد نہ تو وہ واپس جا سکتا تھا اور نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس کی فوج میں اس قدر کمی ہو گئی تھی کہ وہ آگے بڑھنے کا خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ میدانِ جنگ میں دو مقابل طاقتیں صرف اس وقت صلح پر آمادہ ہوتی ہیں جب ان کی اپنی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔

مرہٹہ پیشوا مادھوراؤ نے تقریباً دو لاکھ کے لشکر سے نواب بہادر حیدر علی خاں کی بڑھتی ہوئی

طاقت کے خاتمے کے لیے میسور پر حملہ کیا۔ اس نے مسلسل فتوحات حاصل کیں۔ پورا ملک پامال کر کے رکھ دیا۔ سلطنت میسور پانی پر بہتے پتے کی مانند لرزنے لگی۔

پھر ہوا کا رُخ بدلا۔

نواب بہادر ماگڑی کے جنگل سے اپنے تیز رفتار دستوں کے ساتھ نکلے اور ایسا شب خون مارا کہ مادھوراؤ کے پچاس ہزار کے لشکر میں سے آدھے سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ باقی سامان چھوڑ کے میدان سے نکل بھاگے۔

دوسرا معرکہ نواب بہادر کے پنڈاروں نے سر کیا۔ انہوں نے بارہ محل کی طرف جانے والی فوج پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ مرہٹہ پیشوا کا غرور خاک میں مل گیا اور اس کا سر ندامت کے مارے جھک گیا۔

اس طرح نواب بہادر کو پیہم شکستوں کے بعد دو ایسی فتحیں حاصل ہوئی تھیں جن سے ان کے حوصلے بلند ہوئے تھے مگر یہ خدشہ موجود تھا کہ ابھی مادھوراؤ کے پاس نصف لشکر موجود ہے۔ اگر وہ شکست کا بدلہ لینے آگے بڑھا تو اسے روکنا مشکل ہو جائے گا۔

چنانچہ ـــــ

دونوں طرف "صلح" کا خیال پرورش پانے لگا۔ ہاں پہل نواب بہادر کی طرف سے ہوئی۔

نواب بہادر حیدر علی خاں نے مادھوراؤ کے پاس قاصد بھیجا۔ یہ قاصد خالی ہاتھ نہیں تھا۔ نواب نے سات لاکھ کی رقم اس کے ساتھ کی تھی۔

قاصد نے سات لاکھ کی یہ رقم مرہٹہ پیشوا مادھوراؤ کے سامنے رکھ کے کہا:

"نواب بہادر حیدر علی خاں نے مرہٹہ پیشوا کو پیغام دیا ہے کہ،
"ہمیں جنگ سے عار نہیں۔ انکار نہیں، لیکن مرہٹوں کے عظیم لشکر نے ملک کو پامال کر ڈالا ہے۔ ہم چاہتے ہیں یہ سات لاکھ کی رقم آپ قبول فرمائیں۔ اس کے علاوہ ہم دوسری قسط کے طور پر پانچ لاکھ اور بھجوا دیں گے۔ آپ واپس پونا تشریف لے جائیں تاکہ پامال ملک کی ازسرِنو تعمیر کی جائے۔"

مادھوراؤ دل ہی دل میں اس پیش کش پر بہت خوش ہوا۔ اس نے سات لاکھ قبول کر لیے اور بقیہ لشکر کے ساتھ پونا واپس چلا گیا۔ اسے کہتے ہیں:

بلائے آمد و لے بخیر گذشت
"مصیبت آئی مگر خیریت سے گزر گئی۔"

نواب بہادر کے لیے بھی مرہٹوں کی واپسی بہت غنیمت تھی۔ وہ اپنی طاقت کو ترتیب دینے اور ملک کی تعمیر میں لگ گئے۔

گزشتہ پانچ سال کا وہ عرصہ جس میں شہزادہ ٹیپو نے اپنے والد نواب بہادر حیدر علی خاں کے ساتھ رہ کر پوری جنگی تربیت عملی طور پر حاصل کی، اس میں وہ زمانہ بھی تھا جس میں نواب بہادر نے تواتر کے ساتھ فتوحات حاصل کیں۔ پھر مرہٹہ پیشوا مادھو راؤ کی سلطنتِ میسور پر چڑھائی کا زمانہ بھی شامل تھا، جب اس کے تمام اپنے بیگانے ہو گئے۔ والیٔ شاہنور نواب عبدالحکیم خاں جس نے کچھ ہی دن پہلے اطاعت قبول کی تھی، وہ اس برے وقت میں نواب بہادر کا وفادار ساتھی ہونے کے بجائے آستین کا سانپ ثابت ہوا اور مادھو راؤ کے ساتھ مل کر نواب بہادر کے علاقوں پہ حملہ آور ہوا۔

چتلا رگ کے راجہ نے بھی ایسا ہی قدم اٹھایا اور ایک دُور کی طاقت کا حلیف بن کے قریب کے دوست کی پشت میں چھرا بھونکنے پر تُل گیا۔

سرا، نواب بہادر کے ہاتھ سے نکلا۔ مدگری پر مرہٹوں کا قبضہ ہوا۔ ماگڑی کے قلعہ پر قلعدار سردار خاں نے سخت مدافعت کی مگر آخری وقت تک جنگ کرنے کے بعد زخمی ہوا اور قلعہ مادھو راؤ کے ہاتھ آ گیا۔

پھر بالاپور، کڑپہ، کولار اور ملباگل اور گرم کنڈہ یکے بعد دیگرے نواب بہادر کے ہاتھ سے نکل کر مرہٹوں کے قبضہ میں جاتے رہے۔

ان تمام واقعات کو شہزادہ ٹیپو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے دوستوں کو دشمن بنتے اور وفاداریاں تبدیل ہوتے دیکھا۔ فتح کے دلفریب مناظر بھی اس کی نظر سے گزرے اور شکست کا پُرہول نظارہ بھی پیشِ نظر رہا۔ اس طرح میدانِ جنگ کی عملی تربیت نے شہزادہ ٹیپو کی شخصیت کو ایک باکمال جنرل کے روپ میں ڈھال دیا۔

مرہٹہ پیشوا مادھو راؤ کے واپس جانے کے بعد اگرچہ بظاہر نواب بہادر کو اپنی سلطنتِ خداداد میسور

کے نظام کو درست کرنے کا موقع میسر آیا مگر وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور دشمن ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

نواب بہادر کا یہ دشمن نظام الملک نظام علی خاں والیٔ دکن تھا۔

وہ اکیلا نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سات سمندر پار سے آنے والی مکار اور بے ایمان انگریز قوم بھی تھی، جس نے ایک صدی پہلے تجارت کی آڑ میں پہلے بنگال میں قدم جمائے۔ پھر جنوبی ہند کا رخ کیا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی جو ایک خالص تجارتی ادارہ تھا، اس نے برِصغیر میں ریشہ دوانیاں شروع کرتے ہوئے بھائی کو بھائی سے لڑا کر اس سرزمین کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں کی اگلی جنگ نظام دکن حیدر آباد اور انگریزوں کے مشترکہ لشکر سے ہوئی جس میں نظام اور انگریزوں کے علاوہ ایک مرہٹہ سردار کے دس ہزار سوار بھی تھے۔ یہ مرہٹہ سردار اپنے دس ہزار سواروں کے ساتھ پورے دکن میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا۔ جب نواب بہادر اور نظام حیدر آباد (جس کے ساتھ انگریز بھی تھے) ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئے تو مفاد پرست مرہٹہ سردار نے نواب بہادر کے خلاف جنگ کرنا اپنے مفاد میں سمجھا اور نظام حیدر آباد کے لشکر کا حلیف بن گیا۔

انگریزی تاریخوں میں اسے "انگریزوں کی پہلی جنگ" اور برِصغیر کی تاریخوں میں اسے "میسور کی پہلی جنگ" کا نام دیا گیا ہے۔ اس تاریخی اور اہم جنگ کے اسباب پر نظر ڈالنے سے پہلے ہم اس واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو میسور میں پیش آیا۔ یہ واقعہ تھا راجہ میسور کی وفات۔

آغاز میں لکھا جا چکا ہے کہ ریاست میسور کی ابتدا ۱۳۹۹ء میں ہوئی تھی جب دوارکا (کاٹھیاوار گجرات) کے دو بھائی وجیا راما اور کرشنا راما جنوب میں آئے اور انہوں نے ہڈناڈ میں جو میسور کے قریب ہے، ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں جو روایت مشہور ہے اسے تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ریاست میسور میں مسلمانوں کی آمد کس وقت شروع ہوئی۔

جنوب میں جب تک وجیانگر کی ہندو ریاست قائم رہی اس وقت تک ہڈناڈ (میسور) کی ریاست اس کی باجگذار رہی۔ پھر جب وجیانگر کا زوال ہوا، اس وقت ہڈناڈ کے راجہ تمراج اوڈیار نے علمِ آزادی بلند کیا اور ۱۵۶۶ء میں سرنگاپٹم کو دارالسلطنت بنایا۔

واضح رہے کہ اس وقت تک اس خاندان کے مندرجہ ذیل پانچ راجہ گدی نشین ہو چکے تھے:

۱۔ بڈورا یا وجیا ۱۳۹۹ء سے ۱۴۲۳ء تک

۲۔ چامراج اوڈیرا اوّل ۱۴۲۳ء سے ۱۴۵۸ء تک
۳۔ تمراج اوڈیرا اوّل ۱۴۵۸ء 〃 ۱۴۷۸ء 〃
۴۔ چام راجہ 〃 دوم ۱۴۷۸ء 〃 ۱۵۱۳ء 〃
۵۔ چام راجہ 〃 سوم ۱۵۱۳ء 〃 ۱۵۵۲ء 〃

اسی طرح اس خاندان کے چھٹے راجہ تمراجہ اوڈیرہ دوم نے ۱۵۶۶ء میں بغاوت کر کے اپنا دارالسلطنت سرنگاپٹم منتقل کر لیا۔ اس کے بعد ہی میسور میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ پھر ۱۶۸۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے جنوبی علاقوں پر قبضہ کیا اور یہ ریاست سلطنتِ مغلیہ کی باجگذار بن گئی۔

۱۶۹۶ء میں مرہٹوں نے سرنگاپٹم پر حملہ کیا مگر انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اس وقت مغل شہنشاہِ ہند اورنگ زیب عالمگیر جنوبی ہند میں تھے۔ راجہ چکدیو ارایا اوڈیر نے دربارِ عالمگیری میں تحائف بھیجے اور اطاعت کا اظہار کیا۔

شہنشاہ نے خوش ہو کر راجہ کو جگدیوا کا خطاب عطا کیا۔ نوبت اور نقارہ کی اجازت دی اور ہاتھی دانت کا ایک تخت بھی تحفہ میں دیا۔

پھر جب دہلی پر زوال آیا تو حاکم سرا، نواب بن بیٹھا اور میسور کے راجہ نے خود مختاری اختیار کر لی۔

میسور کی پہلی جنگ میں انگریزی فوج جس میں زیادہ تر والاجاہ محمد علی کی فوجیں تھیں، اس کا سالار کرنل اسمتھ تھا۔ حیدرآبادی فوجیں خود نظام الملک کی کمان میں تھیں اور مرہٹہ سردار الگ تھا۔ یہ متحدہ افواج میسور کی طرف روانہ ہوئیں۔

بعض انگریزی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ میسور پر حملہ اس وجہ سے ہوا کہ نواب بہادر حیدر علی خاں نے حیدرآباد کے علاقوں پر چھاپہ مارا تھا جس کے جواب میں یہ جنگ شروع ہوئی۔

دراصل نظام حیدرآباد کو جنوب میں ایک اور اسلامی سلطنت کا قیام ناگوار گزر رہا تھا مگر وہ اکیلا حیدر علی سے مقابلہ کی تاب نہ رکھتا تھا۔ پس اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ وہاں دوسری طاقت انگریزوں کی تھی۔

انگریزوں کو نواب بہادر کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ انہیں برصغیر ہی سے بے دخل نہ کر دیں۔ اس طرح یہ دونوں مل گئے اور یہ سب فوجیں بالا گھاٹ کی طرف بڑھیں۔

نواب بہادر حیدر علی خاں چونکہ ہر دم آنکھیں کھلی رکھتے تھے اس لیے انہیں اس گٹھ جوڑ کا فوراً علم ہو گیا اور انہوں نے بھی تیاریاں شروع کر دیں۔

نواب بہادر نے حیدری فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستہ کا الگ الگ سالار مقرر کیا جس کی ترتیب اس طرح تھی:

ایک دستہ پر شہزادہ ٹیپو سلطان کو سالار مقرر کیا گیا۔ شہزادے کی عمر اس وقت سولہ سترہ سال کی تھی اور وہ پہلی مرتبہ ایک دستۂ فوج کا جرنل مقرر ہوا تھا۔

دوسرا دستہ محمد علی کمیدان کی زیرِ تحت تھا۔

تیسرے کے سالار بخشی ہیبت خاں تھے۔

چوتھے دستہ پر میر رضا علی خاں کو مقرر کیا گیا۔

باقی فوج نواب بہادر نے اپنے ساتھ رکھی۔

نواب بہادر کے دستے مدافعت کے لیے آگے بڑھے۔ انہوں نے دشمن کو رسد سے محروم کرنے کے لیے دیہاتوں کو لوٹ کر ویران کر دیا اور متحدہ لشکر پر شب خون مارنے شروع کر دیے۔

انگریزوں نے نواب بہادر کا زور توڑنے کے لیے بمبئی سے ایک فوج منگوا کر ساحلِ منگلور پر اتار دی اور اسے حکم دیا کہ بدنور (حیدر نگر) پر قبضہ کر لے۔

نواب بہادر کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے شہزادہ ٹیپو کو بدنور کی طرف روانہ کیا۔ پھر مشرقی محاذ میر رضا علی خاں کے سپرد کر کے خود بھی بدنور روانہ ہوئے۔

نواب بہادر کے جانے سے محاذ کمزور ہو گیا اور اتحادی فوجوں نے وانمباڑی، کنگن گڑھ، ہوسکوٹہ اور کولار وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔

کولار پر قبضہ کی خبر نے والاجاہ محمد علی کو بہت مسرور کیا کیونکہ یہ شہر نواب بہادر کا مولد تھا۔ والاجاہ نے فوراً کولار کو اپنا صدر مقام بنایا اور مراری راؤ کو جو گتی کا حاکم تھا، اپنے پاس بلا کر مفتوحہ علاقے اس کے سپرد کر دیے۔

والاجاہ کا خیال تھا کہ نواب حیدر علی خاں اپنے مولد کے ہاتھ سے نکل جانے سے اس کے مطیع ہو جائیں گے۔

دوسری طرف شہزادہ ٹیپو نے منگلور پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا جس پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ شہزادے کے پاس فوج کم تھی۔ وہ زیادہ مؤثر کارروائی نہ کر سکا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ انگریزی فوج

قلعہ میں قید ہوکے رہ گئی۔ اور بدنور پر قبضہ کا خواب، خواب ہو کر رہ گیا۔

اس عرصہ میں نواب بہادر بھی اپنے چند دستوں کے ساتھ منگلور پہنچے۔ شہزادے نے قلعہ کے محاصرے کا حال بتایا۔ نواب بہادر بیٹے کی کاروائی سے بہت خوش ہوئے۔

نواب بہادر کے پاس بھی زیادہ فوج نہ تھی۔ منگلور کا قلعہ بہت مضبوط تھا۔ اسے سر کرنے کے لیے کافی لشکر کی ضرورت تھی۔ اس وقت نواب بہادر کو ایک عجیب تدبیر سوجھی۔ انہوں نے قرب و جوار کے تمام لکڑی کا کام کرنے والے ترکھانوں کو بلوا لیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ لکڑی کی نمائشی بندوقیں تیار کریں۔ حکم پاتے ہی کاریگروں نے بندوقیں بنانا شروع کر دیں۔

دوسرا کام نواب بہادر نے یہ کیا کہ فوراً آٹھ ہزار آدمیوں کو سپاہی کے طور پہ بھرتی کر لیا۔ وہ سپاہی نہ تھے نہ بندوق چلانا جانتے تھے۔ وہ تمام کے تمام کاشت کار تھے۔ ان آٹھ ہزار سپاہیوں کے لیے رنگ برنگ اور جھلملاتے لباس تیار کیے گئے۔

جب لکڑی کی نمائشی بندوقیں تیار ہو گئیں تو نواب بہادر نے ان نمائشی سپاہیوں کو زرق برق لباس پہنا دیے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک بندوق پکڑا دی۔ بندوقوں پہ ایسی پالش کی گئی کہ دور سے وہ بالکل اصلی لگتی تھیں۔

اس طرح نواب بہادر نے آٹھ ہزار کا نمائشی لشکر جس کے ہاتھوں میں نمائشی بندوقیں اور بدن پر رنگ برنگ اور جھلملاتے ہوئے لباس تھے، اسے آہستہ آہستہ قلعہ منگلور کی طرف بڑھایا۔ قلعہ پر قابض فوج نے جب آٹھ ہزار بندوق بردار سپاہیوں کو قلعے کی طرف آتے دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ انہیں بھاگنے کی فکر ہوئی۔

اس وقت شہزادہ ٹیپو نے توپ خانہ کو حکم دیا کہ قلعے پر گولے برسانا شروع کر دے۔ خود شہزادے نے اپنے دستے کے ساتھ قلعے پر حملہ کر دیا۔ انگریز سراسیمہ ہو کر قلعہ سے ساحل کی طرف بھاگے وہ اپنے ساتھ کوئی سامان بھی نہ لے جا سکے۔

اس طرح مغربی محاذ پر انگریزوں کی حکمت عملی ناکام ہو گئی اور نواب حیدر علی خان پھر مشرقی محاذ پر واپس آ گئے۔

اس کے بعد سے نواب بہادر حیدر علی خان نے جو جنگیں انگریزوں، نظام دکن اور مرہٹہ سرداروں سے لڑیں ان سب میں شہزادہ ٹیپو برابر شریک رہا اور اپنے جری اور حوصلہ مند والد کی پشت سے پشت ملا کر دادِ شجاعت دیتا رہا۔

چونکہ اب شہزادہ ٹیپو سلطان کا تذکرہ بھرپور انداز میں شروع ہو رہا ہے جس میں آیندہ جنگوں کی تفصیل پیش ہو گی مگر نواب بہادر حیدر علی کا تذکرہ اختتام کو پہنچانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کے بقیہ کارناموں پہ (جن کی تفصیل سلطان ٹیپو کے ذیل میں آئے گی) ایک طائرانہ نظر ڈالتے چلیں۔

نواب بہادر حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان نے انگریزوں، نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کو اس قدر زچ کیا کہ وہ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

سب سے پہلے مرہٹہ سردار نے حیدر علی سے دوستی کا معاہدہ کیا اور اپنی فوج لے کر دوسری طرف نکل گیا۔

نظام کو اس خبر نے ہلا کے رکھ دیا۔ اس نے فوراً اپنے دیوان رکن الدولہ کے ذریعے صلح کا پیغام بھیجا اور مندرجہ ذیل شرائط پر صلح ہوئی:

۱۔ نواب محفوظ خان (نواب محمد علی والا جاہ کا بڑا بھائی) کی بیٹی شہزادہ ٹیپو سلطان کے عقد میں آئے گی۔

۲۔ نواب محفوظ خان بحیثیت میر انوار الدین کے بڑے بیٹے ہونے کے، صوبہ دار ارکاٹ مقرر ہوں اور وہ اپنا حق، ٹیپو سلطان کو تفویض کر دیں۔

۳۔ نواب حیدر علی خاں اور نظام حیدر آباد ہمیشہ ایک دوسرے کے حلیف رہیں گے۔

۴۔ نواب حیدر علی اور نظام حیدر آباد متفقہ طور پہ محمد علی والا جاہ کو معزول کرنے کی کوشش کریں گے۔

نواب حیدر علی اگر چاہتے تو مدراس پہ حملہ کر کے جنوبی ہند سے انگریزوں کے قدم ہمیشہ کے لیے اکھاڑ سکتے تھے مگر انہوں نے مغلوب دشمن کے ساتھ ایسی نرم شرائط رکھیں جن پہ لوگوں کو افسوس ہوا انگریزوں نے یہ شرطیں تسلیم کرنے میں پل بھر دیر نہ لگائی۔

شرائط حسبِ ذیل تھیں:

۱۔ آیندہ فریقین ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے۔

۲۔ فریقین ایک دوسرے کے مقبوضات اور قیدی واپس کر دیں گے۔

۳۔ علاقہ کرور جو محمد علی والا جاہ کی ملکیت تھا آیندہ سے نواب حیدر علی خاں

کی ملکیت تصور ہوگا۔

حیدر علی خاں نے اپنی فتح کی یادگار مدراس میں اس طرح چھوڑی کہ ان کے حکم سے انگریزوں نے ایک پتھر پر کندہ کیا ہوا کتبہ قلعہ سینٹ جارج کے دروازہ پر لگایا گیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ گورنر مدراس اور ممبران کونسل، حیدر علی خاں کے سامنے دو زانو بیٹھے ہیں اور حیدر علی خاں ایک ممبر کی ناک کو، جو ہاتھی کی سونڈ کی طرح لمبی تھی، پکڑ کر کھینچ رہے ہیں، جس میں سے اشرفیاں گر رہی تھیں اور کرنل اسمتھ ایک طرح صلحنامہ ہاتھ میں لیے اپنی تلوار توڑ کر رکھ رہا ہے۔

صلحنامہ مدراس کے بعد جب نواب بہادر سرنگاپٹم واپس آئے تو ان کے جلوس کے چشم دید حالات ایک فرانسیسی مورخ نے اس طرح بیان کیے ہیں:

"جس وقت نواب بہادر حیدر علی خاں کا جلوس سرنگاپٹم پہنچا تو جلوس میں پچاس ہزار سوار، اسی ہزار پیادے اور چار ہزار بندوقچی شامل تھے۔ توپ خانہ، بم برداروں اور تیر اندازوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی جس کی ترتیب اس طرح تھی:

۱۔ سب سے آگے یورپ کے سواروں کا رسالہ تھا۔ ان کی اونچی ٹوپیاں زرق برق وردیاں، چمکدار اسلحہ اور تنومند گھوڑے جاہ و جلال کی نشانی تھے۔

۲۔ ان کے پیچھے ۲۰۰۔ اونٹ تھے جن پر نامہ بری کا سامان بار تھا۔ کوہان والے ان اونٹوں پر بھالے لیے نامہ بر بیٹھے تھے۔

۳۔ ان کے پیچھے دو نہایت سربلند نشان بردار ہاتھی تھے۔ یہ نشان نیلے رنگ کے ریشمی اور زرکار پھریروں سے آراستہ تھے۔ ایک نشان پر سورج اور دوسرے پہ چاند ستاروں کو زریں کام سے بنایا گیا تھا۔

۴۔ اس کے بعد ایک بلند ہاتھی تھا جس پر نقاروں کی جوڑی تھی اور نقارچی نقارے بجا رہے تھے۔

۵۔ پھر قرنا بجانے والے سواروں کا ایک غول تھا۔

۶۔ ان کے پیچھے چار ہاتھیوں پر ۲۴۔ ارباب نشاط بیٹھے موسیقی کے

راگ الاپ رہے تھے۔

ان کے پیچھے آنے والوں کی ترتیب اس طرح تھی:

۷۔ پانچ ہاتھی جن پر طلائی عماریاں رکھی تھیں۔

۸۔ چار ہاتھی زریں ہشت پہلو ہودے۔ چھ چھ جوان چار آئینہ لگائے اور بندوقیں سنبھالے بیٹھے تھے۔

۹۔ دو رسالے حبشیوں کے۔

۱۰۔ کاوں کا ایک گروہ۔ سر پر شتر مرغ کے پر اور ہاتھوں میں بھالے۔

۱۱۔ جھنڈی برداروں کا گروہ

۱۲۔ حیدری شہزادے، سپہدار اور دوسرے افسر۔

۱۳۔ شکاری سواروں کی ایک جماعت۔

۱۴۔ خاصہ کے بارہ گھوڑے۔

۱۵۔ پیادوں کی فوج جس کے ہاتھوں میں سنہری ملمع کا سیاہ عصا تھا۔

۱۶۔ ترکی گھوڑوں پر بارہ سوار۔

۱۷۔ منصب دار خانگی۔

۱۸۔ میر صدقات کا ہاتھی۔

۱۹۔ پھر نواب بہادر کا ہاتھی، سفید رنگ کا یہ ہاتھی جھوم جھوم کر آرہا تھا۔

۲۰۔ دو سو ہاتھیوں کی قطار۔

۲۱۔ پانچ ہاتھی جن میں ایک پر طلائی مسجد رکھی تھی۔

۲۲۔ دو رسالے حبشیوں کے۔

۲۳۔ حبشیوں کی پلٹن۔

۲۴۔ جانثار سپاہیوں کا غول۔



نواب حیدر علی خاں کی فتوحات اور انگریزوں اور نواب کے درمیان صلح نامہ مدراس کی خبر جب مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کو پہنچی تو وہ غصہ سے بلبلا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہ آرہا تھا کہ وہ حیدر علی خاں جسے اس نے صرف پانچ سال پیشتر سرنگاپٹم کے مضافات میں ایک زبردست شکست سے دوچار کیا تھا، اس نے اس مختصر عرصہ میں اتنی بڑی طاقت کیسے جمع کر لی کہ انگریزوں کو نواب کی شرائط پر صلح کرنا پڑی۔

چنانچہ اس نے اپنے عالی دماغ وزیر نانا فرنویس سے استفسار کیا:

"نانا فرنویس۔ کیا یہ سچ ہے کہ حیدر علی خاں جب مدراس سے صلح کر کے سرنگاپٹم واپس آیا تو اس کے لشکر کے جلوس میں پچاس ہزار جرار سوار، اسی ہزار پیادے اور چار ہزار بندوقچی شامل تھے؟"

وزیر نانا فرنویس نے بڑی متانت سے جواب دیا:

"پیشوائے محترم۔ میری اطلاع کے مطابق نواب حیدر علی خاں کے لشکر کی اس تعداد میں توپخانہ اور بان و بم برداروں کی تعداد شامل نہیں۔

ہمارے جاسوسوں کا اندازہ ہے کہ اس وقت نواب کے پاس بہترین اسلحہ کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر کیل کانٹے سے درست کھڑا ہے اور اس وقت نواب کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔"

نانا فرنویس کا آخری جملہ سن کر مرہٹوں کے سپہ سالار ترمک راؤ کے تن بدن میں آگ

لگ گئی، وہ چیخ کر بولا:

"وزیر اعظم کی عقل و فراست پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت حیدر علی کا کوئی مقابل نہیں۔

کیا یہ غلط ہے کہ مرہٹہ لشکر نے سرنگاپٹم پہنچ کے حیدر علی کو شکستِ فاش دی تھی اور اس نے سات لاکھ کی رقم دے کر اپنی جان بچائی تھی؟"

"ذرا ٹھہرو ترمک راؤ"

پونا کے پیشوا نے ترمک راؤ کی بات کاٹ دی:

"ہمیں یاد پڑتا ہے کہ حیدر علی خاں نے ہمیں سات لاکھ کی ادائیگی کی تھی اور پانچ لاکھ مزید ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"پیشوائے اعظم نے بالکل درست فرمایا۔"

ترمک راؤ کے بولنے سے پہلے ہی نانا فرنویس نے بات درمیان سے اچک لی۔ دراصل اُسے ترمک راؤ کا اپنی اور پیشوا کی گفتگو میں دخل دینا سخت ناگوار گزرا تھا۔ نانا فرنویس نے ذرا توقف اور سانس لینے کے بعد اپنی بات پوری کی:

"پونا کے دربار کی پچاس لاکھ کی رقم حیدر علی کی طرف پچھلے پانچ سال سے واجب الادا چلی آرہی ہے مگر نواب نے اس سلسلہ میں کوئی پیشرفت نہیں کی اور نہ ادائیگی کے لیے مزید وقت کی درخواست کی ہے۔ ان حالات میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ نواب سے رقم کی ادائیگی کا سختی سے مطالبہ کیا جائے؟"

"سختی سے مطالبہ ــــ"

مادھو راؤ نے یہ الفاظ زیرِ لب دہرائے:

"تم نے ٹھیک کہا نانا فرنویس۔ حیدر علی سے واقعی سختی سے مطالبہ کیا جائے گا مگر یہ مطالبہ زبانی یا تحریری نہیں ہوگا بلکہ ہم یہ مطالبہ نوکِ شمشیر اور توپ خانہ کی زبان سے کریں گے ــــ کیوں ترمک راؤ۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

پیشوا نے ترمک راؤ کو براہِ راست مخاطب کیا تو اس کا سینہ مسرت سے پھول گیا۔ اس نے شمشیر پہ ہاتھ رکھ کر کہا:

"غلام صرف پیشوا کے حکم کا منتظر ہے۔ بہادر تو میدانِ جنگ کا نغمہ سننے کے لیے ہر وقت

بے بس رہتے ہیں۔"

پیشوا نے اسی وقت فیصلہ کر دیا:

"ہم تمہاری بات سے خوش ہوئے ترنک راؤ۔ تمہیں لشکر کی تیاری کا حکم دیا جاتا ہے ۔۔۔ ہم حیدر علی کے پاس خود جائیں گے اور اس سے پچاس لاکھ کی رقم مع سود کے وصول کریں گے۔ اس کے بعد ہمارا لشکر سرا پر اپنی علمداری قائم کرے گا تاکہ جنوبی ہند میں مرہٹہ طاقت کو شہنشاہیت کے روپ میں ڈھالا جاسکے۔"

"ایسا ہی ہوگا پیشوائے اعظم۔"

ترنک راؤ نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی:

"جنوبی ہند میں مرہٹہ سورج ایک بار پھر چمکے گا۔"

نواب حیدر علی خاں کے ذمے پچاس لاکھ کی واجب الادا رقم کا قصہ اس طرح تھا کہ ۱۷۶۱ء میں بھی اسی طرح مرہٹوں نے ابساجی کی سرداری میں سرنگا پٹم پر یلغار کی تھی اور نواب نے اپنی مختصر فوج کے ساتھ مرہٹہ لشکر کو اس قدر پریشان کیا تھا کہ وہ صلح کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ حیدر علی بھی ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے "بارہ محل" کا علاقہ مرہٹوں کو دینے کا اعلان کیا اور صلح ہوگئی۔

ابساجی خوش خوش اپنے لشکر کے ساتھ بارہ محل پر قبضہ کے لیے روانہ ہوا مگر جب وہ بارہ محل پہنچا تو حیدر کے قلعہ داروں نے اسے قبضہ دینے سے انکار کر دیا۔

ابساجی کے لیے یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ اسے حیدر علی اور بارہ محل کے قلعداروں پر بہت غصہ آیا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بارہ محل کے تمام قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور انہیں منہدم کر کے زمین کے برابر کر دے گا۔

ابساجی کے ارادے بڑے خطرناک تھے مگر اسی وقت مرہٹوں کی طاقت کو ایک ایسا دھچکا لگا کہ شمالی ہند میں ان کی قوت کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا۔

مرہٹوں نے مسلمان فاتح احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں پانی پت کی تیسری جنگ میں ایسی شرمناک شکست کھائی کہ انہیں شمالی ہند چھوڑ کے پونا میں پناہ حاصل کرنا پڑی۔

پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی اس شکست کی خبر ابساجی کو ملی تو اس کے ارادوں پر اوس پڑ گئی اور وہ مرہٹہ لشکر لے کر فوراً پونا واپس ہو گیا۔

اس کے بعد ہی پونا کے حالات بدل گئے۔

مرہٹوں کے پیشوا بالاجی باجی راؤ کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ پونا کی گدی پر مادھو راؤ بیٹھا۔

اس نے مرہٹہ لشکر کو از سر نو ترتیب دیا۔ اس وقت نواب حیدر علی خاں کا جنوبی ہند میں طوطی بول رہا تھا۔

مادھو راؤ کو حیدر علی کا اقتدار پسند نہ آیا اور اس نے ایک لاکھ سوار، ساٹھ ہزار پیادے اور پچاس ہزار تیراندازوں کے ساتھ سرنگا پٹم پر چڑھائی کر دی۔

حیدر علی کو مادھو راؤ کے آنے کی خبر ملی تو وہ مقابلہ کے لیے نکلے اور ماگڑی کے جنگل میں گھات لگا کر مرہٹہ ہراول پر حملہ کر کے اسے پوری طرح برباد کر دیا۔

مادھو راؤ نے ایک فوج بارہ محل پر قبضہ کے لیے بھی روانہ کی تھی۔ اس فوج کو حیدر علی کے پنڈاروں نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔

مادھو راؤ ان دو شکستوں سے گھبرا اٹھا۔

ادھر حیدر علی بھی مرہٹوں کو کسی نہ کسی طرح واپس کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے سات لاکھ روپے مادھو راؤ کو بھجوائے اور یہ وعدہ کیا کہ وہ پچاس لاکھ روپے بطور تاوان مزید ادا کریں گے بشرطیکہ مرہٹہ لشکر پونا واپس ہو جائے۔

مادھو راؤ نے اس پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ وہ سات لاکھ کی رقم لے کر پونا لوٹ گیا۔

یوں پچاس لاکھ کی رقم اب تک نواب بہادر کے ذمے واجب الادا چلی آ رہی تھی۔

اس وقت پونا دربار میں انہی پچاس لاکھ کا ذکر ہوا تھا اور پیشوا مادھو راؤ نے اپنے موجودہ سپہ سالار کو لشکر کی تیاری کا حکم دیا تھا۔

مادھو راؤ کے وزیر نانا فرنویس کی رائے یہ تھی کہ نواب حیدر علی کے خلاف واجب الادا رقم کا سختی سے مطالبہ کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ عین ممکن ہے کہ حیدر علی بغیر جنگ کے رقم ادا کرنے پر آمادہ ہو جائے مگر مادھو راؤ اور ترنک راؤ میں جو گفتگو ہوئی تھی اس کا صاف مطلب تھا کہ اب جنگ ناگزیر ہے اور سرنگا پٹم پر حملہ ضرور کیا جائے گا۔

پس مرہٹہ وزیر نانا فرنویس نے جنگ کے خلاف ہونے کے باوجود خاموشی اختیار کر لی۔

کیونکہ شخصی حکومتوں میں شاہِ وقت سے اختلاف کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا اگر بادشاہ رات کو دن کہے تو دربار کے تمام چھوٹے بڑے درباریوں کا فرض ہوتا تھا کہ وہ بادشاہ کی غلطی کی نشاندہی کرنے کے بجائے اس کی ہاں میں ہاں ملائیں ورنہ اپنے سر سے جائیں۔

اُس دن ترنک راؤ جب شام کو دربار سے اپنی حویلی پر پہنچا تو خوشی کے مارے پھُولے نہ سما رہا تھا۔ ترنک راؤ نے سپہ سالار کی حیثیت سے کئی لڑائیاں لڑی تھیں اور ان میں فتح حاصل کی تھی لیکن وہ صرف "لڑائیاں" تھیں۔ انہیں جنگ" کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ترنک راؤ کا خیال تھا کہ جنگ نوابؔ ہوگی اور اسے اپنی بہادری کے پورے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔

اس کا خیال کسی حد تک صحیح بھی تھا۔ اس لیے کہ جنوبی ہند میں اگر مرہٹوں کے بعد کوئی اور طاقت تھی تو وہ نواب حیدر علی خاں کی ریاست میسور تھی۔ جسے نواب بہادر نے سلطنتِ خداداد کا نام دیا تھا۔ یوں تو نظام دکن اور مدراس کے بدیسی حاکموں یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کی بھی ایک طاقت تھی۔ مگر وہ دونوں ہی نواب حیدر علی سے یا تو شکست کھا چکے تھے یا انہوں نے نواب سے دوستی کے معاہدے کر لیے تھے۔ سب سے آخری معاہدہ "معاہدۂ مدراس" تھا جس کے مندرجات سے ظاہر تھا کہ انگریزوں نے نواب بہادر سے کس قدر دب کے اور خائف ہو کر یہ معاہدہ کیا تھا۔

ترنک راؤ اسی نواب بہادر حیدر علی خاں کے مقابلہ پر بھیجا جا رہا تھا۔ پیشوا نے اسے اس اہم جنگ کی ذمہ داری سونپ دی تھی اور حکم دیا تھا کہ وہ جس قدر اور جتنی چاہے فوج تیار کر لے مگر یہ خیال رکھے کہ اس بار حیدر علی کے مرکز یعنی سرنگاپٹم کا نام میسور کی سرزمین اور تاریخ سے مٹا دینا ہے۔

ترنک راؤ کو جوان تو نہیں کہا جا سکتا تھا اس لیے کہ اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی مگر بظاہر وہ ایک تنومند اور مضبوط کاٹھی کا انسان تھا اور اس میں بلا کی پھُرتی اور قوت تھی۔

مرہٹے عام طور پر دراز قامت نہ ہوتے تھے لیکن ترنک راؤ کا قد عام مرہٹوں سے کچھ نکلتا ہوا تھا اور شکل و شباہت سے بھی وہ ایک بارعب سپہ سالار معلوم ہوتا تھا۔

بہادری کے ساتھ ساتھ ترنک راؤ میں حسن پرستی کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ یوں تو اس کے تصرف میں بہت سی حسین عورتیں تھیں جنہیں اس نے ایک بڑی حویلی میں رکھا تھا اور وہیں ان کے قیام و طعام کا معقول انتظام کیا ہوا تھا لیکن اس حویلی کی طرف اس کا جانا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ پونا ہی میں اس کی

دو حویلیاں اور تھیں جو اُسے اتنا وقت نہ دیتی تھیں کہ وہ بڑی حویلی کی طرف جا سکے۔

ان دو حویلیوں میں سے ایک میں اس کی خاندانی بیاہتا بیوی رہتی تھی جس سے ترنک راؤ کی دو اولادیں تھیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ دونوں ہی جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہی تھیں۔ مگر دوسری حویلی میں رہنے والی ایک ایسی نازک اندام حسینہ تھی جس نے سنگدل اور سخت دل ترنک راؤ کو پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔

اس دوشیزہ کا نام رچنا تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے اس کے ایک سپاہی نے رچنا کو ترنک راؤ کے حضور پیش کیا تھا۔ ترنک راؤ اگرچہ ادھیڑ عمر کا ایک سمجھدار آدمی تھا مگر رچنا کے حسن میں اس بلا کی جاذبیت تھی کہ اسے دیکھتے ہی وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اس نے رچنا کے لیے فوراً ایک حویلی کا انتظام کیا اور وہاں اسے رانیوں کی طرح رکھا۔

رچنا کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کی بیٹی ہے یا کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اسے پیش کرنے والے نے ترنک راؤ کو صرف یہ بتایا تھا کہ:

"رچنا کسی مضبوط سہارے کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھی کہ میرے ہاتھ لگ گئی اور میں اسے مرہٹہ لشکر کے سپہ سالار یعنی آپ کے پاس لے آیا کہ آپ سے زیادہ مضبوط سہارا کوئی دوسرا کیا ہوگا!"

رچنا کی خوبصورتی کی خبر شدہ شدہ مادھو راؤ کو بھی پہنچی تھی۔ اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مرہٹہ سپہ سالار نے ایک خوبصورت بلبل کو ایک بہت خوبصورت محل میں قید کر رکھا ہے مگر مادھو راؤ اس اطلاع پر صرف مسکرا کر رہ گیا تھا کیونکہ مادھو راؤ اور ترنک راؤ میں بڑا پرانا یارانہ تھا اور جوانی کے زمانہ میں دونوں ہم مشرب، ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔

پیشوا ہونے کے بعد مادھو راؤ کی خوش فعلیوں پر ذمے داریوں کا سایہ پڑ گیا مگر ترنک راؤ سپہ سالار ہونے پر کچھ اور کھُل کھیلنے لگا تھا۔

رچنا کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ واقعی ایک کھِلتا ہوا گلاب تھی۔ اس کا اور ترنک راؤ کا کوئی جوڑ نہ تھا مگر رچنا، جس کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہ تھی، ترنک راؤ کو نہ صرف دل و جان سے چاہتی تھی بلکہ اسے اپنا بھگوان اور اَن داتا سمجھتی تھی۔

ممکن ہے کہ اس میں ترنک راؤ کے لیے یہ خلوص اس وجہ سے پیدا ہوگیا ہو۔ اس نے

یہاں آنے سے پہلے مصائب کے کئی دریا پار کیے تھے اور ترنگ راؤ کا عطا کردہ یہ محل (حویلی) اس کے لیے جنت سے کم نہ تھا۔

ترنگ راؤ جب رچنا کی حویلی میں داخل ہوتا تو وہ مسکراتے چہرے سے اپنے بھگوان کا استقبال کرتی اور اس کے پیروں میں بیٹھ کے اس کے خاک و دھول میں اٹے ہوئے جوتوں کو اتارتی اور انہیں بے تکلف اپنی قیمتی ساڑی کے پلو سے صاف کرتی۔ پھر دوڑ کے پانی کا ایک آفتابہ اور ڈول اٹھا لاتی اور ترنگ راؤ کے میلے پیروں کو آفتابہ میں رکھ کے دھوتی۔

اس دوران ترنگ راؤ رچنا کے لانبے بالوں سے کھیلتا، ان میں انگلیاں پھیرتا اور شاید اپنی جوانی کے بیتے دنوں کو یاد کرتا رہتا۔

اس شام رچنا نے اپنے بھگوان کو مسکراتے چہرے کے ساتھ حویلی میں داخل ہوتے دیکھا تو دوڑ کے اس سے لپٹ گئی۔

قریب کھڑی دو داسیاں رچنا کے اس والہانہ انداز پر شرما گئیں اور سر جھکا کے دوسری طرف چلی گئیں۔ پھر رچنا نے حسبِ معمول ترنگ راؤ کے پاؤں میں بیٹھ کر اس کے جوتے اتارے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے پیر دھلائے۔

ترنگ راؤ نے ایک عالم بے خودی میں رچنا کو اپنی طرف کھینچ لیا:

"رچنا، تم مجھے چھوڑ کر چلی تو نہ جاؤ گی؟" ترنگ راؤ نے نہ جانے کس جذبے اور خدشے کے تحت کہا۔

رچنا نے کسمساتے ہوئے کہا:

"آپ میرے بھگوان ہیں۔ بھگوان بھلے ہی اپنی پجارن سے منہ پھیر لیں مگر پجارن اپنے بھگوان کو چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہے!"

ترنگ راؤ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ممکن ہے کہ یہ گئی جوانی کا ماتم ہو:

"مجھے ایسا لگتا ہے رچنا جیسے کوئی تمہیں مجھ سے چھین لے گیا ہے۔"

"ایسی باتیں نہ کرو بھگوان۔ موت کے سوا کوئی اور مجھے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔" رچنا نے تڑپ کے کہا۔

پتہ نہیں ترنگ راؤ نے اس کا جواب سنا کہ نہیں کیونکہ اس کی نظریں کھلے آسمان میں جیسے کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

رچنا نے اس کی افسردگی دور کرنے کے لیے کہا:

"آپ آئے تھے تو مسرت جیسے آپ پر قربان ہو رہی تھی مگر اب آپ افسردہ ہو گئے — آخر کیوں؟"

ترنگ راؤ جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا۔ اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا:

"بے شک۔ جب میں حویلی میں داخل ہوا تھا تو بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ مجھے ایک عظیم لشکر کا سپہ سالار بنایا گیا ہے اور میں وہ عظیم جنگ لڑنے جا رہا ہوں جس کی مثال جنوبی ہند کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔"

رچنا نے اپنی بھاری پلکیں پٹ پٹائیں:

"میں سمجھ نہیں پائی بھگوان۔ کیسا لشکر۔ کیسی جنگ؟"

رچنا جیسی سیدھی سادی لڑکی کے لیے ترنگ راؤ کی باتیں کسی معمہ سے کم نہ تھیں۔ اس نے اپنے ہوش میں صرف مصائب دیکھے تھے پھر بھلا جنگ اور لشکر کی باتیں اس کی سمجھ میں کس طرح آتیں؟

ترنگ راؤ نے آفتابہ سے اپنے پیر کھینچ لیے اور قریب رکھی ہوئی ایک چوکی پر بیٹھ گیا۔ چوکی کے پایوں پر چاندی کے پتر منڈھے ہوئے تھے۔ اس نے رچنا کو بھی اپنے سامنے ویسی ہی ایک چوکی پر بٹھا دیا۔

پھر اس نے رچنا کو سمجھایا:

"دیکھو رچنا۔ جنگ اسے کہتے ہیں کہ ایک راجہ دوسرے راجہ پر حملہ کرے اور دونوں کی سینائیں (فوجیں) ایک دوسرے سے لڑیں اور ان میں سے ایک میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔"

رچنا کی سمجھ میں پھر بھی نہ آیا۔ اس نے معصومیت سے پوچھا:

"مگر بھگوان۔ ایک راجہ کو دوسرے راجہ سے لڑنے کی کیا ضرورت۔ وہ اپنی راجدھانی میں خوش رہے اور دوسرا اپنی راجدھانی میں چین کی بنسی بجائے!"

ترنگ راؤ چڑ سا گیا۔ ذرا سختی سے بولا:

"ایسا نہیں ہوتا رچنا۔ ہمارا پیشوا مادھو راؤ۔ دکھنی بھارت کا سب سے بڑا راجہ ہے مگر ایک مسلمان ملیچھ حیدر علی ہمارے پیشوا کا حکم نہیں مانتا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اسے دنیا سے نیست و نابود کر دوں۔"

رچنا، ترنگ راؤ کے سخت لہجہ سے سہم گئی۔ اس نے فوراً بات بدل دی:

"تو بھگون ۔ اس لڑائی میں آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں گے ناں؟"
ترمک راؤ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا:

"کیوں نہیں ۔ کیوں نہیں ۔ تم میرے ساتھ ضرور چلو گی ۔ یہ بات تو میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم بھی میری طرح بہادر اور جی دار ہو۔ میرا خیال تھا کہ لڑائی اور جنگ کا نام سن کر تم ڈر جاؤ گی۔"

رچنا مسکرا دی۔

اور ___ ترمک راؤ کی جوانی کا ڈھلتا سورج ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔

رچنا بڑی لگاوٹ سے بولی:

"بھگون ۔ ڈر تو مجھے اس وقت لگتا جب آپ مجھے اتنی بڑی حویلی میں اکیلا چھوڑ کے چلے جاتے ۔ وہاں تو آپ میرے ساتھ ہوں گے ۔ پھر مجھے کس بات کا ڈر ہو گا۔"

رچنا کی محبت اور اس کی گداز جوانی نے ترمک راؤ کو اپنی دوسری بیویوں کی طرف سے تقریباً غافل کر دیا تھا۔ وہ صرف مشہور تہواروں کے موقع پر اپنے بال بچوں اور دوسری داشتاؤں کے پاس جاتا تھا۔ اس وقت صرف رچنا کا بول بالا تھا اور اس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جلتا تھا۔ دربار کی حاضری اور فوجی ضرورتوں کے بعد اس کا جو وقت بچتا تھا اس کی مالک صرف اور صرف رچنا تھی۔

مگر ___

اسی وقت ترمک راؤ کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب مرہٹوں کے پیشوا نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ:

"ہمارے ذاتی جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ حیدر علی نے سرنگا پٹم میں ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے انگریزوں سے مدراس میں جو معاہدہ کیا ہے اس میں یہ شرط لکھی گئی ہے کہ حیدر علی اگر کسی سے جنگ آزما ہو گا تو انگریز اپنی فوجوں سے اس کی مدد کریں گے۔"

مادھو راؤ نے اتنا کہہ کر اپنے وزیر اعظم نانا فرنویس کی طرف دیکھا:

"نانا فرنویس ۔ کیا تمہیں بھی اسی قسم کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں؟"

"جی ہاں پیشوائے معظم!" وزیر اعظم نے فوراً جواب دیا:

"آج میں ایسی ہی اطلاعات کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا تھا۔ مجھے تو یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ حیدر علی نے مدراس سے انگریزی فوج کے کچھ دستے سرنگا پٹم بلا لیے ہیں اور خیال ہے کہ وہ کسی بڑی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔"

وزیر اعظم نے یہ بات اتنے وثوق سے کہی تھی کہ پیشوا اور سارے درباری حیران رہ گئے، سوائے سپہ سالار ترمک راؤ کے۔ اسے وزیر اعظم پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ آخر اس سے ضبط نہ ہوا اور وہ بول ہی پڑا:

"پیشوائے اعظم ۔ میں جاسوسوں کی بات رد تو نہیں کرتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان خبروں میں بہت زیادہ مبالغہ ہے ۔ حیدر علی کی طاقت اتنی زیادہ نہیں بڑھی ہے کہ اس پر قابو نہ پایا جا سکے ۔ میں اسے سرنگا پٹم سے نکلنے نہ دوں گا اور وہیں اس کی قبر بنے گی۔"

پیشوا نے مسکراتے ہوئے کہا:

"ہم اپنے سیناپتی ترمک راؤ کے جوش و جذبہ کی قدر کرتے ہیں اور ہمیں ان سے ایسی ہی امید ہے مگر دشمن کو کسی وقت بھی کمزور نہ سمجھنا چاہیے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ملیبور کے خلاف ہم بذات خود اپنے لشکر کی کمان سنبھالیں گے۔ وزیر اعظم نانا فرنویس اور سیناپتی ترمک راؤ ہمارے نائب کی حیثیت سے اس جنگ میں ہمارے مددگار ہوں گے۔"

وزیر اعظم نہ جانے کیوں پیشوا کے اس فیصلے سے خوش ہوا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی چمک سی پیدا ہوئی۔

اس کے برعکس ترمک راؤ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ جو کچھ کسر باقی رہ گئی تھی وہ پیشوا کے اگلے اعلان نے پوری کر دی:

مادھو راؤ پیشوا نے کہا:

"مزید یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ چونکہ یہ جنگ مرہٹہ قوم کی زندگی اور موت کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس جنگ کے دوران جنگ میں حصہ لینے والوں کو اپنے ساتھ بال بچوں یا کسی اور عورت کو لے جانے یا ساتھ رکھنے کی قطعی اجازت نہ ہو گی۔"

ترمک راؤ کے دل میں مچلتے ہوئے جذبات بالکل ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس نے سوچا تھا کہ اس مہم میں رچنا اس کے ساتھ ہو گی ۔ پونا میں بھی رچنا ہی اس کے ساتھ ہوتی تھی اور وہ کسی اور عورت کے گھر رات نہ گزارتا تھا مگر اس مہم میں رچنا کا اس کے ساتھ ہونا اس کے لیے نعمت سے کم نہ ہو گا اس لیے

کہ وہ مرہٹہ لشکر کا سپہ سالار ہوگا۔ وہاں صرف اس کا حکم چلے گا۔ وہ جیسے چاہے گا جنگ کرے گا اور جس طرح چاہے گا اپنی جانِ تمنا رچنا کے ساتھ گلچھرّے اڑائے گا۔
مگر ـــــ

آج کے اعلان نے اس کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیے تھے اور جب وہ شام کو دربار سے حویلی پہنچا تو اس کا تھوبڑا پھولا ہوا تھا۔

رچنا اسے دیکھ کر ڈر گئی:

"خیر تو ہے بھگون۔ آج آپ بہت خاموش ہیں؟" یہ کہتے ہوئے رچنا نے اس کے جوتے کھولنے کے بجائے اس کے گلے میں اپنی باہیں حائل کر دیں۔

ترمک راؤ کے بجھے ہوئے دل میں جوانی کی ایک چنگاری چٹخی۔ اس نے بھی رچنا کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"یہ جو اپنا مہامنتری ہے نا۔ ارے وہی نانا فرنویس۔ بڑا خبیث ہے یہ سا... اس نے پیشوا کو ڈرا دیا ہے کہ حیدر علی کے پاس بہت بڑا لشکر ہے۔

پیشوا بھی عجیب ہی آدمی ہے۔ اس نے بھی نانا فرنویس کی بات کا یقین کر لیا۔ میں نے کہا بھی کہ یہ خبر غلط ہے اور دشمنوں کی اڑائی ہوئی افواہ ہے مگر پیشوا نے میری ایک نہ سنی اور اعلان کر دیا کہ فوجوں کی وہ خود سرداری کرے گا۔"

رچنا گھبرا گئی۔ اس نے پوچھا:

"تو کیا پیشوا نے آپ کو سرداری سے ہٹا دیا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ دراصل رچنا کو ترمک راؤ سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ تو اس مضبوط سہارے کی قدر کرتی تھی جو ترمک راؤ کو مرہٹہ سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھا۔

"اری پگلی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سپہ سالار تو میں ہی رہوں گا مگر اب حکم پیشوا کا چلے گا وہ جس طرح چاہیں گے فوجوں کو لڑائیں گے۔" ترمک راؤ نے اسے سمجھایا۔

"یہ تو میرے لیے بہت اچھا ہوا۔" رچنا نے اس طرح کہا جیسے یہ اس کے لیے کوئی اہم بات ہی نہ تھی۔

ترمک راؤ اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"کیوں۔ اچھا کیوں ہوا۔ تجھے اس سے کیا ملے گا؟" ترمک راؤ کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ وہ اس بھولی لڑکی کو کیسے سمجھاتا کہ پیشوا کی موجودگی میں اس کی حیثیت ایک معمولی سپاہی سے زیادہ نہ ہو گی۔

رچنا نے ترمک راؤ کی تلخی کا جواب ایک بھرپور ادا سے دیا۔ وہ بولی:

"رچنا کو اس سے یہ ملے گا کہ اس کا بھگون جنگ کے دنوں میں بھی اپنی پیارن کے پاس رہے گا۔ آپ کو لڑائی کے جھنجھٹوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور آپ دن بھر کی لڑائی کے بعد بے فکر ہو کر میرے پاس آیا کریں گے"۔

"تیرا یہی خیال غلط ہے رچنا"۔

ترمک راؤ نے افسردگی سے جواب دیا:

"اگر ایسا ہوتا تو مجھے کوئی غم نہ ہوتا مگر پیشوا نے میدانِ جنگ میں عورتوں کو ساتھ لے جانے سے منع کر دیا ہے"۔

"کیا کہا آپ نے؟" رچنا کا دل مسرت سے جھوم اٹھا تھا مگر اسے مصنوعی حیرت اپنی آنکھوں میں سجانا پڑی تھی:

"اس کا مطلب ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکوں گی"۔

"اب تم سمجھی ہو اصل بات"۔ ترمک راؤ بولا:

"پیشوا نے تمام لشکریوں کو اپنے ساتھ عورتوں کو لے جانے سے منع کر دیا ہے"۔

"مگر اب کیا ہو گا۔ میں آپ کے بنا اکیلے کیسے رہوں گی"۔ رچنا نے اپنی آواز میں افسردگی شامل کر دی تھی۔

دراصل وہ جنگ پہ جانے سے گھبراتی تھی مگر ترمک راؤ کے حکم سے انکار بھی نہ کر سکتی تھی۔ اب اس نے چین کا سانس لیا تھا۔ اس نے ظاہر یہی کیا تھا کہ اسے ترمک راؤ کے ساتھ نہ جانے کا بے حد افسوس ہے اور اس کے بغیر اس کا وقت اچھا نہ گزرے گا۔

ایک مثل مشہور ہے کہ: "گنوار گوں کا یار"۔

یعنی دیہاتی اَن پڑھ جسے ہم غلطی سے بے وقوف سمجھتے ہیں وہ دراصل بے وقوف نہیں ہوتا بلکہ اپنے مفاد کا پورا خیال رکھتا ہے ـــــ رچنا کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بظاہر بہت بھولی بھالی تھی

مگر اپنے اچھے برے کو خوب سمجھتی تھی۔

رچنا، ترمک راؤ کی سانسوں سے بھی قریب تھی لیکن اسے کسی پہلو چین نہ آ رہا تھا۔ میسور کے محاذ پر خود جانے کے پیشوا کے اعلان نے اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا کے رکھ دیا تھا۔

اس زمانے میں صرف طاقت کا بول بالا تھا۔ یہاں تک کہ پونا کے پیشوا ہونے کے لیے بھی طاقت ہی ضروری تھی۔

ادھر ترمک راؤ کے دل کے کسی کونے کھدرے میں پیشوا بننے کی خواہش دبی ہوئی تھی اور اس خواہش کی تکمیل کا یہ بہترین موقع تھا۔

حیدر علی خاں پر قابو پانا ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔

فرانسیسی، انگریز، مرہٹے اور نظام دکن سب ہی باری باری قسمت آزمائی کر چکے تھے اور انہیں منہ کی کھانا پڑی تھی۔

چنانچہ ترمک راؤ نے سوچا تھا کہ وہ اپنی سپہ سالاری میں میسور پر ایسا حملہ کرے گا کہ جس کا خیال حیدر علی کے گمان میں بھی نہ ہوگا۔ اس کا یہ خیال کسی حد تک درست بھی تھا کہ اس وقت مرہٹہ طاقت ایک بار پھر اپنے عروج پر آ چکی تھی۔

ترمک راؤ نے انہی خیالوں میں کروٹیں بدل بدل کر سویرا کر دیا۔ رچنا کی تمام ادائیں، ناز و انداز اور غمزے و عشوے اس رات ترمک راؤ پر بے اثر ہو کے رہ گئے۔

صبح کو جب ترمک راؤ دربار جانے لگا تو رچنا کا منہ پھولا ہوا تھا مگر ترمک راؤ اس پر توجہ دیے بغیر دربار چلا گیا۔

ترمک راؤ راج محل پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مادھو راؤ پیشوا اپنے وزیر نانا فرنویس کے ساتھ صبح سے لشکر گاہ گیا ہوا ہے۔

"نانا فرنویس"۔ ترمک راؤ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

اسے نانا فرنویس سے دلی نفرت تھی اور جب پیشوا نے نانا فرنویس کے لشکر کے ساتھ جانے کا اعلان کیا تو ترمک راؤ کو اس سے اور زیادہ نفرت ہو گئی۔

اس کا خیال تھا کہ وزیر کا کام صرف ملکی انتظام تک محدود تھا۔ اسے فوجی معاملات میں نہ تو خود

دخل دینا چاہیے اور نہ پیشوا کو اسے اتنا منہ لگانا چاہیے۔

ترمک راؤ لشکر گاہ کے میدان میں پہنچا تو یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ پیشوا اور وزیر اعظم پسینے میں شرابور میدان میں کھڑے فوجی مشقیں دیکھ رہے ہیں۔

پیشوا تو ایک ہی جگہ کھڑا تھا مگر وزیر اعظم بھاگ بھاگ کر ایک سے دوسری صف میں جا رہا تھا ترمک راؤ کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر پیشوا کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔

مرہٹہ لشکر گاہ میں دو ہفتے تک فوجیں اکٹھا ہوتی رہیں۔ تمام مرہٹہ علاقوں کو حکم بھیجا گیا تھا کہ پیشوا بذات خود ایک اہم مہم پر روانہ ہو رہا ہے اس لیے تمام مرہٹہ سردار اور وہ سردار جو مرہٹوں کے حلیف ہیں، اپنے اپنے لشکر کے ساتھ جلد از جلد پونا پہنچ جائیں۔ چنانچہ صبح سے رات گئے تک فوجوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔

اس دوران پیشوا، وزیر اعظم اور سپہ سالار کا عیش و آرام خاک میں مل گیا۔ خصوصاً ترمک راؤ جو پیشوا سے بھی زیادہ عیش پسند تھا، اس کے لیے یہ ایام بہت سخت اور تکلیف دہ ثابت ہو رہے تھے۔

پھر ۱۷۶۲ء میں پیشوا اپنا لشکر لے کر میسور کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نواب حیدر علی خاں کو پیشوا کی پونا سے روانگی کی خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ بڑا بیدار مغز حکمران تھا۔ وہ جنگ اور امن، دونوں حالتوں میں اپنے محکمہ جاسوسی پر خاص توجہ دیتا تھا۔

میسور کے ارد گرد کے تمام رجواڑے، سلطنتیں اور حکومتوں کی تمام غیر معمولی فوجی نقل و حرکت کی خبریں انہیں اپنے جاسوسوں کے ذریعے ملا کرتی تھیں۔

جس وقت مرہٹہ لشکر گاہ میں پہلی مرتبہ پیشوا نے مرہٹہ لشکر کا معائنہ کیا تھا اسی وقت حیدر علی کو پونا کے گرد کے جاسوسوں نے زبانی اور تحریری طور پر اطلاع دی تھی۔

"نواب بہادر۔ مرہٹہ لشکر میں بڑے زور کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ پیشوا، وزیر اعظم اور مرہٹہ سپہ سالار ترمک راؤ سب کے سب فوجی تیاریوں میں حصہ لے رہے ہیں"

یہ اطلاع ایک جاسوس نے نواب کے دربار میں بذات خود پہنچائی تھی۔

نواب نے سوال کیا تھا:

"کیا مرہٹہ پیشوا شمال میں کوئی مہم بھیج رہا ہے یا اس کا خیال نظام دکن یا میسور کی طرف آنے کا ہے"۔

"نواب بہادر۔ ابھی مرہٹہ پیشوا کے ارادے معلوم نہیں ہو سکے"۔ جاسوس نے ادب سے

جواب دیا تھا:

"میں ان کی ابتدائی تیاریاں دیکھ کر ہی سرنگاپٹم روانہ ہو گیا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی مزید خبریں لے کر آپ کے حضور حاضر ہوتے رہیں گے۔"

نواب حیدر علی کے لیے اتنی ہی خبر کافی تھی۔ انہوں نے جاسوس کو واپس پونا بھیج دیا اور اپنی تیاریوں میں لگ گئے۔

ادھر پونا سے حیدر علی خاں کے پاس مرہٹہ فوج کے بارے میں روزانہ کوئی نہ کوئی اطلاع پہنچتی تھی۔ انہیں چند ہی روز بعد یہ معلوم ہو گیا کہ مرہٹوں کی یہ تمام تیاریاں دراصل میسور کے خلاف ہیں اور ان کا پیشوا بہ نفسِ نفیس مرہٹہ لشکر کے ساتھ میسور کو (خاکم بدہن) صفحۂ ہستی سے مٹانے کے ارادے سے آ رہا ہے۔

نواب بہادر نے بھی اپنی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس وقت انہیں اپنے قریبی حلیف یعنی انگریزوں سے مدد لینے کا خیال آیا۔ نواب نے ایک سفیر کے ذریعے فوراً مدراس کے گورنر کو اطلاع دی کہ ان پر مرہٹہ لشکر حملہ آور ہونے کو ہے اس لیے انہیں فوجی مدد بھیجی جائے۔

معاہدہ مدراس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ میسور پر حملہ کی صورت میں انگریز اپنی سات فوجی کمپنیوں سے نواب بہادر کی مدد کریں گے۔ مگر جب نواب کا سفیر مدراس پہنچا اور اس نے انگریز گورنر سے فوجی کمک کی درخواست کی تو گورنر نے منہ بنا کے جواب دیا:

"ہم اپنے دوست اور حلیف نواب حیدر علی خاں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار ہیں لیکن کمپنی کے حالات بنگال میں بہت زیادہ خراب ہیں اور ہم نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ وہاں بھیج دیا ہے۔ ہم اس وقت بہت مجبور ہیں۔ ہمارے حالات جیسے ہی درست ہوتے ہم نواب بہادر کی ضرور مدد کریں گے۔"

یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ اور بہانہ تھا۔

۱۷۵۷ء میں انگریز نواب سراج الدولہ کو فریب کاری سے شکست دے کر بنگال پر قابض ہو چکے تھے اور انہیں بنگال کی طرف سے کوئی پریشانی نہ تھی۔ مدراس کے گورنر کو بھی اس بات کی خبر مل چکی تھی کہ مرہٹہ پیشوا میسور پر ایک زبردست حملہ کرنے والا ہے۔ وہ اس خبر سے بہت خوش تھا پھر معاہدہ مدراس تو انگریزوں نے نواب کو ٹالنے کے لیے کیا تھا۔ اس پر عمل کرنے کا نہ ان کا کوئی ارادہ تھا اور نہ انہوں نے آئندہ کبھی اس پر عمل کیا۔

نواب بہادر نے انگریز گورنر کے اس جواب پر کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ انگریزوں کی بددیانتی اور دغابازی کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے بھی انگریزوں کا منہ چھونے کے لیے ان سے مدد مانگی تھی اس لیے انہیں اس جواب سے مایوسی نہیں ہوئی۔

مرہٹہ لشکر پونا سے روانہ ہوا تو واقعی ایک سیلاب کے مانند تھا۔ اس لشکر میں ایک لاکھ سوار، پچاس ہزار بندوقچی، ساٹھ ہزار پیادے اور پنڈاروں کا لشکر اس کے علاوہ تھا۔

پنڈارے جنوبی ہند کے وہ کرائے کے فوجی تھے جو ہر لشکر کے ساتھ لوٹ مار کے لیے شامل ہو جایا کرتے تھے۔

مرہٹوں کے اس لشکر کے ساتھ ایک بڑا توپ خانہ بھی تھا جس میں ایک سو کے قریب بڑی چھوٹی توپیں تھیں۔

اس موقع پر ملک و ملت کے غداروں اور مفاد پرستوں نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔ شاہنور کے نواب عبدالحکیم خاں نے فوراً مرہٹوں سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا اور اپنی فوجیں لے کر مرہٹہ لشکر میں شامل ہو گیا۔

یہی عمل چتلدرگ کے راجہ نے بھی کیا۔

حالانکہ نواب حیدر علی خاں نے ان دونوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کیا تھا مگر مصائب کے ان ایام میں انہوں نے نواب کی مدد کرنے کے بجائے اس کے خلاف صف آرائی میں حصہ لیا۔

مرہٹہ لشکر کے ساتھ چونکہ پونا کا پیشوا، اس کا وزیر اعظم نانا فرنویس اور سپہ سالار تربک راؤ بھی تھے اس لیے مرہٹے بہت خوش تھے۔ ان کا جوش قابلِ دید تھا اور ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ نواب کے مخالفین دلوں میں خوش ہو رہے تھے کہ اس مرتبہ سلطنت میسور کا خاتمہ ہو کے رہے گا۔

مرہٹہ لشکر آندھی اور طوفان کی طرح دریائے تنگ بھدرا تک پہنچا۔ پیشوا مادھو راؤ کا خیال تھا کہ شاید حیدر علی خاں اسے دریا عبور کرنے سے روکنے کے لیے دریا کے دوسرے کنارے پر موجود ہوں گے لیکن حیدر علی خاں نے اس قسم کی کوئی کوشش نہ کی۔

مرہٹہ لشکر نے بغیر کسی مدافعت کے دریائے تنگ بھدرا کو عبور کیا اور سرزمین میسور پر پہنچ کے اپنے تین فوجی کیمپ قائم کیے۔ یہ کیمپ چرولی، نوزلی اور چرائی کے مقامات پر قائم

کیے گئے تھے۔ اس طرح مرہٹہ لشکر کا پھیلاؤ کئی کوس تک ہو گیا تھا۔

نواب حیدر علی خاں نے بھی اپنی کوشش سے ایک بڑا لشکر اکٹھا کر لیا تھا مگر مرہٹوں کے تقریباً ڈھائی لاکھ لشکر کے مقابلے میں ان کے لشکر کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی سوائے اس کے کہ ان کا لشکر نہایت تجربہ کار اور وفادار تھا۔

پانچ دن تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑے رہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی طاقت کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر چھٹے دن جنگ کا آغاز ہوا۔

مادھوراؤ نے اپنے توپ خانے سے کام لیا اور حیدر علی خاں کے لشکر پر اس قدر گولے برسائے کہ قیامت کا سماں پیدا ہو گیا۔

گولوں کے پھٹنے سے زمین پر زلزلہ سا آ گیا۔ حیدر علی خاں کے پاس بھی توپ خانہ تھا مگر وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دو تین گھنٹوں کی جنگ میں نواب کے لشکر کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا اور ان کی فوج بری طرح شکست کھا گئی مگر حیدر علی نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ فوراً میدانِ جنگ سے ہٹ کر ایک کمین گاہ میں داخل ہو گئے تاکہ رات ہونے پر مادھوراؤ کے توپ خانے پر شب خون مار کر اسے بیکار کر دیں۔

حیدر علی کی یہ کمین گاہ ایک جنگل میں تھی مگر وہ ابھی فوج کو شب خون کے لیے تیار بھی نہ کر پائے تھے کہ سویرا ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی مرہٹوں نے دوسری طرف سے حملہ کر دیا۔ اس مشکل وقت میں سوائے فرار کے اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا۔ آخر انہوں نے توپ خانہ کو جوابی گولہ باری کا حکم دیا تاکہ اس کی آڑ میں کسی بھی طرف کو نکل جائیں مگر مرہٹوں نے ان کی فوج کو کاٹ کے رکھ دیا اور یہ بھی ایک بدنصیبی ہوئی کہ توپ خانہ کی توپیں بھی نہ چل سکیں۔

نواب حیدر علی ایک درخت کے نیچے کھڑے اپنی شکست کو دیکھ رہے تھے مگر وہ اب بھی ناامید نہ تھے اور خدا سے اپنی نصرت کی دعا مانگ رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت طنبور چیوں کا ایک گروہ ادھر آ نکلا۔ نواب کے لیے یہ تائیدِ غیبی تھی۔ انہوں نے فوراً طنبورچیوں کو زور زور سے طنبورے بجانے کا حکم دیا۔

جب ایک ساتھ ایک درجن سے زیادہ طنبوروں کا پوری آواز کے ساتھ شور بلند ہوا تو مرہٹوں میں تہلکہ مچ گیا۔

مادھوراؤ نے گھبرا کر اپنے وزیر سے دریافت کیا:

"کیوں فرنویس۔ یہ فوجی باجوں کی آواز کس سمت سے آ رہی ہے؟"

فرنویس نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ ترمک راؤ چمک کے بولا:

"پیشوا بہادر۔ معلوم ہوتا ہے کہ حیدر علی کو کہیں سے تھوڑی بہت فوجی مدد ملی ہے اسی لیے وہ زور زور سے باجے بجا کر ہم پر رعب ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے مگر آپ اطمینان رکھیے میں ابھی اسے تباہ کر کے رکھ دوں گا۔"

مادھوراؤ کا ماتھا ایک دم گھوم گیا۔ وہ چیخ کے بولا:

"ترمک راؤ۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ لشکر کی کمان میرے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے ہے۔ تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟"

ترمک راؤ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

چند لمحوں بعد پیشوا نے فرنویس سے اپنا سوال دہرایا:

"فرنویس۔ تم نے بتایا نہیں ان فوجی باجوں کے بجنے کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟"

فرنویس بڑا ذہین اور شاطر تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ پیشوا طنبوروں کی آواز سن کے گھبرا گیا ہے اور لڑائی روکنے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر رہا ہے۔ اس لیے اس نے وقت کی مناسبت سے جواب دیتے ہوئے کہا:

"پیشوائے اعظم۔ طنبوروں کے شور و غل سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر علی کو فوجی کمک پہنچ گئی ہے اور وہ طنبورے بجوا کر اپنی بھاگتی فوج کو اکٹھا کر رہا ہے تاکہ جوابی حملہ کر سکے"۔

"تم نے ٹھیک کہا فرنویس"۔

پیشوا نے فوراً اس کی تائید کی:

"ہمیں صحیح صورت حال معلوم ہونے سے پہلے لشکر کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے"۔

اس کے ساتھ ہی پیشوا نے جنگ موقوف کر کے لشکر کو پیچھے ہٹ آنے کا حکم دے دیا۔

اور نواب پر سے ایک زبردست خطرہ اس تائیدِ غیبی کی وجہ سے ٹل گیا۔

مادھوراؤ کے پیچھے ہٹنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے اگرچہ حیدر علی کو وقتی شکست دے

دی تھی مگر حیدر علی کے لشکر نے شکست کھاتے کھاتے بھی مرہٹوں کا اس قدر جانی نقصان کیا تھا کہ وہ گھبرا گیا تھا اور اس نے اس وقت پیچھے ہٹنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی شام نواب بہادر کا نائب ہیبت جنگ، ایک تازہ دم لشکر لے کر مدد کو پہنچ گیا مگر نواب بہادر نے جوابی حملے کا خطرہ مول لینے کے بجائے اپنے لشکر کو بھی پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا۔

مشہور ہے کہ سلطان ٹیپو نے اس جنگ میں جوانمردی اور شجاعت کے کچھ ایسے جوہر دکھائے کہ حیدر علی خاں نے اسے بار بار اپنے سینے سے لگایا۔ تاہم شجاعت اور بہادری کے ان کارناموں کے ساتھ ساتھ شہزادے کو ایک ناگوار فرض بھی انجام دینا پڑا۔

حیدر علی خاں نے لشکر کو منگلور کی سمت ہٹنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی شہزادے کو یہ حکم ہوا کہ وہ منگلور تک کے پورے علاقے کو اس قدر ویران کر دے کہ مرہٹوں کو وہاں سے رسد قطعی حاصل نہ ہو سکے۔

شہزادے نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنے ہی علاقے کو اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

اس دور کی جنگوں میں یہ دستور تھا کہ دشمن کی رسد کو تباہ کر دیا جائے تاکہ وہ آگے قدم نہ بڑھا سکے۔ چنانچہ اب مرہٹے اس راستے سے گزرے تو انہیں آبادیاں ویران اور کنوؤں میں زہر گھلا ہوا ملا۔

بنگلور پہنچ کے نواب بہادر نے اپنے وکیل کے ذریعے مادھوراؤ کو صلح کا پیغام بھیجا مگر اس نے ایک کروڑ کی رقم طلب کرنے کے علاوہ بعض بہت سخت شرطیں پیش کیں۔ نواب بہادر نے اس قسم کی ذلیل صلح پر جنگ کو ترجیح دی اور پھر جنگ کے لیے تیار ہوئے۔

اب مرہٹہ لشکر دریائے تنگ بھدرا کے دامن سے نکل کر سرنگا پٹم کی طرف بڑھا۔ مرہٹوں نے کئی شمالی اور مشرقی اضلاع بغیر کسی مدافعت کے فتح کر لیے۔ اس وقت نواب بنگلور میں تھے اور مرہٹوں کے اور آگے بڑھ آنے کے انتظار میں تھے۔

مادھوراؤ اس سیلِ رواں کے ساتھ بنگلور سے تیس میل کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا۔

یہاں نجگل کے مقام پر نواب بہادر کا ایک مضبوط قلعہ تھا اور وہ بغیر یہ قلعہ فتح کیے آگے نہ بڑھنا چاہتا تھا۔

مادھوراؤ نے قلعہ نجگل کا محاصرہ کر لیا مگر اس کا لشکر خود تین طرف سے محاصرے میں آ گیا۔ مرہٹوں کے لیے ایک محاصرہ یہ تھا کہ اطراف کا تمام علاقہ نواب کے حکم سے ویران کر دیا گیا تھا اس لیے اس کے لشکر میں رسد کی سخت کمی واقع ہو گئی تھی۔

دوسرا محاصرہ یہ تھا کہ نواب بہادر اپنے لشکر کے شب خون مارنے والے دستوں کے ساتھ بنگلور سے نجگل کے قریب ایک پہاڑی کے پیچھے آ کے چھپ گئے تھے اور ہر رات مرہٹہ لشکر پر شب خون مار کے سینکڑوں مرہٹوں کو خاک و خون میں نہلا دیتے تھے۔

تیسرا اور سب سے اہم مورچہ قلعہ نجگل کا تھا۔ قلعہ سے اتنی شدید مدافعت ہو رہی تھی کہ مرہٹوں کے دو لاکھ کے لشکر سے کچھ بنائے نہ بن رہا تھا۔ اور مادھوراؤ قلعہ پر قبضہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔

اس دوران نواب بہادر پر قدرت نے ایک اور مہربانی کی اور وہ یہ کہ جنوبی ہند میں بارش کا موسم شروع ہو گیا۔

مادھوراؤ پیشوا بارش کے دنوں میں بیمار ہو جایا کرتا تھا۔ پس بارش شروع ہوتے ہی وہ بیماری کے حملے میں جکڑا گیا اور سخت پریشان ہو گیا۔

مادھوراؤ کی اس بیماری کی خبر نانا فرنویس کو تھی اور نہ ترمک راؤ کو۔ سپہ سالار ترمک راؤ کو وہ بتانا بھی نہ چاہتا تھا اس لیے اس نے فرنویس سے مشورہ کیا:

"فرنویس۔ تم میرے اعتماد کے آدمی ہو اس لیے میں تمہیں ایک راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں"۔

اس نے فرنویس کو اپنے خیمے میں بلا کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

نانا فرنویس نے بڑی مسرت سے جواب دیا:

"یہ میری خوش نصیبی ہے کہ پیشوا مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا راز میرے ساتھ قبر میں جائے گا"۔

"ہمیں تم سے ایسی ہی امید ہے فرنویس"۔

مادھوراؤ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"دراصل میں ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوں کہ برسات کے موسم میں اس بیماری میں جا گرتا

اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں بارشیں شروع ہو گئی ہیں اور اس کے ساتھ ہی میری طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے"۔

وزیر نانا فرنویس نے مشورہ دیا:

"پیشوائے اعظم، جان ہے تو جہان ہے۔ آپ فوراً پونا تشریف لے جائیے۔ بیماری اور پھر پردیس میں۔ اس سے تو اینشور ہی بچائے۔ مرض کا بڑھنا کسی طرح مناسب نہیں۔ میں ابھی آپ کی واپسی کا انتظام کرتا ہوں"۔

مادھو راؤ نے مضمحل آواز میں کہا:

"میں واپس تو چلا جاؤں مگر یہاں کا کیا بنے گا۔ مجھے ترمک راؤ پر کوئی اعتبار نہیں۔ کہیں وہ مرہٹوں کے اتنے بڑے لشکر کو کٹوا کر نہ رکھ دے"۔

"پیشوائے محترم۔ میں کہہ چکا ہوں کہ جان تو جہان"۔

نانا فرنویس نے اپنی بات دہرائی:

"آپ مرہٹہ لشکر کو اپنی جان پر کیوں ترجیح دے رہے ہیں۔ آپ اس وقت صرف اپنی جان کی فکر کیجیے"۔

"مگر تم کیا کرو گے فرنویس"۔ مادھو راؤ نے دریافت کیا:

"تمہاری اور ترمک راؤ کی نہ کبھی بنی ہے اور نہ بنے گی"۔

"محترم پیشوا"۔ نانا فرنویس مسکرایا:

"میں لشکر کے ساتھ نہیں آپ کے ساتھ آیا تھا اور آپ کے ساتھ ہی پونا واپس جاؤں گا۔ میں تو ترمک راؤ کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا"۔

آخر مادھو راؤ اپنے تمام اختیارات ترمک راؤ کے سپرد کر کے پونا روانہ ہو گیا۔ اس کا وزیر نانا فرنویس بھی اس کے ساتھ ہی واپس چلا گیا۔

اب تو ترمک راؤ کی بن آئی۔ اتنا بڑا لشکر اس کے زیر کمان تھا اور وہ پوری طرح سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

مثل مشہور ہے کہ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ یہی حال اس وقت ترمک راؤ کا تھا۔

مادھو راؤ پیشوا کے واپس جانے کے بعد ترمک راؤ نے دو کام کیے۔ پہلا تو یہ کہ اس نے

فوجوں کی از سرِ نو ترتیب کے لیے تھوڑی سی پسپائی اختیار کی۔ اور اپنی کمک کے لیے رتن گری، میرج، ونکٹ گری، نرگسی، کالسنری اور گتی کے راجاؤں کو طلب کیا۔ ان راجاؤں میں گتی کا راجہ مراری لال سب سے زیادہ طاقتور اور قابلِ اعتماد تھا۔

دوسرا کام جو ترمک راؤ نے کیا اس کا تعلق اس کے دل سے تھا۔ اس نے اپنے نائب رادھن کولی کو بلایا ___ اور کہا:

"رادھن۔ تمہیں اسی وقت پونا جانا ہے"۔

رادھن کولی نے بڑی حیرت سے ترمک راؤ کو دیکھا مگر کوئی سوال کرنے کے بجائے اظہارِ اطاعت کے طور پر کہا:

"سپہ سالار کے حکم کی فوراً تعمیل ہو گی۔ مجھے روانگی کی اجازت دی جائے"۔

ترمک راؤ مسکرایا اور بولا:

"رادھن۔ تمہاری وفاداری اور اطاعت کا یہی انداز مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے تمہیں حکم دیا کہ پونا جانا ہے اور تم نے بغیر یہ پوچھے ہوئے کہ وہاں جا کر کیا کرنا ہے فوراً اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور جانے کی اجازت مانگی"۔

رادھن کولی ایک گٹھے ہوئے بدن کا معقول شکل و صورت والا جوان تھا۔ ترمک راؤ اس پر ہمیشہ سے اعتبار کرتا تھا اور اپنے اہم معاملات اسی کے سپرد کیا کرتا تھا۔ رادھن نے اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔

رادھن نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا:

"سپہ سالارِ اعظم۔ آپ میرے آقا ہیں۔ آقا کا کام حکم دینا اور غلام کا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ اس کا یہ کام ہرگز نہیں کہ کام کی نوعیت، وجہ اور جواز کے بارے میں کوئی بحث کرے۔ میں نے آپ سے روانگی کی اجازت مانگی ہے۔ آپ اجازت دیتے وقت کچھ ہدایات ضرور دیں گے بس ان ہدایات پر عمل کرنا میرا فرض ہو گا"۔

"ٹھیک ہے رادھن۔ ہمیں تم جیسے عقلمند اور قابلِ اعتماد لوگوں کی ہی ضرورت ہے"۔ یہ کہہ کر ترمک راؤ کچھ سوچنے لگا۔

رادھن کولی سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے بولنے کی قطعی کوشش نہ کی۔ آخر چند لمحوں بعد ترمک راؤ نے اسے مخاطب کیا:

"رادھن، تم نے ہماری رچنا کو دیکھا ہے؟"

رادھن کے جسم میں جیسے بجلیاں سی کوند گئیں مگر اس نے خود کو سنبھالا:

"جی ہاں میرے آقا۔ چھوٹی سپہ سالارنی کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں پہنچایا تھا۔"

"اوہ۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے!"

ترمک راؤ مسکرایا:

"ہاں۔ میں اسی رچنا کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ تم اپنے ساتھ اپنے اعتماد کا ایک دستہ فوج کا لے کر پونا جاؤ اور رچنا کو اپنے ساتھ لے آؤ۔

کوشش کرنا کہ اس کی خبر کم سے کم لوگوں کو ہو۔ پھر بھی اگر کوئی اعتراض کرے تو کہہ دینا کہ یہ ترمک راؤ کا حکم ہے اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو تم اپنے فوجی دستے سے کام لے سکتے ہو۔ تمہیں بہرحال رچنا کو اپنے ساتھ لے کے آنا ہے۔"

"ٹھیک ہے آقا!"

رادھن کولی نے سر جھکا دیا:

"اور اگر مالکن سپہ سالارنی آنے میں عذر کریں تو کیا حکم ہے؟"

"تم نے ٹھیک کہا۔" ترمک راؤ بولا:

"رچنا آنے سے انکار کر سکتی ہے۔ زبانی پیغام پر کوئی بھی اعتبار نہیں کرتا۔"

ترمک راؤ کچھ سوچتا ہوا اپنی پگڑی سے وہ بڑا ہیرا اتارنے لگا جسے وہ ہر وقت پگڑی میں لگائے رکھتا تھا:

"یہ لو رادھن۔ یہ ہماری نشانی ہے۔ اب رچنا انکار نہیں کرے گی۔ مگر تم اس ہیرے کی بھی اسی طرح حفاظت کرنا جس طرح رچنا کی حفاظت کرو گے۔"

اور ــــ

ترمک راؤ کا خاص سردار رادھن کولی سواروں کا ایک مضبوط دستہ لے کر پونا کی طرف روانہ ہو گیا۔ رادھن ہی رچنا کو ترمک راؤ کے پاس لایا تھا۔ وہ پونا کی گلیوں میں بھٹک رہی تھی کہ رادھن اسے مل گیا۔ رچنا نے ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کی کہ وہ اسے اپنی پناہ میں لے لے مگر اس وقت رادھن کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ محض ایک سپاہی تھا۔

رچنا کی موہنی صورت نے اسے بے خود سا کر دیا تھا مگر وہ کوئی خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔ اس لیے وہ رچنا کو لے کر سیدھا سپہ سالار ترمک راؤ کے خیمے پر پہنچا۔ اس طرح رچنا خاک سے اٹھ کے محل میں پہنچ گئی تھی۔

رادھن کولی کو اگرچہ ترمک راؤ نے ایک معمولی سپاہی سے سردار بنا دیا تھا لیکن وہ چھوٹی طبیعت کا آدمی تھا اس لیے سردار ہونے کے بعد اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب تقدیر اسے سردار بنا سکتی ہے تو وہ سپہ سالار بھی بن سکتا ہے۔

اس فاسد خیال نے اس کے دل میں کچھ ایسا گھر کیا کہ ایک شب اس نے ترمک راؤ کو قتل کر کے خود سپہ سالار بننے کا قصد بھی کر لیا مگر عین موقع پر وہ گھبرا گیا اور اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

اب ــــ

ترمک راؤ نے اسے اپنا قاصد بنا کر بھیجا تو ایک بار پھر اس کے دماغ میں وہی فاسد خیال پیدا ہوا مگر کم عقل اور ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے وہ صرف یہ سوچ سکا کہ اگر وہ مادھو راؤ کو یہ خبر پہنچا دے کہ مرہٹہ سپہ سالار ترمک راؤ نے اسے اپنی محبوبہ رچنا کو لانے کے لیے بھیجا ہے تو شاید پیشوا خوش ہو کر اسے ترمک راؤ کی جگہ سپہ سالار بنا دے۔

پونا پہنچتے پہنچتے رادھن کولی کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ وہ جیسے ہی پیشوا کو یہ بتائے گا کہ سپہ سالار ترمک راؤ نے اپنی محبوبہ رچنا کو محاذِ جنگ پر بلایا ہے تو اسی وقت پیشوا ترمک راؤ کو سپہ سالاری سے معزول کر کے اسے سپہ سالار مقرر کر دے گا۔

پس ــــ پونا پہنچ کر وہ رچنا کی حویلی پر جانے کے بجائے سیدھا پیشوا کے محل پر پہنچا اور اطلاع کرائی کہ سرنگاپٹم کے محاذ سے ترمک راؤ کا خاص سردار رادھن کولی آیا ہے اور پیشوا سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔

رادھن کولی کو مادھو راؤ اور نانا فرنویس دونوں ہی اچھی طرح جانتے تھے۔ اس وقت فرنویس پیشوا کے پاس ہی موجود تھا۔

پیشوا نے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید رادھن میدانِ جنگ سے کوئی خاص پیغام یا خبر لے کر آیا ہے، اسے باریابی کی اجازت دیدی، حالانکہ خود بھی اسے محاذ سے واپس آتے ابھی مشکل سے

ایک ہی ہفتہ گزرا تھا اور اس کی طبیعت پوری طرح سنبھلی بھی نہ تھی۔

رادھن، پیشوا کے سامنے پیش ہوا تو وزیر نانا فرنویس نے اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا:

"رادھن۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ہمارے سپہ سالار کے خاص آدمی ہو اس لیے تمہارا آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تم کوئی بہت اہم خبر لے کر آئے ہو"۔

نادان رادھن کولی نے سینہ پھلا کے بڑے فخر سے جواب دیا:

"وزیر اعظم کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ میں واقعی یہ اہم خبر لے کر آیا ہوں کہ ہمارا مرہٹہ سپہ سالار ترمک راؤ دشمنوں سے لڑنے کے بجائے عیش و عشرت کی محفل سجانے کی کوشش کر رہا ہے"۔

نانا فرنویس پہلے ہی ترمک راؤ کے خلاف تھا۔ وہ اس بات پر چونک پڑا۔ پیشوا جو مرض کی وجہ سے مضمحل ہو رہا تھا، اس نے بھی اس اطلاع پہ بُرا سا منہ بنایا اور نانا فرنویس کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس بات کی تفصیل معلوم کرے۔

نانا فرنویس نے چٹکارا لیتے ہوئے رادھن سے پوچھا:

"رادھن۔ تم تو ترمک راؤ کے خاص آدمی ہو۔ اس نے تمہیں سپاہی سے سردار بنایا۔ پھر تم اس کی شکایت کیوں کر رہے ہو؟"

رادھن نے اور زیادہ تن کر کہا:

"وزیر اعظم۔ آخر میں بھی ایک نمک خوار مرہٹہ سردار ہوں۔ میں یہ کیسے دیکھ سکتا ہوں کہ ہمارا سپہ سالار میدان میں حیدر علی سے جنگ کرنے کے بجائے اپنے خیمے میں عیش کی محفل سجائے۔ مجھے یہ بات سخت ناگوار گزری اس لیے میں اپنے پیشوا اور وزیر اعظم کو بتانے کے لیے آیا ہوں"۔

رادھن کی باتوں نے وزیر اعظم کو الجھا دیا۔ اس نے دوبارہ پوچھا:

"اچھا یہ بتاؤ تمہیں سپہ سالار کی کونسی بات ناگوار گزری۔ کیا اس نے حیدر علی سے صلح کر لی ہے اور اب وہ میسور کی لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے؟"

رادھن گھبرا گیا پھر ذرا سنبھل کے بولا:

"یہ بات نہیں ہے وزیر اعظم۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا سپہ سالار جنگ کے بجائے عیش کی محفلیں سجانا چاہتا ہے اور یہ اہم خبر دینے کے لیے میں یہاں آیا ہوں"۔

نانا فرنویس اور زیادہ الجھ گیا۔ پیشوا کو بھی رادھن کی باتیں کچھ بے ربط سی معلوم ہوئیں اور اس نے ناگواری سے منہ گھما لیا۔

نانا فرنویس نے ذرا تلخ لہجے میں کہا:

"تو کیا بکواس کر رہا ہے۔ آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ تو مرہٹہ فوج کا ایک سردار ہے اور تیری جگہ سرنگا پٹم کا محاذ ہے۔ تو محاذ چھوڑ کے ہمارے پاس کیوں آیا ہے؟ تو سپہ سالار سے اجازت لے کے آیا ہے یا وہاں سے بھاگ آیا ہے اور اب ہمیں سپہ سالار کے خلاف بھڑکانا چاہ رہا ہے؟"

رادھن کولی سے جو ایک دم اتنے بہت سے سوالات کیے گئے تو اس کی عقل ٹھکانے آ گئی اور سپہ سالار بننے کا سارا نشہ اتر گیا۔

اس نے گھگیا کے کہا:

"میں محاذ سے بھاگ کے نہیں آیا بلکہ سپہ سالار نے مجھے یہاں بھیجا ہے"۔

اب پیشوا بھی چونک پڑا۔ اس نے رخ بدلتے ہوئے خود سوال کیا:

"یہی تو تجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ ترمک راؤ نے تجھے پونا کیوں بھیجا ہے؟"

رادھن ڈر گیا تھا۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا:

"اَن داتا۔ ترمک راؤ سپہ سالار نے مجھے پونا سے رچنا کو لے آنے کا حکم دیا ہے اور میں صرف اسی کام کے لیے آیا ہوں"۔

"مادھو راؤ اور نانا فرنویس دونوں ترمک راؤ کے اور رچنا کے معاملات سے پوری طرح آگاہ تھے اس لیے دونوں کو رادھن کی بات پہ ہنسی آ گئی۔

پیشوا نے مسکراتے ہوئے کہا:

"اے عقل کے دشمن! جب تجھے رچنا کو لینے بھیجا گیا تھا تو پھر تُو ہمارے پاس کیا لینے آیا؟"

رادھن نے پھر بے عقلی کی بات کی:

"اَن داتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ خبر بہت اہم ہے اور آپ اسے سن کر بہت خوش ہوں گے اور آپ ــــ"

مگر رادھن بات پوری نہ کر سکا اور گھبرا کے خاموش ہو گیا۔

وزیر اعظم غصہ سے کھڑا ہو گیا:

"تو آدمی ہے کہ گدھا۔ تجھے یہ نہیں معلوم کہ تو پیشوا کے دربار میں کھڑا ہے۔ تو پوری بات کیوں نہیں کرتا یہ ادرا اور کی کیا رٹ لگا رکھی ہے؟"

رادھن کی تو جان ہی نکل گئی۔ اس نے روہانسے انداز میں کہا:

"مہامنتری جی۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ خوش ہو کر مجھے انعام دیں گے"۔ آخر رادھن نے اصل بات اگل دی۔

اس پر بیمار پیشوا کو ہنسی آ گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا:

"تو واقعی بے وقوف ہے۔ تو مرہٹہ لشکر کے سپہ سالار کی طاقت سے واقف نہیں ہے۔ اس کے زیر کمان دو لاکھ کا لشکر ہے۔ وہ تو پونا کی سلطنت کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ ایک رچنا کیا، اگر ترمک راؤ ایک ہزار رچنائیں بھی اپنے ساتھ رکھے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ آخر وہ مرد ہے اور مردوں کو عورتیں رکھنے کا حق ہوتا ہے۔

چل نکل جا یہاں سے — اور خبردار۔ ترمک راؤ سے اس بات کا ذکر نہ کرنا کہ تو ہمارے پاس آیا تھا"۔

رادھن کولی چپ چاپ دربار سے واپس آ گیا۔ وہ تو ڈر رہا تھا کہ کہیں پیشوا اسے قتل ہی نہ کرا دے مگر لطف کی بات یہ کہ اسے اپنی غلطی کا ذرا بھی احساس نہ ہوا بلکہ وہ یہی سوچتا رہا کہ پیشوا اور وزیر کیسے بے وقوف لوگ ہیں کہ اپنے سپہ سالار کی حرکتوں پر ناراض ہونے کے بجائے صرف ہنس دیتے ہیں۔

دربار سے وہ سیدھا رچنا کی محل نما حویلی پہ پہنچا۔ رچنا اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔

حیران اس وجہ سے کہ رادھن کے آنے کی اسے کوئی امید ہی نہ تھی اور خوش اس لیے کہ رچنا نے اپنے بُرے دنوں میں رادھن سے پناہ مانگی تھی مگر وہ بزدل اس کومل کلی کو اپنے پہلو میں جگہ دینے کے بجائے ادھیڑ عمر ترمک راؤ کے حوالے کر کے الگ ہو گیا تھا۔

رچنا نے ہنستے ہوئے اس کا استقبال کیا:

"رادھن۔ تم اچانک کیسے آ گئے۔ خیریت تو ہے؟"

رادھن پہلے ہی پریشان تھا۔ رچنا کے سوال پر اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ جواب دینے کے بجائے وہ ٹکر ٹکر رچنا کو دیکھنے لگا۔

رچنا کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے رادھن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مسہری پر بٹھا لیا۔ اسی وقت رچنا کی ایک ملازمہ اچانک اندر آ گئی۔

رچنا نے اس کے آنے کی کوئی پروا نہ کی اور اسے حکم دیا:

"باہر کا خیال رکھو اور ہاں کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو"۔

خادمہ مسکراتی ہوئی سر جھکا کے واپس چلی گئی۔ پھر ذرا دیر بعد رادھن کے سامنے شراب اور پیالے رکھے تھے۔ کھانے کے لیے نمکین چیزیں بھی تھیں۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں رچنا"۔ رادھن نے جیسے خواب سے چونک کے کہا۔

رچنا نے لگاوٹ سے کہا:

"رادھن۔ میں نے تمہارے ساتھ چلنے سے نہ پہلے انکار کیا تھا اور نہ اب انکار کروں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ تم مجھے کہاں لے جاؤ گے۔ تمہیں ترمک راؤ کا کوئی خوف نہیں؟"

اس وقت تک رچنا کے ہاتھ سے بھرے ہوئے شراب کے دو پیالے رادھن کے حلق سے اتر چکے تھے۔ خود رچنا نے بھی ایک پیالہ چڑھا لیا تھا اور اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے چمک اٹھے تھے۔

رادھن نے ترنگ میں جواب دیا:

"میں نے پہلے بھی تمہیں ترمک راؤ کے حوالے کیا تھا اور اب بھی میں تمہیں ترمک راؤ کے پاس ہی لے جاؤں گا۔ اس نے تمہیں بلایا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے رادھن نے ترمک راؤ کا دیا ہوا ہیرا رچنا کے سامنے کر دیا۔

"مجھے یقین آ گیا کہ ترمک راؤ ہی نے تمہیں بھیجا ہے لیکن ایک ہفتہ تک میں نہیں جاؤں گی"۔ رچنا نے سرشاری کے عالم میں کہا۔

"کیوں نہیں جاؤ گی؟"

رادھن کے ہاتھ میں شراب سے بھرا لبریز پیالہ تھا:

"پیشوا کہتا ہے کہ ترمک راؤ کے پاس دو لاکھ کا لشکر ہے۔ وہ پونا کا تخت بھی الٹ سکتا ہے۔ تم جانے سے انکار کرو گی تو وہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کرا دے گا"۔

"کچھ بھی ہو جائے میں ایک ہفتہ سے پہلے نہیں جاؤں گی اور یہ پورا ہفتہ تم اس محل میں

میرے ساتھ رہو گے۔"

پھر ـــــــ

رچنا اور رادھن کولی یونہی آمنے سامنے بیٹھے دیر تک شراب پیتے رہے۔ رچنا پہ نہیں کب کی بھوکی اور پیاسی تھی کہ وہ شراب پیتے پیتے مدہوش ہو کے رادھن کی آغوش میں گر گئی۔

محل کی خادماؤں نے سوائے ایک کے تمام شمعیں گُل کر دیں۔

ادھر رچنا اور رادھن رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اُدھر ان کی تمام پے ہٹو وگیوں کی تفصیلی اطلاعات پونا کے پیشوا اور وزیراعظم کو پہنچائی جا رہی تھیں مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ نہ تو وزیراعظم نے پیشوا کو ان دونوں کے خلاف قدم اٹھانے کا مشورہ دیا اور نہ خود پیشوا ہی نے باخبر ہونے کے باوجود اپنے طور پر کوئی حکم دیا۔

اس سے دو باتوں کا اظہار ہوتا ہے:

ایک تو یہ کہ شاید پونا میں ہر امیر یا سردار عورتوں کو ناجائز طور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ پیشوا اور وزیراعظم کو غالباً یہ خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے سپہ سالار ترمک راؤ کی داشتہ کو گرفتار کر کے سزا دی تو کہیں ترمک راؤ پونا کے خلاف فوج کشی نہ کر دے۔

پھر بھی مادھو راؤ پیشوا نے اپنے سپہ سالار کو ایک بہت مشفقانہ خط روانہ کر دیا جس میں اس کے کارناموں کی تعریف کی گئی اور آخر میں دبے لفظوں میں اسے یہ خبر دی گئی کہ رادھن اور رچنا ایک ہی حویلی میں، ایک ہی کمرے میں چوبیس گھنٹے ایک ساتھ رہتے ہیں اور یہ کہ شاید رادھن ایک ہفتہ بعد رچنا کو لے کر سرنگا پٹم روانہ ہو گا۔ اگر ترمک راؤ مناسب سمجھے تو اس سلسلہ میں رادھن اور رچنا سے پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔

پیشوا نے اس خط کے بھیجنے کے علاوہ اور کسی قسم کی تادیبی کارروائی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ فارسی کے محاورہ "این ہمہ خانہ آفتاب است" کے مصداق (جس کے لیے اردو کا یہ محاورہ زیادہ موزوں ہے کہ "اس حمام میں سب ننگے ہیں") کیا پیشوا اور کیا وزیراعظم سب کے سب اسی طرح کی عیش پرستی میں مبتلا تھے۔ پھر وہ دوسروں کی برائیوں پر کیوں کان دھرتے!

ایک ہفتہ بعد رچنا کو محسوس ہوا کہ اب عشرت کی رات گزر چکی ہے اور فرقت کا دن آن پہنچا ہے اس نے فوراً رادھن کولی کو خوابِ خرگوش سے بیدار کیا اور دونوں جلدی جلدی تیار ہو کے سرنگا پٹم روانہ ہوئے۔

رادھن کولی نے ایسے عیش کے دن کہاں گزارے تھے۔ چنانچہ جب رچنا نے اسے بتایا کہ پونا میں زیادہ دن ٹھہرنا مناسب نہیں تو اس نے سخت مخالفت کی اور مزید ایک ہفتہ پونا میں ہی گزارنے کی ضد کی مگر رچنا نے اسے سختی سے جھڑک دیا اور ان خطرات سے آگاہ کیا جن کے پیش آنے کے امکانات تھے۔

رادھن کولی اور رچنا جس دن ترمک راؤ کے پاس پہنچے اس سے دو دن پیشتر ترمک راؤ کو پیشوا کا وہ خط مل گیا تھا جس میں رادھن اور رچنا کا کچا چٹھا لکھا تھا۔

ترمک راؤ زخمی شیر کی طرح غصہ میں بھرا بیٹھا تھا کہ اسے رادھن کولی اور رچنا کے آنے کی اطلاع دی گئی۔

ترمک راؤ نے حکم دیا:

"رچنا کو ایک الگ خیمے میں رکھا جائے اور اس پر پہرہ لگا دیا جائے اور رادھن کو گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا جائے۔"

چنانچہ رچنا خیمے میں قید کر دی گئی اور رادھن کو گرفتار کر کے ترمک راؤ کے سامنے پیش کیا گیا۔

ترمک راؤ نے رادھن کو دیکھتے ہی تلوار کھینچ لی۔ رادھن کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ رادھن کو گرفتار کر کے لانے والے سپاہی کے خیمے سے باہر جانے کے بعد ترمک راؤ نے تلوار کی نوک رادھن کے سینے پر رکھ دی۔

"رادھن تو سچ بولے گا تو شاید تیری سزا کم ہو جائے!"

رادھن نے ہاتھ جوڑ لیے:

"مالک۔ میں سچ بولوں گا"۔

ترمک راؤ نے کڑک کر کہا: "تو پھر بتا۔ کیا تو ایک ہفتے تک رچنا کے ساتھ ایک ہی

کرنے میں سوتا رہا ہے؟"

"ہاں مالک۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے ـــ"

رادھن کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ ترمک راؤ کی تلوار اس کے سینے میں اتر گئی اور وہ سینہ پکڑے ہوئے زمین پر گر پڑا۔

پھر ترمک راؤ نے رچنا کو بلا کر دریافت کیا:

"رچنا۔ کیا یہ سچ ہے کہ تو اس نمک حرام کے ساتھ ایک ہفتہ تک سوتی رہی ہے؟"

رچنا، رادھن کی لاش دیکھتے ہی سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے سر جھکا کر جواب دیا:

"جو کچھ ہوا وہ رادھن کی زبردستی تھی۔ میں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی"۔

پھر رچنا نے کچھ اس طرح آنسو بہائے کہ ترمک راؤ نے اسے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔



اب ترمک راؤ نے پورے لشکر کے ساتھ سرنگا پٹم کی طرف یلغار کی۔

نواب حیدر علی خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے سرداروں کے ساتھ جنگ کی نئی حکمت عملی تیار کی اور فیصلہ ہوا کہ کھلے میدان میں مقابلے کے بجائے دشمن کی پشت پر حملہ کیا جائے۔

نواب حیدر علی نے تھوڑی سی فوج سرنگا پٹم کی حفاظت کو چھوڑی اور بقیہ لشکر لے کر سرنگا پٹم سے نکلے۔ پھر چن پٹن کے راستے سے ماگڑی کے جنگل میں پہنچ گئے۔

ترمک راؤ کو جب معلوم ہوا کہ حیدر علی، سرنگا پٹم چھوڑ کے ماگڑی کے جنگل میں پناہ گزین ہو گئے ہیں تو اس نے بھی ماگڑی ہی کا رخ کر لیا۔ وہ حیدر علی خاں کو بچ کے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ حیدر علی اس وقت میرن کی پہاڑی پر ٹھہرے ہوئے تھے۔

ترمک راؤ نے جاتے ہی پہاڑی کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ اس قدر سخت تھا کہ چند دن کی لڑائی اور شب خون کے بعد حیدر علی کو باہر سے رسد ملنا مشکل ہو گئی۔

حیدر علی کے لیے یہ ایام بہت مشکل تھے اور ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ محاصرہ توڑ کے لڑتے بھڑتے سرنگا پٹم پہنچ جائیں اور وہاں محصور ہو کر مدافعتی جنگ کریں۔

اپنے اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے ایک شب حیدر علی اپنے توپ خانے کے ساتھ جنگل سے سرنگا پٹم کی طرف روانہ ہوئے مگر بد قسمتی سے ان کی ایک توپ چل گئی جس سے ترمک راؤ کو ان کے فرار کا علم ہو گیا اور اس نے ایک زبردست فوج حیدر علی خاں کے تعاقب میں روانہ کر دی۔

حیدر علی پر پیچھے سے آنے والی مرہٹہ فوج نے زبردست حملہ کر دیا مگر وہ ٹھہرنے کے بجائے آگے ہی بڑھتے گئے۔

جب وہ موتی تالاب پر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ آگے راستہ بند ہے اور مرہٹہ توپ خانہ آٹھ توپوں کے ساتھ تالاب پر گولہ باری کے لیے موجود ہے۔ اس موقع پر حیدر علی نے ایک انتہائی خطرناک مگر جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔

حیدر علی خاں نے حکم دیا کہ موتی تالاب پر قبضہ کرنے والے مرہٹہ توپ خانے پر حملہ کر دیا جائے۔ انہوں نے صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ وہ خود ایک منتخب دستہ لے کر مرہٹہ توپ خانے پر حملہ آور ہو گئے۔

یہ حملہ اس قدر غیر متوقع اور اچانک تھا کہ مرہٹے بوکھلا گئے اور توپیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے جن پر حیدر علی نے قبضہ کر لیا۔

فوجیں دو دن سے بھوکی تھیں اس لیے وہاں تھوڑی دیر رک کر انہوں نے کچھ کھایا پیا۔ پھر آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

ترمک راؤ کو اپنے توپ خانہ کی تباہی کا فوراً ہی علم ہو گیا۔ اس نے اسی لمحے اپنے بڑے توپخانے کو حیدر علی کا راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھا دیا، جس نے حیدر علی اور ان کی فوج پر شدت سے گولہ باری شروع کر دی۔

مرہٹہ توپ خانے کی گولہ باری سے حیدر علی کی بارود لے جانے والی گاڑیوں میں آگ لگ گئی اور کئی سو آدمی اس میں جل مرے ــ اور مرہٹے حیدری فوج کے قلب تک پہنچ گئے۔

اس جنگ میں حیدر علی کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کے ایک سردار لالہ میاں نے اس جنگ میں شہادت پائی۔

لالہ میاں، حیدر علی کے بھائی شہباز خاں کے داماد تھے۔ اس کے علاوہ دو اور بڑے سردار میر علی رضا خاں اور میر علی زماں بھی مرہٹوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

ان بڑے سرداروں کی گرفتاری کے بعد مرہٹوں کو حیدر علی کی تلاش تھی اور وہ انہیں پورے جنگل میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ ان کی نظر حیدر علی کے سپہ سالار یاسین خاں پر پڑی جو شدید زخمی حالت میں زمین پر گرا ہوا تھا۔

یاسین خاں کا جثہ اور شکل وصورت حیدر علی سے بے حد مشابہ تھے۔ مرہٹے یہی سمجھے کہ وہ حیدر علی ہے۔ جب مرہٹوں نے اس سے پوچھا:

"تم کون ہو؟"

تو زیرک اور عقلمند یاسین خاں کو فوراً شبہ ہوا کہ مرہٹے اسے حیدر علی خاں سمجھ رہے ہیں۔

چنانچہ ـــــ

یاسین خاں نے بھی خود کو حیدر علی ہی ظاہر کیا۔ مرہٹے لشکری فوراً مؤدب ہو گئے اور بڑے احترام کے ساتھ زخمی یاسین خاں کو اپنے سپہ سالار ترمک راؤ کے پاس لے گئے۔ یاسین خاں نے وہاں بھی اپنے آپ کو حیدر علی ظاہر کیا۔

وقت حیدر علی کے خلاف ہو گیا تھا اور قسمت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ان کی تمام فوج منتشر ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے تھے یا مرہٹوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ مرہٹہ توپ خانہ کی گولہ باری سے اس قدر دھواں پھیل گیا تھا کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ شہزادہ ٹیپو بھی ان سے جدا ہو گیا تھا۔

اس عالم دل گرفتگی میں حیدر علی خاں جو بالکل اکیلے رہ گئے تھے، انہوں نے سرنگاپٹم کا رخ کیا اور کسی نہ کسی طرح قلعے میں داخل ہو گئے۔

سرنگاپٹم میں حیدر علی نے محل میں جانے کے بجائے درگاہ شاہ قادر ولی میں قیام کیا۔ انہیں سب سے زیادہ پریشانی اپنے لخت جگر شہزادہ ٹیپو کی تھی مگر خدا نے شہزادے کی مدد کی اور شام ہونے سے پہلے ہی شہزادہ مرہٹہ لباس میں شاہ قادر ولی کی درگاہ میں پہنچ کے حیدر علی کی خدمت میں باریاب ہوا اور باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا کر سکون حاصل کیا۔

اس جنگ میں حیدر علی کے اہم سردار محمد علی کمیدان نے ایک عجیب وغریب کارنامہ انجام دیا۔ حیدر علی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ بھی اپنے لشکر سے بھٹک گیا تھا۔ جب اسے کہیں

حیدر علی اور ٹیپو سلطان نظر نہ آئے تو اس نے جلدی جلدی حیدری لشکر کے جس قدر لشکری مل سکے، انہیں اکٹھا کیا اور ایک پہاڑی کے اوپر مورچہ قائم کر لیا۔

مرہٹہ سپہ سالار ترمک راؤ نے اس پہاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور شدید گولہ باری کی مگر محمد علی کمیدان اور اس کے ساتھیوں نے بارہ گھنٹے تک مرہٹہ لشکر کا مقابلہ کیا اور پہاڑی پر قابض رہے۔ پھر جب محمد علی کمیدان کے آدھے سے زیادہ آدمی مارے گئے اور مرہٹوں نے چاروں طرف سے یلغار کر کے اسے بے بس کر کے گرفتار کر لیا تو وہ اس پہاڑی پر قبضہ حاصل کر سکے۔

محمد علی کمیدان کی اس بے پناہ شجاعت پر مرہٹہ سپہ سالار ترمک راؤ بے حد متاثر ہوا اور اس نے محمد علی کو پونا دربار کی ملازمت کی پیشکش کی۔

محمد علی کمیدان نے یہ پیشکش فوراً قبول کر لی اور ترمک راؤ سے درخواست کی کہ اسے اپنے بال بچوں کو سرنگاپٹم سے لانے کی اجازت دی جائے۔

ترمک راؤ کو یہ خوش فہمی تھی کہ اس نے حیدر علی خاں کو اسیر کر لیا ہے۔ اب محمد علی بھاگ کر کہاں جائے گا۔ چنانچہ اس نے محمد علی کو سرنگاپٹم جانے کی اجازت دے دی۔

محمد علی کمیدان اپنے ساتھیوں کو لے کر مرہٹہ لشکر گاہ سے نکلا تو شام کا وقت تھا اور جب وہ مرہٹہ ہراول دستوں کے مورچوں تک پہنچا تو اندھیرا پھیل گیا۔

اس کے ساتھ ترمک راؤ نے ایک راہبر بھیجا تھا تاکہ اسے راستے میں کہیں روکا نہ جائے محمد علی کمیدان نے اس راہبر کے ذریعے ہراول دستوں کے سردار سے درخواست کی کہ اسے ان مورچوں میں رات گزارنے کی اجازت دی جائے۔

اجازت ملنے پر محمد علی اور اس کے ساتھی بظاہر سو گئے۔ پھر جب ان کا راہبر بھی سو گیا تو محمد علی اور اس کے ساتھی اٹھے اور انہوں نے ہراول دستوں کے سوتے ہوئے لشکریوں کے ہتھیار اکٹھا کیے۔ پھر ان پر حملہ کر کے بیشتر کو جہنم واصل کر دیا اور ان ہتھیاروں کو لے کر حیدر علی کے پاس سرنگاپٹم پہنچ گئے۔

مرہٹہ سردار ترمک راؤ نے اپنے خیال میں حیدر علی خاں کو گرفتار کر لیا تھا اس لیے اس کا خیال تھا کہ سرنگاپٹم پر کسی وقت بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کے وہ سرنگاپٹم سے پندرہ میل دور پڑاؤ ڈالے عیش ونشاط کی محفلیں سجاتا رہا اور ادھر حیدر علی نے سرنگاپٹم میں پوشیدہ رہ کر لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بارہ ہزار کا لشکر تیار کر لیا۔

اب حیدر علی خاں نے ارادہ کر لیا کہ کھلے میدان میں نکل کے مرہٹوں کا مقابلہ کرے لیکن محمد علی کمیدان نے عرض کیا:

"نواب بہادر۔ یہ ٹھیک ہے کہ حیدری لشکر کی تعداد بارہ ہزار سے بڑھ گئی ہے اور ہم مرہٹوں کا کھلے میدان میں مقابلہ کر سکتے ہیں مگر ابھی نواب بہادر کے چند جاں نثار موجود ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ نواب بہادر انہیں جاں نثاری کا موقع عطا فرمائیں۔"

حیدر علی اس کی بات نہ سمجھ سکے اور پوچھا:

"محمد علی کمیدان۔ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ تمہاری وفاداری اور جاں نثاری کے تو ہم پہلے سے قائل ہیں۔ اب تم مزید کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"آقائے محترم" محمد علی نے بڑے عجز سے عرض کیا:

"آپ کھلے میدان میں مرہٹوں سے ضرور مقابلہ کریں لیکن اس سے پہلے اس غلام کو اجازت دیں کہ وہ مرہٹوں سے دو دو ہاتھ کرے۔"

"محمد علی۔ تم پہلے ہی ایک عجیب و غریب کارنامہ سرانجام دے چکے ہو۔ ہم تمہاری اس جرأت کی داد دیتے ہیں لیکن ہم تمہارے جیسے وفادار کو ضائع نہیں کر سکتے۔ ہم تمہیں مرہٹوں کے اس بڑے لشکر پر تنہا حملہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔" حیدر علی نے محمد علی کمیدان کی بھرپور تعریف کی مگر اسے کوئی اور قدم اٹھانے سے بھی روکا۔

محمد علی کمیدان دراصل ایک منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس نے سراپا عجز بن کر درخواست کی:

"نواب بہادر۔ مجھے صرف ایک بار اور اجازت دے دیجیے۔ میں دو دن کے اندر اپنا منصوبہ مکمل کر کے سرنگاپٹم واپس آ جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ کے ساتھ کھلے میدان میں مرہٹوں کا مقابلہ کروں گا۔"

حیدر علی خاں نے پھر بھی انکار کیا:

"ہرگز نہیں محمد علی۔ ہم تمہیں مرہٹہ لشکر پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہاں — اگر تم اپنا پورا منصوبہ ظاہر کر کے ہمیں قائل کر لو تو تمہیں اجازت دی جا سکتی ہے۔"

محمد علی کمیدان نے تیسری بار درخواست کی:

"آقائے عالی مقام۔ میں آپ کی حکم عدولی کی جرأت کا تصور بھی نہیں کر سکتا مگر ایک بار پھر یہی التماس کروں گا کہ مجھے مرہٹوں کے مورچے کوہ کری گڈہ جانے کی اجازت دی جائے — میں

انشاء اللہ اس مورچے کو تباہ کر کے دو تین دن میں لوٹ آؤں گا۔"

آخر حیدر علی خاں کو اجازت دینا پڑی:

"محمد علی کمیدان۔ ہم اپنے وفاداروں کی ضد کی بھی قدر کرتے ہیں۔ جاؤ تمہیں اجازت ہے۔ جتنے دستے چاہو ساتھ لے جا سکتے ہو۔"

محمد علی کمیدان خوش خوش صرف چند دستوں کے ساتھ مرہٹوں کے مضبوط مورچے کوہ کری گڈہ کی طرف روانہ ہوا۔

اس نے اپنے منصوبے کے مطابق اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لباس کوہ کری گڈہ پہنچنے سے پہلے ہی تبدیل کر لیے۔ اب وہ حیدری لشکر کے سواروں کے بجائے ترنک راؤ کے مرہٹہ سوار دکھائی دیتے تھے۔ ان کے ساتھ مرہٹہ جھنڈے اور دیگر نشانات بھی تھے۔

کوہ کری گڈہ پہنچ کے محمد علی کمیدان نے ایک ایسے آدمی کو پہاڑی پر بھیجا جو مرہٹی زبان بڑی اچھی طرح بول اور سمجھ سکتا تھا۔ اس نے مورچے کے پہریداروں کو بتایا کہ وہ سپہ سالار ترنک راؤ کے پاس سے آیا ہے اور مورچے کے سردار سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ پہریدار نے اسے اپنے سردار کے پاس پہنچا دیا۔

اس نے مورچے کے سردار کو ٹھیٹ مرہٹی زبان میں بتایا:

"مرہٹہ سپہ سالار ترنک راؤ نے اس پہاڑی مورچے کی حفاظت کے لیے تازہ دم دستے بھیجے ہیں اور پرانے فوجیوں کو واپس بلایا ہے۔"

مرہٹہ سردار نے فوراً اس کی بات پر یقین کر لیا۔ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ قاصد مرہٹہ لباس میں تھا اور مرہٹی زبان بول رہا تھا۔ اس نے پہاڑی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے نیچے مرہٹہ دستے کھڑے دکھائی دیے۔

محمد علی کمیدان کے بھیجے ہوئے آدمی نے صرف ایک جملہ استعمال کیا اور اسے پہاڑی کا قبضہ دے دیا گیا۔

پرانے مرہٹہ لشکری مورچوں سے نکل کر پہاڑی سے اتر گئے اور نئے تازہ دم لشکریوں نے کوہ کری گڈہ کا مورچہ سنبھال لیا مگر — پرانے مرہٹہ لشکریوں کو صحیح سلامت واپس جانا نصیب نہ ہوا

محمد علی کمیدان کے دستوں نے کوہ کری گڈھ پر نصب توپوں کا رخ جانے والوں کی طرف کر دیا اور پھر جو گولہ باری ہوئی تو قیامت برپا ہو گئی۔

مرہٹوں کو چھپنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ وہ جس طرف بھاگ کے جاتے، محمد علی کمیدان کے چھپے ہوئے سپاہی تلوار بلند کر کے ان پر ٹوٹ پڑتے۔

دو گھنٹے کے مختصر وقت میں مرہٹوں کا پوری طرح صفایا کر دیا گیا۔ محمد علی کمیدان کی یہ مہم پہلی مہم سے زیادہ کامیاب ہوئی۔

اب مشکل یہ تھی کہ بھاری توپوں کو سرنگا پٹم کس طرح لے جایا جائے۔ اس کے لیے محمد علی نے حکم دیا کہ بڑی توپوں کو ناکارہ کر دیا جائے اور چھوٹی توپوں کو ساتھ لے کر فوراً سرنگا پٹم واپس روانہ ہوا جائے۔

ظاہر ہے کہ وہ چند دستوں کے ساتھ کوہ کری گڈھ کے مورچے پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے مرہٹوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر چھوٹی توپیں ساتھ لے کر بھاگم بھاگ سرنگا پٹم پہنچ گیا۔

جب محمد علی کمیدان نے اپنی مہم کی روداد حیدر علی خاں کو سنائی تو اس نے اسے فرطِ محبت سے اپنے سینے سے لگایا مگر اس سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ آئندہ وہ اس قسم کے اقدام سے پرہیز کرے گا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی کوشش کسی صورت بھی نہ کرے گا۔

کوہ کری گڈھ کی تباہی کی خبر جب ترمک راؤ کو پہنچی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھ کے پنڈارہ سردار کو حکم دیا کہ نواحِ سرنگا پٹم کی آبادیوں کو اس طرح تاراج اور برباد کر دیا جائے کہ سرنگا پٹم والوں کو وہاں سے رسد کا ایک دانہ نہ مل سکے۔

ترمک راؤ نے یہ حکم تو دے دیا مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ابھی اسے کوہ کری گڈھ سے زیادہ بڑی ایک اور شکست سے دوچار ہونا ہے۔

یہاں اس بات کی ایک بار پھر وضاحت کر دی جائے کہ اس زمانہ کے پنڈارے، کرائے کے ایسے فوجی ہوتے تھے جن کی خدمات نقد رقم دے کر حاصل کر لی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی پنڈاروں کو لوٹ مار میں حاصل ہونے والا مال بھی بخش دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مرہٹوں اور حیدر علی خاں کی ان

مختلف جنگوں کے دوران دونوں طرف پنڈاروں کا بھی غیر منظم لشکر رہتا تھا۔ حیدر علی خاں کے ساتھ جو پنڈاروں کا لشکر تھا اس کا سردار غازی خاں تھا۔

حیدر علی نے اندازہ لگایا تھا کہ کوہ کری گڈھ کی تباہی کا ترمک راؤ پر شدید ردِ عمل ہو گا۔ اس لیے انہوں نے فوراً احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔

حیدر علی کے ہندو لشکریوں نے بتایا کہ اگلے ہفتے مرہٹوں کا ایک بہت بڑا تہوار آ رہا ہے جس میں مرہٹے کسی دریا میں اشنان (غسل) کرنے ضرور جائیں گے۔

اس اطلاع کے ملتے ہی حیدر علی نے فوج کے تین حصے کیے۔

ایک حصے پر شہزادہ ٹیپو کو سردار بنا کر دریائے کاویری کی طرف بھیجا کہ وہ گھات لگا کے بیٹھ جائے اور جب ترمک راؤ دریا میں نہانے کے لیے آئے تو موقع محل دیکھ کر اس پر حملہ کر دے۔

دوسرے حصۂ فوج پر اس نے محمد علی کمیدان کو سردار بنا کر روانہ کیا کہ وہ دوسری طرف سے مرہٹوں پر حملہ آور ہو۔ محمد علی کے ساتھ حیدر علی خاں نے پنڈاروں کی فوج بھی کر دی جس کا سردار غازی خاں تھا۔

باقی فوج لے کر حیدر علی خاں خود ایک کمین گاہ میں پوشیدہ ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ ترمک راؤ دریائے کاویری پر ہی غسل کے لیے آئے گا اس لیے کہ مرہٹہ لشکر سے قریب ترین دریا یہی تھا۔ یہیں پہ کاویری کا دوآبہ بھی تھا۔

چنانچہ — حیدر علی کے اندازے اور جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق ترمک راؤ اپنے محافظ دستوں اور ایک بڑی فوج کے ساتھ اشنان کے لیے کاویری کے دوآبہ پر پہنچا۔ اس نے بڑی فوج کو کچھ دور پر مقرر کیا اور محافظ دستوں کے ساتھ دریا پہ پہنچ کے اشنان کرنے کا ارادہ کیا۔

ترمک راؤ کو ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ نہ ہو سکا کہ حیدر علی کے تین لشکروں نے دریائے کاویری کے دوآبہ کو گھیر رکھا ہے۔

ابھی وہ دھوتی باندھ کے دریا میں اترا ہی تھا کہ محمد علی کمیدان اپنے دستوں کے ساتھ ترمک راؤ کے محافظ دستوں پر گولیاں برساتا ہوا ٹوٹ پڑا۔

ترمک راؤ کے محافظ دستے اس اچانک حملے سے ایسے گھبرائے کہ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر

بھاگ پڑا

اس وقت ترنبک راؤ دریا میں کمر کمر پانی میں کھڑا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آرہی تھی۔

مرہٹوں کی وہ بڑی فوج جو کچھ دور کھڑی پہرہ دے رہی تھی، اس نے جب گولیوں کی آواز سنی تو پہریدار دستوں کی مدد کے لیے تیزی سے آگے بڑھی۔

اس وقت پنڈارہ سردار غازی خاں صرف ایک سو سواروں کے ساتھ اس بڑی فوج اور دریا کے درمیان آگیا۔ مرہٹوں نے صرف سو سواروں کو دیکھ کر ان پہ شدید حملہ کیا۔

پنڈاروں نے اتنے بڑے حملے کو بڑی پامردی سے روکا اور صرف پانچ منٹ تک جم کے لڑنے کے بعد انہوں نے پسپا ہونا شروع کر دیا۔ مرہٹوں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ پنڈارے لڑتے اور بھاگتے ہوئے اس خشک نالے تک پہنچ گئے جس میں شہزادہ ٹیپو گھات لگائے بیٹھا تھا۔ شہزادے نے نالے سے نکل کر تعاقب کرنے والے مرہٹوں پہ حملہ کر دیا۔

اسی وقت حیدر علی خاں بھی اپنی فوج کے ساتھ شہزادے کی مدد کو پہنچ گئے۔ اس چوطرفی مار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹے اپنی کثیر تعداد کے باوجود میدان چھوڑ بھاگے۔

سب سے بری حالت سپہ سالار ترنبک راؤ کی تھی۔ وہ دریا میں اتر چکا تھا اور صرف دھوتی میں کھڑا تھا۔ ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں اور اس کے محافظ دستے حیدری حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے محافظ اسے نہ بچا سکیں گے تو وہ اسی طرح دھوتی پکڑے ہوئے دریا سے نکلا اور دوڑ کے اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا۔

ترنبک راؤ کو دوسری دھوتی بدلنے کا بھی موقع نہ مل سکا اور جب وہ گھبرایا ہوا اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تو دھوتی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

ترنبک راؤ نے گھوڑے پر بیٹھتے ہی اسے تیز بھگانا شروع کر دیا اور اسی طرح بے تحاشہ بھاگتا ہوا وہ سرنگاپٹم سے تیس میل دور موتی تالاب پہ پہنچ کے رکا۔

مرہٹے میسور کو مٹانے آئے تھے مگر انہیں لینے کے دینے پڑ گئے اور اس شکست نے ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔

ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں کئی ہزار مرہٹے مارے گئے اور سات ہزار کے قریب

گرفتار ہوئے۔

ترنبک راؤ نے سرنگاپٹم کی طرف بڑھنے کا ارادہ تو ملتوی کر دیا مگر لشکر کو حکم دیا کہ پائیں گھاٹ اور بالا گھاٹ کو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیا جائے تاکہ حیدر علی خاں کو رسد نہ مل سکے۔

حیدر علی خاں نے ان علاقوں کو بچانے کے لیے شہزادہ ٹیپو اور محمد علی کمیدان کو ادھر روانہ کیا۔ شہزادے کو راستے میں معلوم ہوا کہ ترنبک راؤ کا خزانہ کنکدری کی طرف سے راٹے کوٹہ جا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے حملہ کر کے خزانے پر قبضہ کر لیا۔

ایک طرف مرہٹہ دستوں نے پائیں گھاٹ اور بالا گھاٹ کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ شہزادہ ٹیپو نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ایک دستے کو مرہٹہ لباس پہنایا اور اس دستے کو ساتھ لے کر لوٹ مار کرنے والے مرہٹہ فوجیوں میں شامل ہو گیا۔

مرہٹہ دستے اس وقت تک آبادیاں لوٹ چکے تھے اور لوٹے ہوئے سامان کو گاڑیوں اور گھوڑوں پہ بار کر رہے تھے۔ پھر جب وہ لوٹا ہوا سامان جس میں ہزاروں گھوڑے، بیل، اونٹ اور ہاتھی بھی شامل تھے، لے کر روانہ ہوئے تو شہزادہ بھی ان سے ذرا پیچھے ہو کر چلنے لگا۔

مرہٹے جب اس مقام پر پہنچے جہاں شہزادہ اپنے فوجی دستے چھوڑ گیا تھا تو شہزادے نے حیدری نعرہ لگا کر سامان لے جانے والے مرہٹوں پر حملہ کر دیا۔

اس کی آواز سن کر کمین گاہ میں پوشیدہ دستے بھی نکل آئے اور ان سب نے مل کر مرہٹوں کو مار بھگایا۔

اس طرح تمام لوٹا ہوا مال و اسباب شہزادہ ٹیپو کے ہاتھ آ گیا۔ اس میں چار ہزار گھوڑے، بیس ہاتھی اور بے شمار اونٹ اور بیل شامل تھے۔

مرہٹہ سپہ سالار ترنبک راؤ کی خواہش تھی کہ کسی طرح حیدر علی خاں کو کھلے میدان میں جنگ کے لیے آمادہ کیا جا سکے۔ مگر حیدر علی کو معلوم تھا کہ اتنے بڑے مرہٹہ لشکر سے کھلے میدان میں جنگ کرنا کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے لشکر کو کئی حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا جن میں سے دو حصوں کا سردار شہزادہ ٹیپو تھا۔ شہزادے کے ساتھ محمد علی کمیدان بھی تھا جس سے شہزادہ اہم موقعوں پر کام لیتا تھا۔

حیدری لشکر نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ یا تو وہ کمین گاہوں سے حملہ کرتے یا رات کو شب خون مارتے۔ اس طرح کے حملوں نے ترمک راؤ کا ناک میں دم کر دیا تھا۔

وہ جنگ جس کی کامیابی کے لیے ترمک راؤ نے صرف چھ ماہ کا عرصہ مقرر کیا تھا، وہ چار سال سے بھی زیادہ طویل ہو گئی تھی۔ اس میں مرہٹے ہزاروں کی تعداد میں مارے جا چکے تھے۔ دوسری طرف حیدر علی کا بہت کم نقصان ہوا تھا۔ جو نقصان ہوتا بھی تھا اسے حیدر علی فوراً نئی بھرتی سے پورا کر لیتے تھے۔

ترمک راؤ اور حیدر علی کا آخری معرکہ جسے فیصلہ کن بھی کہا جا سکتا ہے وہ ماگڑی کے جنگل کے قریب ہوا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس چار پانچ سال کے عرصے میں مرہٹوں اور حیدر علی کے درمیان صرف اتنی ہی لڑائیاں ہوئیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ لڑائی تو تقریباً روز ہی ہوا کرتی تھی اور ہفتے عشرے میں کوئی نہ کوئی بڑا مقابلہ بھی ہوتا تھا لیکن حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو نے یہ طریقہ اپنا لیا تھا کہ دن میں مرہٹہ لشکر پر چھپ کر حملہ کیا جائے اور رات کو شب خون مارا جائے۔

چنانچہ ــــ

اس دوران ہونے والی لڑائیوں اور حملوں کا اگر شمار کیا جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے جن میں محمد علی کمیدان نے بعض مواقع پر بڑی جرأت مندی اور ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔

ایک بار جب مرہٹوں کا کیمپ میل کوٹہ میں تھا تو حیدر علی نے محسوس کیا کہ ترمک راؤ کافی زیادہ پریشان ہو چکا ہے اور ممکن ہے وہ واپس جانے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہو اس لیے حیدر علی نے اس سلسلے میں خود قدم اٹھایا اور ترمک راؤ کو صلح کا پیغام بھیجا مگر اس مغرور نے صلح کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے لشکر کو بدنور پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

اس کے جواب میں حیدر علی نے محمد علی کمیدان کو چھ ہزار کے لشکر اور بھاری توپ خانہ کے ساتھ بدنور کی طرف روانہ کیا۔

راستہ جنگل سے ہو کر گزرتا تھا اور اس راستے سے بھاری توپ خانہ نہیں جا سکتا تھا۔ مجبور ہو کر کمیدان نے توپ خانہ واپس کر دیا اور لشکر لے کر بدنور کی طرف بڑھا۔

ترمک راؤ کو محمد علی کمیدان کے میدان میں آنے کی اطلاع ملی تو اس نے ایک بڑا لشکر اس کے مقابلے پر بھیجا۔ ان دونوں کا آمنا سامنا کھلے میدان میں ہو گیا۔

یہ لڑائی تمام دن ہوتی رہی اور اس قدر خوفناک تھی کہ میدان میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ رات ہونے پر مرہٹہ سردار نے ترمک راؤ سے مزید فوج اور توپ خانہ منگوایا۔

محمد علی کمیدان کو مزید توپ خانہ آنے کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً مرہٹہ لاشوں کے پشتے بنا لیے اور ان کی آڑ میں بیٹھ کے مقابلہ کا فیصلہ کیا۔

صبح کو جب مرہٹوں نے اپنے ہی بھائیوں کی لاشوں کے پشتے دیکھے تو پریشان ہو گئے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح دن بھر جنگ ہوتی رہی مگر شام ہوتے ہی محمد علی کمیدان نے اپنے لشکر میں اعلان کر دیا کہ وہ استارہ جا رہا ہے جہاں سے وہ اپنے زخمیوں کو اٹھوانے کے لیے ڈولیاں بھیجے گا۔

اس طرح محمد علی کمیدان جس کی گرفتاری اور سر کے لیے ترمک راؤ نے بھاری انعام بھی مقرر کر دیا تھا وہ میدان سے غائب تھا۔ وہ رات ہی رات میں اپنے لشکر کو لے کر نکل گیا۔

مرہٹہ سردار کو زخمیوں سے معلوم ہوا کہ محمد علی کمیدان استارہ گیا ہے تو وہ لشکر لے کر اُدھر روانہ ہوا مگر محمد علی استارہ جانے کے بجائے جنگل کے کنارے ایک قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ چنانچہ مرہٹے اس کا پیچھا کرتے ہوئے استارہ سے قلعہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

محمد علی نے قلعہ کی فصیل پر جگہ جگہ آگ روشن کرا دی اور لکڑی کی کھونٹیوں کے سہارے کپڑے ٹنگوا دیے۔ مرہٹے مطمئن ہو گئے کہ محمد علی قلعے میں موجود ہے اور مقابلے کی تیاری کر رہا ہے مگر صبح کو قلعہ ویران پڑا تھا۔

مرہٹوں نے قلعہ پر حملہ کیا تو کوئی مدافعت نہ ہوئی۔ وہ سیڑھیاں لگا کر قلعے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ محمد علی کمیدان اپنی فوج کے ساتھ رات کو جنگل میں اتر گیا ہے۔

مرہٹوں کی فوج کا بڑا حصہ راسٹے پٹن ندی کے کنارے خیمہ زن تھا۔ جب ترمک راؤ کو محمد علی کمیدان کی گرفتاری میں ناکامی ہوئی تو اس نے اپنا لشکر آگے بڑھایا۔

شہزادہ ٹیپو اس وقت صحرائے ماگڑی کی کمین گاہ میں پوشیدہ تھا۔ مرہٹہ لشکر جب اس صحرا کے قریب آ کر ٹھہرا تو رات میں شہزادے نے اس پر زبردست شب خون مارا اور اس کے ہاتھ بہت سا سامان آیا۔

دوسری طرف محمد علی کمیدان اپنے دستوں کو بسپا کر کے نواب حیدر علی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ وہ اس وقت ماگڑی کے گھنے جنگل کے کنارے مقیم تھے۔ مرہٹوں پر شب خون مارنے کے بعد شہزادہ بھی ان سے جاملا۔ اب نواب حیدر علی خاں نے مرہٹہ لشکر پہ ایک زبردست شب خون مارنے کا فیصلہ کیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ حیدری سردار محمد علی کمیدان، شہزادہ ٹیپو اور خود نواب حیدر علی موقعہ کی مناسبت سے اپنی جنگی حکمت علی تبدیل کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی بالکل نئے قسم کی حکمتِ علمی استعمال کرتے تھے۔ پس — اس شب خون میں بھی نواب حیدر علی خاں نے بالکل نئی حکمتِ علمی اختیار کی۔

بیدار مغز حیدر علی نے حکم دیا کہ ترنک راؤ سے حاصل کیے ہوئے تمام بیلوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور قرب و جوار سے بھی دس بارہ ہزار بیل خرید کر لائے جائیں۔

سب لوگ پریشان تھے کہ آخر نواب بہادر اس قدر کثیر تعداد میں بیلوں کا کیا کریں گے؟ لیکن جب بارہ ہزار کے قریب بیل حیدر علی کی خیمہ گاہ کے قریب جمع کر دیے گئے تو انھوں نے حکم دیا:

"تمام بیلوں کے سینگوں پر کپڑا لپیٹ کے تیل چھڑک دیا جائے"۔

نواب کے اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور چار گھنٹے میں بیلوں کے سینگوں پر لپٹے ہوئے کپڑوں کو تیل سے تر کر دیا گیا۔

اس وقت نواب نے دوسرا حکم جاری کیا:

"صرف دو سو سواران بیلوں کو قابو میں رکھیں۔ باقی تمام لشکر، مرہٹہ لشکر کے گرد دور دور رہ کے گھیرا ڈال لے۔ حملہ ہرگز نہ کیا جائے"۔

حیدر علی کے اس حکم کی بھی فوراً تعمیل کی گئی۔ حیدری فوجیں چاروں طرف پھیل گئیں۔ مرہٹہ لشکر اس جنگل کے سامنے میلوں دور تک پھیلا ہوا تھا۔

ترنک راؤ کو معلوم ہو گیا تھا کہ حیدر علی کی پوری طاقت اسی جگہ اکٹھا ہے اور وہ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا چاہتا ہے اس لیے وہ بھی زور شور سے تیاریاں کر رہا تھا۔

حیدر علی نے اپنے تمام لشکر کو مرہٹوں کے گرد پھیلا دیا اور خود بیلوں والے دستے کے پاس کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے حکم دیا:

"بیلوں کے سینگوں پر بندھے کپڑوں کو آگ دکھا دی جائے"۔

تیل سے بھیگے ہوئے کپڑوں میں آگ لگی تو جیسے وہاں چراغاں ہو گیا۔ مرہٹہ پہریداروں نے ہزاروں چراغ جلتے دیکھے تو پریشان ہو گئے۔ انہوں نے سونے والے لشکریوں کو جگا دیا۔ وہ سب ہڑبڑا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب حیدر علی نے آخری حکم دیا:

"تمام بیلوں کو مرہٹہ خیمہ گاہ کی طرف ہانک دیا جائے"۔

چنانچہ —

سوار دستوں نے بیلوں کو، جن کے سینگوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے، مرہٹہ خیمہ گاہ کی طرف ہانکنا شروع کر دیا۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے شعلوں کا ایک دریا یا سمندر گرجتا ہوا مرہٹہ خیموں کی طرف دوڑ پڑا ہو۔ جب شعلوں کی گرمی بیلوں کے سینگوں تک پہنچی تو ان کے دوڑنے میں اور تیزی آ گئی۔ اور وہ بپھرے ہوئے پاگلوں کی طرح مرہٹہ خیمہ گاہ پر ٹوٹ پڑے۔

مرہٹے ابھی پوری طرح بیدار ہو کر سنبھلے بھی نہ تھے کہ مشعل بردار بیل کسی بلائے بے درماں کی طرح انہیں روندنے کچلنے اور سینگوں سے چھیدنے لگے۔

یوں مرہٹہ لشکر میں قیامت برپا ہو گئی اور وہ خیمہ گاہ چھوڑ کے ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ بیلوں سے بچ سکیں۔

لیکن —

ان بھاگنے والوں کو بیلوں سے دور ہو کر بھی پناہ نہ مل سکی اس لیے کہ حیدر علی نے اپنی گھیرا ڈالنے والی فوج کو حکم دے دیا تھا کہ بھاگنے والے مرہٹوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹہ لشکر پہلے تو بیلوں کا شکار ہوا اور جو بچ کے نکل بھاگا اسے حیدری فوجیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس افراتفری میں ترنک راؤ بھی اپنی جان بچا کے بھاگ نکلا اور جب وہ وہاں سے بھاگنے کے بعد صبح کو خیمہ گاہ سے دس میل دور جا کے رکا تو اس کے ساتھ صرف چند ہزار سپاہیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ترمک راؤ کی خیمہ گاہ کو رات بھر حیدری لشکر کے پنڈاروں اور خود مرہٹہ لشکر کے ساتھی پنڈاروں نے خوب لوٹا۔

اس عظیم شکست کے بعد ترمک راؤ نے پونا سے کمک کی درخواست کی۔

حیدر علی خاں کے سر سے نحوست کا سایہ دور ہو چکا تھا۔ ان کی قسمت نے اب یاوری شروع کر دی۔

جب ترمک راؤ کا قاصد کمک کی درخواست لے کر پونا پہنچا تو مادھو راؤ پیشوا مر چکا تھا اور نارائن راؤ اور رگھوبا دو امیدواروں میں پیشوا کے عہدے کے لیے جنگ ہو رہی تھی۔

حیدر علی نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ترمک راؤ کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ ترمک راؤ نے اسے غنیمت جانا مگر تاوانِ جنگ کا مطالبہ کیا۔ آخر ۳۶ لاکھ تاوانِ جنگ حاصل کر کے ترمک راؤ پونا واپس چلا گیا۔

اور ـــــ یہ چھ سالہ جنگ ختم ہو گئی!

اس جنگ کے سلسلہ میں "بہادر نامہ" ایک مختصر منظوم جنگ نامہ درج ہے جو قارئین کے لیے یقیناً باعثِ دلچسپی ہو گا:

کروں کیا بیاں ماجرائے ستیز
کہ برپا تھی اس جا پہ اک رستخیز
سرِ حلقِ مردانِ جنگ آزما
نثارِ دمِ خنجر و تیغ تھا

رواں خوں تھا مانندِ دریائے آب!
سرِ پہلواناں تھے مثلِ حباب
جواں مرد جتنے تھے اس فوج کے
سبھی دفعتاً واں پہ مارے گئے

ہوئے کشت اعدا بہت وقتِ جنگ
زمیں خوں سے یکسر ہوئی لالہ رنگ
کوئی لوٹتا تھا پڑا خاک پہ
کوئی کھا کے نیزہ گرا آہ کر

ہوئے کشتہ کتنے کروں کیا بیاں
سوا لاش کے کچھ نہ واں تھا عیاں
مظفر ہوئی غازیوں کی سپاہ
ہوئی فوجِ پونا سراسر تباہ





خانہ جنگی کی وجہ سے مرہٹہ طاقت منتشر ہو کر رہ گئی۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حیدر علی خاں اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی کے لیے کوشاں ہوئے۔

حیدر علی خاں کے پاس اس وقت محمد علی کیدان، رضا علی خاں، ہیبت جنگ اور خود اس کا جوان بیٹا شہزادہ ٹیپو جیسے اعلیٰ درجہ کے شجاعت سے بھرپور اور تجربہ کار سردارانِ فوج موجود تھے۔ ان لوگوں کی موجودگی میں حیدر علی کسی بھی طاقت سے ٹکر لے سکتے تھے۔

انہی دنوں ادھونی کے ناظم بسالت جنگ نے بلاری پر حملہ کر دیا۔ بلاری کوئی ریاست نہیں بلکہ ایک پالیگار زمینداری تھی۔

بلاری کے پالیگار نے حیدر علی سے مدد مانگی۔ حیدر علی فوراً لشکر لے کر بلاری پہنچے۔ بسالت جنگ کی فوج فرانسیسی سردار موسیو ڈی لالی کے زیرِ کمان تھی۔ وہ حیدر علی کے مقابلہ پہ آیا اور شکست کھا کر پسپا ہو گیا۔

اس شکست کے نتیجے میں بلاری کی پالیگار زمینداری (یہ زمیندار خود کو راجہ کہتے تھے) حیدر علی کے ماتحت ہو گئی۔ اور وہاں کے راجہ نے نظامِ دکن کے بجائے حیدر علی خاں کو خراج دینا شروع کر دیا۔

بلاری کے بعد حیدر علی نے ریاست گتی کا رُخ کیا۔ راجہ گتی مراری راؤ کی بہادری کے

کارنامے دور دور تک مشہور تھے۔ مراری راؤ نے دوبار حیدر علی خاں کی مخالفت کی تھی اور اپنی فوج کے ساتھ دشمنوں میں شامل ہو کے حیدر علی خاں سے جنگ کر چکا تھا۔

حیدر علی خاں نے محاصرہ اس قدر سخت کیا کہ اندر والوں کو باہر سے رسد ملنا بند ہو گئی اور قلعہ کے اندر تالاب اور باؤلیاں خشک ہو گئیں۔ جب لوگ بھوک اور پیاس سے بے حال ہوئے تو راجہ نے اطاعت قبول کر لی۔

حیدر علی خاں نے ریاست پر قبضہ کر کے راجہ اور اس کے اہل و عیال کو سرنگا پٹم بھیج دیا۔ گتی کی فتح کا یہ اثر ہوا کہ گرم کنڈہ کے قلعہ دار نے خود ہی قلعہ حیدر علی کے حوالے کر دیا۔

بلاری کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے نظامِ دکن، حیدر علی کے خلاف ہو گیا تھا اور اب جو ان کا قبضہ گتی پر ہوا تو مرہٹے بھی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت مرہٹوں کا پیشوا رگھوبا تھا۔ اس نے سولہ ہزار کا لشکر نظامِ دکن کے پاس بھیجا تا کہ وہ اپنے اور مرہٹہ لشکر کی مدد سے حیدر علی کو شکست دے کر بھگا دے۔

پس —

نظامِ دکن اور مرہٹوں کا لشکر دونوں مل کے حیدری لشکر کی طرف بڑھے۔ اس مشترکہ لشکر کا سردار ابراہیم خاں دھونسہ تھا۔

حیدر علی خاں نے اپنے سردار محمد علی کیدان کو "گھونسہ" کا خطاب دے کر دھونسہ کے مقابلے پہ روانہ کیا۔

محمد علی گھونسہ نے جاتے ہی دھونسہ کو مار بھگایا۔

کہتے ہیں کہ جب ابراہیم خاں دھونسہ میدانِ جنگ سے بھاگا تو اس کے سر پر ٹوپی یا خود، کوئی چیز نہیں تھی اور وہ ننگے سر بھاگ کے بسالت جنگ کے پاس پہنچا۔

یہ وہی بسالت جنگ تھا جسے حیدر علی نے بلاری کے محاذ پر شکست دے کر پسپا کر دیا تھا۔ اس وقت بھی حیدر علی، دھونسہ کا تعاقب کرتے ہوئے ادھونی تک پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کے حیدر علی نے ایک دلچسپ مذاق کیا۔ انہوں نے ایک قاصد کے ہاتھ ناظم ادھونی کو مندرجہ ذیل پیغام بھجوایا:

"ناظم ادھونی بسالت جنگ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دارالامارت
سرنگاپٹم دور ہونے کی وجہ سے حیدری لشکر کو دو ماہ کی تنخواہ ادا نہیں
کی گئی، اس لیے ضروری مصارف کے لیے دس لاکھ روپیہ بھیج دیا
جائے۔"

یہ حسنِ طلب کا ایک بہترین اور نہایت عمدہ و مہذب انداز ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر علی اَن پڑھ ہونے کے باوجود اخلاق اور تہذیبی اقدار کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔

بسالت جنگ کو جیسے ہی حیدر علی خان کا پیغام ملا، اس نے اسی وقت مطلوبہ رقم بھیج کے ادھونی کو بچا لیا۔

ایک روایت کے مطابق حیدر علی خان نے قلعہ ادھونی کا محاصرہ کر کے جب دو چار گولے قلعہ کے اندر پھینکوائے تو بسالت جنگ کی محل سرا میں تہلکہ مچ گیا۔ اور خواتین اور بچوں کے شور سے قیامت برپا ہو گئی۔

بسالت جنگ نے خود بخود ایک بڑی رقم حیدر علی کے پاس ارسال کی اور آئندہ دوستی کا وعدہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔

نواب بہادر کو ذرا امن نصیب ہوا تو انہیں اپنے بیٹے شہزادہ ٹیپو کی شادی کی فکر ہوئی۔ شہزادہ نہایت پرہیزگار اور سعادت مند بیٹا تھا۔ اس نے گیارہ سال کی عمر ہی میں میدانِ حرب میں قدم رکھ دیا تھا اور اب اس کی عمر تقریباً ۲۲ سال ہو رہی تھی۔ وہ جوانی کی منزل سے گزر رہا تھا مگر اس سے اب تک کوئی ایسی لغزش نہ ہوئی تھی کہ والدین یا اہلِ لشکر کو انگشت نمائی کا موقع ملتا۔

انہی خوبیوں کے پیشِ نظر حیدر علی خان کسی ایسی بہو کی تلاش میں تھے جو جواں مرد مگر نیک دل شہزادے کی ملکۂ دل بن سکے۔

جہاں تک شہزادہ ٹیپو کا تعلق تھا تو اس کی طرف سے آج تک کسی سمت ہلکا سا اشارہ بھی نہ ہوا تھا۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ شہزادہ ٹیپو کی والدہ فاطمہ بیگم (فخر النساء) میر رضا علی خان کی ہمشیرہ تھیں۔ اس طرح میر رضا علی خان شہزادے کے ماموں ہوتے تھے۔ پس فاطمہ بیگم نے اپنے بھائی کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ کسی طرح شہزادے کا عندیہ معلوم کریں یعنی یہ معلوم ہو کہ شہزادہ کسی خاص لڑکی کو تو پسند نہیں کرتا۔

فاطمہ بیگم نے یہ کام بھائی کو تین سال قبل سپرد کیا تھا جب شہزادے کی عمر بیس سال تھی مگر میر رضا علی خان اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اس معاملہ میں کورے کے کورے ہی رہے۔ اور آخر انھوں نے بہن کو یقین دلا دیا کہ شہزادے کے دل میں کسی کی صورت نہیں بسی ہے اور اس کی شادی جس جگہ بھی کرنے کا ارادہ کیا جائے وہ اسے بخوشی تسلیم کر لے گا۔

قرائن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیدر علی خان نے بھی شادی کے [illegible] میں شہزادے کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کی مگر انہیں بھی اس سلسلے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اب حیدر علی نے اپنے طور پر شہزادے کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کی۔

اس تلاش میں ان کی نظر امام صاحب بخشی نائطہ کی بیٹی پہ آ کر رک گئی۔

نائطہ خاندان، نواب حیدر علی خان کے ساتھ ہی ارکاٹ سے ہجرت کر کے سرنگاپٹم آیا تھا۔ اور دونوں خاندانوں میں گہرے تعلقات تھے۔

ادھر حیدر علی خان نے شہزادے کے لیے امام صاحب بخشی نائطہ کی بیٹی کو پسند کیا، اُدھر ان کی حرم سرا میں ایک اور ہی گل کھلا۔

وہ گل یہ تھا کہ شہزادے کی والدہ نے اپنے ہی خاندان کے لالہ میاں کی بیٹی رقیہ بانو کو شہزادے کے لیے پسند کر لیا۔ اور اس کا اعلان بھی کر دیا۔

جب یہ خبر حیدر علی کو پہنچی تو ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور انہوں نے بھی فوراً اعلان کر دیا کہ شہزادے کی شادی امام صاحب بخشی نائطہ کی دختر نیک اختر سے ہوگی۔

اس طرح حیدر علی خان کے حرم میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ لطف یہ کہ حیدر علی خان نے شہزادے کی شادی کی تیاریوں کا حکم بھی دے دیا۔ مگر دوسری جانب شہزادے کی والدہ بھی اکڑی ہوئی تھیں اور انہوں نے باآوازِ بلند کہا تھا کہ شہزادے کی شادی رقیہ بانو سے ہوگی اور اس شادی کو کوئی نہیں روک سکتا۔

حیدر علی خان کی حرم سرا کی یہ چہ میگوئیاں محل سے نکل کر دربار تک پہنچ گئیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ حیدر علی خان نے شہزادے کی شادی کی تیاریوں کا حکم تو دے دیا تھا مگر انہوں نے ابھی تک امام صاحب بخشی نائطہ سے اس نسبت کے لیے کوئی گفت گو نہ کی تھی جبکہ دوسری طرف

فاطمہ بیگم نے لالہ میاں سے شہزادے کے لیے رقیہ بیگم کو مانگ لیا تھا اور لالہ میاں نے اس پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

شہزادہ ٹیپو کے لیے جس خاندان سے بھی رشتہ مانگا جاتا وہ اس پر فخر کرتا اس لیے کہ شہزادہ ولی عہد سلطنت خداداد میسور رہنے کے علاوہ اپنی شجاعت، اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے پوری سلطنت میں مقبول تھا۔

بہرحال ـــــ حیدر علی خاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ فاطمہ بیگم نے شہزادے کے لیے رقیہ بانو کو پسند کر کے رشتہ طے کر لیا ہے تو انہیں بہت غصہ آیا۔ انہوں نے بیوی سے تو کچھ نہ کہا البتہ رضا علی خاں کو بلا کر ان سے شکایت کی:

"رضا علی خاں۔ یہ کیسے ستم کی بات ہے کہ ہم نے شہزادے کے لیے امام صاحب بخشی نائطہ کی بیٹی کو پسند کیا اور ہماری بیگم نے ہماری مرضی کے خلاف شہزادے کے لیے رقیہ بانو کو پسند ہی نہیں کیا بلکہ اس سے رشتہ بھی طے کر دیا!"

رضا علی خاں کو حیدر علی اور فاطمہ بیگم کے اس دلچسپ اختلاف کی خبر مل چکی تھی اس لیے انہوں نے بڑی احتیاط سے جواب دیا:

"نواب بہادر درست فرما رہے ہیں۔ نواب بیگم کو آپ کی مرضی کے خلاف یہ رشتہ طے نہیں کرنا چاہیے تھا!"

"پھر اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں شہزادے کے لیے امام صاحب بخشی کی بیٹی بیاہ کے ضرور لاؤں گا۔ اب یہ میری انا کا مسئلہ بن گیا ہے کیونکہ بات پورے دربار میں پھیل چکی ہے۔" نواب بہادر کے لہجے سے غصے کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔

رضا علی خاں کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے:

"نواب بہادر۔ میرا خیال ہے کہ نواب بیگم کو شاید یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ نے امام صاحب بخشی کی بیٹی کو شہزادے کے لیے مانگ لیا ہے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ نواب بیگم اب بھی یہی کہہ رہی ہیں کہ آپ نے امام صاحب بخشی سے ان کی بیٹی کے لیے اب تک کوئی بات نہیں کی"۔

حیدر علی خاں جیسے چونک پڑے۔

وہ کچھ دیر رضا علی خاں کو گھورتے رہے۔ پھر بولے:

"یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس سلسلے میں امام صاحب سے اب تک کوئی بات نہیں کی مگر کیا میرا یہ اعلان کر دینا کافی نہیں کہ میں نے شہزادے کے لیے امام صاحب کی بیٹی کو پسند کر لیا ہے"۔

رضا علی خاں نے ذرا شیر ہو کے مگر دبے لہجے میں کہا:

"نواب بہادر بالکل درست فرما رہے ہیں۔ آپ کا اعلان کر دینا ہی کافی تھا مگر شاید نواب بہادر اس بات سے واقف نہیں کہ نائطہ خاندان اپنی بیٹیاں دوسرے خاندانوں میں نہیں دیتے۔ ہو سکتا ہے وہ شہزادے کے لیے بھی انکار کر دیں"۔

"کیا کہا۔ انکار کر دیں!"

یہ کہتے ہوئے نواب بہادر غصہ سے تلملا کے کھڑے ہو گئے:

"یہ تم نے کیسے کہا کہ نائطہ ہمارے شہزادے کے رشتہ کو رد کر دیں گے۔ کیا ہمارا خاندان ان سے کمتر ہے"۔

رضا علی خاں نے پُرزور الفاظ میں کہا:

"ہرگز نہیں۔ ہم نائطہ سے کسی بات میں بھی کم نہیں لیکن معلوم یہ ہوا ہے کہ نائطہ اس بات پر غرور کرتے ہیں کہ وہ خالص عربی النسل ہیں اور ان کے خون میں اب تک کوئی میل نہیں ہوا اس لیے وہ دوسرے لوگوں سے افضل اور اعلیٰ ہیں"۔

حیدر علی خاں چیخ کے بولے:

"اگر نائطہ ایسا کہتے ہیں تو وہ لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ میں خود بھی عربی النسل ہوں[1] لیکن میں اس بات پر فخر نہیں کرتا اس لیے کہ اسلام نے رنگ، نسل، خون کے تمام امتیاز مٹا دیے ہیں۔ اور اعلان کیا تھا کہ بزرگی اور عظمت کا تعلق تقویٰ سے ہے جس کا کردار جتنا عظیم ہو گا وہ خود بھی اتنا ہی عظیم سمجھا جائے گا"۔

"بے شک بے شک۔ میں نواب بہادر کے خیالات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں"۔

رضا علی خاں نے تائید کی؛ اسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں نواب بہادر نائطہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔

نواب بہادر نے ذرا توقف کے بعد کہا:

"رضا علی خاں۔ تم امام صاحب بخشی نائطہ کے پاس جاؤ اور ہماری طرف سے ان کی بیٹی کا رشتہ شہزادے کے لیے مانگو۔ میں دیکھوں گا وہ کیا جواب دیتے ہیں"۔

---

[1] انگریز مؤرخ اورڈ ولفنٹا نے حیدر علی کو عربی النسل لکھا ہے

رضا علی خاں مخمصے میں پھنس گئے۔ وہ دراصل حیدر علی خاں کو اس رشتے سے باز رکھنا چاہتے تھے مگر اب نواب بہادر نے انہیں شہزادے کے رشتے کے لیے نائطہ کے پاس جانے کا حکم دے دیا تھا۔ انکار کرنے کا بھی کوئی موقع نہ تھا اس لیے انہوں نے تعمیل کے لیے سر جھکا دیا۔

امام صاحب بخشی نائطہ، رضا علی خاں کو اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ رضا علی میسور کے ان آدمیوں میں سے ہیں جن پہ نواب بہادر اندھا اعتماد کرتے تھے۔

انہوں نے رضا علی خاں کو بڑی عزت اور محبت سے ملاقات کا شرف بخشا اور ان کی تواضع کے لیے عرب سے آئی ہوئی کھجوریں پیش کیں۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد رضا علی خاں حرفِ مطلب زبان پر لائے:

"محترم امام صاحب۔ آپ کی بزرگی اور خاندانی عظمت کا سلطنتِ خداداد کا بچہ بچہ قائل ہے اور ہر شخص آپ سے قریب تر ہونے کا خواہاں ہے"۔

امام صاحب خوش ہو گئے۔

"یہ تو آپ لوگوں کی نوازش ہے کہ ہماری بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں"۔

رضا علی خاں نے فوراً کہا:

"امام صاحب۔ آپ بزرگی تسلیم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ یہاں تو بڑے بڑے لوگ آپ سے رشتے ناتے کرنا چاہتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

امام صاحب نے حیران نظروں سے رضا علی کو دیکھا:

"خان صاحب میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

رضا علی نے تکلف کو بالائے طاق رکھ کر صاف الفاظ میں کہہ دیا:

"امام صاحب! آپ کو مبارک ہو کہ نواب بہادر حیدر علی خاں، شہزادہ ٹیپو کو آپ کی فرزندی میں دینا چاہتے ہیں"۔

یہ سن کر امام صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شاید انہوں نے بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ ان کے حلق میں اٹک کے رہ گئے۔

رضا علی خاں سمجھ گئے کہ امام صاحب کے دل میں اس وقت کیسے کیسے ناقابلِ بیان خیالات

اٹھ رہے ہوں گے۔

فارسی مثل ہے کہ گویم مشکل، نہ گویم مشکل۔ (بولوں تو مشکل نہ بولوں تو مشکل)۔ ان میں نواب بہادر کی درخواست نامنظور کرنے کی جرأت نہ تھی اور قبول کرنے میں ان کے خون میں فرق آتا تھا۔

کچھ انتظار کے بعد رضا علی خاں نے کہا:

"امام صاحب۔ آپ نے نواب بہادر کی خواہش کا کوئی جواب نہیں دیا؟"

امام صاحب بوکھلا گئے:

"جواب ـــ ہاں ہاں جواب ـــ ضرور دوں گا جواب ـــ زنان خانے سے ہو کے میں ابھی واپس آتا ہوں"۔

رضا علی خاں کو تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ زنان خانے میں کیا گفتگو ہو رہی تھی اس کا صحیح اندازہ تو وہ نہ کر سکے مگر انہوں نے یہ ضرور دیکھا کہ نائطہ خاندان کے تقریباً تمام بڑے بڑے سردار اور معززین ایک ایک کر کے باہر سے آتے اور زنان خانے میں جاتے رہے۔ بعض اوقات زنان خانے کی گفتگو میں اس قدر تلخی اور ترشی آ جاتی تھی کہ آوازیں دیواروں اور دروں سے گزر کر رضا علی تک بھی پہنچتی تھیں۔

آخر امام صاحب سر جھکائے، منہ لٹکائے برآمد ہوئے اور رضا علی خاں کے پاس پہنچ کے بڑے مہذب طریقے سے بولے:

"خان صاحب۔ معاف فرمائیے۔ آپ کو بہت انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑی۔ دراصل فیصلہ تو مجھ ہی کو کرنا تھا۔ آخر میں لڑکی کا باپ ہوں لیکن بیٹی کے معاملے میں دستور کے مطابق چار عزیزوں سے مشورہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ تاخیر کی یہی وجہ تھی"۔

رضا علی خاں ایک تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے اس پہ امام صاحب کا وضاحتی بیان۔ وہ بل کھا کر رہ گئے اور ترش لہجے میں بولے:

"قبلہ امام صاحب۔ مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو نواب بہادر کی خواہش کا جواب چاہیے"۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ نواب بہادر کی خواہش کو کون نامنظور کر سکتا ہے۔ پھر آخر شہزادہ بہادر ولی عہد سلطنت ہیں"۔ امام صاحب نے چبا چبا کے جواب دیا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ فیصلہ انہوں نے بادلِ نخواستہ کیا ہے۔

امام صاحب کا جواب صاف اور واضح نہ تھا۔

رضا علی خاں نے وضاحت چاہی:

"امام صاحب۔ میں آپ کے جواب سے کیا نتیجہ نکالوں۔ آپ نے شہزادہ بہادر کا رشتہ منظور فرما لیا ہے یا ابھی اس پر مزید غور و فکر باقی ہے؟"

"نہیں نہیں خان صاحب۔ غور و فکر کی کیا ضرورت ہے۔ نواب بہادر کا ارشاد ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ ہماری طرف سے خوشنودی اور رضامندی کا اظہار فرما دیجیے۔"

امام صاحب نے اگرچہ صاف طور پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی مگر رضا علی خاں کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ امام صاحب اور ان کے عزیز و اقارب اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔

رضا علی خاں کو اس بات کا پہلے سے اندازہ تھا اور اسی لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ شہزادے کا رشتہ اس گھرانے میں ہو جو بزعم خود اپنے خاندان کو محض عربی النسل ہونے کے سبب برصغیر کی تمام دیگر قوموں اور خاندانوں سے افضل سمجھتا ہو۔

انہی خیالات میں گم وہ نواب بہادر کے پاس پہنچے۔

نواب بہادر مہمان خانہ سے اٹھ کر اندر جا چکے تھے۔ رضا علی خاں نے اپنے آنے کی اطلاع کرائی تو نواب نے انہیں اندر ہی بلوا لیا۔

نواب بہادر نے دیکھتے ہی سوال کیا:

"کیا جواب دیا امام صاحب بخشی نائطہ نے؟"

اور ـــــ

رضا علی خاں کو مجبوراً کہنا پڑا:

"انہوں نے رشتہ منظور کر لیا ہے نواب بہادر اور مجھے پیغام دیا ہے کہ نواب بہادر کو ان کی خوشنودی اور رضامندی سے آگاہ کر دیا جائے۔"

نواب بہادر کا بجھا بجھا سا چہرہ اک دم چمک اٹھا:

"میں نہ کہتا تھا کہ امام صاحب انکار نہیں کر سکتے۔ آخر ہم بھی تو عربی النسل ہیں۔ وہ انکار کیسے کر سکتے تھے!"

اس وقت نواب بیگم کمرے میں تشریف لے آئیں۔ نواب بہادر انہیں دیکھ کے مسکرائے:

"مادرِ ٹیپو۔ آپ نے سنا امام صاحب نے اپنی دختر کے لیے ہمارے شہزادے کا

رشتہ منظور کر لیا ہے"۔

فاطمہ بیگم کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی، چیخ کے بولیں:

"نواب بہادر۔ اولاد کے رشتوں کا فیصلہ ماں کی مرضی سے ہوا کرتا ہے۔ آپ یہ حق مجھ سے کیوں چھیننا چاہتے ہیں؟"

نواب بہادر کا منہ بھی کچھ بدمزہ ہو گیا۔ انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"فاطمہ بیگم۔ اگر آپ شہزادے کی ماں ہیں تو میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے بھی اس پر وہی حق حاصل ہے جس کا دعویٰ آپ کر رہی ہیں اور میں نے اپنا حق استعمال کیا ہے۔ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔"

"نواب بہادر۔ میں کمال معذرت سے یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ شہزادے ٹیپو کی شادی کوئی ملکی یا سیاسی معاملہ نہیں جس میں آپ کی مرضی کو مقدم رکھا جائے۔ آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ میں نے شہزادے کے لیے رقیہ بانو کا انتخاب کر لیا ہے۔ پھر آپ کو نائطہ خاندان کی خوشامد کرنے کی کیا ضرورت تھی!"

رضا علی خاں نے دیکھا کہ بات بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کا اور نواب بہادر کا رشتہ بہت نازک تھا اس لیے وہ فوراً وہاں سے اٹھ آئے۔

ان کے جاتے ہی نواب بہادر کا لہجہ بھی کرخت ہو گیا:

"میں نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ میں شہزادے کی شادی نائطہ خاندان میں کر رہا ہوں۔ پھر آپ نے رقیہ بانو کے لیے کیوں درخواست کی؟"

فاطمہ بیگم نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا:

"رقیہ بانو کا رشتہ پہلے میں نے مانگا تھا اس لیے شہزادے ٹیپو کی شادی میں رقیہ بانو سے کروں گی"۔

نواب بہادر ایک لمحے کو جھجکے پھر بولے:

"میں نے بھی بخشی نائطہ کی بیٹی کو شہزادے کے لیے مانگا ہے اور اس نے رشتہ منظور کر لیا ہے۔ میں اپنے بیٹے کی شادی وہیں کروں گا۔"

ٹھیک اسی وقت حیدر علی خاں کی والدہ مجیدہ بیگم دو کنیزوں کے سہارے کمرے میں داخل ہوئیں۔ حیدر علی خاں ان کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ فاطمہ بیگم نے آنچل سنبھالتے ہوئے فوراً آگے بڑھ کر

ان کا بازو تھام لیا۔

"ادھر آئیے مادرِ مہرباں۔ یہاں تشریف رکھیے۔" حیدر علی خاں نے ماں کو سہارا دے کر ایک نرم کوچ پر بٹھا دیا۔

مجیدہ بیگم نے سانس سنبھالتے ہوئے کہا:

"کیا بات ہے فاطمہ بیٹی۔ یہ کیسا شور ہو رہا تھا؟"

فاطمہ بیگم نے بیان دینا شروع کیا:

"دیکھیے امی جان۔ میں نے شہزادے بٹو کے لیے رقیہ بانو کو پسند کر لیا ہے اور شہزادے کی شادی اسی سے ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ اچھا رشتہ ہے۔ کر دو شادی۔" بڑی بی نے بڑے اطمینان سے شادی کی اجازت دے دی۔

اب نواب بہادر نے دخل دیا:

"مادرِ مہرباں۔ میں نے شہزادے کے لیے نائطہ خاندان کے امام صاحب بخشی کی دختر کو پسند کیا ہے۔ شہزادے کی شادی اس سے ہوگی۔"

بڑی بی نے ایک لمبی سانس لے کر فرمایا:

"ٹھیک ہے۔ اچھا رشتہ ہے۔ کر دو شادی۔"

"جی!"

یہ لفظ حیدر علی خاں اور فاطمہ بیگم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور وہ دونوں حیران ہو کر بڑی بی کو دیکھنے لگے۔

"جی سے تم دونوں کا کیا مطلب ہے؟" بڑی بی تلخی سے بولیں۔

"امی جان۔ آپ نے مجھے شہزادے اور رقیہ بانو کی شادی کی اجازت دے دی ہے ناں؟"

فاطمہ بیگم نے بڑی امیدوں سے کہا۔

"ہاں ہاں بیٹی۔ میں نے کب انکار کیا ہے!" بڑی بی نے فاطمہ بیگم کی بات کی تائید کر دی۔

فاطمہ بیگم نے فاتحانہ انداز میں حیدر علی کو دیکھا۔

حیدر علی نے ایک قدم آگے بڑھ کر مجیدہ بیگم کا ہاتھ پکڑا اور لجاجت سے بولے:

"مادرِ مہرباں۔ ابھی آپ نے مجھے شہزادے بٹو کی امام صاحب بخشی کی بیٹی کے ساتھ شادی کی اجازت دی تھی ناں؟"

"ہاں ہاں بیٹے۔ میں نے کب انکار کیا ہے!" بڑی بی نے حیدر علی خاں کی بات کی بھی تائید کر دی۔

اب فاطمہ بیگم حیران رہ گئیں۔ تنک کر بولیں:

"آپ نے مجھے رقیہ بانو کے ساتھ شہزادے کی شادی کی اجازت دی ہے؟"

بڑی بی مسکرائیں:

"فاطمہ بیگم۔ میں نے تمہیں اجازت ضرور دی ہے مگر ایک شرط کے ساتھ۔"

"جی۔ کیسی شرط؟" فاطمہ بیگم نے گھبرا کر کہا:

"میں سمجھ نہیں سکی۔"

"شرط بتانے سے پہلے میں تمہیں ایک ہندی مثل سناتی ہوں۔" مجیدہ بیگم نے بیٹے اور بہو کے غصہ بھرے چہروں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"ہندی مثل مشہور ہے کہ جو راج ہٹ سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا سب کچھ گنوایا۔ ہٹ کہتے ہیں ضد کو۔ راج ہٹ کے معنی ہوئے راجہ یا بادشاہ کی ضد۔ اس لیے میں چاہوں گی کہ تم بادشاہ یعنی حیدر بیٹے کی ضد سے نہ ٹکراؤ۔ انہیں اپنی ہٹ پوری کرنے دو۔"

"واہ وا۔ سبحان اللہ۔ کیا اچھا فیصلہ کیا ہے مادرِ مہرباں نے۔" حیدر علی خاں نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ مجیدہ بیگم نے انہیں روک دیا:

"ٹھہرو حیدر بیٹے۔ ابھی میں نے اپنی بات ختم نہیں کی۔" مجیدہ بیگم سنبھل سنبھل کے کہہ رہی تھیں

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جو راج ہٹ سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا سب کچھ گنوایا۔ اس مثل کا اگلا ٹکڑا یہ ہے کہ جس نے تریا ہٹ توڑی اس نے زندگی کی راحت چھوڑی۔ تریا ہٹ سے مراد ہے عورت کی ضد۔ بس جس طرح راج ہٹ سے ٹکرانے سے سب کچھ کھونا پڑتا ہے اسی طرح تریا ہٹ کے توڑنے سے زندگی کا عیش چھوڑنا پڑتا ہے۔"

فاطمہ بیگم خوش ہو کر جلدی سے بولی:

"امی جان۔ اس کا مطلب ہے کہ نواب بہادر کو میری ضد مان لینی چاہیے۔"

"بالکل مان لینا چاہیے"۔

مجیدہ بیگم نے بے تکلف کہہ دیا:

"لیکن جس طرح حیدر بیٹے کو تمہاری ضد مان لینی چاہیے اسی طرح تمہیں بھی حیدر بیٹے کی ضد پوری کرنی چاہیے"۔

فاطمہ بیگم اور حیدر علی دونوں نے گھبرا کر مجیدہ بیگم کو دیکھا:

"مگر مادرِ مہربان۔ دو میں سے ایک ہی بات ہو سکتی ہے!" حیدر علی سے نہ رہا گیا اور وہ کہہ بیٹھے۔

مجیدہ بیگم نے گھور کر انہیں دیکھا:

"ایک نہیں۔ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں اور ہوں گی۔ تمہاری ضد ہے کہ شہزادے کی شادی امام صاحب بخشی نائطہ کی بیٹی سے کی جائے۔ یہ بات ہو گی۔ تم شہزادے کی شادی وہاں کر دو۔ رہی فاطمہ بیگم کی بات، تو وہ شہزادے کی شادی رقیہ بانو سے کرنا چاہتی ہیں، انہیں اپنی ضد پوری کرنے دو۔ وہ شہزادے کی شادی رقیہ بانو سے کر دیں۔

اب میری ضد ہے کہ شہزادے ٹیپو کی شادی امام صاحب بخشی کی بیٹی اور رقیہ بانو سے یعنی دونوں لڑکیوں سے ہو اور ایک ساتھ اور ایک ہی دن ہو۔ اس طرح تم دونوں کی ضد پوری ہو جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے ناں؟"

"بالکل ٹھیک، امی جان۔ آپ نے بڑا اچھا فیصلہ کیا"۔ فاطمہ بیگم مسرت سے بولیں۔ ان کی ضد جو پوری ہو رہی تھی۔

حیدر علی نے بھی ماں کے فیصلے کی تائید کر دی:

"مادرِ مہربان۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے"۔

"اب مجھے اجازت دو۔ میں جا رہی ہوں"۔ مجیدہ بیگم نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور ان کی کنیزوں نے سہارا دے کر انہیں کھڑا کر دیا۔

مجیدہ بیگم دو قدم چلیں۔ پھر رکیں اور پلٹ کر بولیں:

"میں نے جو ہندی مثل بیان کی ہے اس کے دو ٹکڑے تم نے سن لیے مگر اس کا ایک ٹکڑا ابھی باقی ہے۔ کہو تو وہ بھی بیان کر دوں؟"

"ضرور امی جان۔ ضرور بیان کیجیے"۔ فاطمہ بیگم چہک کے بولیں۔

"ہاں تو پوری مثل یوں ہے کہ "تین ہٹیں کبھی نہیں ٹوٹتیں۔ چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے"۔

بڑی بی کنیزوں کے سہارے کھڑی چبا چبا کے کہہ رہی تھیں:

"ان ہٹوں میں سے ایک ہے "راج ہٹ"۔ دوسری ہے "تریا ہٹ" اور تیسری ہٹ کا نام ہے "بال ہٹ"۔ یعنی بچے کی ضد۔ یہ تینوں ضدیں ہمیشہ پوری ہوئی ہیں اور ہمیشہ پوری ہوتی رہیں گی"۔

حیدر علی کی والدہ کے اس فیصلے کو سب نے پسند کیا۔ فاطمہ بیگم اور حیدر علی کے درمیان اس شادی کے سلسلے میں جو اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اس کا بھی خاتمہ ہو گیا اور دونوں کی ضدیں بھی برقرار رہیں۔

پھر ۱۱۸۵ھ یعنی ۱۷۷۴ء کی ایک مبارک رات کو شہزادہ ٹیپو سلطان کے دو عقد ہوئے۔ ایک بار بارات جس میں حیدر علی کے علاوہ تمام عمائدین سلطنت اور معززین شامل تھے، امام صاحب بخشی نائطہ کے گھر گئی اور ان کی دختر کو رخصت کرا کے لایا گیا۔

پھر اسی رات کو شہزادے کی دوسری بارات چڑھی اور لالہ میاں کے گھر پہنچی۔ اس بارات میں بھی وہی باراتی تھے۔ اس طرح رقیہ بانو کو رخصت کرا کے لاتے لاتے نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی۔

دونوں باراتیں بڑی دھوم دھام سے چڑھی تھیں۔

حیدر علی کے گھر میں یہ پہلی شادی تھی اور شادی بھی ولی عہد سلطنت شہزادہ ٹیپو سلطان کی تھی پھر کیوں نہ خوشیاں منائی جاتیں؟

ایک ماہ تک پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں۔ ہر کوچہ و بازار میں چراغاں کیا گیا اور تمام خواص و عوام کو دعوتِ حیدری میں شریک کیا گیا۔ غربا و مساکین کو جی کھول کے بخشش دی گئی۔ خزانے کا منہ کھول دیا گیا اور سب نے حسبِ توفیق اپنا حصہ پایا۔

کہتے ہیں پورا مہینہ رقص و سرود کی اس قدر محفلیں جمیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے روز ایک شادی ہوتی تھی۔

ولی عہد سلطنت کی شادی سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی خاں نے اپنے مرحوم بھائی شہباز خاں کی دو چھوٹی بیٹیوں کی شادی کی۔ ان میں سے ایک لڑکی علی خاں نائطہ سے بیاہی گئی

اور دوسری کا عقد یٰسین خاں دکنی سے ہوا۔

شاہی خاندان کی شادیوں کے اس سلسلے میں سب سے آخری شادی شہزادہ ٹیپو کی بہن کی تھی۔ اس شہزادی کو حافظ علی ولد شاہ صاحب دکنی سے بیاہا گیا۔

اس طرح شادیوں کا یہ سلسلہ ایک مہینے سے بڑھ کر کئی مہینوں پر محیط ہوا اور ان دنوں میں سرنگاپٹم کے گلی کوچوں میں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔

شاہی خاندان کی ان تمام شادیوں کے بعد حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان اپنی فوج کے انتظام کی طرف متوجہ ہوئے۔

حیدر علی نے فرانسیسی، ولندیزی اور پرتگالی بندرگاہوں سے اپنی فوج کے لیے اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ منگوایا۔ آیندہ تین سال تک حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو زیادہ تر سرنگاپٹم ہی میں رہے مگر وہ مرہٹوں، نظام اور انگریزوں سے ملنے والی سرحدوں سے غافل نہیں ہوئے اور انہیں مضبوط سے مضبوط تر بناتے رہے۔

چتل درگ کی مہم کے بعد ایک نہایت دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ یہاں پر اس کا ذکر قارئین کیلیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ نواب بہادر حیدر علی خاں کے دماغ میں ایک دم یہ خیال آیا کہ اس کے عمائدین اور متعلقین بظاہر اس کی وفاداری کی بڑی ڈینگیں مارتے ہیں۔ کیوں نہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی وفاداری کا امتحان ہو سکے اور دوست دشمن کی تمیز بھی ہو جائے۔

چنانچہ ——

حیدر علی خاں نے یہ کیا کہ خود ایک خیمے میں گوشہ نشیں ہو گیا اور ایک شاندار تابوت بنا کر سرنگاپٹم روانہ کر دیا۔

مشہور یہ کیا گیا کہ نواب بہادر کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کی میت سرنگاپٹم بھیجی جا رہی ہے۔ تابوت پر زرنگار پردے پڑے ہوئے تھے۔ آگے آگے چلنے والوں کے ہاتھوں میں عود دان اور لوبان دان تھے جن سے خوشبودار دھواں پھیل رہا تھا۔ تابوت کے چاروں طرف پہریدار سوار چل رہے تھے۔

حیدر علی خاں کے مرنے کی خبر پھیلی تو پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ سوائے چند لوگوں کے کسی اور کو حقیقت کا علم نہ تھا۔ یہاں تک کہ تابوت کے ساتھ چلنے والے سپاہیوں کو بھی کچھ علم نہ تھا۔ وہ روتے اور سر پیٹتے تابوت کے ساتھ چل رہے تھے۔

تابوت جس آبادی سے گزرتا وہاں کے باسی خاک بسر چیختے چلّاتے تابوت کے ساتھ کچھ دور تک چلتے رہتے۔

ظاہر ہے کہ اس سانحے کا ردِعمل تو ہونا ہی تھا۔ حیدر علی کے دوستوں کو حد درجہ افسوس ہوا جس نے سنا اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ بیوہ اور مسکین عورتیں جن کے حیدر علی نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے ان کے بین تو دیکھے نہ جاتے تھے۔ وہ اپنا سینہ اور سر پیٹتی ہوئی تابوت کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھیں۔

مگر ——

حیدر علی کے دشمنوں نے اس خبر پہ خوب بغلیں بجائیں۔ مرہٹوں، انگریزوں اور نظام دکن نے سکھ کا سانس لیا۔

نواب عبدالحلیم خاں والیٔ کڑپہ تو اس حادثے سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے پورے علاقہ میں مٹھائی تقسیم کرائی اور حکم دیا کہ خوشی کے شادیانے بجائے جائیں۔ اس نے حیدری پرچہ نویس کو بھی کڑپہ سے نکال باہر کیا۔

ادھر حیدر علی کو ایک ایک لمحے کی خبر مل رہی تھی۔ جب انہوں نے والیٔ کڑپہ عبدالحلیم کی شادمانی کا حال سنا تو مارے غصے کے برا حال ہو گیا۔ پھر وہ خلوت سے باہر آئے اور دربار لگایا۔

جن لوگوں نے حیدر علی کے لیے جس قدر غم کا اظہار کیا تھا اسی اعتبار سے انہوں نے ان میں انعام و اکرام تقسیم کیا —— اور عبدالحلیم خاں کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا اور خود فوج لے کر کڑپہ کی طرف روانہ ہونے کا قصد کیا۔

عبدالحلیم خاں کو حیدر علی کے زندہ ہونے کی خبر ملی تو اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ اس نے فوراً اپنے وکیل کو معافی مانگنے کے لیے حیدر علی کے پاس بھیجا۔ وہاں عبدالحلیم کا نکالا ہوا نواب بہادر کا پرچہ نویس موجود تھا اور اس نے رو رو کر نواب سے بیان کیا تھا کہ والیٔ کڑپہ نے اسے کس قدر ذلیل کر کے نکالا تھا اور کیسی شان سے نواب کی موت کا جشن منایا تھا۔

حیدر علی نے والیٔ کڑپہ کے وکیل کو بے نیل و مرام واپس بھیج دیا اور ساتھ کہہ دیا کہ اب عبدالحلیم

کو کسی صورت معافی نہیں مل سکتی۔

عبدالحلیم خاں کے لیے اب سوائے مقابلہ کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے دو بھتیجوں سعید میاں اور حسین میاں کی سرکردگی میں ایک لشکر دیلور کی طرف روانہ کیا تاکہ حیدر علی کو روکنے کی کوشش کریں۔

اتفاق سے دیلور میں پہلے ہی سے میر رضا علی خاں موجود تھا۔ اسے نواب بہادر نے اپنے آنے کی خبر بھیج دی تھی اور وہ انتظار کر رہا تھا۔

ادھر سے عبدالحلیم خاں کے دونوں بھتیجے افغانوں کا لشکر لے کر دیلور پہنچے اور انہوں نے پہنچتے ہی میر رضا علی خاں پر حملہ کر دیا۔

یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میر رضا علی خاں کو شکست ہو گئی لیکن اسی وقت حیدر علی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے والیٔ افغان کے اس لشکر کو کڑپہ کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

دیلور کا یہ معرکہ ۱۷۶۹ء میں پیش آیا تھا۔ افغانوں نے بڑی سخت مدافعت کی اور ان کے نوجوان سردار ہاتھیوں پر سوار میدان میں ڈٹے رہے تھے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ جب حیدر علی نے دیکھا کہ وہ ہتھیار نہیں ڈالتے تو انہوں نے ان پر ایسی گولہ باری کرائی کہ ان کی ایک نہ چلی اور ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔

سعید میاں اور حسین میاں کو گرفتار کر لیا گیا۔

وہاں سے حیدری لشکر کڑپہ پہنچا اور ایک ہی حملے میں قلعہ کڑپہ فتح ہو گیا۔ نواب عبدالحلیم اور اس کے بھتیجوں سعید میاں اور حسین میاں کو حویلی میں قید کر دیا گیا۔

حیدر علی نے حکم دیا کہ تمام افغان اپنے ہتھیار حیدری فوج کے حوالے کر دیں۔ اس حکم پر بعض افغانوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ جھگڑا بڑھ گیا۔ رات کا وقت تھا اور حیدر علی میدان میں ایک خیمے میں آرام کر رہے تھے۔

ایک افغان جھگڑتا ہوا حیدر علی کے خیمے کی طرف پہنچ گیا اور ننگی تلوار لیے خیمے کے اندر داخل ہو گیا۔ حیدر علی شور سن کر بیدار ہو گئے اور قنات چیر کر دوسری طرف نکل گئے۔ بوکھلایا ہوا افغان حیدر علی کے تکیے پر تلوار مارنے لگا۔ اسی وقت ایک حیدری لشکری نے اندر آ کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

رات کی اس افراتفری میں عبدالحلیم خاں کو موقع مل گیا اور وہ سدھوکوٹ بھاگ جانے میں

کامیاب ہو گیا۔

صبح کو جب عبدالحلیم خاں کے فرار ہو جانے کی اطلاع حیدر علی کو دی گئی تو انہوں نے اسی وقت ایک دستہ گنجی کوٹ روانہ کیا اور خود افغانوں کے قتلِ عام کا حکم دے کر سدھوکوٹ چل پڑے۔ وہاں پہنچ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

میر رضا علی خاں فوجی دستے کے ساتھ گنجی کوٹ پہنچا اور اس نے گنجی کوٹ کو فتح کر لیا۔

سدھوکوٹ کا یہ انجام ہوا کہ نواب عبدالحلیم نے اپنے وکیل محمد غیاث کو نواب بہادر حیدر علی خاں کے پاس بھیجا۔

"نواب بہادر"۔ محمد غیاث نے والیٔ میسور کے حضور بڑے ادب سے عرض کیا:

"میرے آقا نواب عبدالحلیم خاں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں شاہِ میسور سے ان کی طرف سے دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ انہیں امید ہے کہ آپ اپنے الطافِ خسروانہ کے تحت انہیں معاف فرمائیں گے"۔

"ہرگز نہیں"۔ نواب بہادر نے غصہ سے جواب دیا:

"عبدالحلیم خاں کی یہ پہلی غلطی نہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی مرہٹوں کی حمایت میں ہمارے خلاف تلوار اٹھا چکا ہے"۔

"انہیں اپنی غلطی کا احساس ہے عالی مرتبت شاہِ میسور"۔ محمد غیاث نے بڑے مہذب طریقے سے اپنے آقا کی وکالت کی:

"انہی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ذلیل و خوار ہو کے آپ کے سامنے دست بستہ معافی نامہ پیش کر رہے ہیں۔ شاہِ معظم کو اپنی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے انہیں معاف کر دینا چاہیے"۔

آخر حیدر علی نے مشروط معافی پر اظہارِ رضامندی کیا۔

"محمد غیاث۔ ہم تمہاری وکالت سے خوش ہوئے۔ تمہارے آقا کو ہم معافی دے سکتے ہیں مگر ایک شرط پر"۔

"وہ کیا شرط ہے بادشاہ؟" محمد غیاث نے جلدی سے پوچھا۔

حیدر علی نے شرط بیان کی:

"شرط یہ ہے کہ عبدالحلیم کے ساتھ قلعے کے اندر جتنے افغان سپاہی ہیں ان سب کو باہر نکال دیں۔ اس صورت میں ہم اسے معاف کر دیں گے!"

محمد غیاث سلام کر کے واپس گیا۔ عبدالحلیم خاں سے شرط بیان کی۔ اس نے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانوں پر تمام افغان سپاہیوں کو قربان کر دیا۔

اس نے حکم دیا کہ تمام افغان سپاہی قلعہ سے نکل جائیں۔ سپاہی قلعے سے باہر نکلے اور قتل کر دیے گئے۔

اس وقت کمانداز تیر کی طرح عبدالحلیم خاں کے دیوان خانے میں پہنچا اور اسے پالکی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔

عبدالحلیم خاں پالکی میں بیٹھ گیا۔ پھر اس کے حرم کی خواتین اور دیگر متعلقین کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور انہیں شہر گنجی میں قید کر دیا گیا۔ عبدالحلیم اور اس کے اہل خانہ کے لیے حیدر علی نے ایک معقول رقم وظیفے کے طور پر مقرر کر دی۔

کچھ عرصہ بعد اس قید میں نواب عبدالحلیم خاں کا انتقال ہو گیا۔ حیدر علی خاں نے مرزا کاظم بیگ کے عبدالحلیم خاں کی بہن سے شادی کر لی اور اسے "بخشی بیگم" کا خطاب دیا۔



پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پونا میں مرہٹہ پیشوائی کے لیے دو گروہوں میں جنگ شروع ہو گئی تھی۔ مرہٹوں کے ایک گروہ کا سرغنہ رگھوبا تھا اور دوسرا گروہ نارائن راؤ کے شیر خوار بچہ کا تھا جس کا ساتھ مرہٹہ وزیر اعظم نانا فرنویس دے رہا تھا۔

مرہٹوں کی آپس کی اس جنگ میں حیدر علی خاں نے تو کوئی حصہ نہ لیا مگر انگریز رگھوبا کی حمایت میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی فوج بھیج کے جنگ کے شعلے اور بھڑکا دیے۔ اس وقت نانا فرنویس کو ہوش آیا کہ انگریز ہندوستانیوں کے آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر کس طرح اپنا علاقہ بڑھا رہے ہیں۔

رگھوبا نے انگریزوں کو اس مدد کے عوض ایک بڑا علاقہ لکھ کے دیدیا تھا۔

یہ بات دماغ میں آتے ہی نانا فرنویس نے ایک خط نظام دکن کو اور دوسرا خط حیدر علی کو لکھا۔

خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

انگریز روز بروز اپنی چیرہ دستیوں سے ہندوستان پر قبضہ کر رہے ہیں۔ تحفظ وطن کی خاطر اب ضروری ہے کہ دیسی حکمران ملک

متحد ہو کر انگریزوں کو ملک سے نکال دیں۔"

حیدر علی نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس لیے کہ مرہٹے آئے دن اس کے علاقوں پر یلغار کرتے رہتے تھے اور علاقوں کی تباہی و بربادی کے علاوہ اسے مرہٹوں کو لاکھوں اور کروڑوں کی رقم دے کر اپنے ملک سے نکالنا پڑتا تھا۔

نظام دکن کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اس کے دربار میں انگریزوں کا اثر و رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ نظام کے علاقہ گنٹور پر بغیر نظام کی اجازت کے قابض ہو گئے تھے۔

مرہٹوں اور نظام کے علاوہ حیدر علی کو انگریزوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے کہ انگریزوں نے معاہدہ مدراس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حیدر علی کے درخواست کرنے کے باوجود مرہٹوں کے خلاف فوجی مدد نہیں دی تھی۔ حیدر علی کے لیے یہ تینوں طاقتیں انتہائی بد لحاظ، بے مروّت اور ناقابلِ اعتبار تھیں۔

ابھی یہ خط و کتابت ہو ہی رہی تھی کہ یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔

انگریزوں کا ملک برطانیہ اور فرانسیسیوں کا ملک فرانس براعظم یورپ میں واقع ہیں اور ان کے درمیان ۱۸ میل کی ایک سمندری پٹی واقع ہے۔ اس پٹی کو انگلش چینل کہا جاتا ہے۔ یورپ کی یہ دونوں قومیں زمانۂ قدیم سے لڑتی جھگڑتی چلی آ رہی ہیں۔

اس طرح جب قوموں میں یورپ میں جنگ شروع ہوتی ہے تو اس کا اثر ان کی نوآبادیات پر بھی پڑتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے پاس کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے کچھ علاقے تھے جبکہ فرانسیسیوں کے قبضے میں پانڈیچری اور ماہی کی بندرگاہ تھے۔ یورپ میں جنگ چھڑتے ہی انگریزوں نے پانڈیچری پر قبضہ کر لیا اور فوجیں لے کر ماہی کی طرف بڑھے۔

ماہی، مالابار کے علاقے میں تھا اور مالابار کا پورا علاقہ حیدر علی کے زیرِ تسلط تھا۔ انگریز بغیر حیدر علی کے علاقے سے گزرے ماہی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

حیدر علی نے ایک قاصد کے ذریعے انگریزوں کو تنبیہ کی کہ ان کی فوجیں ماہی پہنچنے کیلیے حیدر علی کی زیرِ تسلط سرزمین سے گزرنے کی کوشش نہ کریں۔

انگریزوں نے اس تنبیہ کی کوئی پرواہ نہ کی اور حیدر علی کے علاقے کو روندتے ہوئے ماہی پہنچے اور اس پر قبضہ کر لیا۔

اس خبر سے حیدر علی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ان کی دور رس نگاہوں نے محسوس کر لیا کہ ہندوستان کی کمزوری کی اصل وجہ ہندوستان میں بحری فوج اور طاقت کا فقدان ہے۔ اس سلسلے میں وہ پہلے ہی قدم اٹھا چکے تھے۔ ماہی کی بندرگاہ کے ذریعے حیدر علی کا یورپ سے رابطہ تھا جہاں سے وہ سامانِ جنگ منگا سکتے تھے اور اس بندرگاہ کے ذریعے انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں سے بھی سامان حاصل کر سکتے تھے۔

انگریزوں کے بندرگاہ ماہی پر قبضہ کرتے ہی نواب حیدر علی خاں نے کرناٹک پر زبردست حملہ کر دیا۔

کرناٹک کہنے کو تو والاجاہ محمد علی کے قبضہ میں تھا مگر اس علاقے کے مالک اصل میں انگریز یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی۔

حیدر علی کے اس حملہ کے متعلق یورپ کے تمام مؤرخین ایک ہی بات لکھتے اور کہتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ:

"حیدر علی خاں کا حملہ ایک طوفانِ برق و باد تھا جو میسور سے اٹھا اور کرناٹک پہ چھا گیا۔ نواب حیدر علی خاں کے زیرِ کمان اسی ہزار کا لشکر تھا۔"

نواب حیدر علی کا یہ حملہ اس قدر مہیب تھا کہ کرناٹک نے اپنی سرزمین پہ اس سے پہلے اتنا بڑا افواج کا اجتماع نہ دیکھا تھا۔

حیدر علی نے اپنے لشکر کو مختلف سرداروں اور دونوں شہزادوں، شہزادہ ٹیپو اور شہزادہ کریم میں تقسیم کر دیا اور خود ایک حصۂ فوج کے ساتھ پائیں گھاٹ کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ علاقہ والاجاہ محمد علی کا تھا۔

اس جنگ کو انگریزوں کی دوسری جنگ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز جولائی ۱۷۸۰ء میں ہوا اور یہ دو سال تک جاری رہی۔

شہزادہ ٹیپو نے پائیں گھاٹ سے نکل کے قلعہ ارنی کا محاصرہ کر لیا۔ پھر اس محاصرہ پر بدر الزماں کو مامور کر کے خود ثمری کی طرف بڑھا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

حملاتِ حیدری کا مصنف اس حملہ کے بارے میں لکھتا ہے:

"والاجاہ کے قلعدار نے شہزادے ٹیپو کے حضور خود آ کے عرض کیا:
"شہزادہ بہادر۔ میں قلعہ کی حفاظت کرنے کو تیار ہوں مگر قلعہ میں

کثرت سے اہلِ سادات آباد ہیں اور سادات خواتین آپ کی گولہ باری سے بہت زیادہ خوفزدہ ہیں۔ اس لیے گولہ باری موقوف کر کے آپ قلعہ کا قبضہ لے لیجیے۔"

شہزادہ ٹیپو کو قلعدار حسین علی خاں کے اس فضول جواز پہ ہنسی آ گئی۔ اس نے قلعدار کو کوئی جواب نہ دیا البتہ اس سے قلعہ کی چابیاں لے کر سیدی امام کے سپرد کر دیں۔ سابق قلعدار وہاں سے رخصت ہو کر اندرونِ ملک چلا گیا۔

فتحِ ارنی کے بعد ترد کور، کلوہ اور رکادیری پٹن معمولی لڑائیوں کے نتیجے میں آ گئے۔

شہزادہ کریم نے بندرگاہ محمود بندر پر حملہ کیا اور چند دنوں کی جنگ کے بعد اس پر حیدری پرچم لہرا دیا۔

نواب بہادر اپنے لشکر کے ساتھ چنگما گھاٹ سے نکل کے کرناٹک کے صدر مقام ارکاٹ پہنچے راستے میں چھوٹے چھوٹے قلعوں پر معمولی سی مزاحمت ہوئی اور بس!

اب نواب بہادر کی فوج کنجی ورم کے نواح میں پہنچ چکی تھی اور ان کے ہراول دستے انگریزوں کے مرکز مدراس کے قریب پہنچے ہوئے تھے۔

انگریزوں نے ارکاٹ کو بچانے کے لیے دو لشکر مدراس سے روانہ کیے۔ ان میں سے ایک لشکر کا کمانڈر سر ہیکٹر منرو تھا اور دوسری فوج کرنل بیلی کے زیرِ کمان تھی۔ کرنل بیلی، نظام دکن کے علاقہ گنٹور کا انگریزوں کی طرف سے حاکم تھا۔

نواب بہادر کو ان لشکروں کی آمد کی خبر ملی تو وہ ارکاٹ کے محاصرہ پہ ایک دستہ فوج چھوڑ کے باقی لشکر کے ساتھ کنجی آ گئے۔ یہاں سے انہوں نے شہزادہ ٹیپو کو حکم بھیجا کہ وہ پولی پور پہنچ کے کیمپ لگائے اور دونوں لشکروں کو آپس میں ملنے سے باز رکھے۔

کرنل سر ہیکٹر منرو اپنے لشکر کے ساتھ پولی پور پہنچا اور وہاں سے دو میل آگے ندی کے کنارے اپنا کیمپ لگا لیا۔

دوسری طرف کرنل بیلی بھی پولی پور آیا تو وہاں اس کی شہزادہ ٹیپو سے جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ کو چند ہی گھنٹے گزرے تھے کہ نواب حیدر علی نے اپنے ایک دستے کے ساتھ کرنل بیلی پر دوسری جانب سے حملہ کر دیا۔

حیدر علی کے اس حملہ سے کرنل بیلی کی فوج جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئی۔

ایک طرف سے شہزادہ ٹیپو اور دوسری طرف سے حیدر علی نے انگریزوں کو مارنا شروع کیا۔ کرنل بیلی نے گھبرا کر ایک باغ میں پناہ لے لی مگر حیدر علی نے باغ پر گولہ باری شروع کرا دی جس سے پورا باغ دھوئیں سے بھر گیا۔ اب حیدر علی نے اپنے سواروں کو باغ میں داخل ہونے کا حکم دیا۔

حیدری فوج کے سواروں نے باغ میں داخل ہو کر انگریزی فوج پر اس قدر زبردست حملہ کیا کہ انگریز گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ یہاں تک کہ فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

حیدری سواروں نے انگریز لشکریوں کو بھی گرفتار کیا اور ان کے سالار کرنل بیلی کو بھی اسیر کر لیا۔

بہادر نامہ کے مصنف نے اس جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

جہاں جُو نے دیکھا جو لشکر کھڑا
تو آ سامنے اس کے باندھا پرا
سوارانِ جنگی و مردانِ کار
ہوئے آ کے قائم یمین و یسار
لگی لڑنے پھر دونوں جانب کی فوج
لگا مارنے خون ہر سمت موج
ہوا اس گھڑی اس قدر کشت و خوں
کہ حیرت میں تھا چرخِ فیروزہ گوں
عدو اس قدر واں پہ کشتہ ہوئے
کہ میداں میں کشتوں کے پشتے ہوئے
ہوا موت کا واں پہ بازار گرم
دلوں میں رحم اور نہ آنکھوں میں شرم
برستی تھیں یوں گولیاں اس گھڑی
کہ بھادوں کی جس طرح برسے جھڑی

اس نظم میں پہلے شعر میں "جہاں جو" کا اشارہ شہزادہ ٹیپو کی طرف ہے۔
رسالہ "ملٹری بائیو گرافی" مطبوعہ لندن، میں تحریر ہے کہ:
'اس جنگ میں ساڑھے چار ہزار فرنگی سپاہی مارے گئے۔

کرنل فلیچر بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ کرنل بیلی اور کپتان بیرڈ باقیماندہ فوج کے ساتھ گرفتار ہوئے"۔

جس وقت کرنل بیلی کی شکست کی خبر سر ہیکٹر منرو کو ملی تو وہ اپنی بڑی بڑی توپیں دریا میں پھینک کر مدراس فرار ہو گیا۔

جنوبی بھارت کے نقشہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ مرہٹوں کی پونا کی سلطنت اور نظام دکن کی حکومت کے علاوہ جنوبی ہند کا تمام علاقہ سلطنتِ خداداد میسور میں شامل ہو گیا تھا۔ نواب حیدر علی خاں نے گزشتہ انیس سال میں میسور کی ایک چھوٹی سی ریاست کو ایک عظیم سلطنت میں تبدیل کر دیا تھا۔

اس سلطنت کے قیام میں حیدر علی خاں کے علاوہ اس کے جواں سال بیٹے شہزادہ ٹیپو کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔ یہ ساری ترقی حیدر علی اور ان کے شیر دل فرزند شہزادہ ٹیپو کے زورِ بازو اور دور اندیشی کا نتیجہ تھی۔

وہ سینکڑوں پالیگار جو حکومت کی فتح و شکست کے ساتھ ہی اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیتے تھے، اب پوری طرح مطیع ہو چکے تھے۔

حیدر علی نے بڑے بڑے کج کلاہوں کے سر نیچے کر دیے تھے اور انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نواب بہادر نے انہیں صرف بزورِ شمشیر ہی مطیع نہیں کیا تھا بلکہ بعض سرکشوں کو الفت اور قرابت کے رشتے میں جوڑ کر بھی اپنا بنا لیا تھا۔

سادنور کا حاکم عبدالحلیم خاں (یاد رہے کہ یہ والیٔ کڑپہ عبدالحلیم خاں نہیں ہے) کبھی کبھی بغاوت پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ حیدر علی نے اسے قرابت کی مار ماری یعنی اپنے دوسرے بیٹے شہزادہ کریم صاحب کی شادی عبدالحلیم خاں حاکمِ سادنور کی صاحبزادی سے کر دی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی بیٹی کو عبدالحلیم خاں کے بیٹے عبدالخیر خاں سے بیاہ دیا۔

شہزادہ ٹیپو اب تک ہر معرکہ میں حیدر علی خاں کے ساتھ رہا تھا اور اس نے شجاعت اور اولوالعزمی کے ایسے جوہر دکھائے تھے کہ معاملاتِ جنگ ہوں یا صلح کی گفتگو، انتظامِ سلطنت ہو یا عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے، ہر معاملہ میں حیدر علی، شہزادہ ٹیپو کی رائے اور شرکت کو

مقدم رکھتے تھے۔

اس جگہ اس بات کا اظہار کر دینا بہت ضروری ہے کہ پچھلے چھ سال سے حیدر علی ایک خطرناک مرض میں مبتلا تھے جس کی خبر بہت کم لوگوں کو تھی۔

نواب بہادر کی پیٹھ پر سرطان کے پھوڑے نکلتے تھے جنہیں جراح نشتر زنی کر کے صاف کر دیا کرتے تھے مگر یہ موذی مرض جس کو لگ جاتے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

نواب بہادر کو اطباء نے آرام کا مشورہ دیا تھا مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آرام کا لفظ انہوں نے سنا ہی نہ تھا۔ انہوں نے معالجوں کے مشوروں کی کبھی پرواہ نہ کی اور اپنے مرض کی شدت کو بڑھاتے ہی رہے۔

ان کی پیٹھ پہ ہر سال ایک خطرناک پھوڑا نکلتا جس کا مواد جراحت کے ذریعہ نکال دیا جاتا۔ نواب بہادر صرف چار چھ دن صاحب فراش رہنے کے بعد گھوڑے پر یوں جست کر کے سوار ہو جاتے جیسے انہیں کبھی کوئی مرض ہوا ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صحت سال بہ سال گرتی چلی گئی۔

مرہٹوں کی چھ سالہ جنگ کے بعد میسور کی دوسری لڑائی نے انہیں اور زیادہ نڈھال کر دیا تھا مگر وہ اپنی تکلیف کو اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیتے تھے اور شدید حملۂ مرض میں بھی گھوڑے کی سواری نہ چھوڑتے اور نہ بستر پر آرام کرتے۔

ان کے تمام قریبی متعلقین ان کی گرتی ہوئی صحت سے سخت پریشان تھے۔ وہ مختلف انداز سے نواب بہادر کو اس مرض کی ہلاکت خیزیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے مگر نواب بہادر اس کان سے سنتے اور اس کان سے اڑا دیتے۔

شہزادہ ٹیپو ہر معرکہ میں اپنے باپ کے دوش بدوش رہتا تھا۔ اس کی تلوار دشمنوں کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ نوجوان سپہ سالار دن بدن اپنی فوج میں مقبول ہو رہا تھا۔ چھاپہ مار جنگ میں تو اس کی مہارت ضرب المثل بن گئی تھی اور اسی وجہ سے وہ حیدر علی کی نظروں کے ساتھ ساتھ فوج میں بھی ہر دلعزیز ہوتا جا رہا تھا۔

سب جانتے تھے کہ اس ہونہار شہزادے کو آگے چل کر انتظام سلطنت سنبھالنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیاست دان اس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اس کے روشن اور تابناک مستقبل کی پیشن گوئیاں کرتے تھے۔

پولی لور کی فتح ٹیپو کا ایک شاندار کارنامہ تھا۔ اس فتح کو وہ کبھی نہیں بھولا۔ اس جنگ کی یادگار کے طور پر شہزادے نے دریا دولت باغ میں تصاویر بنوائیں جن میں اس جنگ کے پورے واقعات دکھائے گئے تھے۔

اس واقعہ کے بعد ٹیپو کا نام انگریزوں میں لرزہ پیدا کر دیتا تھا۔ انہوں نے شہزادے کے بارے میں بہت سے من گھڑت قصے تراشے۔ اسے ظالم اور جابر کہا گیا بلکہ لغت میں برائی کے جتنے الفاظ تھے وہ سب شہزادے ٹیپو کے لیے استعمال کیے گئے۔

والی کے مقام پر حیدر علی کے سامنے انگریز قیدی لائے گئے۔ ان قیدیوں میں جنرل بیرڈ بھی تھا۔ قیدیوں کے ساتھ انگریزوں کے کٹے ہوئے سر بھی تھے مگر ان میں کرنل فلیچر کا سر نہ تھا۔ فلیچر کے سر کی تلاش میں لوگوں کو لگایا گیا۔ تلاش بسیار کے بعد فلیچر کا سر بھی دستیاب ہو گیا۔ حیدر علی نے ان قیدیوں کو شہزادہ ٹیپو کے سپرد کر دیا۔

شہزادہ ٹیپو نے انگریز قیدیوں کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور ان کی بڑی خاطر تواضع کی۔

قیدیوں میں ایک کپتان مونٹ نام کا تھا۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی مدراس میں تھی۔ کپتان نے شہزادے سے اظہار کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کو خط لکھنا چاہتا ہے۔ شہزادے نے اسے خط لکھنے کا سامان مہیا کیا اور خط لے جانے کے لیے ایک تیز رفتار قاصد مقرر کر دیا۔

ان قیدیوں میں ڈیوڈ بیرڈ بھی تھا۔ اس نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ شہزادے سے ٹیپو کا سلوک عام قیدیوں کے ساتھ بھی نہایت شریفانہ تھا اور انگریز افسروں کا شہزادہ ٹیپو بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔

شہزادہ، کرنل بیلی کی بہت دلجوئی کرتا تھا اور اسے وہ تمام چیزیں مہیا کر دی گئی تھیں جن کی اس نے تمنا کی تھی

لیکن ــــ

انگریز مؤرخین نے شہزادہ ٹیپو کو کبھی اچھے نام سے یاد نہیں کیا۔

قیدیوں کو سرنگاپٹم بھیجنے کے بعد حیدر علی خان ویلور پہ قبضہ کرتے ہوئے ارکاٹ پہنچے۔

ارکاٹ نواب والاجاہ محمد علی کا صدر مقام تھا اور اس کا قیام یہیں رہتا تھا۔

یہ قلعہ مضبوط تھا اور اس کی فصیل بہت بلند تھی چنانچہ حیدر علی نے زمین کھود کر دمدمے بنانے کا حکم دیا۔ حکم کی دیر تھی کہ لشکریوں نے زمین کھود کے مٹی کے اونچے اونچے ٹیلے بنا دیے۔ ان ٹیلوں پر توپیں چڑھا دی گئیں۔ پھر یہاں وہاں سے گولہ باری ہوئی تو قلعہ میں زلزلہ آگیا۔
مگر ــــ

قلعہ میں موجود والاجاہی اور انگریز فوجوں نے بڑی مستعدی دکھائی اور زبردست مدافعت کی تین ماہ تک قلعہ پر گولہ باری ہوتی رہی مگر فصیل نہ ٹوٹ سکی پر فصیل میں جگہ جگہ رخنے پڑ گئے۔ ان رخنوں پر حیدری فوج نے زبردست حملہ کیا اور دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔ اسی جنگ میں حیدر علی کے داماد حافظ علی خاں شہید ہوئے۔

حافظ علی خاں کی شہادت سے حیدری فوج میں اور زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور اس نے ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن کے قدم اکھڑ گئے۔ والاجاہ کے تمام سرداروں نے ہتھیار ڈال کے گرفتاریاں پیش کی۔

والاجاہ محمد علی کے جو سردار اس جنگ میں اسیر ہوئے ان میں سید حمید خاں، راجہ بیربر، رچنا پنڈت، ارشد بیگ، ہچنی یار خاں، تبنونا تہرا اور میر صادق شامل تھے۔ ایک پرانا دشمن نجف خاں ابھی معافی مانگنے حاضر ہوا۔

ان سب سرداروں نے معافی مانگ کر اپنی خدمات نواب بہادر حیدر علی خاں کو پیش کر دیں۔

نواب بہادر نے ازراہِ کرم سید حمید خاں کو چار ہزار سپاہ کی سرداری پر متقرر کیا۔ راجہ بیربر کو ارکاٹ کی گورنری دی گئی اور میر صادق افسرِ مال متقرر ہوا۔

واضح رہے کہ یہ وہی غدار میر صادق ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ قوم و ننگِ ملت، ننگِ وطن

اس کے بعد حیدر علی نے حیدر نگر (بدنور) پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کیا جو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

بدنور وہی مقام ہے جس پر قبضہ کرنے کے بعد حیدر علی خاں نے اس کا نام تبدیل کر کے حیدر نگر رکھ دیا تھا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنا کے اس میں بہت سی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ حیدر علی نے حیدر نگر کا نیا گورنر اپنے لے پالک بیٹے شیخ ایاز کو مقرر کیا۔

فتح بدنور کے بعد حیدر علی خاں پھر ارکاٹ واپس آئے اور یہاں انہوں نے ایک بہت بڑا جشنِ فتح منایا۔

اس موقع پر جو دربار لگا اس میں امراء نے نذریں پیش کیں۔ نذر پیش کرنے والوں میں درگاہ ٹیپو مستانؒ کے متولی بھی تھے۔ یہ درگاہ انہی ٹیپو مستانؒ کی تھی جن کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے حیدر علی کو شہزادہ ٹیپو دیا تھا اور انہی کے نام پر شہزادے کا نام ٹیپو سلطان رکھا گیا تھا۔

حیدر علی خاں نے ٹیپو مستانؒ کے متولی کو ایک سو اشرفیاں اور زربفت کا ایک شامیانہ عنایت کیا جس کے چاروں پائے طلائی تھے۔

قارئین کو علم ہے کہ حیدر علی خاں کی پیدائش کولار میں ہوئی تھی اور جب والاجاہ محمد علی نے ۱۷۶۸ء میں کولار پر قبضہ کیا تھا تو اسے امید ہو چلی تھی کہ اب حیدر علی اس کے پاس معافی مانگنے اور اپنی جائے پیدائش کو مانگنے آئے گا مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی تھی۔

خدا کی قدرت دیکھیے کہ اس کے صرف بارہ سال بعد حیدر علی، والاجاہ کے دارالسلطنت ارکاٹ پر قبضہ کر کے وہاں جشنِ نصرت منا رہا تھا اور والاجاہ انگریزوں کی دوستی میں دربدر ہو رہا تھا۔ اور ان دنوں مدراس میں ایک مفرور کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

حیدر علی نے اس دربار میں بڑے غصے سے اعلان کیا تھا:

"والاجاہ کی وطن دشمنی اور منافقت نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں
اس لیے اس دفعہ میں کرناٹک کی رعیت کے لیے غضبِ الٰہی بن کر
آیا ہوں"۔

اس کے اس اعلان پر لوگ دربار میں چیخ پڑے تھے کیونکہ مسلسل جنگوں نے کرناٹک اور خاص کر دارالسلطنت ارکاٹ کے شہر اور مضافات کا نقشہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا اور ہر طرف بربادی اور ویرانی ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔

پس ــــ

حیدر علی نے خود ہی اپنے اس اعلان کو ردّ کر دیا اور ان کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ وہ حیدر علی کا دم بھرنے لگے۔

مسٹر ڈبلو ٹارنس ممبر پارلیمنٹ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"ایک مہیب اور خونریز معرکے کے بعد ارکاٹ، پر ۳۔ نومبر ۱۷۸۰ء کو حیدر علی خاں کا قبضہ ہو گیا۔ قبضے کے بعد رعایا کے ساتھ بہت شرافت اور انسانیت بھرا سلوک کیا گیا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت کی قطعی ممانعت کر دی گئی۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ امن و آسائش سے اپنا کاروبار جاری رکھے۔

اس کے علاوہ والاجاہ کے ملازموں کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال رکھا گیا۔ جو انگریز قیدی حیدر علی خاں کی قید میں تھے انہیں روپیہ دیا گیا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کریں"۔

اس سلسلے میں "امپائر ان ایشیا" کے مصنف کا بیان بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"انگریزوں نے جب ناہی پر قبضہ کر لیا تو حیدر علی خاں کے غصہ کی انتہا نہ رہی۔ وہ کرناٹک پر طوفانِ بلا بن کے گرا۔ شہر و دیہات پر نہ صرف قبضہ کیا بلکہ انہیں تباہ کر دیا۔ وہ لوگ (انگریز) جو والاجاہ محمد علی کی نیابت کرتے ہوئے حکمرانی کر رہے تھے رعایا کی حفاظت کرنے کے بجائے انہیں اپنی قسمت پر چھوڑ کر چلے گئے۔ عذر یہ تھا کہ فوج مدافعت کے قابل نہیں رہی"۔

یہ بھگوڑے انگریز جب مدراس پہنچے تو انہوں نے وہاں سے انگلستان کی حکومت کو خطوط بھیجے جن میں حیدر علی کے ظلم و ستم کی فرضی داستانیں بیان کی گئیں مگر ان باتوں کی کوئی صداقت نہ تھی اور نہ ان کا کوئی ثبوت پیش کیا گیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ کرناٹک کے عوام حیدر علی خاں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ اس بات کا ثبوت کرنل کاسبی کے واقعہ سے ملتا ہے۔ اس نے اپنے ایک خط میں اقرار کیا ہے کہ:

"کرناٹک کے لوگ ہماری ذرا ذرا سی نقل و حرکت کی اطلاع حیدر علی کو پہنچاتے تھے"۔

اسی سے حیدر علی کے ساتھ عوام کی ہمدردی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

ایک دوسری مثال سے بھی حیدر علی کے ساتھ عوام کی محبت کا پوری طرح اظہار ہوتا ہے۔ وہ واضح مثال یہ ہے کہ:

"جب کرنل بیلی حیدری فوجوں میں گھر گیا اور اس کی خبر کرنل منرو کو ملی تو اس نے کرنل بیلی کی مدد کا قصد کیا۔ اب مشکل یہ تھی کہ اسے سیدھا اور محفوظ راستہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔

جنرل منرو نے حکم دیا کہ چند مقامی لوگوں کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے۔ انگریز سپاہی کچھ مقامی افراد کو گرفتار کر کے جنرل کے پاس لے آئے۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے گلے میں طوقِ غلامی ڈالے جائیں۔

پھر اس نے گرفتار شدہ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ انگریز لشکر کو کرنل بیلی کے لشکر تک پہنچا دیں تو انہیں انعام دیا جائے گا اور انہیں طوق اتار کے آزاد کر دیا جائے گا ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے گا۔"

مثل مشہور ہے کہ بندھا ہوا مار کھاتا ہے پس گرفتار شدہ مقامی لوگ مجبوراً انگریز لشکر کو راستہ دکھانے پر آمادہ ہو گئے۔

لشکر روانہ ہوا۔ مقامی لوگ ان کے آگے آگے تھے۔ یہ سب لوگ تمام دن سفر کرتے رہے اور شام کے وقت ایک ایسی جھیل یا تالاب کے کنارے پہنچے کہ جس سے آگے جانے کا راستہ مسدود تھا۔ اس وجہ سے جنرل منرو، کرنل بیلی کی مدد کو نہ پہنچ سکا"۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کرناٹک کے لوگ جو انگریزوں کے محکوم تھے وہ حیدر علی سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کرناٹک وہ علاقہ یا ریاست تھا جس کا والاجاہ محمد علی حاکم تھا اور ارکاٹ اس ریاست کا دارالسلطنت تھا۔



انگریزوں نے تمام محاذوں پر شکست کھانے کے بعد ایک بار پھر صلح کے لیے سفارت بھیجی۔ نواب بہادر اس وقت ارکاٹ میں مقیم تھے۔

اس سفارت کا سربراہ ایک کپتان تھا۔ اس نے نواب بہادر حیدر علی خاں کے سامنے درخواست پیش کی:

"مدراس سرکار کی خواہش ہے کہ اب خلقِ خدا کا خون نہ بہایا جائے کیونکہ اس وقت تک دونوں طرف سے سینکڑوں آدمی مارے جا چکے ہیں اور اس سے کسی کو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اس لیے مدراس سرکار نواب بہادر حیدر علی خاں سے درخواست کرتی ہے کہ جنگ بند کر دی جائے اور دونوں فریقوں میں صلح ہو جائے۔"

نواب بہادر نے کپتان کی تقریر دلپذیر سن کے زہر خند کیا:

"بہت خوب۔ انگریز ہم سے پھر صلح کی درخواست کر رہے ہیں ٹھیک ہے۔ ہم صلح پر آمادہ ہیں لیکن ہمیں یہ بتایا جائے کہ کیا انگریز اس سے پہلے ہم سے صلح نہیں کر چکے ہیں؟"

کپتان خوش ہو کر جلدی سے بولا:

"جی ہاں نواب بہادر۔ ہمارے اور آپ کے درمیان صلح نامہ مدراس موجود ہے اور میں اسی کی تجدید کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

نواب بہادر نے اسے گھور کر دیکھا:

"کپتان۔ تم نے ٹھیک کہا۔ ہم بھی اسی صلح نامے کا حوالہ دینا چاہتے تھے۔ اچھا ہوا کہ تم نے اپنی زبان سے اس صلح نامے کا ذکر کر دیا ـــــ مگر شاید تمہیں اس کی شرطیں یاد نہیں۔ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ صلح نامہ مدراس اس وقت ہوا تھا جب تمہاری مکار قوم پورے جنوبی ہند سے نکل چکی تھی اور تمہارے پاس صرف مدراس کی ریذیڈنسی رہ گئی تھی۔ اس وقت ہم مدراس سے صرف تین یا پانچ میل کے فاصلے پر تھے۔ ہمارا لشکر مدراس کو گھیرے ہوئے تھا اور ہمارا توپ خانہ اس پہاڑ پر نصب تھا جہاں سے گولہ باری کر کے مدراس کو زمین کے برابر کیا جا سکتا تھا۔ کیوں کپتان یاد آیا وہ وقت؟"

"جی ہاں نواب بہادر"۔ کپتان جلدی سے بولا:

"میں خود اس وقت مدراس میں موجود تھا۔"

نواب بہادر کی تیوریوں کے بل اور گہرے ہو گئے:

گلفام ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ اسی لیے وہ گلفام سے برادرانہ محبت تو کر سکتی تھی لیکن وہ اس کی اس پاگل پن کی محبت کے سخت خلاف تھی۔

دس سال کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوتی لیکن گلرخ نے ایک دن گلفام کو ڈانٹ دیا تھا:

"گلفام۔ ہوش کی باتیں کرو۔ تم میرے سگے بھائی جیسے نہیں بلکہ سگے بھائی ہو۔ میں تم سے بھائیوں جیسی تو محبت کر سکتی ہوں مگر اس کے آگے کچھ نہیں۔"

مگر اس کے ہم عمر گلفام نے بڑے والہانہ انداز میں جواب دیا تھا:

"نہیں گلرخ۔ تم میری سگی بہن نہیں ہو۔ میں تم سے بڑا ہو کر شادی کروں گا۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے!"

اور گلرخ نے غصہ سے اس کے منہ پر ایک طمانچہ جڑ دیا تھا۔

اس دن کے بعد گلفام نے اسے چھیڑنا اور اپنی بے تکی باتوں سے تنگ کرنا تو چھوڑ دیا تھا مگر گلرخ کی محبت اس کے دل سے پھر بھی نہ نکل سکی۔

پھر جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تو گلفام کی محبت میں کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہو گیا۔

یہ ۱۷۶۶ء کا آغاز تھا۔

نظام الملک نظام دکن نے والی ارکاٹ والاجاہ نواب محمد علی خاں کو سزا دینے کے لیے نواب حیدر علی والیِ میسور کو ایک نامہ روانہ کیا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

یہ بات نہیں تھی کہ نظام دکن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ والاجاہ نواب ارکاٹ کو شکست دے سکے بلکہ بات یہ تھی کہ بدبسی تاجر یعنی انگریز والاجاہ نواب محمد علی کے حلیف تھے اور خطرہ یہ تھا کہ اگر نظام نے ارکاٹ پر حملہ کیا تو والاجاہ اپنے حلیف کو پکارے گا اور انگریزی فوجیں فوراً اس کی مدد کو پہنچ جائیں گی۔

اس متوقع اتحاد سے نظام دکن پریشان تھا اور اسی بنا پر اس نے نواب حیدر علی خاں کو خط لکھا تھا اور ان سے تعاون کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

یہ نامہ جب لکھ کر تیار ہوا تو اس پر نظام دکن کے دستخط ہو کر مہر لگ گئی۔ پھر نظام نے اپنے خاص غلام گلفام کو طلب کیا۔ وہ اس کا معتمدِ خاص تھا۔

"گلفام!" نظام نے اسے مخاطب کیا:

"یہ خط بہت اہم اور خفیہ ہے۔ اسے لے کر تمہیں سرنگاپٹم جانا ہے اور صرف نواب حیدر علی خاں کے ہاتھ میں دینا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تم اس خط کی پوری پوری حفاظت کرو گے۔"

"شاہ بہادر۔ اطمینان رکھیے۔"

گلفام نے بڑے وثوق سے کہا:

"میں اس اہم نامہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا اور نواب حیدر علی خاں کو پہنچا کے آپ کی نظروں میں سرخرو ہوں گا۔"

"ہمیں تم سے یہی امید ہے گلفام۔"

نظام نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا:

"تم کافی سمجھدار ہو اور تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم اس نامہ کو جسم کے کون سے حصے میں چھپاؤ گے۔"

"آپ بالکل فکر نہ فرمائیے شاہ بہادر۔"

گلفام نے سینہ تان کر کہا:

"میں اس سے پہلے بھی آپ کے اعتماد پر پورا اتر چکا ہوں۔ اسی طرح اب بھی میں اعتماد بحال رکھوں گا۔"

"ٹھیک ہے گلفام۔"

نظام کو اطمینان ہو گیا:

"اب اس سلسلے میں ایک انتہائی خاص بات بھی سن لو۔ وہ یہ کہ دو بادشاہوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی ہے اس کی تفصیل کبھی قاصد کو نہیں بتائی جاتی لیکن اس خط کے مضمون سے تمہیں آگاہ کیا جا رہا ہے اس لیے کہ اگر خدانخواستہ راستے میں کوئی ایسا وقت آ جائے جب تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ خط تم سے چھین لیا جائے گا، اس صورت میں تمہیں اختیار حاصل ہو گا کہ تم اس خط کو فوراً ضائع کر دو اور سرنگاپٹم پہنچ کر نواب حیدر علی خاں کے سامنے اس خط کے مضمون کو زبانی عرض کرو۔"

گلفام کی سمجھ میں نہ آیا کہ نظام دکن کیا کہنا چاہتا ہے:

"میں سمجھ نہیں سکا شاہ معظم۔ نواب حیدر علی خاں سے میں کیا عرض کروں گا؟"

نظام دکن مسکرایا۔ وہ سمجھ گیا کہ گلفام الجھ گیا ہے:

"تم نواب بہادر سے وہی کہو گے جو ہم تمہیں بتائیں گے۔ اگر تمہیں خط ضائع کرنا پڑے تو نواب سے کہنا کہ کرناٹک کے والاجاہ نے بغاوت کر دی ہے۔ اسے ہم سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس کام میں نواب بہادر ہم سے تعاون کریں۔"

"میں سمجھ گیا۔" گلفام نے فوراً جواب دیا:

"بالکل سمجھ گیا شاہ معظم۔"

نظام دکن نے گلفام کو ایک سربمہر لفافہ دیا۔ گلفام نے لفافہ لے کر نظام کو سلام کیا اور واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ نظام کی آواز سنائی دی:

"گلفام۔ تمہیں مزید کسی تاکید کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی پھر بھی دوبارہ یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ کام نہایت خفیہ اور اہم ہے۔"

گلفام نے پلٹ کر اس طرح سر کو خم کیا جیسے دل و جان سے حاضر ہو۔

گلفام جب نظام کا نامہ لے کر گھر پہنچا تو اسے کچھ اور ہی خیالوں نے گھیر لیا۔

اس نے اس بات پر پہلے غور ہی نہیں کیا تھا کہ سرنگاپٹم میں اس کا ایک بھائی سردار بھی موجود ہے۔ یہ اس کا وہی بھائی تھا جس سے اس کی بچپن میں جنگ ہوا کرتی تھی اور اس جنگ کا باعث ان کی بہن گلرخ تھی۔

گلرخ کا خیال آتے ہی اس کا دماغ الٹ گیا۔

پچھلے سال ایک آدمی کرناٹک جا رہا تھا تو اس نے گلرخ کو ایک محبت بھرا خط لکھا تھا۔ اسے اب تک یہی یقین تھا کہ گلرخ اس کی سوتیلی بہن ہے اور وہ اس سے رشتہ جوڑ سکتا ہے مگر الگ الگ مقامات پر رہنے کی وجہ سے ان کی محبت پروان چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

گلرخ، گلفام اور سردار ــــ

اس مثلث نے اس کا دماغ گھما کے رکھ دیا۔ وہ تمام رات انہی خیالوں میں الجھا رہا اور لمحہ بھر نہ سو سکا۔

صبح کو اس کا بدن بے خوابی سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے نظام سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی سرنگاپٹم روانہ ہو جائے گا مگر دوپہر تک وہ بستر سے نہ اٹھ سکا۔

شاہی محل کے اندر ہی غلام گردش میں اس کی کوٹھڑی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ گلفام نظام کا منہ چڑھا غلام ہے اس لیے سب اس سے دور ہی دور رہتے تھے اور اس کے معاملات میں قطعی دخل نہ دیتے تھے۔

شام ہوتے ہوتے اس کا دماغ کچھ ٹھکانے لگا۔ وہ نہا دھو کے تیار ہوا۔ وہ ایک نئے فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

گلفام مختصر سفری سامان لے کر گھوڑے پر سوار ہوا مگر جب اس نے گھوڑے کو ایڑ دی تو اس کا رخ سرنگا پٹم کے بجائے کرناٹک کی طرف تھا۔

اس نے واقعی ایک زبردست فیصلہ کیا تھا۔

گلفام اپنی بہن گلرخ کی محبت میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے شاہی راز کو دشمن کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس نے کرناٹک جانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہ نواب والاجاہ محمد علی کے ہاتھ اس راز کو فروخت کرنا چاہتا تھا۔

گلفام نے چلنے سے پہلے اس معاملہ پر اچھی طرح سوچ بچار کر لیا تھا۔ اس کا یہ قدم انتہائی خطرناک تھا۔ وہ کھلے طور پر اپنے آقا اور اپنے ملک دکن سے غداری کر رہا تھا کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سرنگا پٹم کے بجائے کرناٹک پہنچ کے نواب والاجاہ کو یہ یقین دلائے گا کہ نظام دکن، اس کے خلاف نواب حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا ثبوت وہ خود یعنی گلفام ہے جو نظام کا پیغام لے کر نواب بہادر کے پاس جا رہا ہے۔

پھر جب گلفام نے کرناٹک پہنچ کر نواب والاجاہ کو یہ خبر بھجوائی کہ نظام دکن کا ایک خاص ہرکارہ والاجاہ کو ایک اہم راز سے آگاہ کرنے آیا ہے تو والاجاہ واقعی چونک پڑا۔

"نظام دکن کا ہرکارہ اور کرناٹک کے دربار میں۔"

اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

والاجاہ نے گلفام کو فوراً اپنے پاس طلب کر لیا۔

"تمہارا نام؟" نواب والاجاہ نے گلفام کے فرشی سلام کے جواب میں سوال کیا۔

"غلام کو گلفام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔" اس نے ادب سے جواب دیا۔

"ہم نے سنا ہے تمہارے پاس نظام دکن کا کوئی راز ہے۔" والاجاہ نے اس سے دوسرا

سوال کیا۔

"اعلیٰ حضرت والاجاہ کو صحیح اطلاع دی گئی۔" گلفام نے مختصر جواب دیا۔

"اور یہ راز تم ہم پر ظاہر کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ بھی درست ہے اعلیٰ حضرت!"

"مگر یہ راز تو نظام دکن کا ہے ہمیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

والاجاہ بڑا ہوشیار حکمران تھا۔ وہ گلفام پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ راز معلوم کرنے کے لیے بے چین ہے۔ پس اس نے پہلو بدل کے اس انداز سے کہا جیسے یہ بات اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

"مگر اعلیٰ حضرت والاجاہ۔" گلفام گھبرا گیا۔

اس کا اندازہ تھا کہ والاجاہ راز معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو جائے گا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔

اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور حوصلے سے کہا:

"اعلیٰ حضرت یہ درست ہے کہ راز نظام دکن کا ہے مگر اس راز یا اطلاع کا تعلق براہ راست حکومت کرناٹک سے ہے اور اگر وہ اطلاع آپ کے گوش گزار نہ کی گئی تو آپ کی حکومت کو زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

والاجاہ پھر بھی لاپرواہ بنا رہا۔ وہ بولا:

"اچھا۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تمہارے پاس جو راز ہے اس کا تعلق ہماری سلطنت کرناٹک سے ہے اور تم اسے ہم پر ظاہر بھی کرنا چاہتے ہو تو بھی تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم نظام دکن سے غداری کر رہے ہو۔ ایک ملک کے راز کو دوسرے ملک کے ہاتھ فروخت کرنا غداری کے سوا اور کسی نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟"

"غلام کو افسوس ہے کہ اسے غلط سمجھا جا رہا ہے۔"

گلفام نے مضبوط لہجے میں کہا:

"حالانکہ میں نے اعلیٰ حضرت پر خود اس راز کو افشا کرنے کی پیش کش کی ہے۔ اسے راز کو فروخت کرنے کا نام نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ میں نے اس کی کوئی قیمت طلب نہیں کی ہے۔"

والاجاہ نے دیکھا کہ غلام تو ہتھے سے اکھڑا جا رہا ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ بتائے بغیر ہی ناراض ہو کر چلا جائے۔ اس نے فوراً نرم پڑتے ہوئے کہا:

"ہمیں تمہاری صاف گوئی سے بہت خوشی ہوئی گلفام۔ دراصل ہم تمہارا امتحان لے رہے تھے۔ اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ ادھر ادھر کے لوگ غلط اطلاعات فراہم کر کے بھاری معاوضہ وصول کر لیتے ہیں۔

بہرحال تم وہ راز ظاہر کرو۔ ہم تمہاری خاطر خواہ خاطر مدارات کریں گے اور اگر کوئی مطالبہ کرو گے تو اسے بھی پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"

"اعلیٰ حضرت۔ اس معاملہ میں چونکہ ذرا سی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اس لیے میں درخواست کروں گا کہ پہلے اسے دور کر لیا جائے۔" گلفام نے بڑی ذہانت سے اپنی اہمیت جتائی۔

والاجاہ جلدی سے بولا:

"ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں۔ تم بے فکر رہو گلفام۔"

"غلام اعلیٰ حضرت کا شکر گزار ہے۔"

گلفام نے بات آگے بڑھائی:

"مگر میں پھر بھی یہ چاہتا ہوں کہ اپنی شخصیت، دیانت اور شرافت کے ثبوت میں آپ کے محل سے ایک گواہ پیش کروں۔"

والاجاہ نے چونک کر گلفام کو دیکھا:

"کیا کہا تم نے۔ گواہ اور ہمارے محل میں۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" اور والاجاہ کے چہرے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

"جی ہاں عالی جاہ!" گلفام نے جواب میں کہا:

"آپ کے محل میں گلرخ نام کی ایک کنیز ہے۔ آپ اسے طلب کیجیے۔ وہ میری گواہی دے گی۔"

والاجاہ کو تعجب سا ہوا:

"میری کنیز اور تمہاری گواہی۔ تمہاری بات کچھ مبہم ہے۔"

"عالی جاہ۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ گلرخ کو بلوائیے تو۔ پھر دیکھیے وہ میری گواہی دیتی ہے یا نہیں۔" گلفام نے زور دے کر کہا۔

نواب والاجاہ محمد علی خاں نے گلرخ کو طلب کر لیا۔

وہ اس اچانک طلبی پر سہم گئی۔ دربار میں پہنچ کے گلفام کو دیکھا تو بھونچکی رہ گئی۔ ادھر گلفام اسے بڑے پیار بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"کیوں کنیز۔" والاجاہ نے سخت لہجے میں دریافت کیا:

"کیا تم اس آدمی کو پہچانتی ہو؟"

گلرخ سہمی ہوئی تو پہلے ہی تھی، ہکلاتی ہوئی بولی:

"جی ہاں سرکار۔ یہ میرا بھائی گلفام ہے جو نظام دکن کی نوکر[illegible]"

"کس طرح کی نوکری کرتا ہے یہ؟" والاجاہ نے وضاحت چاہی۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی سرکار۔"

گلرخ جان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی:

"یہ بہت پرانی بات ہے۔ آٹھ سال پہلے کی۔ جب میں نظام دکن کے محل میں رہتی تھی اس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ پتہ نہیں یہ تب کیا کرتا تھا اور اب کیا کر رہا ہے۔"

"جب گلفام تمہارا بھائی ہے تو اتنے عرصے تک تم نے اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" والاجاہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"سرکار۔ چھوٹے دلیس کا رشتہ ہی کیا۔ میں کرناٹک سرکار کی نمک خوار ہوں اور یہ نظام سرکار کا غلام۔ رشتہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب میں کرناٹک آ گئی تھی۔" گلرخ نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔

"تم جا سکتی ہو کنیز۔" نواب والاجاہ نے اسے واپس کر دیا۔

"گلفام۔ ہمیں تم پر پہلے ہی اعتماد ہو گیا تھا۔"

والاجاہ نواب محمد علی خاں نے کہا:

"ہم نے تمہاری خواہش پر کنیز کو طلب کیا تھا۔ اس نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ تمہارا تعلق نظام حکومت سے ہے۔ اب تم بے دھڑک اس راز کو ظاہر کر سکتے ہو۔"

خیال رہے کہ خواہ زمانہ قدیم کے شاہی محلات ہوں یا آجکل کے حکومتی ایوانات، وہاں ہونے والی تمام گفتگو کنیزیں اور غلام چھپ چھپ کے سنتے تھے اور معقول معاوضہ پر دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ چونکہ یہ کام مشترکہ طور پر ہوتا تھا اس لیے کوئی کنیز یا غلام دوسرے کی شکایت نہ

کرتا تھا۔

اس ترقی یافتہ دور میں بھی بڑی بڑی حکومتوں کے اہم ترین راز ایسے ہی لوگوں کے ذریعے افشا ہوتے اور بھاری معاوضہ پر دوسروں تک پہنچ جاتے ہیں۔

نواب والاجاہ نے جب گلرخ کو طلب کیا تھا، اسی وقت تمام محل میں کھلبلی مچ گئی تھی اور اکثر کنیزیں اور غلام اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کے دربار میں ہونے والی گفتگو سننے میں لگ گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گلفام، گلرخ اور نواب والاجاہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو سنی تھی۔

اس کے بعد جب گلرخ دربار سے واپس گئی تو اسے بھی فکر ہوئی کہ آخر گلفام، نواب بہادر کے پاس کس غرض سے آیا ہے؟ پس وہاں سے باہر نکلتے ہی وہ بھی ایک ایسی جگہ چھپ کے کھڑی ہو گئی جہاں سے وہ دربار میں ہونے والی گفتگو سن سکتی تھی۔

نواب والاجاہ نے گلفام سے تنہائی میں گفتگو کی تھی۔ دربار کے پہلو والے جس کمرے میں دونوں میں گفتگو ہوئی تھی اس کے باہر صرف غلام پہرے پر تھا۔

گلفام چونکہ خود بھی ایک درباری غلام تھا اس لیے اس نے کرناٹک کے دربار میں داخل ہوتے ہوئے ایک سرسری نگاہ میں ہر چیز دیکھ لی تھی۔

جب والاجاہ نے گلفام کو راز ظاہر کرنے کو کہا تو اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا:

"اعلیٰ حضرت۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ دروازے پر پہرے دار موجود ہے۔ مجھے راز ظاہر کرنے میں کوئی عذر نہیں بشرطیکہ آپ مطمئن ہوں۔"

نواب نے اس کی احتیاط کو سراہا:

"تم نے درست کہا گلفام۔"

پھر نواب نے تالی بجا کر پہرے دار کو اندر بلوایا:

"تم دربار کے بڑے دروازے پر جا کے پہرہ دو ۔۔۔ اور خبردار کسی کو اس طرف ہرگز نہ آنے دینا۔"

پہریدار نواب کا حکم سن کر باہر چلا گیا۔ اس طرح پہرے دار کے گفتگو سن لینے کا خطرہ بھی ختم ہو گیا مگر نواب والاجاہ محمد علی خاں اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کی کنیز گلرخ کمرے کی اس

کھڑکی سے چمٹی کھڑی ہے جہاں سے وہ تمام گفتگو بآسانی سن سکتی ہے۔ صرف وہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ایک اور کنیز اور ایک غلام بھی دربار کی گفتگو سننے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد گلفام نے اپنی مکمل غداری کا ثبوت دیتے ہوئے نظام دکن کا راز افشا کیا:

"اعلیٰ حضرت۔ میرے آقا نظام دکن نے حیدر علی خاں والی سرنگا پٹم کو میرے ذریعے پیغام بھیجا ہے کہ تاجر پیشہ انگریز کرناٹک کے سرکش صوبیدار محمد علی خاں کی ملی بھگت سے جنوبی ہند میں اپنی حکمرانی کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے اس لیے نظام دکن یہ چاہتے ہیں کہ وہ حیدر علی خاں کے تعاون سے کرناٹک کے صوبے دار اور اس کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے آئیں۔"

گلفام نے سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی:

"یہ پیغام لے کر میں سرنگا پٹم جا رہا ہوں اور جو جواب حیدر علی خاں مجھے دے گا وہ میں نظام کو پہنچاؤں گا۔

میں نے اس مسئلے پر جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اس نتیجہ پہ پہنچا کہ اگر نظام دکن اور حیدر علی خاں کا مشترکہ لشکر کرناٹک پہ حملہ آور ہوا تو بہت خون بہے گا اور ہزاروں بے گناہ مارے جائیں گے اور ۔۔۔ اور ۔۔۔"

گلفام کہتے کہتے گھبرا گیا۔ اس کی آواز گلے میں اٹک گئی۔ اس موقع پر نواب والاجاہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا:

"کہو کہو۔ اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اور یہ کہ اعلیٰ حضرت جانتے ہیں کہ یہاں میری بہن گلرخ بھی موجود ہے۔" آخر گلفام نے دل کی بات اگل دی۔

"تمہیں اپنی بہن سے بہت محبت ہے گلفام؟" نواب والاجاہ نے بڑی تیکھی نظروں سے گلفام کو دیکھا۔

گلفام کا سر جھکا ہوا تھا اس لیے وہ نواب کی نظریں اور تلخ لہجہ محسوس نہ کر سکا۔

"جی ہاں اعلیٰ حضرت۔ گلرخ صرف میری بہن ہی نہیں بلکہ منگیتر بھی ہے مگر ذرا بد دماغ سی واقع ہوئی ہے۔"

والاجاہ چونک پڑا:

"اچھا تو یہ بات ہے۔ خیر ہم تمہارا خیال رکھیں گے۔ تم دو چار دن ہمارے مہمان رہو۔ ہم کچھ غور و فکر کریں گے اور اس دوران گلرخ سے بھی دریافت کریں گے۔"

گلفام کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اس نے سمجھ لیا کہ بس اب پالا مار لیا۔ اس کا چھوٹا دماغ اس کے سوا اور سوچ بھی کیا سکتا تھا۔

نواب والاجاہ کے حکم پر گلفام کو شاہی مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا اور وہ اپنے تصور میں گلرخ کو لیے مہمان خانے کے لوازمات میں پھنس گیا۔

ادھر والاجاہ کو اپنی فکر پڑ گئی۔ کرناٹک کا صوبہ اگرچہ ایک علیحدہ حکومت تھی جس کا وہ بلا شرکت غیرے حکمران تھا لیکن دہلی دربار کے فرمان کے مطابق نظام دکن کو کرناٹک کی یہ سیادت دی گئی تھی کہ کرناٹک کا ہر نیا نواب نظام دکن کی مرضی سے مقرر ہوتا تھا۔

نواب والاجاہ بالکل خود مختار صوبے دار تھا لیکن اسے دہلی دربار کی یہ شق بھی گوارا نہ تھی کہ کرناٹک کے گورنر کا تقرر نظام دکن کی مرضی سے کیا جائے۔

دہلی دربار کے فرمان کی اس شق کو دور کرنے کے لیے نواب محمد علی خان نے تگ و دو شروع کی اور آخر وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔

دہلی دربار سے تاجدارِ ہند کا ایک فرمان جاری ہوا جس میں نواب محمد علی خان کو کرناٹک کا نہ صرف خود مختار حکمران تصور کیا گیا بلکہ اسے "والاجاہ" کا خطاب بھی دیا گیا۔

اس فرمان سے نظام دکن پر جیسے بجلی گر پڑی۔ نواب والاجاہ نے اس فرمان کے جاری ہوتے ہی نظام دکن سے آنکھیں پھیر لیں اور اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اس نے انگریزوں سے ایسا گٹھ جوڑ کیا کہ انگریز اور والاجاہ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو گئے۔

نواب والاجاہ کی اس سرکشی اور غرور کے پیشِ نظر ہی نظام دکن نے نواب حیدر علی خاں کے تعاون سے کرناٹک پر قبضہ کرنے کا سوچا تھا اور اس سلسلے میں ایک خط اپنے خاص غلام گلفام کے ہاتھ سرنگاپٹم بھجوایا تھا لیکن غدار گلفام نے اس راز کو اپنی یک طرفہ محبت پر قربان کر دیا اور اپنی محبوبہ گلرخ کو حاصل کرنے کے لیے کرناٹک پہنچ گیا۔

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ گلفام اور گلرخ سگے بہن بھائی تھے مگر گلفام کے دماغ میں یہ بیٹھ گیا تھا یا کسی نے بٹھا دیا تھا کہ وہ گلرخ کا سوتیلا بھائی ہے اور یہ کہ وہ گلرخ سے شادی کر سکتا ہے جبکہ گلرخ کو اپنے سوتیلے بھائی سردار علی سے محبت تھی جو ان دنوں سرنگاپٹم میں نواب حیدر علی خاں کی فوج

میں ملازم تھا۔

نواب والاجاہ نے گلفام کو مہمان خانے میں بھیج کے فوراً اپنے نائب کو بلوایا اور اسی وقت اپنے حلیف انگریزوں کو ایک خط لکھوایا:

"ہمارے فوجی جاسوسوں نے نظام الملک نظام دکن کے ایک نامہ بر کو گرفتار کیا ہے جس کے قبضہ سے ایک اہم خط برآمد ہوا۔ اس خط میں نظام دکن نے نواب حیدر علی خاں کو لکھا ہے کہ غیر ملکی انگریز تاجر، والیٔ کرناٹک یعنی میرے تعاون سے جنوبی ہند پر قبضہ کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے اس لیے نواب حیدر علی خاں اور نظام دکن کو مشترکہ لشکر کے ساتھ انگریزوں اور کرناٹک کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔ خط لے جانے والا قاصد ہمارے قبضے میں ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ فوری طور پر آپ نظام دکن کو حیدر علی خاں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے سے کسی بھی طرح روکنے کی کوشش کیجیے اور نظام کو کچھ لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کیجیے کہ وہ حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کے بجائے آپ کا اور ہمارا تعاون حاصل کرے تاکہ ہم سب مل کر حیدر علی کی زور پکڑتی طاقت کو ختم کر دیں۔"

والاجاہ نے یہ خط انگریزی میں ترجمہ کرا کے انگریزوں کے صدر مقام مدراس روانہ کیا۔ اس بروقت اطلاع کے ملنے سے والاجاہ بہت خوش تھا کیونکہ نظام اور حیدر علی کے گٹھ جوڑ میں انگریزوں سے زیادہ اس کا نقصان مضمر تھا۔ کرناٹک پر حملہ کی صورت میں انگریز کرناٹک کی مدد کو ضرور آتے، کیونکہ والاجاہ دراصل انگریزوں کا ماتحت ہو گیا تھا لیکن انگریزوں کی طاقت اس قدر نہ تھی کہ وہ نظام اور حیدر علی کے دُہرے حملے کا مقابلہ کر سکتے۔

والاجاہ کے شاہی محل سے شام کے وقت ایک قاصد مدراس روانہ ہوا اور اسی محل سے نصف شب کے بعد ایک اور قاصد روانہ ہوا مگر اس کا رخ کرناٹک سے مدراس کے بجائے سرنگاپٹم کی طرف تھا۔ یہ قاصد شاہی محل کا ایک غلام تھا جسے گلرخ نے اپنے تمام زیورات حوالے کر کے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ فوراً سرنگاپٹم پہنچے اور وہاں سردار علی سے جو حیدری فوج میں ملازم ہے، ملے اور اسے یہ پیغام دے کہ نظام دکن کا قاصد سرنگاپٹم روانہ ہوا تھا مگر والاجاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہے اور

اس نے تمام راز اگل دیا ہے ـــ اور اس نے والاجاہ کو بتایا ہے کہ نظام دکن، نواب حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پس اگر نظام دکن کا قاصد گلفام سرنگاپٹم پہنچے تو اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کیا جائے بلکہ نواب حیدر علی خاں کو اپنے طور پر جنگ کی تیاری کرنی چاہیے کیونکہ والاجاہ نے انگریزی فوج کو بلوانے کے لیے قاصد روانہ کر دیا ہے اور سرنگاپٹم پر چند دنوں بعد حملہ ہو سکتا ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ کرناٹک کے شاہی محل سے چلنے والے دونوں نامہ بر اور پیامبر اپنے اپنے مقام پر پہنچے۔ والاجاہ کا نامہ بر مدراس پہنچا۔

اور ـــ

گلرخ کے بھیجے ہوئے پیامبر نے سرنگاپٹم میں قدم رکھا۔



سردار علی حیدری فوج کا ایک عام سپاہی تھا۔

مگر ـــ یہ عام سپاہی اپنی ہنس مکھ طبیعت، چٹکلوں اور لطیفوں کی وجہ سے خاص آدمی بن گیا تھا۔ حیدری فوج کے تمام چھوٹے بڑے عہدیدار سردار علی کی پُرلطف باتوں سے محظوظ ہوتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ فوجیوں کی محبوب اور مقبول شخصیت بن گیا تھا۔

چنانچہ ـــ

ارکاٹ سے آنے والے اس غلام کو جو گلرخ کا پیغام لے کر سرنگاپٹم پہنچا تھا سردار علی کو تلاش کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔

پیامبر نے فوجی بستی میں پہنچ کے جب سردار علی کے بارے میں دریافت کیا تو کئی فوجی اسے ساتھ لے کر سردار علی کے پاس پہنچے۔

"لو سنبھالو اپنے مہمان کو۔" ایک نے ہنس کر کہا۔

"سردار۔ ہم نے مہمان کو تمہارے پاس پہنچا تو دیا ہے مگر اپنے مہمان کی وجہ سے ہمیں فراموش نہ کر دینا۔" ایک دوسرے سپاہی نے اسے چھیڑا۔

"میرے بھائیو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میرے مہمان کو مجھ تک پہنچا دیا۔" سردار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"مگر اب خدا کے لیے میری جان چھوڑو تاکہ میں اپنے مہمان کی خاطر مدارات کر سکوں۔ اس سے

باتیں کرسکوں۔

اس مختصر نوک جھونک کے بعد جب سردار علی کے یار دوست رخصت ہوگئے تو اس نے اپنے مہمان سے دریافت کیا۔

"میرے مہمان بھائی۔ ان کم بختوں کی بک بک میں میں آپ سے ایک بات بھی نہیں کرسکا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس سے پہلے آپ کو کہاں دیکھا تھا!"

ارکاٹ کے قاصد نے جواب دیا:

"سردار بھائی۔ آپ اپنی یادداشت پر زور نہ دیجیے اس لیے کہ آپ مجھ سے کبھی نہیں ملے اور نہ میں نے آپ کو اس سے پہلے دیکھا ہے۔"

"آپ بڑے سچے اور کھرے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" سردار نے بڑے خلوص سے کہا:

"کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

قاصد نے جواب میں کہا:

"میرے بھائی سردار علی۔ میں ارکاٹ سے آیا ہوں جہاں کے حکمراں نواب محمد علی والاجاہ ہیں۔"

"اچھا تو آپ ارکاٹ سے تشریف لائے ہیں!" ارکاٹ کا نام سن کر سردار علی کا دل بلّیوں اچھلنے لگا تھا۔

"جی ہاں۔ میں ارکاٹ سے آیا ہوں اور آپ کے لیے گلرخ کا ایک نہایت اہم پیغام لایا ہوں۔" قاصد نے بے دھڑک ہوکے گفتگو شروع کی۔

"گلرخ؟"

سردار علی نے حیران نظروں سے پیامبر کو دیکھا:

"کیا تم گلرخ کو جانتے ہو؟"

"شاید تم ہوش میں نہیں ہو سردار علی۔" پیامبر نے جواب دیا:

"میں کہہ رہا ہوں کہ میں گلرخ کا پیغام لایا ہوں اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کیا میں گلرخ کو جانتا ہوں۔ تم ہوش میں آؤ تو میں تمہیں وہ اہم پیغام سناؤں جسے سنانے کے لیے میں خطروں کی پرواہ نہ کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں اور جس کے لیے گلرخ نے مجھے منہ مانگا معاوضہ ادا کیا ہے!"

"ہاں ہاں ضرور سناؤ۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ بس ذرا یونہی —" اور سردار علی کہتے کہتے رک گیا جیسے شرما گیا ہو۔

قاصد نے ادھر ادھر دیکھ کر رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا:

"ذرا کان کھول کے سنو سردار علی۔ میں اس وقت تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں یہی کچھ تم نواب حیدر علی خاں کے سامنے دہراؤ گے —"

"میں — میں نواب بہادر کے پاس کیسے جاؤں گا؟" سردار علی نے بات کاٹ دی:

"مجھ جیسے معمولی سپاہی سے نواب بہادر کیوں ملیں گے؟"

"تم خواہ مخواہ پریشان ہوگئے سردار علی۔"

قاصد نے اسے تسلی دی:

"یہ بات اتنی اہم ہے کہ نواب بہادر تمہیں انعام دیں گے۔ پہلے تم سن تو لو!"

"اچھا۔ تم کہتے ہو تو سنے لیتا ہوں۔"

سردار کو پسینہ آگیا تھا۔

قاصد نے آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کے گلرخ کا پیغام سنایا۔ پیغام سن کے سردار علی اور زیادہ گھبرا گیا۔

"قاصد بھائی۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا:

"تم جو پیغام لائے ہو وہ ضرور سچ ہوگا مگر میں نواب بہادر کے سامنے اسے کس طرح بیان کرسکوں گا۔ میں تو ان کے سامنے بول ہی نہ سکوں گا۔"

"سردار علی۔ تم بڑے بزدل آدمی ہو۔ سپاہی ہو کر ایسے ڈرپوک۔ معلوم نہیں تم میدانِ جنگ میں کیسے لڑتے ہوگے؟" قاصد بڑبڑانے لگا۔ اسے سردار علی پر غصہ آرہا تھا۔

"دیکھو بھائی۔ میدانِ جنگ اور جگہ ہے اور نواب بہادر کا دربار اور جگہ۔" سردار علی نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی:

"پھر بھی اگر تم مجھے ڈرپوک کہتے ہو تو میں تسلیم کیے لیتا ہوں لیکن میں نواب بہادر کے سامنے یہ سب کچھ نہ کہہ سکوں گا۔"

"پھر اور کون کہے گا؟" قاصد بگڑ گیا:

"اس بے چاری گلرخ نے تم تک یہ بات پہنچانے کے لیے مجھے اپنے سارے زیور دے دیے

ہیں اور ایک تم ہو کہ جسے نہ گلرخ کا خیال ہے اور نہ اس بات کی اہمیت کا کوئی احساس ہے۔"

"قاصد بھائی!" سردار لجاجت سے بولا:

"میں گلرخ کا اور تمہارا دونوں کا بہت بہت شکر گزار ہوں اور تم سے امید کرتا ہوں کہ جس حفاظت سے تم نے یہ پیغام مجھ تک پہنچایا ہے بالکل اسی طرح تم اسے نواب بہادر تک پہنچا دو گے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

قاصد کا پارہ چڑھ گیا:

"میں نے پیغام پہنچانے کا کام انجام دے دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں واپس ارکاٹ جا رہا ہوں۔"

قاصد واقعی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

سردار علی نے اس کے پیر پکڑ لیے:

"میرے بھائی۔ میرے دوست۔ میں تمہارے ساتھ نواب بہادر کے پاس چلوں گا لیکن ان سے بات تم کرو گے۔ خدا کے لیے مجھ پر یہ احسان کر دو۔"

قاصد کو اس پر رحم آ گیا۔ پھر وہ مسکرانے لگا:

"اچھا۔ مجھے لے چلو نواب بہادر کے پاس۔ میں خود بات کر لوں گا ان سے۔"

سردار علی خوش ہو گیا ــــ اور قاصد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا:

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں نواب بہادر سے اجازت لے کر ابھی آتا ہوں۔"

نواب بہادر حیدر علی خاں اپنے ایک سردار ہیبت خاں سے گفتگو کر رہے تھے کہ ان کے محافظ نے داخل ہو کر عرض کیا:

"نواب بہادر کا اقبال بلند ہو۔ سردار علی نام کے ایک سپاہی نے درخواست پیش کی ہے کہ اس کے پاس ارکاٹ سے ایک قاصد آیا ہے۔ اس کے پاس نواب بہادر کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔ اجازت ہو تو ان دونوں کو حاضر کیا جائے؟"

نواب بہادر نے حیرانگی سے پہلے محافظ اور پھر ہیبت خاں کو دیکھا:

"ارکاٹ سے قاصد آیا ہے۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ والاجاہ محمد علی تو انگریزوں کے جوتے

پورا بدن کانپ اٹھا۔

"میرے آقا ــــ میرے مالک ــــ میرے نواب بہادر۔ میں گستاخی کرنے پر مجبور ہوں۔ میں یہ گستاخی بار بار کروں گا مگر آپ کو غسل نہ کرنے دوں گا۔"

حیدر علی خاں چیخ پڑے:

"ہم تمہیں قتل کرنے کا حکم بھی دے سکتے ہیں۔"

"غلام کو قتل ہو جانا منظور ہے لیکن آپ کا غسل کرنا منظور نہیں۔" طبیب نے سر ہتھیلی پر رکھ کر جواب دیا۔

تمام مصاحب دم بخود کھڑے مریض اور طبیب کے نرم و گرم، تلخ و شیریں سوال و جواب سن رہے تھے۔

طبیب کے آخری جواب نے نواب بہادر کو خاموش کرا دیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر تکیے پر رکھ دیا۔

طبیب اور مصاحبوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

اس لمحے ــــ نواب بہادر نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ مصاحبین نے زندگی میں پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھے۔

پھر ــــ

انہوں نے بہت ہی نحیف آواز میں طبیب کو مخاطب کیا:

"میرے وفادار۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنے مالک کے دربار میں گندے بدن اور بدبودار کپڑوں کے ساتھ جاؤں؟"

نواب بہادر کے اس جملے پر حاضرین کی آنکھیں برس پڑیں۔ طبیب نے چیخ مار کر نواب بہادر کے پیر پکڑ لیے:

"میرے آقا۔ اب میں آپ کو نہیں روک سکتا۔ میں آپ سے تو گستاخی کر سکتا ہوں مگر اس دربار میں گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ غسل ضرور فرمائیں گے۔"

نواب بہادر کو اسی وقت غسل دیا گیا۔ اور ان کا لباس تبدیل کیا گیا۔ دوسرا لباس پہن کے حیدر علی خاں نے کلمہ اور درود شریف پڑھ کے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر حکم دیا:

"پانچ ہزار سوار انگریزوں کے مقابلہ پر اور دو ہزار سوار ارکاٹ روانہ کیے جائیں۔"

صرف یہی حکم نہیں دیا بلکہ اس کی تعمیل بھی کرائی۔

یہ نواب بہادر کا پہلا اور آخری سنبھالا تھا جس میں انھوں نے احکامات صادر کیے۔

رات کے آخری حصے میں چند گھونٹ شوربے کے پیے اور آرام کرنے کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔ پھر تمام لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا مگر تمام لوگ ذرا سا پیچھے ہٹ کر وہیں کھڑے رہے۔

پھر —

چند ساعت بعد نواب بہادر حیدر علی خاں نے ایک پُرآشوب اور پُرجوش زندگی گزار کر نہایت خاموشی سے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

یہ وہ شب تھی کہ ۱۱۹۵ھ رخصت اور ۱۱۹۶ھ کا آغاز ہو رہا تھا اور انگریزی تاریخ، دسمبر ۱۷۸۲ء تھی۔

اراکینِ سلطنت نے وفات کی خبر مصلحتاً مخفی رکھی اور جنازہ کو ایک آراستہ و پیراستہ صندوق میں اس طرح بھیجا گویا وہ کوئی بڑا قیمتی خزانہ ہو۔

عارضی طور پر نواب بہادر کا جسدِ خاکی کولار میں ان کے والد فتح محمد کے پہلو میں امانتاً دفن کیا گیا۔ بعد میں سرنگا پٹم بھیج کے گنبد میں دفن کیا گیا۔

ایک شاعر نے تاریخ وفات:

حیدر علی خاں بہادر

۱۱۹۵ھ

سے نکالی۔



جنوبی ہند کے اس اولوالعزم اور بہادر فرمانروا نے اپنی تمام عمر نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ بسر کی۔

حیدر علی نے اگرچہ مکتب کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن وہ تعصبات سے مبرّا ایک کھرے سپاہی اور بہترین شہسوار تھے۔ دنیا میں اس پایہ کے بہت کم فوجی پیدا ہوتے ہیں۔

حیدر علی نے کبھی خوف و ہراس کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ انھوں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی ہمت نہیں ہاری۔ سرنگا پٹم میں جب راجہ کی سازش سے ان کی جان پر بن آئی تو وہ رات کو دریا کی طوفانی موجوں میں کود کے پار جا اترے اور پھر فوج جمع کر کے مقابلے پر آ گئے۔

مرہٹہ سپہ سالار ترمک راؤ کے مقابلہ میں انہیں سرنگا پٹم کی طرف پسپا ہونا پڑا مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری اور پلٹ کر ایسا شب خون مارا کہ مرہٹوں کو بھاگتے ہی بنی۔

ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ دشمنوں کی صفوں میں بے خوف و خطر دلیرانہ وار گھس جایا کرتے تھے۔

نواب حیدر علی خاں مستقل مزاج اتنے تھے کہ خطرے میں کبھی نہ گھبراتے۔ کڑپہ میں رات کے وقت جب افغانوں نے ان کے خیمہ پر حملہ کیا تو انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ بستر پر تکیہ رکھا اور اس پر چادر اوڑھا کر چپ چاپ باہر نکل گئے۔

ان کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے مفسدہ پرداز ان کے نام سے کانپتے تھے۔ حیدر علی غلطیاں معاف نہیں کرتے تھے بلکہ کوڑوں کی سزا دیتے تھے۔ ایک بار کسی غلطی پر

انہوں نے اپنے پیارے بیٹے شہزادہ ٹیپو کو بھی کوڑوں کی سزا دی تھی۔

حیدر علی کی سختی اور درشتگی کا بہت پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ جسقدر سخت مزاج تھے اس سے کہیں زیادہ منصف مزاج اور رحمدل تھے۔ دو انگریزوں نے جب فرانسیسی جن گران کے ملازموں کو ورغلانا شروع کیا تو نواب بہادر نے انہیں سزا دینے کے بجائے پانڈیچری روانہ کر دیا۔

ان کے انصاف کا یہ عالم تھا کہ ایک بار سیر کے دوران ایک بڑھیا نے ان کو روک کر فریاد کی کہ اس نے ایک درخواست دی تھی جس پر غور نہیں کیا گیا۔ پتہ چلا کہ درخواست سردار حیدر شاہ کو دی گئی تھی جس میں درج تھا کہ نقیبوں کے سردار آغا محمد نے بڑھیا کی لڑکی چھین لی ہے اور حیدر شاہ نے اسلیے درخواست پر غور نہیں کیا کہ ماں بیٹی کو طوائف بنا یا گیا تھا۔

مزید تحقیقات سے ثابت ہوا کہ بڑھیا اور لڑکی پاکباز ہیں اور ان پر ظلم ہوا ہے۔ نواب بہادر نے سردار حیدر شاہ کو ۲۰ کوڑوں کی سزا دی اور آغا محمد کا سر قلم کرا کے بڑھیا کو اس کی بیٹی واپس کی گئی اور اسے کافی رقم دے کر رخصت کیا گیا۔

خدا رحمت کرے برصغیر کے اور عالمِ اسلام کے اس عظیم اور زبردست ہیرو پر جو برصغیر کے مسلمانوں کا نجات دہندہ بن کر آیا تھا۔

